جولائی ۱۹۴۹ء

دُنیا کا معرکہ آرا تاریخی شاہکار

تاریخ عالم کی خونچکاں داستانیں اُردو ادب میں بلحاظ موضوع اور تحقیق و تفتیش بے مثال تصنیف!!!

تاریخ انقلاباتِ عالم

دو جلدوں میں

از سید ابو سعید بزمی ایم اے

اُردو ہی نہیں دُنیا کی تمام زبانوں میں یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے پہلی کتاب ہے جو تاریخ انقلاباتِ عالم کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے عہدِ حاضر تک کے تمام سیاسی، تمدنی، مذہبی اور سماجی انقلابات کی جامع اور ہمہ گیر تاریخ ایسے مفکرانہ انداز سے لکھی گئی ہے جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ فاضل مصنف نے دس سال کی طویل محنت اور عرق ریزی سے کام لے کر ثابت کر دیا ہے کہ یہ تاریخ سیاست اور معیشت پر ایک مستقل انسائیکلوپیڈیا ہے جس کا مطالعہ ہر اہلِ علم کے لئے ناگزیر ہے خصوصاً اخبار نویسوں، طالبعلموں اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد معلومات افزا کتاب ہے۔ اور طرفہ یہ کہ مصنف کا نقطۂ نظر پارٹی پالٹکس سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا وہ اس درجہ غیر جانبدارانہ ہے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوگی۔

سائز ۲۲×۱۸/۱۶ کاغذ دبیز۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب

قیمت۔ جلد اوّل دس روپے۔ جلد دوم دس روپے

کتاب منزل لاہور

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس، ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

مدیر

محمد ناظر

مدیر "آموزش" کی تسلیم کے ساتھ

ناشر

جولائی ۱۹۴۹ء | کتاب منزل | سالانہ چندہ :-

جلد :- ۲ | لاہور | پاکستان کیلئے: ۶ روپے

شمارہ :- ۴ | قیمت فی پرچہ دس آنے | غیر ممالک کیلئے: ۸ روپے

رموز

قیام پاکستان کے بعد "تعلیم" کا موضوع سب سے زیادہ اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ سب کی توجہات اسی طرف مبذول ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے۔ کہ اپنے بچّے کو تعلیم سے بہرہ ور کرے۔ اسکولوں میں بچّوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور اب حالت یہاں تک پہنچی ہے۔ کہ اکثر اسکول طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کو سنبھالنے کے ناقابل ہیں۔

قیام پاکستان سے پیشتر اسکولوں اور کالجوں میں غیر مسلم طلبہ کے مقابلے میں مسلم طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ اور اس کم تعداد کا بیشتر حصّہ ابتدائی جماعتوں میں ہوا کرتا تھا۔ اعلیٰ جماعتوں میں کچھ تو افلاس اور ناقابل برداشت مصارف کے باعث اور زیادہ تر غیر اقوام کے غلبہ کے زیر اثر مسلم طلبہ کی تعداد بہت ہی کم رہ جاتی تھی؛ پاکستان بننے کے بعد خدا کے فضل سے یہ حالت نہیں رہی۔ اب جہاں ابتدائی جماعتوں میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہے۔ وہاں اعلیٰ جماعتیں بھی کھچا کھچ بھری ہوئی ہیں۔

تعداد کے بڑھ جانے سے نئے اسکولوں اور کالجوں کی ضرورتیں بڑھ گئی ہیں۔ موجودہ اسکول اور کالج محدود تعداد تک تعلیم دے سکنے کے قابل ہیں۔ ان میں غیر محدود طلبہ کے داخلے سے تعلیم پر بحیثیت مجموعی بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اور نہ صرف بُرا اثر پڑے گا

بلکہ تعلیم سرے سے ناممکن ہو جائے گی۔ موجودہ اسکول اور کالج بچّوں کے والدین کو اس بات سے مطمئن نہیں کر سکتے۔ کہ ان کے ہاں محدود وسعت، اور ذرائع وسامان تعلیم کی قلت کے باعث مزید داخلہ ناممکن ہے۔ ان کے بچّے داخل نہ ہوں، تو وہ یہی کہتے ہیں عجیب بات ہے! پاکستان بننے کے بعد تعلیم کے اربابِ اہتمام کا دماغ کہاں پہنچا ہے کہ اب ہمارے بچّوں کو داخل بھی نہیں کیا جا سکتا۔" اس قسم کی شکایات برقرار رہیں گی۔ جب تک نئے اسکولوں اور کالجوں کا اہتمام نہیں ہوتا ——!

نئے اسکولوں اور کالجوں کا اہتمام بھی آسان نہیں۔ ان کے لئے عمارتیں، سامان اور اساتذہ چاہئیں۔ عمارتیں اور خاص طور پر اچھی تعداد کے اسکولوں اور کالجوں کی عمارتیں مختصر سے سرمایہ سے تیار نہیں ہو سکتیں۔ درسگاہوں کا ضروری سامان بھی چھوٹی رقموں سے مہیّا نہیں ہو سکتا۔ اساتذہ بھی کم تنخواہوں پر میسّر آنے ناممکن ہیں۔ کیونکہ دوسرے محکموں میں معقول تنخواہیں مل جانے کے باعث گریجوایٹوں کی توجہ زیادہ اُن محکموں کی طرف مائل ہے۔ اور وہ درسگاہوں میں ملازمت کرنے سے متنفر اور گریزاں ہیں۔ جب تک کہ اس تعلیمی محکمے میں جاذب تنخواہیں نہیں رکھی جائیں گی۔ نئے اساتذہ کا میسّر آنا بھی ممکن نہیں۔

بہرحال اس اہم قومی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہمیں بھاری اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے۔ تاکہ عمارتیں بھی میسّر آئیں، سامان بھی ضرورت کے مطابق مہیّا ہو۔ اور قابل اساتذہ بھی ملیں۔

اب سوال یہ ہے۔ کہ یہ اہم اخراجات کہاں سے پورے ہوں؟

دوسری چیزوں کی خاطر جن سے تعلیم کچھ کم اہم نہیں۔ ٹیکس وصول کئے جا رہے ہیں۔ اور ان ٹیکسوں کی ادائیگی باقاعدہ ہو رہی ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا۔ کہ تعلیم جیسے اہم قومی فریضہ کے ان ہنگامی اور ضروری اخراجات کے لئے ٹیکس عائد کئے جائیں۔ اور قوم کے افراد بخوشی اس ٹیکس کو ادا کریں۔ جس سے ان کی مستقبل کی اُمیدیں مناسب طور پر پروان چڑھیں۔

تعلیمی حلقے میں دوسرا اہم مسئلہ جو اس وقت زور شور سے زیر بحث ہے۔ ذریعہ تعلیم کا ہے۔ اردو کو قومی زبان قرار دینے کے بعد آزاد ملک کی اہم ضرورت یہ ہے۔ کہ یہی زبان اس ملک میں ذریعہ تعلیم ہو۔ دسویں جماعت تک تمام مضامین کے لئے اردو ذریعہ تعلیم قرار دینے میں کسی کو دقت محسوس نہیں ہو رہی۔ البتہ اعلیٰ تعلیم میں اس زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر اختلاف ہو رہا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے۔ کہ سائنسی علوم و فنون کے لئے یہ ذریعہ تعلیم مہلک ہوگا۔ اور اس کے لئے دو بڑی وجوہ پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اصطلاحات کا ترجمہ ابھی تک معیاری طور پر اردو میں نہیں ہوا۔ دوسرا یہ کہ وہ اصطلاحیں بین الاقوامی بن چکی ہیں اور سائنسی علوم کے لئے تحقیق و تدقیق اور جدید انکشافات کا اظہار عموماً بین الاقوامی زبان میں ہوتا ہے۔ اس لئے اردو کے ذریعے تعلیم لینے والے حضرات نئی تحقیقات کے علم سے محروم رہ جائیں گے۔ یا جدید انکشافاتی حلقے میں کام کرسکنے کے اہل نہیں رہیں گے سائنسی علوم میں طبیعیات، کیمیا، طب، انجنیئرنگ، وغیرہ کا خاص طور پر نام لیا جاتا ہے۔ اور انہی کی مروجہ اصطلاحات کو آڑ بنایا جا رہا ہے۔

یہاں ہمیں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی اہمیت بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مسلمہ امر ہے۔ کہ اجنبی زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ کسی چیز کے سمجھنے میں بھی کافی دیر لگتی ہے۔ اور پھر صحیح طور پر کچھ پلے بھی نہیں پڑتا۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنائے بغیر چارہ نہیں لیکن سائنسی علوم کے علاوہ باقی مضامین کا ذریعہ اردو بنا دینے سے تو کوئی بڑا قومی فائدہ میسر نہیں آنے کا۔ ذریعہ تعلیم اردو بنانے کا مقصد تو یہ ہے۔ کہ سائنسی علوم آسانی سے اور صحیح طور پر طلبہ کے ذہن نشین ہوں۔ اور ان کے حصول میں کافی عرصہ نہ لگے۔ اگر بقول بعض حضرات سائنسی علوم کی تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہی رہا۔ تو پھر قومی حیثیت سے تعلیمی مقاصد میں ترقی کا خیال موہوم ہے۔ ماضی اور مستقبل میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اصطلاحات کے ترجمے کا بہانہ بے سود ہے۔ اور اس بہانے سے ان علوم کی تحصیل کو محض

ی طرح دشوار اور پیچیدہ رکھنے سے بہت بڑا نقصان ہوگا۔ یہ بہانہ تو اس طرح بھی رفع کیا جاسکتا ہے۔ کہ جب تک اُردو میں معیاری اصطلاحات قائم نہیں ہوتیں۔ انگریزی اصطلاحات سے ہی کام لیا جائے لیکن تعلیمی توضیحات ساری اُردو زبان کے ذریعہ ہوں۔ دوسری دِقت جو عام طور پر پیش کی جارہی ہے۔ وہ بھی مبنی بر صحت نہیں۔ مانا کہ بین الاقوامی زبان میں تحقیق و تدقیق ہوتی رہے گی لیکن کیا اس قسم کی تحقیق و تدقیق کو اپنے ملک کے ارباب علم و فہم تک پہنچانے کا کوئی سامان نہیں کیا جائے گا۔ کیا مغربی علوم و فنون کی ترقی اور توسیع کے معلومات حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان کے ذریعے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ ایسی حالت میں تو ملک کی رفتار بجائے ترقی کی طرف بڑھنے کے منقطع ہو کر رہ جائے گی۔ ملک کی علمی اور معلوماتی ترقی کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ دُنیا میں جو تحقیقیں یا ایجادیں ہورہی ہیں۔ ان کے معلومات اُردو زبان میں اس ملک میں شائع ہوا کریں۔ حکومت کو اپنے ملک کی بہتری کے لئے ایک ایسا دارالترجمہ یا ادارہ کھولنا پڑے گا۔ جو دُنیا کی تحقیقات کے متعلق دوسری زبانوں میں بیانات کے ترجمے اپنے ملک کے آدمیوں تک پہنچائیں۔ اور مستقل طور پر ایسے رسالے جاری کرنے پڑیں گے۔ جو ان علوم و فنون کی توسیع و ترقی کے لئے معلومات بہم پہنچائیں۔

علاوہ ازیں تحقیقات کا معاملہ تو انتہائی جماعتوں کی تعلیم کے آخر میں شروع ہوتا ہے کالجوں میں ایسے طلبہ کے لئے اختیار ہوگا۔ کہ وہ انگریزی کو بطور ایک علیحدہ مضمون کے پڑھیں اور اس میں وہ حسب ضرورت مہارت پیدا کرکے اس قابل ہو سکتے ہیں۔ کہ انگریزی کی کتابیں دیکھ سکیں۔ کیا جرمنی، فرانسیسی، اطالوی اور دوسری مغربی زبانوں میں تحقیق و تدقیق کرنے والے ان زبانوں کا مطالعہ اعلےٰ تعلیم کے دوران میں شروع نہیں کرتے۔ اور پھر کچھ عرصے میں اس قابل نہیں ہوجاتے۔ کہ ان زبانوں میں لکھے ہوئے ادب کا تسلی بخش مطالعہ کر سکیں۔ جامعہ عثمانیہ میں اعلےٰ تعلیم سب اُردو میں دی جاتی تھی۔ اس کے طلبہ تحقیقات و انکشافات

کے میدانوں میں بھی اُترے۔ مغربی ممالک میں مزید تعلیم کے لئے بھی گئے۔ ہر جگہ سرخرو ہوئے
ان کے لئے تو اس قسم کے بہانے حائل نہیں ہوئے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ اصطلاحی اور تحقیقاتی دِقتیں اس وقت تک ہیں۔ جب تک
کہ اُردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا جاتا۔ اسے ذریعہ تعلیم بنانے کا حکم جاری ہو جائے تو ساری
تکالیف حسب ضرورت خود بخود دُور ہو جائیں گی۔ اصطلاحیں حسب ضرورت جلد ایجاد
ہوں گی۔ اور تحقیقات کے لئے سامان بھی ہو جائے گا۔

بہت ضرورت ہے۔ کہ اُردو میں تعلیم دینے کا کام جلد شروع ہو جائے۔

مُعلّم حساب کی مُشکلات — ۳

سیّد محمد صدیق - ایم - اے

طلبہ کسورِ عام کی جمع اور تفریق سیکھ چکے ہیں۔ اب مُعلّم اُنہیں کسورِ عام کی ضرب سِکھانا چاہتا ہے۔ وہ کوئی کسر مثلاً ۲/۷ تختہ سیاہ پر لکھے گا۔ اور اُسے چار دفعہ جمع کرنے کو کہے گا۔ لڑکے اس کا جواب ۸/۷ نکالیں گے۔ اب اسی کسر کو ۴ سے ضرب دینے کو کہے گا۔ اور طلبہ کی رہنمائی کرتے ہوئے اُنہیں بتائے گا۔ کہ ۲/۷ سے دو ساتویں حصّے مراد ہیں۔ اور ساتویں حصّوں کی تعداد ظاہر کرنے والا ہندسہ ۲ ہے۔ اس لئے ہم ۲ کو ۴ سے ضرب دیں گے۔ اور ۷ کو اُسی طرح رہنے دیں گے۔ جواب وہی آئے گا۔ جو ۲/۷ کو چار دفعہ جمع کرنے سے آتا ہے۔ یعنی ۸/۷

اِسی طرح کی چند مثالیں حل کرانے کے بعد طلبہ سے یہ قاعدہ اخذ کرائے گا۔ کہ جب کسی کسر کو صحیح عدد سے ضرب دینا ہو۔ تو شمار کنندہ کو صحیح عدد سے ضرب دے دی جاتی ہے۔ اور مخرج اپنے اصلی حال پر رہتا ہے۔ البتہ اگر کسر کا اختصار ممکن ہو۔ تو وہ کیا جا سکتا ہے

پھر مُعلّم کسروں کو صحیح اعداد پر تقسیم کرنے کا طریقہ یوں سکھائے گا۔ کہ کوئی کسر مثلاً ۶/۷ تختہ سیاہ پر لکھے گا۔ اور ایک سوال کے ذریعے طلبہ سے نکلوائیگا۔ کہ یہ چھ ساتویں حصّے ہیں۔ وہ اُن سے

کہے گا۔ کہ اس کسر کو ۳ پر تقسیم کرنا ہے۔ اب اُن سے دریافت کرے گا۔ کہ چھ ساتویں حصّوں کا تیسرا حصّہ کیا ہے۔ چونکہ شمار کنندہ ساتویں حصّوں کی تعداد کو ظاہر کرتا ہے۔ اسلئے شمار کنندہ کو ہی ۳ پر تقسیم کرنا ہوگا۔ اور جواب $\frac{2}{7}$ آئے گا۔ اگر شمار کنندہ صحیح عدد پر پورا تقسیم نہ ہو سکے۔ تو ہم کسر کی صورت بدلنے کے لئے اُس کے شمار کنندے اور مخرج دونو کو کسی عدد سے ضرب دے دیں گے۔ اِس سے کسر کی قیمت میں کوئی فرق نہیں آئے گا مثلاً ہمیں $\frac{3}{4}$ کو ۵ پر تقسیم کرنا ہو۔ تو کسر کا شمار کنندہ چونکہ ۳ ہے۔ اور وُہ ۵ پر تقسیم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم شمار کنندہ اور مخرج دونو کو ۵ سے ضرب دیں گے۔ اِس کی صورت $\frac{15}{20}$ ہو جائے گی۔ اس کے شمار کنندہ کو ۵ پر تقسیم کریں گے۔ تو جواب $\frac{3}{20}$ آئے گا۔

اب مدرس طَلَبہ کو بتائے گا۔ کہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اگر $\frac{3}{4}$ کے مخرج کو ۵ سے ضرب دے دیں۔ تو بھی جواب $\frac{3}{20}$ آتا ہے۔ پس اختصارِ عمل کی خاطر ہمیں ایسے سوالوں میں کسر کے مخرج کو صحیح عدد سے ضرب دے دینی چاہیئے۔

کسر کو کسر سے ضرب دینے کا طریق طَلَبہ کے ذہن نشین کرنے کے لئے مدرس یہ طریق کار اختیار کرے گا۔ مثلاً وہ تختۂ سیاہ پر $\frac{5}{8} \times \frac{3}{8}$ لکھے گا۔ اور طَلَبہ سے نکلوائے گا۔ کہ $\frac{5}{8}$ سے پانچ آٹھویں اور $\frac{3}{8}$ سے تین آٹھویں حصّے مراد ہیں۔ اب وہ کسر کو صحیح عدد پر تقسیم کرنے کے مندرجہ بالا قاعدے کی رُو سے $\frac{5}{8}$ کا آٹھواں حصّہ دریافت کرے گا۔ طَلَبہ جواب دیں گے $\frac{5}{64}$، پھر کسر کو صحیح عدد سے ضرب دینے کے مندرجہ بالا طریق کی مدد سے وہ $\frac{5}{64}$ کو ۳ سے ضرب دلائے گا۔ جس کا جواب $\frac{15}{64}$ آئے گا۔ چند ایک مثالیں حل کرانے کے بعد مدرس یہ قاعدہ اخذ کرائے گا۔

جب ایک کسر کو دوسری کسر سے ضرب دینا ہو۔ تو اُن کے شمار کنندوں کے حاصل ضرب کو نیا شمار کنندہ اور مخرجوں کے حاصل ضرب کو نیا مخرج بناؤ۔ جب دو سے زیادہ کسروں کو باہم ضرب دینا ہو۔ تو بھی تمام کسروں کے شمار کنندوں کا حاصل ضرب

کسر مطلوبہ کا شمار کنندہ۔ اور اُن کے مخرجوں کا حاصل ضرب کسر مطلوبہ کا مخرج ہوگا۔

کسر کو کسر پر تقسیم کرنے کا طریق سکھاتے وقت مدرس ذیل قسم کے طریق تعلیم سے کام لے گا۔ وہ تختہ سیاہ پر لکھے گا۔ $\frac{2}{3}$ کو $\frac{3}{4}$ پر تقسیم کرو۔

اب وہ طلبہ کو بتائے گا۔ کہ اگر $\frac{2}{3}$ کو ۳ پر تقسیم کرنا ہوتا۔ تو جواب $\frac{2}{3} \times \frac{1}{3} = \frac{2}{9}$ ہوتا۔ مگر چونکہ $\frac{2}{3}$ کو تین کے چوتھے حصے پر تقسیم کرنا ہے۔ اس لئے $\frac{2}{9}$ اصل جواب کا چوتھا حصہ ہے۔ یا یوں سمجھو کہ اصل جواب $\frac{2}{9}$ سے چار گنا ہے۔ اس لئے جواب مطلوبہ $\frac{2}{9} \times 4 = \frac{8}{9}$ ہے۔

ایسی چند مثالیں حل کرانے کے بعد مدرس یہ قاعدہ اخذ کرائے گا:-

"جب کسر کو کسر پر تقسیم کرنا ہو۔ تو مقسوم علیہ کو اُلٹا دو اور پھر ضرب کا عمل کرو۔"

کسورِ عام کے چاروں قاعدے سکھا چکنے کے بعد۔ اب مدرس طلبہ کو کسورِ اعشاریہ کے ہر چہار قواعد یعنی جمع۔ تفریق۔ ضرب اور تقسیم۔ سے روشناس کرائے گا۔

لڑکے صحیح اعداد کی کتابت کے سلسلے میں پڑھ چکے ہیں۔ کہ کسی ہندسے کو اگر بائیں طرف سے دائیں طرف سرکائیں۔ تو اُس کی قیمت دسواں حصہ رہ جاتی ہے۔ مثلاً ۲۲۲ میں بائیں طرف کا ۲ دو سینکڑوں کو، اس سے دائیں طرف کا ۲ دو دہائیوں کو۔ اور اس دو سے دائیں طرف کا ۲ دو اکائیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ مدرس طلبہ کو بتائے گا۔ کہ اگر اس طریقۂ کتابت کو وسعت دی جائے اور ۲۲۲ کے بائیں طرف کے آخری دو کی دائیں طرف ۵، ۶، ۷ ترتیب وار لکھ دئے جائیں۔ تو اکائی کے پاس کا ہندسہ ۵ دسویں۔ اُس کی دائیں طرف کا ہندسہ ۶ سویں اور اُس کی دائیں طرف کا ہندسہ ۷ ہزارویں ہوگا۔ اور اس طرح جوں جوں دائیں طرف ہندسوں کا اضافہ کرتے جائیں گے اِن کی قیمتوں میں دس گُنا کے حساب سے کمی آتی جائے گی۔ اُوپر کی مثال میں ۲۲۲ تو صحیح عدد ہے۔ اور ۵ دسویں ۶ سویں اور ۷ ہزارویں کسور ہیں۔ صحیح عددوں کو کسروں

سے جدا کرنے کے لئے صحیح عددوں کی دائیں طرف یہ نشان " ٫ " لگایا جاتا ہے۔ جسے
علامتِ اعشاریہ کہتے ہیں۔ اس علامت کی دائیں جانب کے ہندسوں کو اعشاریہ کے
ہندسے اور اِن ہندسوں کی تعداد کو مراتبِ اعشاریہ کہتے ہیں۔ چونکہ اِن کسروں کا مخرج یا
نسب نما دس یا دس کا کوئی ضعف ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں کسورِ اعشاریہ کہتے ہیں۔
اَعشار عُشر کی جمع ہے۔ اور عُشر عربی میں دسویں حِصّے کو کہتے ہیں۔

کسورِ عام اور کسورِ اعشاریہ میں یہ فرق ہے۔ کہ کسورِ عام میں مخرج یا نسب نما مقرر نہیں ہوتا۔ ایک چیز کے جتنے حِصّے چاہیں۔ بنا لیں۔ لیکن کسورِ اعشاریہ میں اِن کسروں کا مخرج دس یا دس کا کوئی ضعف ہونا ضروری ہے۔

کسرِ اعشاریہ کا تصوّر دلانے کے بعد مدرس طلبہ کو کسورِ اعشاریہ کی جمع سکھائیگا مدرس اُنہیں بتائے گا۔ کہ کسورِ اعشاریہ کی جمع کا طریق بھی وہی ہے۔ جو صحیح اعداد کی جمع کا ہے جس طرح صحیح عددوں کی جمع میں اکائی کے نیچے اکائی اور دہائی کے نیچے دہائی وغیرہ لکھتے ہو۔ اسی طرح کسورِ اعشاریہ میں دسویں کے نیچے دسواں۔ سویں کے نیچے سواں وغیرہ لکھو۔ اور حسبِ معمول دائیں طرف سے جمع کرنا شروع کرو۔ ہزارویں کا حاصل سویں میں اور سویں کا حاصل دسویں میں اور دسویں کا حاصل اکائی میں جمع کرو۔ مثلاً :-

۴۷٫۱۲۳ ، ۱۵۶٫۷۴۶۷ ، ۹٫۵۷۶۸ کو ہمیں جمع کرنا ہے۔

۴۷٫۱۲۳
۱۵۶٫۷۴۶۷
۹٫۵۷۶۸
۲۱۳٫۴۴۶۵

پہلے مندرجہ بالا طریق سے کسورِ اعشاریہ کو لکھا۔ پھر ۷ اور ۸ دس ہزارویں کو جمع کیا۔ تو پندرہ دس ہزارویں حاصل ہوئے۔ مگر دس دس ہزارویں برابر ہیں ایک ہزارویں کے۔ اس لئے ۵ کا ہندسہ تو دس ہزارویں کے نیچے لکھ دیا۔ اور ایک ہزارواں

جو حاصل ہؤا۔ اُسے ہزارویں کے ہندسوں میں جمع کردیا۔ اِس عمل کو جاری رکھتے ہوئے تمام سوال کو مکمّل کیا۔ چونکہ کسورِ اعشاریہ کی تفریق کا قاعدہ بھی صحیح عددوں کی تفریق سے ملتا جلتا ہے۔ اس لئے مدرّس مندرجہ بالا سوال کی طرح تفریق کی دونو رقموں کو ترتیب سے لکھائیگا تفریق کا عمل کرائے گا۔ اور علامتِ اعشاریہ لگانے اور صحیح عددوں سے حاصل لینے کے قاعدے سے آگاہ کرے گا۔

لڑکے جانتے ہیں۔ کہ ضرب کا قاعدہ جمع کی مختصر صورت ہے۔ کسورِ اعشاریہ کی ضرب سکھاتے وقت مدرس طلبہ کی اِس واقفیت سے فائدہ اُٹھائے گا۔ مثلاً ۱ء۶ کو ۶ سے ضرب دینے کی صورت میں وہ ۱ء۶ کو چھ مرتبہ اُوپر نیچے لکھ کر طلبہ سے جمع کا عمل کرائیگا۔ اور ۹ء۶ جواب حاصل کرے گا۔ اب وہ اُنہیں بتائے گا۔ کہ ضرب دینے سے عمل مختصر ہوجائے گا۔ اور اُس کی صورت یہ ہوگی :-

۱ء۶
۶
۹ء۶

اس طرح کئی ایک مثالیں حل کرانے کے بعد وہ یہ قاعدہ اخذ کرائے گا۔ کہ اگر کسر اعشاریہ کو صحیح عدد سے ضرب دینا ہو۔ تو مضروب کو مضروب فیہ سے صحیح عددوں کی طرح ضرب دو۔ اور حاصل ضرب میں دائیں طرف سے گن کر اُتنے مرتبے کے بعد علامتِ اعشاریہ لگاؤ۔ جتنے مرتبے اعشاریہ کے مضروب میں ہیں۔

اب مدرس بتائے گا۔ کہ اگر مضروب اور مضروب فیہ دونو میں مراتب اعشاریہ موجود ہوں۔ تو حاصل ضرب میں علامتِ اعشاریہ لگانے کے لئے مضروب اور مضروب فیہ دونو کے مراتب اعشاریہ کے مجموعے کے برابر دائیں طرف سے مراتب شمار کرکے نشان لگاؤ۔ اور اگر حاصل ضرب میں مراتب کی تعداد کم ہو۔ تو بائیں طرف صفر بڑھا کر اس شرط کو پورا کرو۔ مثلاً ۰۱۲۴ء

ء۳۵
۶۲۰
۳۷۲
ء۰۰۴۳۴

حاصلِ ضرب کے مراتب میں چونکہ مضروب اور مضروب فیہ کے مراتب اعشاریہ کے مجموعے کی نسبت دو کی کمی تھی۔ اس لئے مراتب پورے کرنے کے لئے بائیں طرف دو صفر بڑھائے گئے ہیں۔ اور کسور اعشاریہ میں دائیں طرف کے صفر کی چونکہ کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس لئے دائیں طرف کا صفر کاٹ دیا گیا ہے۔

کسرِ اعشاریہ کو صحیح عدد پر تقسیم کرنے کا قاعدہ سکھانے کے لئے مدرس کسرِ اعشاریہ کی ایک رقم تختہ سیاہ پر لکھے گا۔ اور اُسے کسی صحیح عدد پر صحیح اعداد کی تقسیم کی طرح طلبہ سے تقسیم کرائے گا۔ بعد میں اُنہیں بتائے گا۔ کہ مقسوم میں چونکہ اعشاریہ کے مراتب بھی موجود ہیں اس لئے ہمیں خارج قسمت میں بھی اُتنے مراتب کے بعد اعشاریہ کا نشان لگانا ہوگا۔ مثلاً

۱۲ | ۹۳۰٫۷۲
۷۷٫۵۶

کسرِ اعشاریہ کو کسرِ اعشاریہ پر تقسیم کرنے کی صورت میں مدرس صحیح اعداد کی تقسیم کی طرح طلبہ سے تقسیم کا عمل کرائے گا۔ مگر اعشاریہ کا نشان لگاتے وقت مقسوم کے مراتب اعشاریہ میں سے مقسوم علیہ کے مراتب اعشاریہ کو تفریق کرکے باقی تعداد کے مطابق خارج قسمت میں دائیں طرف سے شمار کرکے اعشاریہ کی علامت لگائے گا۔ مثلاً :-

۳٫۷۴
٫۱۶) ٫۵۹۸۴
۴۸
۱۱۸
۱۱۲
۶۴
۶۴
×

اب طلبہ صحیح اعداد، کسورِ عام اور کسورِ اعشاریہ کی جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے قواعد سیکھ چکے ہیں۔ اِنکی مدد سے حساب کے باقی قواعد سکھانے کے لئے زمین ہموار ہوگئی ہے۔ مدرس حسبِ ضرورت اِن اِن سے کام لیکر طلبہ کو تجارت، اکائی، اوسط، فیصدی، مسطحات وغیرہ غرضیکہ حساب کے تمام قواعد سکھا سکتا ہے

قدیم عرب سائنسدان اور اُن کی خدمات

علی ناصر زیدی

ہمارے آباؤ اجداد نے طب اور سائنس میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ تاریخ اُن کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ایران اور عرب کے قدیم سائنسدانوں نے صرف مشرق پر ہی احسان نہیں کیا۔ بلکہ مغرب بھی اپنی معلومات کے لئے صدیوں تک اُن کا مرہونِ منّت رہا۔ عربوں نے ایران اور اور یونان کے علم و فضل سے استفادہ ضرور کیا لیکن ایک زمانہ آیا جب کہ انہوں نے اپنی قوّتِ خیال اور محنت کے بل بوتے پر ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ ایرانی اور یونانی کتب کے ترجمے جن میں عرب کے علما و فضلا نے قابلِ قدر تبدیلیاں کیں۔ شام ہسپانیہ اور سسلی ہوتے ہوئے یورپ تک پہنچے۔ اور وہاں اُس علم و ہنر کی بنیاد ڈالی۔ جو یورپ وسطیٰ کا طرۂ امتیاز بنا رہا۔ اگر کلچر کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو علوم کو اِدھر اُدھر پھیلانا بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ارسطو اور گیلن جیسے علما کی تصانیف اِدھر اُدھر نہ پہنچائی جاتیں تو اُن کا عدم وجود برابر ہی رہتا۔ طبعزاد اور مترجم تصانیف کے درمیان ایک واضح حدِ امتیاز قائم کرنا دشوار ہے۔ بہت سے ترجمہ کرنے والے ایسے بھی گذرے ہیں۔ جو خود بڑے اچھے مضامین لکھتے تھے۔ اور انہوں نے علم و فضل میں بہت سے

نئے ابواب کا اضافہ کیا ہے۔

عربوں کو علم العلاج میں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ مذہب اور طب وہاں ساتھ ساتھ پروان چڑھے۔ اُس زمانہ میں عرب طبیب علم موجودات کا جاننے والا، فلسفی اور زاہد متقی بھی ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں عربوں نے بہت سی نئی اور پُر اثر دوائیں دریافت کیں سب سے پہلے انہوں نے ہی عطار خانے کھولے۔ دوا سازی کے اسکول قائم کئے اور دواؤں کی سب سے پہلی کتاب ترتیب دی۔ عطائی دوا فروشوں سے گریز کیا جاتا تھا۔ خلیفہ المامون کے قدیم دور میں بھی دوا سازوں کو ایک امتحان پاس کرنا پڑتا تھا۔ ان کے علاوہ اطبا کو بھی امتحان دینا ہوتا تھا۔ سنہ ۹۳۱ء میں ایک کیس خراب ہو جانے کی وجہ سے خلیفہ نے ایک ممتاز طبیب کو حکم دیا کہ وہ تمام اطبا کا جائزہ لے اور صرف معیاری لوگوں کو کام کرنے کی اسناد عطا کرے۔ صرف بغداد میں ساڑھے آٹھ سو سے زائد اطبا اس امتحان پر پورے اترے اور اُس دارالخلافہ کو عطائی حکیموں سے نجات مل گئی۔ ایک وزیر کے احکامات کے مطابق دیہاتیوں کی صحت کی دیکھ بھال کے لئے ایک محکمہ الگ قائم کیا گیا۔ اور اطبا کی ایک گشتی جماعت بہت سی ضروری ادویات ساتھ لے کر عوام کی امداد کے لئے روانہ ہوئی۔

اطبا جیلوں میں جاکر بیمار قیدیوں کو روزانہ دیکھتے تھے۔ ایسے تمام واقعات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں عربوں اور اُن کے خلفا نے جو توجہ صحتِ عامہ کی طرف دی، اُس کی مثال اُس زمانہ کے کسی ملک میں نہیں ملتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں سب سے پہلا شفاخانہ ہارون الرشید نے نویں صدی کے آغاز میں ایرانی طرز پر قائم کیا تھا۔ اُس کے تقریباً فوراً بعد ہی ۳۴ شفاخانے تمام اسلامی دنیا میں قائم کر دئے گئے۔ قاہرہ میں پہلا شفاخانہ تقریباً ۸۷۲ء میں قائم کیا گیا۔ اور وہ پندرھویں صدی تک باقی رہا۔ گیارھویں صدی میں گشتی شفاخانوں کی بنیاد پڑی۔ اِن شفاخانوں میں خواتین کے لئے علیحدہ انتظام تھا۔ ان میں سے چند میں طبی کتب خانے بھی موجود تھے۔ اور طبی تعلیم کا انتظام بھی تھا۔

علمِ طب پر جو لوگ سند کہے جا سکتے ہیں۔ وہ ایرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ اُن کی زبان عربی تھی۔ اِن عظیم المرتبت قدیم سائنسدانوں میں سے دو ممتاز ہستیوں "رازی" اور "بوعلی سینا" کے مجسّمے اب بھی پیرس یونیورسٹی کے مدرسۂ طب کے ہال کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

الرازی

ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی جس کا عرصۂ حیات ۸۶۵ء سے ۹۲۵ء تک بتایا جاتا ہے۔ نہ صرف اِسلام بلکہ زمانۂ وسطیٰ کا قابل ترین اہلِ قلم اور طبیب تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ بغداد کے سب سے بڑے شفا خانہ کا صدر تھا۔

ایک سوانح نگار کی تحریر کے مطابق رازی ۸۶۶ء میں "رے" مقام پر پیدا ہُوا جو کوہِ البرز کے جنوبی ڈھالوں پر واقع ہے۔ اوائل عمر میں اُس کو موسیقی، لٹریچر، فلسفہ، مالویت، طلسم اور الکیمیا سے بہت دلچسپی رہی۔ لیکن تیس سال کی عمر میں اُسے بغداد جانے کا اتفاق ہُوا۔ وہاں سے واپس آکر حکیم علی ابنِ سہیل (جو پہلے یہودی تھا اور بعد میں مشرّف بہ اسلام ہُوا اور جو تبرستان کے مشہور اسکول سے تعلق رکھتا تھا) کی شاگردی اختیار کی۔ اور توجہ سے طب کا مطالعہ کیا۔ اُس نے ایسی ذہانت کا اظہار کیا۔ کہ اُس کا اُستاد متعجب ہوگیا۔

اُس نے کم از کم سَو کتابیں تصنیف کیں۔ الکیمیا کے علاوہ دیگر سائنسی مضامین پر اُس نے ۳۳ ریاضیات اور علمِ ہیئت پر گیارہ رسالے اور فلسفہ، منطق اور مذہبیات پر ۴۵ سے زیادہ رسالے لکھے۔ الکیمیا پر بارہ رسالوں کی ایک مکمل کتاب اور "صحیفۂ راز" کے علاوہ اُس نے تقریباً بارہ کتابیں اور لکھیں جن میں سے دو کتابیں الکیمیا کے مخالفین کی کتابوں کے جواب میں لکھی گئی تھیں۔ "صحیفۂ راز" کو بہت سے علما نے پڑھا۔ اور آخر کار بارھویں صدی کے آخر میں اُس زمانہ کے ممتاز مترجم گرارڈ آف کریمونیا نے لاطینی زبان

میں اُس کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب چودھویں صدی تک کیمیادی مسائل کے لئے مشعل راہ بنی رہی۔ روجر بیکن نے بھی اُس سے اقتباسات لئے۔ الرازی کا بہترین کارنامہ اُس کی وہ کتاب سمجھی جاتی ہے جو اُس نے چیچک پر لکھی۔ یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب تھی۔ اور عربوں کے طبی لٹریچر کے لئے باعثِ زینت سمجھی جاتی ہے۔ اُس کی اہم ترین کتاب "الحادی" تھی۔ چارلس اوّل کی سرپرستی میں سسلی کے یہودی طبیب فرج بن سالم نے ۱۲۷۹ء میں پہلی مرتبہ اُس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ ۱۴۸۶ء سے لے کر کافی عرصہ تک یہ کتاب شائع ہوتی رہی۔ اور اُس کا پانچواں ایڈیشن وینس میں ۱۵۴۲ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب طبی حیثیت سے مجمع العلوم کا درجہ رکھتی ہے۔ اُس میں عربوں کی اُن تمام معلومات کا ذکر ہے جو اُن کو یونانی، ایرانی اور ہندی ادویات کے متعلق حاصل تھیں۔ ان کے علاوہ چند جدید معلومات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ الرازی کی یہ تمام کتابیں اُس وقت طبع ہوئیں جبکہ طباعت خود اپنی اولیں منزل میں تھی۔ تاہم انہوں نے روم کے باشندوں کے دماغوں پر صدیوں تک اپنا سکہ جمائے رکھا۔

رازی ایک آزاد اور فراخ دل انسان تھا۔ اور غریبوں پر اتنا مہربان تھا کہ اکثر اُن کی مالی امداد کیا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات خود ہی اُن کی تیمار داری بھی کیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ لکھنے پڑھنے کے شغل میں لگا رہتا تھا۔ باقلے کا زیادہ استعمال کرنے کی وجہ سے اُس کی آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا تھا۔ اور اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ نابینا ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے وطن میں ساٹھ سال اور دو ماہ کی عمر میں ۲۶ر اکتوبر ۹۲۵ء کو انتقال کیا۔

طب کے علاوہ رازی کی خدمت علم کیمیا کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی مالک ہے۔ پہلی مرتبہ اُسی کی کتابوں میں کیمیائی مادّوں، سازوسامان اور تاثیر وغیرہ کا بیان نہایت سلجھی ہوئی زبان اور باترتیب شکل میں ملتا ہے۔ اُس کے طریقِ بیان نے اُس کی تصانیف کو عام فہم بنایا۔ اور اُس کو زندۂ جاوید کر دیا۔ اُس نے مادّوں کی تقسیم چار

نظام پیش کیا۔ جس سے علمِ کیمیا پر تشریح کن روشنی پڑتی ہے۔ رازی نے کیمیا میں مستعمل آلات کی بھی ایک فہرست دی ہے۔ اور وہ معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں۔ جو جدید عمل گاہوں کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

رازی کی کیمیائی تصانیف کے مطالعے سے اسٹیپلٹن (Stapleton) نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ کہ دنیا میں علم و دانش کا چاہنے والا ایسا انسان نہیں پیدا ہوا جیسا رازی ہوا ہے۔ اُس کی یکتائی میں مدتوں تک فرق نہیں آیا۔ یہاں تک کہ جدید سائنس نے یورپ میں جنم لیا۔ اور گیلیلو اور رابرٹ بوائل جیسے سائنسدان میدانِ عمل میں اُترے۔ اُس کی کیمیائی تصانیف سے جس صداقت پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اُس کی اُن کتابوں سے جو اُس نے دیگر موضوعات پر لکھیں جس خداداد ذہانت کا پتہ چلتا ہے، اُن سب کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ جابر ابنِ حیان کے ماسوا جس کی عظمت کو خود اُس نے تسلیم کیا ہے، رازی ہی صرف ایک قابل انسان تھا جو ارسطو کی موت کے بعد انیس۱۹ سو سال کے عرصہ میں پیدا ہوا۔ اور جس نے ساتویں تا چہارم صدی قبلِ مسیح کے یونانی فلسفیوں کے نظریات کی دانشمندانہ طور پر پیروی کی۔ اُس کی اعلیٰ صفات اِن حقائق پر مبنی تھیں۔ کہ وہ کبھی طلسمانہ یا جوتشی عمل پر یقین نہیں کرتا تھا۔ اور جو باتیں تجربہ سے ثابت نہ ہو سکیں۔ اُن کو کبھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔

بوعلی سینا

الرازی کے بعد طبِ عرب کی تاریخ میں بوعلی سینا کا نام سب سے زیادہ درخشندہ و تابندہ نظر آتا ہے۔ یہی شخص یورپ میں اوی سینا (Avicenna) کے نام سے متعارف ہوا۔ اور اسی کو عربوں کا ارسطو ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اگرچہ وہ بذاتِ خود عربی نہیں تھا۔ بلکہ ایرانی تھا۔ وہ بخارا کے نزدیک ۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اُس کے والد بلخ کے باشندہ تھے۔ اوائل عمر میں اُس نے حساب، قانون، اقلیدس اور منطق کا

مطالعہ کیا۔ ان سب کے علاوہ اُس نے طب پر خاص توجہ دی اور سولہ سال کی عمر میں ہی اتنا ماہر ہوگیا کہ مستند اطبا اُس سے مشورہ کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔

سترہ سال کی عمر میں وہ اپنے ملک کے ایک شہزادہ کا طبیب مقرر ہوا۔ اور اُس کے بعد بہت سے اہم اور ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ایک مرتبہ وزیرِ اعظم بھی مقرر کیا گیا۔ تھوڑی ہی عمر میں ۱۰۳۶ء یا ۱۰۳۷ء میں اُس کا انتقال ہوگیا۔

اُس کے زمانہ میں اُس کی کتاب القانون سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ یورپ کے طبی اسکولوں میں اُس کو درسی کتاب کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ پندرھویں صدی کے آخری تیس سال کے عرصہ میں اُس کے تیس ایڈیشن لاطینی زبان میں اور ایک عبرانی زبان میں شائع ہوئے۔ حال ہی میں اُس کے کچھ حصّہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اُس کے حصّہ ادویات میں تقریباً ۷۶۰ ادویات کا تذکرہ ہے۔ بارھویں صدی سے سترھویں صدی تک یہ کتاب مغرب میں طبی سائنس کے لئے رہبرِ اوّل کا کام کرتی رہی اور اسلامی ممالک میں اب بھی اُس کو گاہ بگاہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ولیم اوسلر کے الفاظ میں "یہ کتاب کسی بھی دیگر تصنیف کے مقابلہ میں عرصہ تک طبی بائیبل کا مقام حاصل کئے رہی۔"

طب کے علاوہ کیمیا پر بھی بو علی نے طبع آزمائی کی۔ وہ اپنی کتاب "کتاب العلاج" میں جس کا لاطینی ترجمہ ایک انگریز عالم الفریڈ نے ۱۲۰۰ء میں کیا۔ چٹانوں، پتھروں کی ساخت اور دیگر ارضیاتی تشکیلات پر روشنی ڈالتا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصّہ میں معدنیات اور دھاتوں کی خصوصیات کا بیان ہے۔ یہ حصّہ نہایت دلچسپ اور اہم ہے۔

بو علی سینا نے کیمیاگروں کی خبر بھی لی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ دھاتوں کی ماہیت میں کوئی خاص تبدیلی پیدا کرنا کیمیاگروں کے بس میں نہیں ہے۔ ہاں نقلی دھاتیں ضرور بنائی جاتی ہیں۔ اُس کی کوششوں کے باوجود اکسیر سازی پر لوگوں کا یقین جما رہا۔ اور الکیمیا زیادہ تر ایک خیالی دنیا بن کر رہ گئی۔ اور تجرباتی میدان سے دور تر ہوتی چلی گئی لیکن تیرھویں صدی

عیسوی میں قاہرہ کی ٹکسال کے بڑے کیمیا دان منصور الکاملی نے سونے کے نکالنے، صاف کرنے اور پرکھنے پر ایک عملی کتاب لکھی۔ جو الکیمیا کے طوالت پسند نظریاتی بیانات سے پاک ہے۔ یہ کتاب نایاب ہے صرف ایک نسخہ موجود ہے۔ جو بادشاہِ مصر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ تیرھویں صدی کے عرب تپائی، سونے اور چاندی کو شورے کے ترشہ کی مدد سے جدا کرنے، چاندی کو پارہ کی آمیزش سے اکھاڑنے اور کیمیاوی ذرائع سے سونے چاندی کے مرکّب کا تجزیہ کرنے سے اچھی طرح واقف تھے۔ سولھویں صدی کے وسط میں یورپ میں جو کتابیں اِس مضمون پر تصنیف ہوئیں۔ وہ منصور کے طریقوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

قدیم زمانہ میں اور خاص طور سے اِسلامی دَور میں علم و ہنر پر اتنی پابندیاں نہیں تھیں جتنی اب ہیں فلسفی ریاضی دان اور ماہرینِ موسیقی بھی ہوتے تھے۔ اور ہیئت دان شاعری کے دلدادہ ہوتے تھے مثلاً ایران کا مشہور شاعر عمر خیّام اسلامی دَور کا بے نظیر ہیئت داں بھی تھا۔ اِسی طرح کندی کی تصنیف بھی عجیب و غریب ہے۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے اُس نے افلاطون اور ارسطو کے خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ فلسفی ہونے کے علاوہ وہ ایک منجّم، کیمیا داں، ماہرِ علمِ بصارت اور نظریاتی موسیقی کا ماہر بھی تھا۔ اُس کی تصانیف ۲۶۵ شمار کی جاتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اُن میں سے بیشتر ضائع ہو چکی ہیں علمِ بصارت پر اُس کی مشہور تصنیف مشرق اور مغرب میں کثرت سے استعمال کی گئی۔ اُس نے روجر بیکن کو بھی متاثر کیا۔ موسیقی پر اُس کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو وہ موسیقی جو مسیحی یورپ میں عام ہوئی، صدیوں پہلے آتی تھی۔

اسلام میں ہیئت دانی کا سائنٹیفک مطالعہ ایک ہندوستانی تصنیف سدّھانت کے زیرِ اثر شروع ہوا۔ جو ۷۷۱ء میں بغداد میں لائی گئی۔ نویں صدی کے آغاز میں پہلی ترجمہ

جنوب مغربی ایران میں عمدہ اور صحیح آلات کی مدد سے باترتیب اور صحیح مشاہدات عمل میں لائے گئے۔ اسی صدی کے وسط میں خلیفہ المامون نے بغداد میں اور دمشق سے باہر رصد گاہیں قائم کیں۔ خلیفہ کے ہیئت دانوں نے ارضی درجہ کی لمبائی معلوم کرکے اُس زمانہ کی تاریخ میں ایک نئے کارنامہ کو جگہ دی۔ اُن کا منشا یہ تھا۔ کہ زمین کی جسامت اور اُس کا قطر معلوم کئے جائیں۔ اُن کا بنیادی خیال یہ تھا کہ زمین گول ہے۔ یہ تجربات دریائے فرات کے شمال میں ایک ہموار میدان میں انجام دیئے گئے۔ خطِ نصف النّہار کے ایک درجہ کی لمبائی ۵۶ ۲/۳ عربی میل نکالی گئی۔ یہ نتیجہ صحیح لمبائی سے صرف ۲۸۷۷ فیٹ زیادہ تھا۔ اور اُس زمانہ کی ایک غیر معمولی کامیابی تسلیم کیا جاتا ہے۔

اِس مرحلہ میں جن ہیئت دانوں نے حصّہ لیا۔ اُن میں الخوارزمی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ صفِ اوّل کے مسلمان سائنسدانوں میں سے ایک تھا۔ اُس نے زمانۂ وسطیٰ کے کسی بھی مصنّف کے مقابلہ میں ریاضی میں کہیں زیادہ بیش بہا کام انجام دیا ہے۔ اُس نے قدیم ترین ہیئتی جدولوں کو ترتیب دینے کے علاوہ حساب اور الجبرا پر بھی کتابیں لکھیں جن کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا۔ اور اُن کو سولھویں صدی تک یورپ کی درسگاہوں میں درسی کتب کا درجہ حاصل رہا۔ انہوں نے ہی یورپ کو الجبرا کی سائنس سے روشناس کرایا۔ اُس کی تصنیف کی بدولت ہی یورپ میں عربی ہندسے پہنچے۔ جن کو اُس کے نام کی رعایت سے انگریزی میں الگورزم (Algorisms) کہا جاتا ہے۔

حج، مساجد کا رُخ مکہ کی طرف رکھنا اور نماز کے لئے کعبہ کی سمّت کا تعیّن کرنا وغیرہ نے مسلمانوں کے جغرافیائی مطالعہ میں مذہبی رنگ کی آمیزش کی۔ نجوم نے، جس کے لئے دنیا بھر کے مقامات کے عرض البلد اور طول البلد جاننا ضروری تھے، سائنسی رنگ پیش کیا۔ ساتویں اور نویں صدی کے درمیان مسلمان تاجر مشرق میں چین تک پہنچے۔ اس کے لئے انہوں نے خشکی اور تری کا سفر کیا۔ جزیرۂ زنجبار کو حاصل کیا۔ اور جنوب میں افریقہ کے

دور دراز ترین ساحلوں تک پہنچے۔شمال میں روس کو چھوا۔اور مغرب میں اُن کی رَو کو
بحر اوقیانوس نے روکا۔جو تاجران ممالک سے واپس آتے تھے۔وہ سب لوگوں کو
وہاں کے دلچسپ قصے سناتے تھے۔چنانچہ تمام باشندوں میں دلچسپی کی ایک لہر دَوڑ
گئی بطلیموس کے جغرافیہ کا کئی مرتبہ عربی میں ترجمہ کیا گیا اور اُس کو سامنے رکھ کر خوارزمی
نے دنیا کا ایک نقشہ تیار کیا۔اُس میں وہ اور اُس کے ۶۹ رفقائے کار شامل تھے۔
اسلام میں افلاک اور دنیا کا یہ پہلا نقشہ تھا۔عرب کے ابتدائی جغرافیہ دانوں نے
ہندوستان سے یہ نکتہ حاصل کیا۔کہ دنیا کا ایک مرکز ہے۔جس کو وہ "ارین" کہتے تھے
بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق یہ ہندوستان کے ایک شہر کا بگڑا ہُوا نام ہے۔اُس کے
متعلق وہ یہ سمجھتے تھے۔کہ وہاں ایک رصدگاہ موجود ہے۔اور اُسی خطِ نصف النہار پر
دنیا کی چوٹی واقع ہے۔انہوں نے اُس کا تعین خطِ استوا پر مشرق اور مغرب کی انتہائی
حدود کے درمیان کیا۔وہ سمجھتے تھے کہ مغربی خطِ نصف النہار اِس خیالی مقام سے
نوّے درجہ کے فاصلہ پر واقع ہے۔

طب، ہیئت اور ریاضیات کے بعد عربوں نے علمِ کیمیا میں بہت کام کیا۔
انہوں نے جملہ طبیعی سائنسوں میں یونانیوں کے قدیم خیالات سے آگے ایک قدم رکھا۔
وہ تھا نظریاتی سائنس کے ساتھ تجرباتی امتحان۔

جابر ابنِ حیّان

عرب کیمیا کا جدِّ امجد جابر ابنِ حیّان تھا۔جس نے کوفہ میں تقریباً ۷۷۶ء میں
عروج پایا۔وسطِ عمر میں اُس کو بغداد کے خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں رسائی
نصیب ہوئی۔اُس نے خلیفہ کے لئے الکیمیا پر ایک کتاب "صحیفۂ بہار" لکھی جس میں
نہایت تعجب خیز تجربات بیان کئے گئے۔جابر ہی کی کوششوں کی بدولت یونانی کتابوں

کی دوسری قسط قسطنطنیہ سے لائی گئی۔ جن کی پہلی قسط تقریباً پچھتر سال قبل خالد ابنِ یزید نے منگائی تھی۔ ۸۰۳ء میں کچھ سیاسی تبدیلیاں ہونے پر جابر کوفہ واپس آ گیا۔ اور اپنی زندگی کا باقی حصّہ اُس نے وہاں ہی صرف کیا۔ قیاس ہے کہ اُس نے پچانوے سال کی عمر پائی۔

جابر کی خصوصیت یہ ہے کہ صوفیانہ خیالات کا دلدادہ ہونے کے باوجود، اُس نے اپنی تصانیف میں دیگر کیمیا دانوں کی بہ نسبت تجرباتی کیمیاگری پر بہت زور دیا ہے۔ اس کی کتابوں کے تقریباً ایک سو قلمی نسخے موجود ہیں۔ نظریاتی کیمیا میں دھاتوں کی ساخت پر اُس نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ قابلِ قدر ہیں۔ اُس نے دھاتوں کی ساخت کے متعلق ارسطو کے فلسفۂ فطرت سے اتفاق تو کیا لیکن وہ یہ سمجھتا رہا کہ یہ نظریہ مشاہدات کی توضیح کرنے سے قاصر ہے۔ اور کیمیاگری کے عملی پہلوؤں پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اِس نظریہ کو قابلِ فہم بنانے کے لئے کچھ تبدیلیاں کیں۔ کچھ قطع و برید کے بعد یہ نیا نظریہ اٹھارویں صدی تک زندہ رہا۔ حتّٰی کہ موجودہ کیمیا نے جنم لیا۔ اٹھارویں صدی میں ہی نظریۂ تحریق کی بنیاد پڑی۔ اور وہ اپنے نقائص کے باوجود کیمیاگروں کے لئے مشعلِ راہ بنا رہا۔ یہ جابر کے نظریۂ امتزاج ہی سے اخذ کیا گیا تھا۔ جس کی بنیاد ارسطو کے اصول پر رکھی گئی تھی۔

مصری اور یونانی متقدّمین کی طرح جابر نے بھی اِسی خیال پر عمل کیا۔ کہ بنیادی دھاتیں مثلاً ٹین، سیسہ، لوہا اور تانبہ ایک نامعلوم مادّہ کے ذریعہ سونے اور چاندی میں تبدیل کی جاسکتی ہیں۔ اُس نے اپنی قوتوں کو اِسی تلاش اور جدّوجہد پر مرکوز کر دیا اُس نے کسی بھی ابتدائی کیمیا داں کی نسبت تجرباتی سائنس کی اہمیت کو کہیں زیادہ سمجھا۔ اور اُس پر زور دیا۔ عملی میدان میں وہ عام کیمیائی مدارج سے اچھی طرح واقف تھا۔ مثلاً قلم پذیری، تبخیر، تصعید اور عملِ تحویل وغیرہ کا اُس نے اپنی کتب میں باکثر ذکر کیا ہے۔

وہ گندھک اور شورے کا تیزاب بنانا جانتا تھا۔ اور اُن کو اِس ترکیب سے ملا سکتا تھا۔ کہ مرکب میں سونا چاندی گل جائیں۔ اُس نے فولاد تیار کرنے اور دھاتوں کو صاف کرنے کی ترکیب بیان کی ہے۔ کپڑا اور چمڑا رنگنا، لوہے کو زنگ سے بچانے کے لئے وارنش تیار کرنا، خضاب بنانا، اِن تمام چیزوں کو بیان کیا ہے۔ اُس نے گندھکی فولاد سے ایک چمکدار روشنی بنانے کا نسخہ دیا ہے۔ جو مسودے تیار کرنے کے لئے خالص سونے سے بنائی جاتی تھی۔ اُس نے شیشہ گری میں منگ نیز ڈائکسائڈ کے استعمال کا بھی ذکر کیا۔ وہ سرکہ کا ترشہ بنانا بھی جانتا تھا۔ اور لیموں کے ترشہ و دیگر نامیاتی مادّوں سے بھی واقف تھا۔

مغربی سائنسدان جابر کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُس کی کئی کیمیاوی مرکبات کا بانی تسلیم کرتے ہیں۔ جابر کی چند کتب مثلاً "کتابِ ہنقاد" اور "صحیفۂ رحمت" کا زمانۂ وسطیٰ میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اِن دونوں کتابوں کے عربی و لاطینی قلمی نسخے موجود ہیں۔ اُس کی چند لاطینی کُتب اور بھی ہیں۔ جن کے عربی نسخے نہیں ملتے ہیں۔ ایک مسئلہ جو کیمیا کے مورخین ابھی تک حل نہیں کر سکے ہیں۔ یہ ہیں کہ یہ تصانیف طبع زاد ہیں یا نہیں۔ عربی اور لاطینی میں کم وبیش سَو کتب اُس کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ بہت سے علما کا خیال ہے۔ کہ یہ بارھویں یا تیرھویں صدی میں یورپین جعلسازی کے بالنتیجہ ظہور نما ہوئیں۔ اس کے ثبوت میں وہ چند دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کتب کے مستند ہونے میں ابھی تک شک ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ جابر یا دیگر کیمیا گروں کی عربی تصانیف کا ترجمہ ہوں۔ یا وہ جابر کی عربی کتب کے خلاصے ہیں۔ جو قرونِ وسطیٰ میں یورپ میں اخذ کئے گئے۔ یا وہ زمانۂ وسطیٰ کے کسی گمنام یورپین مصنّف کی جعلی تصانیف ہیں۔ جس نے اُن کو جابر سے منسوب کرکے اُن کے لئے شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مستقبل میں کچھ بھی ثابت ہو، ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتابیں جابر کی شایانِ شان ہیں۔ اور ہم کسی بھی دیگر مسلم یا عیسائی کیمیا گر کا تصوّر نہیں کر سکتے جس نے اُن کو تصنیف کیا ہو۔

جابر کی وفات کے سو سال بعد اسلامی تاریخ میں پھر ایک قابل انسان پیدا ہؤا۔ اگرچہ تاریخ اس وقفہ میں چند دیگر کیمیاگروں کو بھی پیش کرتی ہے۔ لیکن جابر کے مقابلہ میں اگر کسی شخص کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ تو وہ ایران کا کیمیاگر اور طبیب رازی تھا۔ جو مغرب میں (Rhazes) کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اور جس کا مفصّل حال طب کے سلسلہ میں گذشتہ چند اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے۔

ابو منصور موفّق

دسویں صدی عیسوی کے آخری دَور میں فنِ دوا سازی پر ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی گئی۔ جو ایک ایرانی اہلِ قلم ابو منصور موفّق کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ یہ کتاب یونانی، ہندی، عربی اور ایرانی ادویات کا مکمل حال بیان کرتی ہے۔ بظاہر ایک طبی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ تاہم کیمیاگر کے لئے بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ ابو منصور غالباً پہلا انسان ہے۔ جس نے سوڈیم کاربونیٹ اور پوٹاشیم کاربونیٹ کے درمیان حدِ امتیاز قائم کی۔ اور اُس کو "قلی" کے نام سے منسوب کیا۔ اُس نے چُونے کے پانی، سنکھیا دار آکسائڈ، طباشیر، سرمۂ تانبہ، توتیا، سیسہ، کھریا مٹی، اور بحری پانی کی کشید کا حال بیان کیا ہے۔

ابو منصور کے بعد بو علی سینا نے اِسلامی تاریخ کو چار چاند لگائے۔ اُس کا مفصّل ذکر طب کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ بو علی سینا کے ساتھ ہی ساتھ یا اُس کے کچھ عرصہ بعد ایک قابلِ ذکر کتاب تصنیف ہوئی۔ جس کے نام کا ترجمہ "مساعئ درویش" کیا جا سکتا ہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۰۴۷-۵۰ء بتایا جاتا ہے۔ مدّتوں تک اِس کتاب کے متعلق یہ خیال رہا۔ کہ یہ میڈرڈ کے مسلمہ کی تصنیف ہے جو ہسپانوی عربوں میں سب سے زیادہ قابل انسان تھا۔ وہ بہت بڑا ریاضی داں اور اختر شناس تھا۔ اور مسئلۂ میراث کو خوش اسلوبی کیساتھ بیان کرنے سے اُس کی شہرت میں اور بھی اضافہ ہؤا۔ مصنّف کوئی بھی ہو، کتاب سے اُس کے نہایت قابل اور عالم باعمل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اُس کے نزدیک کیمیا ایک ایسی سائنس ہے۔ جس کے مطالعہ سے قبل طالب علم کو ریاضیات،

اقلیدس اور ارسطو کی کتابوں سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھ تجرباتی امور میں ماہر ہونے چاہئیں۔

کتاب کے مصنف نے جابر اور الرازی کی جابجا تعریف کی ہے۔ اگرچہ اس کے نظریات کچھ مختلف نہیں ہیں تاہم وہ ڈیڑھ سو سال کے عملی تجربات اور کیمیادی طریقوں کی زندہ تاریخ ہے۔ اس میں پارہ کے آکسائڈ کا ذکر ہے جس کی تکمیل یورپ میں پریسٹلے اور لوائزر کے ہاتھوں ہوئی۔ مصنف نے یہ تجربہ خود اپنی معمل گاہ میں کیا۔ اور اصولِ اوزان کو پیش نظر رکھا۔ اس نے گندھک، پارہ، گندھکی فولاد، توتیا، میگنیشیا، ابرق، گندھک کے نمک، پھٹکری اور دیگر ضروری اجزا پر روشنی ڈالی ہے اور سونے چاندی کو صاف کرنے کی ترکیب بھی بیان کی ہے۔

مصنفینِ مابعد

اسلامی دور کی کیمیا کا بیان نامکمل رہ جائے گا۔ اگر عراق کے ابوالقاسم اور ایدمر الجلدکی کا ذکر اس مقالہ میں نہ کیا جائے۔ ابوالقاسم تیرھویں صدی میں غالباً قاہرہ میں رہا کرتا تھا اور اس نے کئی کتابیں چھوڑی ہیں۔ جو اپنی دلچسپ خصوصیات کے علاوہ اسلامی کیمیادی نظریات و تجربات کے طور طریق کو بھی بیان کرتی ہیں۔ جو یورپ کے اتصال کے باعث تجربہ میں بہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ تجرباتی کیمیا کو اس نے کافی فروغ دیا لیکن اپنے نظریاتی اصولوں میں وہ جابر اور سکندریہ کے کیمیا دانوں سے مدد لیتا ہے۔

الجلدکی جس نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ قاہرہ میں گزارا، مسلم کیمیادی لٹریچر سے بہت واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے کیمیادی کتب کو جمع کیا۔ اور ان کی تفاسیر پیش کیں۔ اسی کی تحریروں سے ہم کو اسلامی کیمیا اور کیمیا دانوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس نے بذاتِ خود بھی چند تجربات کئے۔ جو لوگ علم کیمیا کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کو الجلدکی کا ممنون ہونا چاہیئے۔

یورپین مصنفین نے اس امر کا اقرار کیا ہے۔ کہ یورپ میں کیمیا کی ابتدا اسلامی کیمیا سے ہوئی۔ اسلامی سائنسدانوں نے ہی سب سے پہلے کیمیا کو توہم پرستی کے چنگل سے آزاد کیا۔ اسلام نے

یونانی علوم کو عیسائیوں سے متعارف کرنے کا جو بڑا کام انجام دیا۔ اُس کی اہمیت سب پر روزِ روشن کی طرح ہویدا ہے سنہ ۱۱۰۰ء کے فوراً بعد یورپین علما نے اِس حقیقت کو محسوس کیا کہ مسلمان قدیم علوم سے مالا مال ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے تحصیلِ علم کے لئے اِسلامی ممالک کا سفر اختیار کیا۔ جزیرۂ سسلی جو سنہ ۹۰۲ء سے سنہ ۱۰۹۱ء تک مسلمانوں کا مقبوضہ رہا؛ بعد میں نارمنوں کے قبضہ میں آیا لیکن مسلمان اطبّا اور دیگر سائنسدان نارمنوں کے دربار میں موجود رہے۔ اور یہ جزیرہ عربی تہذیب و علوم کا گہوارہ بن گیا۔ اِسلامی علوم و قابلیت کا سب سے بڑا مظاہرہ ہسپانیہ میں ہؤا۔ مسلم درسگاہوں میں عیسائی طلبا کو خوش آمدید کہا گیا۔ پامپلونا، سیگوویا، بارسلونا، ٹولیدو اور دیگر ہسپانوی شہروں کے کتب خانے اُن کے لئے کھول دئے گئے۔ اور انہوں نے ترجمہ کا کام شروع کیا۔ اِس طرح مسلمانوں کے دماغوں کی نظریاتی و تجرباتی پیداوار یورپ پہنچی ؞

بچّے کے لئے اخلاقی اور مذہبی تعلیم

انور قریشی

اِس مضمون میں زیادہ تر ان اثرات پر بحث کی جائے گی۔ جن کے باعث بچّے میں
غلط قسم کے اخلاقی رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ استاد یا والدین
کے نرم رویّے سے ایسا ہو جانا عین ممکن ہے۔ یہ درست نہیں، بلکہ اخلاقی کج روی
تو نرمی کی بجائے ضرورت سے زیادہ جبر اور احتیاط کا بدیہی نتیجہ ہے۔ غلط قسم کا چلن
بچّے کی ذہنی بناوٹ کو نہ سمجھنے کی تخلیق ہے۔ ماہرینِ نفسیات ہر بچّے کو نہ صرف معاشرتی
اور ذاتی میل جول کے لحاظ سے بلکہ ہر رنگ میں ایک مکمل فرد شمار کرتے ہیں۔ اگر ہم اس
کی شخصیت یا ' وحدت ' کو ٹھکرا دیں تو جولان ہو کر اس میں وہ تمام خصوصیات ہرگز تکمیل کو
نہیں پہنچ سکتیں۔ جن سے کہ معاشرہ کے ایک اعلیٰ فرد کو مرصع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ یہ
لابدی ہے۔ کہ ہر نو عمر کو بجائے دبانے کے اُبھارا جائے۔ اور بجائے نظر انداز کرنے کے
اسے تعلیم دی جائے۔ چلن کی تخلیق کی راہ میں بچّے کے لئے ایک اخلاقی معیار پیش کر دینا
ایک ناقابل عبور چٹان کھڑی کر دینے کے مترادف ہے۔ بالخصوص ایسا اخلاقی معیار جسے
حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہ ہو نفسیاتِ نو بعض اوقات موردِ عتاب گردانی جاتی ہے

کیونکہ صحیح کیریکٹر کی تعمیر کے ضمن میں یہ فرد کو نہ صرف درجہ نو آبادیات' بلکہ مکمل آزادی عطا کرتی ہے۔ دراصل یہ الزام ہی غلط ہے کسی مشہور ماہر نفسیات نے کبھی آزادروی کی تلقین نہیں کی۔ بالخصوص وہ آزادروی جو معاشرہ کے مروجہ ضابطوں کے خلاف ہو۔ ماہر نفسیات تو محض جبری طور پر عائد کردہ اخلاقی قوانین وضوابط کو نرم کر دینے کے حق میں ہے۔ بچے سے متعلق اس کا نظریہ یہ ہے۔ کہ اسے زندگی کی اخلاقی قدروں کو خود سمجھنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے حق میں یہ اچھا نہیں کہ زور دے کر اسے ان روایاتی راہوں پر چلنے پر مجبور کیا جائے جس پر کہ اس کے بزرگ اور پیشرو ہمیشہ گامزن رہے۔ یہاں ایک اور باریک سا نکتہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ پانچ یا پانچ سال سے کم عمر کے بچے کے طبعی رجحانات کو ہرگز اخلاقی قدروں کے مطابق نہیں جانچنا چاہیئے۔ بچے کے روبرو گناہ و ثواب ایسے الفاظ استعمال کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ وہ اس کے معانی نہیں سمجھتا غیر معروف اصطلاحیں ایک نوزائیدہ کے لئے بے حقیقت شے ہیں۔ الفاظ کی پرہیز یہاں تک ضروری ہے کہ 'شرارتی' ایسا لفظ بھی بچے کے لئے استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ ہوسکتا ہے کہ بار بار شرارتی کہنے سے بچہ واقعی شرارتی ہو جائے بعض اوقات بچے کی ناروا حرکت پر تادیب بھی ضروری ہوتی ہے۔ مگر کسی اچھے کام پر تعریف و توصیف بھی اتنی ہی لازمی شمار ہونی چاہیے۔ بلکہ تعریف یا اچھے افعال کی داد اکثر اوقات دینا مفید ہے۔

بچہ آپ کی نگاہوں سے پہچانے گا۔ کہ آیا اس کا کوئی رویہ یا عمل مفید ہے یا غیر مفید۔ اس کی اصلاح کے لئے آپ کا اندازِ نگاہ گفتار کی نسبت زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ لہذا ایسی صورتِ حالات میں ایک لمبی چوڑی تقریر بالکل لایعنی ہے۔ اگر زبان سے بچے کے کردار کی اصلاح کی ضرورت بھی پڑے۔ تو اپنی زبان کو قابو میں رکھئے اور نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف یہ کہہ دیجئے۔ کہ " تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا " اور ساتھ ہی تھوڑا سا سمجھا دیں۔ کہ ایسا کرنا کیوں بُرا ہے۔ اگر بچے کا عمل ایسا ہے کہ اس کا دہرایا جانا بہت ہی غیر موزوں ہے۔ تو نہایت وثوق کے ساتھ یہی بات ذہن نشین کرا دینی چاہیئے مختصر طور پہ ہر بُرے فعل کی برائی کو ذہن نشین کر دینا بہت ہی مفید اور ضروری ہے ورنہ آپ

بچے کو قطعی تاریکی میں چھوڑ دیں گے۔ بہر صورت ایک لمبے چوڑے وعظ۔ درشت لہجے اور زہر دار پند و نصائح یا خشمگیں نگاہ۔ اور دھمکیوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ بچہ ان تمام اندازوں کو ہرگز نہیں سمجھ سکے گا۔ آپ کی تمام فصاحت و بلاغت رائیگاں جائے گی اور بچے کے دل پر وہ غصّہ جسے آپ الفاظ کے ہجوم میں چھپانے کی بے سود کوشش کرتے رہے۔ ہمیشہ کے لئے برے اثرات چھوڑ جائے گا۔ اگر آپ واقعی ناراض ہیں تو اس کا اظہار صاف اور واضح الفاظ میں کر دیجئے۔ اپنے غصّے کو نفس پردہ میں مستور کرنا مفید نہیں۔ چھوٹی چھوٹی عمر سے ہی بچہ کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا معیوب نہیں۔ ایک عاقل اور دور اندیش استاد بچے کی ہر غلط کاری کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہرگز نہیں سوچتا کہ چلو ابھی اسے کیا کہنا ہے۔ ابھی تو اس کی عمر چھوٹی ہے۔ اور نہ وہ یہ یقین کرتا ہے کہ بچہ اپنے آپ ہی فوراً نیک کردار اختیار کر لے گا۔ بعض والدین اکثر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کا فرزند جو کبھی شرارتی اور ضدی ہونے کے علاوہ غصیل اور غلیظ بھی تھا۔ یکایک فرمانبردار شریف الطبع اور صاف ستھرا ہو گیا ہے۔ اور اب وہ ماشاءاللہ بے حد نیک بخت ہے۔ سادہ لوح والدین اس طبعی انقلاب کے ساتھ بچے کی طبع میں دوسرے تغیرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بچہ جب شریر تھا یا اپنی فطری خاصیتوں سے پوری طرح جلوہ گر تھا۔ تو وہ ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔ وہ خوب ہی کھاتا تھا۔ اور نیند بھر کے سویا کرتا تھا۔ اور اس طبعی تبادلہ یا تغیر کے بعد اس میں ضد کے ساتھ ساتھ قنوطیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی خاموشی جسے ممکن ہے قوتِ متخیلہ کی بیداری پر محمول کیا جاوے حقیقتاً کم آمیزی اور بدمزاجی ہے۔ اور اس کی طبع کی تمام رعنائیاں اور جولانیاں ختم ہو چکی ہیں۔ یہی کہ اسے بھوک بھی کم لگنے لگی ہے۔ وزن کم ہو گیا ہے۔ اور رات کو خوف کھا کھا کر اٹھتا ہے۔ لہٰذا وہ والدین جو بچے کو دھمکا کر اس کی طبع میں تغیر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کج فہم اور کوتاہ نظر ہیں۔ اظہارِ غم و غصّہ سوائے اس کے کہ بچے کی طبعی جولانیوں کو فنا کر دے اور کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ والدین کا ایسا رویہ بچے کے چلن کے لئے تعمیری نہیں تخریبی ہے پس بچے کی اخلاقی اصلاح کے لئے ظلم، جبر یا رعب کے استعمال کو کم کرنا ہمارے لئے

یت ہی ضروری ہے۔ نفسیاتی رو سے اخلاقی تربیت اور پرورش کا تو ایک ہی واضح
ول ہے۔ وہ یہ کہ بچّے کے فطرتی جذبات اور وجدانی خواہشات کو رعب اور جبر
ے بالکل آزاد رکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنے آپ خود کو مجلسی ماحول کے مطابق
مال لے۔ بچے کو ہر وقت احکام دیتے رہنا رعب اور جبر کے مترادف ہے۔ لہٰذا سمجھ دار
ساتذہ اور والدین ایسے حربوں سے پرہیز کرتے ہیں یا اگر انہیں استعمال بھی کرتے ہیں۔ تو
س وقت جب بچّے سے کوئی مہلک قسم کی حرکت سرزد ہو جائے۔ یہی وقت ہے جب سختی کرنا
زمی سا ہو جاتا ہے۔ تاکہ بچے کے مخفی احساسِ خوف کو بیدار کیا جا سکے۔

غصے اور رعب کی نسبت بچے کو پیار اور محبت کی زیادہ ضرورت ہے۔ مگر یہ محبت ایسا
لب اختیار نہ کر جائے۔ کہ آپ بچّے کو ہر وقت اپنے ساتھ ہی منسلک رکھیں۔ اسے آزادی عطا کیجئے
کہ وہ اپنے کام اختیاری طور پر کر سکے۔ اس کا جو عمل قابلِ ستائش ہو۔ اس کی ضرور داد دیجئے۔ اور
شکست یا ناکامی کے موقع پر اس کی حوصلہ افزائی کیجئے۔ اس سے آپ دیکھیں گے۔ کہ بچے میں
ود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ مدح و ستائش اور محبت اس حد تک بھی نہیں ہونی چاہیئے
کہ بچّہ اس کا خوگر ہو جائے۔ اور قدم قدم پر داد و پیار کا طالب ہو۔ خود اعتمادی پیدا ہونے پر
آپ اکثر ملاحظہ کریں گے۔ کہ بچّہ مدح سرائی سے خود گریز کرتا ہے بلکہ بیجا تعریف سے اسے نفرت
سی ہو جاتی ہے۔ بہرحال غیر واجب تعریف اور محبّت بچّے کے چلن میں اصلاحی محرکات کا باعث
ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بعض والدین بچے کی طبیعت سے اندازہ کر لیتے ہیں۔ کہ وہ کتنی تعریف و توصیف سے
مجبورِ عمل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسی حربہ سے بچّے میں حسنِ عمل پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اسی 'پیمانہ'
کا مستقل استعمال بچے کے کردار کے لئے ضربِ پیہم بلکہ مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ جذباتِ محبت سے
بہت ہی مفید کام لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً مشہور ہے کہ ہم جس سے محبت کرتے ہیں۔ ویسا ہی بننے
کی سعی کرتے ہیں۔ اگر بچّے کے دل میں ہم اپنی محبت اور عزت پیدا کر سکیں۔ تو وہ ہماری تقلید پر
مجبور ہوگا۔ مگر یہ تقلید اور نقل اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے۔ جب کہ ہم خود اخلاق کا پیکر ہوں۔

تقلید (Imitation) کے ساتھ ساتھ دوسرا نیم وجدانی جذبہ مشورہ ہے۔ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے۔ کہ بچّے کے سامنے لمبی چوڑی تقریر کی بجائے اسے محض سمجھا دینا یا آسان سی زبان میں مشورہ دے دینا کافی ہوگا۔ مثلاً ایک بچّہ گھر میں پھولدانوں کو خراب کرتا ہے۔ اور باغیچہ میں پھولوں اور پھلوں کو توڑ کر پھینکتا رہتا ہے۔ اسے یوں سمجھا دیا جاوے کہ دیکھو بیٹا بعض چیزوں کا باغیچہ میں توڑنا اور اکھاڑنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مگر وہ خس و خاشاک ہیں پھل پھول نہیں۔ کئی بچّے دیواروں پر تصویر کشی کی مشق کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان سے کہا جاوے کہ تصویر بنانا بہت اچھا فن ہے اور تم تصویر بھی خوب بناتے ہو۔ مگر اس کے لئے بہترین جگہ کاغذ ہے۔ نہ کہ دیوار۔ اور جب وہ کاغذ پر تصویر بنا کر لائے تو پہلی دفعہ اس کی بے جا تعریف بھی مسموم نہ ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ بچّے میں مصوّری کا مشہور جوہر پنپ جائے اور وہ اسے زندگی کا نصب العین قرار دے لے۔ بخلاف اس کے اگر اسے دیوار پر تصویر بنانے پر پیٹا جائے تو ممکن ہے وہ آرٹ سے ویسے ہی نفرت کرنے لگے کبھی تصویریں نہ بنائے۔ اور اگر بنائے بھی تو اپنے گھر کی تضحیک اڑائے بڑے ہو کر اس میں آرٹ کا مذاق بالکل مفقود ہو۔ اور اگر والدین اسے زبردستی انجنیئرنگ کی ٹریننگ بھی دلائیں۔ تو وہ ایک ناکام انجنیئر ثابت ہو۔

مذہب اور اخلاقی تعلیم کے ضمن میں بھی کچھ اسی قسم کا رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ بچہ غیر معروف تصورات کو ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ معبود کا تصور اوائل عمر میں پیدا ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ اوائل عمر ہی کیا اچھے خاصے نوجوانوں کو اس تخیل سے تہی پایا گیا ہے۔ چونکہ بچّہ "اللہ" کے سمجھنے سے یکسر عاری ہے۔ محض اس لئے کہ وہ بچّہ ہے۔ لہٰذا ڈنڈے کے زور سے اس تصور کو اس کے دماغ میں داخل کرنا کج فہمی ہے۔ اور اس سلسلے میں بضد ہونا اور مصر ہونا کوتاہ نظری ہی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ بلکہ اکثر اوقات اس کا نتیجہ الٹ ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ بچہ والدین سے نفرت کرنے لگے۔ بلکہ نعوذ باللہ معبود کے تصور سے ہمیشہ کے لئے سرگرداں ہو جائے۔ اس کا باغی یا لامذہب ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں۔ لہٰذا اخلاقی اور مذہبی تعلیم

میں بالخصوص سختی کا استعمال اچھا نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جبر کے باعث بچے کو نیکی نفرت ہو جائے اور وہ بدی کا پرستار بن جائے۔ وہ بظاہر متین و سنجیدہ ہو مگر اس کے دریائے دل میں شیطنت موجزن ہو۔ لہٰذا اساتذہ اور والدین کو چاہیئے کہ وہ خورد سال بچے میں بزور اور بہ زجر و توبیخ نیکی، عجز، سچائی اور فرمانبرداری پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ صحیح اور توانا بچے میں ان اوصاف کا نیم پخت حالت میں ہونا ہی بہتر ہوگا۔ اگر والدین نیک دل۔ نرم مزاج اور محبت سے بھرپور ہوں گے۔ تو بچے کا ان کی صحبت میں رہ کر ویسے ہی معبود کی تلاش کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس کا معبود یا اللہ یقیناً پیکرِ محبت ہوگا۔ ہر بچے میں مذہبی رجحان قدرتی طور پر موجود ہوتا ہے۔ مذہب اس کے خون میں ہے۔ کیونکہ یہ تصور اسے ورثہ میں ملا ہے۔ دینِ فطرت آغازِ آفرینش سے قائم ہے۔ اور انسان میں مذہب اور دین کا تخیل ایک جبلی خواہش کی حد تک موجود ہے۔ بچے کے واسطے اس مخفی معدن کو کھولنے کے لئے تھوڑا سا اشارہ کافی ہے۔ یہاں پھر وہی اصول کام دے گا۔ خدا کا تصور ایک ننھی سی جان میں بلاواسطہ نہیں اُتر سکتا۔ بلکہ بچے کو قدرتی حسن کی طرف راغب کرتے ہوئے اس کے مالک کا تصور دلایئے۔ دیکھیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا استدلال کس قدر نفسیاتی ہے۔ بچوں کو پھل پھول، باغات، بارش اور موسموں کے تغیر و تبدل کا احساس خالقِ حقیقی کے تصور کے نزدیک تر لے جائے گا۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں جابجا اسی استدلال کی طرف اشارات موجود ہیں۔ بچے کو سمجھایئے کہ یہ تمام حسن یہ تمام قدرتی رعنائیاں اور بوقلمونیاں اپنے آپ معرضِ وجود میں نہیں آگئیں۔ بلکہ ان کے پیچھے ایک کارساز ہے۔ یہاں آکر بچہ خود بخود اس کارسازِ مطلق کے متعلق استفسار کرے گا۔ اور آپ کے لئے مواقع مہیا کرے گا کہ آپ اس کے دل میں بطریقِ احسن رجوع الی اللہ پیدا کر سکیں۔ یہاں پھر احتیاط لازم ہے۔ خداوندِ عالم کے قہر و جبر کی سمجھ اگر بچہ اپنے آپ پیدا کرے تو بہتر ہوگا۔ خدا کے رحم و جبر سے متعلق تصورات اگر بچہ اپنے آپ اخذ کرے تو اس کے حق میں یہی بہتر ہوگا کیونکہ وہ اخلاق

جو جرم و سزا کے خوف سے پیدا ہوتا ہے کسی کام کا نہیں سے
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

گناہ و ثواب کے تخیل میں مستور انسان صحیح اخلاقی قدروں کو ہرگز نہیں پہچان سکتا۔ ہر بچّہ میں بڑھنے کی اور ترقی کی خو موجود ہے۔ اگر ایسے اشاروں سے صحیح راستوں پر گامزن کر دیا جاوے۔ تو وہ زندگی کی اصل راہوں پر بھاگتا ہوا چلا جائے گا۔ اور ذرا سا جبر اور خوف اسے ہمیشہ کے لئے تباہ کر سکتا ہے۔ اگر بچّہ ابتدا ہی سے نماز کی طرف رغبت نہیں کرتا تو مارنے سے اس کے دل میں صحیح عبودیت ہرگز نہیں پیدا کی جا سکتی۔ وقت آئے گا۔ کہ وہ خود عبد اور معبود کے مقام کو پہچانے گا۔

ایک بہت بڑے عالم دین سے کسی نے پوچھا کہ آپ کا بھتیجا تو مذہبی لحاظ سے بہت باغی تھا۔ آپ نے اسے نمازی کس طرح بنا لیا۔ آپ نے جواب دیا۔ کہ میں نے اسے کبھی اصلاح کے لئے نہیں کہا۔ البتہ اتنا کرتا رہا ہوں۔ کہ اکثر نمازیں اس کے روبرو پڑھی ہیں۔ لہذا مجھے دیکھ کر وہ بھی اس طرف راغب ہو گیا۔

بچّہ کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم ایک معمہ نہیں ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ بچّے کے معلّم پہلے اپنی اصلاح کر لیں۔

ایک ۱۹ سالہ اَن پڑھ کو کس طرح پڑھایا گیا؟

محمد عامر

معمول - ایک ۱۹ سالہ نوجوان - نام وسیم -

ماحول - گھر کا: - پڑھا لکھا - باہر کا: - شہر کے آوارہ مزاج اور پولیس کے آدمی -

بچپن - نہایت ناز و نعم میں گذرا -

وراثت - باپ اور ماں دونوں طرف - خاندان میں عالم گذرے ہیں - جسمانی طور پر بھی کسی میں کوئی خامی نہیں تھی -

ذہنی و جذباتی کیفیت - اس کا موقع نہیں ملا - کہ باقاعدہ ذہنی آزمائش کی جا سکتی - تاہم یہ ضرور اندازہ کیا جا سکا - کہ عام سوجھ بوجھ عوام سے زیادہ ہے - جذباتی طور پر مزاج میں تلون تھا - غصہ بات بات پر آتا تھا -

تعلیم - ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی کی پہلی جماعت تک - انگریزی کی پہلی کتاب - جب مجھ سے وسیم صاحب کی ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا - کہ ان میں صلاحیتوں کی کمی نہیں - اگر ان کی طرف توجہ کی جائے تو وہ کام کے آدمی بن سکتے ہیں -

* * *

اس سے پہلے کہ میں ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لیتا۔ میں نے یہ غور کرنا شروع کیا۔ کہ تعلیم و تعلیم یافتہ لوگوں سے ان کی بیزاری کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

بچپن میں تو تعلیم سے بچے اس وجہ سے بیزار رہتے ہیں کہ یہ نیا دور زندگی ان کی آزادی میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اور بچے فطری طور پر ان پابندیوں بلکہ ان اداروں سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ جو یہ پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ وسیم صاحب بھی بچپن نہایت آزاد گزار رہے تھے۔ کہ یک بیک گھر بار چھوڑ کر دُور جانا پڑا۔ اور اس پر مدرسہ کی ناگوار پابندیاں' نتیجہ ظاہر ہے۔ پڑھنے سے طبیعت بالکل اچاٹ ہوگئی کسی نہ کسی طرح ایک جماعت میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ بالکل ختم ہوگیا۔ انگریزی بھی ایک کتاب سے زیادہ نہ پڑھ سکے۔ غرض تعلیم کا سلسلہ قریبًا بارہ سال کی عمر تک ٹوٹا پھوٹا رہ کر منقطع ہوگیا۔ سولہ سال کی عمر تک بے کار وقت ضائع ہوتا رہا۔ خاندان کا ہر فرد انہیں گری ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کے جذبۂ خودی (ego) کو بہت صدمہ پہنچا۔ اور ان میں ایک طرح کا احساس کمتری پیدا ہوچلا۔ اس جذبہ کی شدت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ گھر کی مالی حالت کچھ بہت اچھی نہ تھی۔ اور دوسرا یہ کہ یہ صاحب اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے اور شروع سے سب پر حکومت کرتے آئے تھے۔ اور اب برعکس اس کے ان کو دوسروں کی سہنا پڑتی تھی۔ ان تمام چیزوں کا مجموعی ردِعمل یہ ہوا کہ یہ جذباتی طور پر بہت کچھ متلون مزاج اور مغلوب الغیظ ہوگئے۔ جاننے والوں میں سے ہر ایک ان کو اپنا دشمن دکھائی دینے لگا۔ پناہ اگر ملتی۔ تو بس تیسرے درجہ کے لوگوں میں۔ تاہم لاشعور نفس کی تشفی کی راہیں تلاش کررہا تھا۔ اسی زمانہ میں سوک گارڈ (Civic guards) مقرر ہونے شروع ہوئے آپ نے بھی اپنا نام دے دیا۔ شائد اسی خیال سے کہ اب ان کی عزت ان کے ماحول میں ہونے لگے۔ مگر نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔ اس ملازمت کے بعد لوگوں نے اور بھی بُرا کہنا شروع

کردیا۔ پہلے تو صرف بےکاری اور نااہلی کے الزامات تھے۔ اب بدچلنی اور آوارگی کی پھبتیں لگائی جانے لگیں۔ دوسری طرف افسری اور ماتحتی کی ناگوار جکڑ بند۔ پولیس افسر گالیوں کے لفظ بات نہیں کرتے۔ اور یہ شریف گھرانے کے فرد بھلا گالیوں کی انہیں کہاں تاب۔ آخر کار ایک روز کوتوال شہر سے برسرِ پیکار ہو کر مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد ان کا ذہنی انتشار اور بڑھ گیا۔ یہی زمانہ ہے جب مجھ سے اور ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ مگر چونکہ ان میں غصہ بہت تھا۔ اس لئے کسی باقاعدہ تجربہ کی ہمت نہ ہوئی۔ اس خوف سے کہ کہیں یہ مجھے بھی اپنا دشمن نہ سمجھ لیں۔

میرے تجربہ کی بنیاد (Suggestion) اشاروں پر تھی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا ان کے ساتھ بے تکلفی اور برابری کا برتاؤ کرنا شروع کردیا۔ اور اکثر ان پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ کہ ان میں کوئی کمی نہیں ہے۔ بجز تعلیم اور ضبط غیظ کے۔ ان کے سامنے دوسرے کم پڑھے لکھے لوگوں کو میں یہ سمجھاتا کہ دنیا میں آدمی کو صرف تین چیزوں سے عزت حاصل ہوسکتی ہے۔ اوّل علم۔ دوسرے ضبطِ نفس اور تیسرے دولت۔ اگر علم کے ساتھ دولت بھی ہو۔ تو کیا کہنا۔ اور اس بات سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کہ علم دولت حاصل کرنے کا ایک باعزت ذریعہ ہے۔ میری باتوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کے دل میں پڑھنے کا خیال پیدا ہو چلا۔ اب میں نے ایک روز باتوں باتوں میں کہا۔ کہ "میاں۔ تم ہائی سکول کا امتحان کیوں نہیں دے ڈالتے"۔ کہنے لگے۔ کہ "بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نے انگریزی کی صرف ایک کتاب پڑھی ہے۔ اور دوسرا کوئی مضمون نام کو نہیں جانتا۔ آپ بھی کیا مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں۔ میں نے ان کو ہمت دلائی اور کہا کہ "زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ تم ناکامیاب ہو جاؤگے۔ اگر تیاری نہ کروگے۔ تو امتحان بھی نہ دے پاؤگے۔ اس طرح امتحان تو دے لوگے۔ امتحان کی فیس میرے ذمہ۔ اس طرح تم سیکھ بھی لوگے۔ اور تمہارا کچھ نقصان بھی نہ ہوگا"۔ غرض وہ راضی ہو گئے۔

سب سے پہلے ان کے لئے مضامین چھنٹنے کا سوال تھا۔ چونکہ ان کو مدرسہ میں داخل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس لئے ایسے مضامین ہونے چاہئیں تھے کہ اپنے ماحول کا کوئی نہ کوئی آدمی ان کی مدد کر سکے۔ دوسرے یہ کہ اس میں تجربہ اور دارالعمل کا سوال نہ پیدا ہو۔ ان سشرائط اور پابندیوں کے زیرِ نظر اختیاری مضامین میں اُردو، تاریخ اور عربی چھنٹے گئے۔ اور جبری میں انگریزی، ریاضی اور شہریت تو تھے ہی۔ مضامین کی یہ فہرست امتحان کے فارم کے لئے لکھ کر رکھ دی گئی۔

پڑھانے کے لئے سب سے پہلے ان مضامین کو چنا گیا۔ جن سے وہ تقریباً بالکل ناواقف تھے یعنی انگریزی اور ریاضی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے مضامین بالکل نظر انداز کر دئے گئے۔ عربی وہ اس قدر جانتے تھے کہ اپنے امتحان کی درسی کتاب اگر کسی سے پڑھ لیں۔ تو کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ عربی انہوں نے ایک اور صاحب سے شروع کر دی۔ کیونکہ میں عربی سے ناواقف ہوں۔ دوسرے مضامین کے متعلق میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ خالی اوقات میں تقریباً پڑھ لیا کریں۔ اور جہاں کہیں زحمت ہو۔ مجھ سے مدد لیں۔ انگریزی و ریاضی کی تدریس میں نے اپنے ذمہ لی۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے ان میں پڑھنے کی طرف سے ایک طرح کی ہچک تھی اور یہ ہچک اگر عام طریقہ پر پڑھایا جاتا تو ہرگز نہ دور ہوتی۔ بلکہ اور بڑھ جانے کے امکانات تھے۔ اسی چیز کو مدِ نظر رکھ کر میں نے ان سے انتہائی بے تکلفی کا برتاؤ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ سگرٹ ایسی چیز جو ہمارے ماحول میں چھوٹوں کا بڑوں کے سامنے پینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں نے بے تکلفی اور بے باکی سے پیش کرنے میں گریز نہیں کیا۔ تاکہ خود دی اور بزرگی کا لحاظ ان کی بے تکلفی میں حارج نہ ہو اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں روبہ کار آسکیں۔ ان کی جہاں کوئی بُرائی کتابیں آڑے آتا۔ اور اس کی مخالفت کرتا۔ میں اپنا روپیہ پیسہ سب انہیں کے پاس رکھتا اور ان کو اجازت دے دی تھی۔ کہ

اس میں سے جس قدر چاہیں۔ خرچ کرسکتے ہیں۔ اس انداز کے برتاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بجائے مربی اور بزرگ کے مجھے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھنے لگے۔ ان مراحل کے بعد میں نے ان کو پڑھانے کا کام شروع کیا۔

انگریزی

شروع شروع میں میں نے انہیں کوئی کتاب پڑھنے کو نہیں دی۔ بلکہ میں ان سے انگریزی میں باتیں کرتا۔ خواہ وہ اُردو میں گفتگو کریں۔ بلالحاظ اس کے کہ میری باتیں ان کی سمجھ میں بھی آتی ہیں یا نہیں۔ پہلے تو وہ بہت گھبرائے مگر ایک ہفتہ کے بعد میری باتیں ان کی سمجھ میں آنے لگیں۔ اسی گفتگو کے دوران میں میں نے ان کو ماحول کے اندر کی مختلف چیزوں کے لئے انگریزی الفاظ بھی بتائے۔

باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے میں نے انہیں انگریزی زبان کی ابتدائی اور آسان کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ کتاب ان کے سامنے کھلی رہتی اور میں پڑھتا جاتا۔ ان سے صرف یہ کہہ دیا تھا۔ کہ میرے ساتھ ساتھ وہ کتاب دیکھتے جائیں۔ ایک ہفتہ کے بعد ان کو بہت ہی شروع کی کتابیں لاکر پڑھنے کو دیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سٹیٹس مین (States man) اخبار کی موٹی موٹی خبریں بھی پڑھواتا۔ دو مہینہ تک لکھنے کا کوئی کام نہیں ہوا۔ جو لفظ ان کی سمجھ میں نہ آتا۔ میں اس کو ان کے سامنے لغت میں ڈھونڈتا اور ان سے کہہ دیتا کہ تم بھی میرے ساتھ ڈھونڈتے جاؤ۔ اس طرح ان کو لغت کا استعمال بھی معلوم ہوگیا۔ اب وہ (Bright Story Readers) کے سلسلے کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے لگے۔ ان کہانیوں کے علاوہ (Koh-i-noor Readers) کی چوتھی کتاب تک ان سے ختم کرا دی گئیں۔ ترجمہ کے لئے ان سے زبانی جملے دونوں زبانوں سے بولے جاتے اور وہ ترجمہ کرتے جاتے۔ جب وہ انگریزی زبان سے ایک حد تک مانوس ہو گئے۔ تو ان کو لکھنے کا کام بھی دیا جانے لگا۔ حروف کی درستی کے لئے (Longmans)

کی مشقی کاپیوں پر لکھنے کی مشق کرائی گئی۔ پڑھی ہوئی کتابوں کی عبارتیں بھی نقل کرائی گئیں اکتوبر سے ان سے ڈائری بھی لکھوائی جانے لگی۔ اس پیپر نے ان کو مضمون نگاری میں بہت مدد دی۔ دسمبر تک ان کو کوئی درسی کتاب نہیں پڑھائی گئی۔ جنوری میں نثر کی کتاب میں نے ایک دفعہ ختم کی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہانیوں کی کتابیں ان کے سامنے ختم کی تھیں۔ دوسری مرتبہ ان سے پوری کتاب پڑھوائی۔ تیسری مرتبہ انہوں نے کتاب کا مطلب میرے سامنے پڑھ کر کیا۔ پھر مشکل مقامات پر میں نے نشان لگا دئے۔ ان ٹکڑوں کے معنی ان سے انگریزی میں کہلا کر لکھوائے۔ غلطیوں پر نشان کر دیا۔ دو تین غلطیاں انہوں نے اپنی کوشش سے دور کر لیں۔ اس کے بعد میں نے درست کر دیں۔ دو تین مرتبہ کے بعد ان کو مطلب لکھنے کا بہت کچھ ڈھب معلوم ہو گیا۔ اسی طرح نظم کی کتاب بھی ختم کرا دی گئی۔ سوانح اور کہانیاں کو انہوں نے لکھ کر مجھ سے اصلاح کرالی۔ جنوری سے وہ باقاعدہ مضمون بھی لکھنے لگے تھے۔

ریاضی

گنتی لکھنا پڑھنا۔ جوڑنا۔ گھٹانا۔ انہیں تجربہ نے سکھا دیا تھا۔ میں نے ان کے سامنے دو مرتبہ حساب (Arithmetic) کی حل کی ہوئی مشقیں مختلف کتابوں سے حل کیں۔ دو مہینہ میں میں نے حساب کی تمام مشقیں ختم کر دی تھیں۔ ستمبر کے مہینہ سے وہی مشقیں ان سے حل کرائی گئیں۔ کبھی کبھی انہیں طریقوں کے نئے سوالات بھی بول دئے جاتے۔ اکتوبر کے اواخر سے دسمبر تک الجبرا بھی اسی عنوان سے ختم کرا دیا گیا۔ اقلیدس (Geometry) کا کام حساب کے ساتھ ہی شروع کرایا گیا تھا۔ ابتداً اقلیدس کی مختلف شکلیں ان کو دکھائی گئیں۔ اور ان کے نام بتائے گئے۔ اس کے بعد ان شکلوں کی خصوصیتیں بتائی گئیں۔ پھر ان شکلوں کو بنانا سکھایا گیا۔ دسمبر تک کتاب کی تمام عملی اور نظری شکلیں کاپی پر حل کرا دی گئیں۔

دیگر مضامین

اُردو تو ایک حد تک یہ جانتے ہی تھے کیونکہ اوّل تو جہاں جہاں یہ رہے ان کا ساتھ اُردو داں لوگوں کا رہا۔ دوم میں خود اُردو کتابوں کا اچھا ذخیرہ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنے پڑھنے کے لئے اُردو زبان کے اکثر رسائل منگایا کرتا تھا۔ وہ ان کو خالی اوقات میں دیکھا کرتے تھے۔ جنوری کے اواخر میں انہیں مطلب لکھنے کا طریقہ بتا کر ان کی نصاب کی کتابیں ختم کرادی گئیں۔ عربی پڑھنے کا سلسلہ ایک دوسرے صاحب کی مدد سے جاری تھا۔ اور جیسا کہ نتیجہ سے معلوم ہؤا۔ اس میں انہوں نے کوتاہی کو دخل نہیں دیا صرف تاریخ کا مضمون ایسا تھا جس کی طرف توجہ نہ کی جا سکی۔ باوجود میرے کہنے کے کہ "دن میں ایک گھنٹہ تاریخ تفریحاً پڑھ لیا کرو۔ یاد ہو نہ ہو۔ اس کی فکر نہ کرو"۔ وہ اس میں دلچسپی نہ پیدا کر سکے۔ پہلے ہی سال ان میں اس قدر خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ کہ وہ بے جھجک امتحان میں بیٹھ گئے۔ گو کامیاب نہ ہو سکے۔ (Cross-list) کو دیکھنے پر معلوم ہؤا۔ کہ وہ صرف تاریخ میں ناکام رہے۔ مجھے تو اس کا خدشہ پہلے ہی سے تھا۔ اسی لئے امتحان کے بعد ہی سے میں نے ان کو اس کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ برے نتیجہ سے متاثر ہوکر وہ پھر پڑھنے سے متنفر نہ ہوجائیں۔ چنانچہ نتیجہ کے بعد ان پر چند روز انتشار اور بے کیفی کا عالم رہا۔ کبھی کبھی وہ کہتے کہ "میری قسمت ہی خراب ہے مجھے دنیا میں ذلیل ہی ہونا مقسوم ہوچکا ہے۔ اب میں نہ پڑھوں گا۔ بہت پڑھ لیا"۔ اس پریشانی کے زمانہ میں مَیں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ جب اس جذبہ کی شدت کچھ کم ہوئی۔ تو میں نے ان کو تفریح میں لگا دیا۔ تاکہ جی بہل جائے۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ جولائی سے پھر ان کی پڑھائی شروع ہوگئی۔ اس بار تاریخ پر خاص توجہ کی گئی۔ روزانہ تاریخ کا ایک حصہ ان کو زبانی قصہ کی شکل میں سنایا جاتا۔ بعد ازیں کتاب سے یہی چیز پڑھکر سنا دی جاتی۔ دوسرے روز اس کا خلاصہ ان سے لکھوا لیا جاتا۔

دوسرے تمام مضامین میں یہ تیار ہی تھے۔صرف دہرانے کا کام ہوتا رہا۔اس مرتبہ ہائی سکول کا امتحان انہوں نے دوئم درجہ میں پاس کر لیا۔اب ان میں کوئی بنیادی کمزوری باقی نہیں تھی۔اس لئے انہوں نے میرے مشورہ سے کالج میں داخلہ کرا لیا۔ اس سال وہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں بیٹھ رہے ہیں۔ اب میرا ان کا ساتھ نہیں ہے۔کیونکہ میں پاکستان میں ہوں اور وہ ہندوستان میں۔

میرے اس طریق کار کا یہ نتیجہ ضرور ہؤا۔کہ اب ان کو غصّہ بہت کم آتا ہے وہ اکثر باتیں اپنے مزاج کے خلاف بھی سُنکر اور دیکھ کر برداشت کر لیتے ہیں۔ اس کا سبب جیسا کہ میں نے اُوپر لکھا ہے محض یہ ہے کہ اب ان کی عزت نفس کو صدمہ پہنچنے کا احتمال جاتا رہا۔اور پرانی جراحتیں مندمل ہو چلی ہیں۔اب وہ یہ سمجھنے لگے ہیں۔کہ وہ بھی اپنی تعلیم کی بنا پر چار میں باعزت شمار کئے جانے لگے۔اور یہ واقعہ بھی ہے۔کہ جب لوگوں نے ان میں یہ غیر معمولی تغیر دیکھا۔تو سب کی رائے ان کی طرف سے بدلی۔ اور انہیں اچھی نظر سے دیکھنے لگے ؛

نیوزی لینڈ میں تعلیم و تدریس کی روئداد

سال ۱۹۴۷-۱۹۴۸

ترجمہ ——— سلیم فارانی

تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہونے والے بچوں اور بالغوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد کی بنا پر نیوزی لینڈ کے پہلے تمام تعلیمی مسائل ذرا پیچیدہ ہوگئے ہیں ۔ اور کئی اور نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ بظاہر یہ تمام مسائل سادہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان کے اندر کئی اُلجھاؤ ہیں۔

ابتدائی مدارس میں نظام تعلیم کے ذرائع پر پیدائش کی بڑھتی ہوئی رفتار کے باعث پہلے ہی سے کافی بوجھ پڑ رہا ہے۔ اور اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ ۱۹۵۲ء تک عمارتوں اور اُستادوں کی تعداد میں تقریباً ۲۰ فی صدی اضافے کی ضرورت ہوگی

ثانوی مدارس میں جہاں ۱۹۱۱ء میں ابتدائی مدارس سے صرف ۳۷ فیصدی بچے پاس ہوکر داخل ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء سے ہی ۷۰ فی صدی طلبہ آنے شروع ہوچکے تھے۔ اس بڑی زیادتی کی وجہ ایک طرف عوام کا ثانوی تعلیم کے لئے مسلسل مطالبہ اور دوسری طرف حکومت کی فیاضانہ حکمت عملی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۹۳۹ء

اور ۱۹۴۱ء کے درمیان پیدائش کی زیادتی سے اور ساتھ ہی سکول چھوڑنے کی عمر بڑھا کر پندرہ سال کر دینے سے ثانوی تعلیم میں طلبہ کی تعداد نسبتاً اور بڑھ گئی چنانچہ ۱۹۴۶ء میں ۸۵ فیصدی تھی۔ اور سال رواں میں ۹۰ فیصدی سے بھی بڑھ رہی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ اس قدر سرعت سے بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے ضروری ہے کہ مدارس کی عمارتوں اور سامان میں بڑی توسیع کی جائے۔ اور کافی تعداد میں اساتذہ تیار کئے جائیں۔ چنانچہ دس لاکھ پاؤنڈ سالانہ سے زیادہ اب نئی عمارتوں اور سامان کے لئے وقف کیا جا رہا ہے۔ اور ایک نیا ٹیچرز ٹریننگ کالج بھی کھول دیا گیا ہے۔

ان خارجی اقدامات کے مقابل اگرچہ کم واضح لیکن اسی قدر اہم وہ داخلی تبدیلیاں اور اصلاحات ہیں۔ جو اسکولوں کے اندر مطلوب ہیں۔ ثانوی مدارس میں اب بہت سے ایسے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جن کی قابلیتیں اس معیار سے کم ہیں جو پہلے ابتدائی مدارس کی اعلیٰ جماعتوں میں تعلیم جاری رکھنے اور ثانوی مدارس میں داخلے کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے استادوں کو پہلے کے مقابلے میں اب بہت زیادہ مختلف قسم کے نصاب مہیا کرنے کے مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ اعلیٰ قابلیتوں اور علمی رجحان رکھنے والی ذہنیتوں کے بچوں کو قابلیت قائم رکھنے اور پیشوں کے لئے تیار کرنے کے ساتھ ساتھ اب ثانوی مدارس کو کم قابلیتوں اور غیر علمی رجحان رکھنے والے طالب علموں کے لئے بھی حقیقتاً ضروریات مہیا کرنا پڑتی ہیں۔

ا۔ نظم و نسق مدارس

(ا) بحیثیت عمومی، تعلیمی ضبط کو مرکزانے کی خاطر ایک اہم تجربہ شروع کیا گیا ہے۔ اور آک لینڈ ایجوکیشن ڈسٹرکٹ (آک لینڈ کے تعلیمی ضلع کو جس میں نیوزی لینڈ کی سالانہ مدرسی آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ ہے۔ بہت حد تک اختیار دے دیا گیا ہے۔ ایک مقامی نگران تعلیم بھی مقرر کر دیا گیا ہے۔ جس کے اختیارات عام تعلیمی

حکمت عملی کے حدود کے اندر حکومت (Dominion) کے ناظم تعلیم کی طرح وسیع ہوں گے۔ انتظامی امور میں فیصلے کے متعلق آک لینڈ کے لئے ویلنگٹن سے التجا یا استدعا کرنا غیر ضروری قرار دینے سے بہت سا وقت بچ جائے گا۔ یہ بھی اُمید کی جاتی ہے کہ یہ علاقہ مقامی ماحول کے اختلاف کے مطابق تعلیم کو ڈھالنے کے مسئلے کے سلسلے میں اپنے طور پر غور کر سکے گا۔

چونکہ ان ماؤری اسکولوں کی زیادہ تعداد آک لینڈ کے علاقے میں پائی جاتی ہے جو اب تک علیحدہ علیحدہ نظام رکھا کرتے تھے۔ اِس لئے محکمہ تعلیم کا وہ شعبہ جو ماؤری مدارس سے تعلق رکھتا ہے۔ اب آک لینڈ بھیج دیا جائے گا۔

(ب) قبل از مدارس شعبے: ۱۹۴۵ء کی تعلیمی کانفرنس کی سفارشات کے مطابق وزیر تعلیم نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ تاکہ وہ قبل از مدارس شعبوں کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیٹی نے سفارش کی۔ کہ شعبہ ہائے قبل از مدارس کے لئے ایک نگران مقرر کیا جائے۔ اور حکومت اِس تربیت قبل از مدارس کے فروغ کی تمام تر ذمہ داری خود سنبھالے۔ جو اب تک مختلف مجالس رضاکارانہ طور پر سرانجام دے رہی ہیں چنانچہ ایک نگران خاتون مقرر کی گئی جس نے ریاض الاطفال (کینڈر گارٹن) اور معصوم گاہوں (نرسری سکول) کو ایک دوسرے کے قریب ترلانے میں اور اس کا محکمہ سے قریبی رابطہ پیدا کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ ان قبل از مدارس شعبوں کے ضابطے کا بڑا مسئلہ ابھی زیر بحث ہے لیکن حکومت رضاکار مجالس کو سُرعت کے ساتھ مالی امداد دے رہی ہے۔ تربیت لینے والے طلبہ کے لئے وظائف مقرر کئے گئے ہیں۔ اور حال ہی میں یہ فیصلہ ہوا ہے۔ کہ حکومت اساتذہ کی تمام تنخواہیں ادا کرے گی۔ اس طرح رضاکارانہ مجالس کے کندھوں سے مصارف کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ جو نا قابل برداشت ثابت ہونے لگا تھا۔ اور قبل از مدارس معصوم گاہوں کے استادوں کے معیاری [illegible]

بہت کچھ ترقی و اصلاح ہوسکے گی۔

(ج) ابتدائی تعلیم: ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں اس سال قابل ذکر بات یہ ہے کہ گذشتہ دس سالہ تجربے کی روشنی میں تعلیمی نصابات کی ترمیم ہوئی۔ اور ان تجربی سالوں میں معلومات اساتذہ کو حاصل ہوئے۔ ان کے مطابق نئی درسی کتابیں تیار ہوئیں اور چھپیں۔

(د) ثانوی تعلیم: جہاں تک ثانوی تعلیم کے سلسلے میں ہمارے رویہ کی اہم تبدیلی کا تعلق ہے۔ وہ ۱۹۴۴ء کے ترمیم نصاب سے اور ہائی اسکولوں میں جانے والے طلبہ کی تعداد سے ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں نظم و نسق اور نصاب کے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے جارہے ہیں۔ اور مدارس کے صدر معلم کچھ مدت تک انہی مسائل میں اُلجھے رہیں گے۔ کہ (۱) ایسے بالغوں کی جماعت بندی اور طبقہ بندی کے بہترین طریقے کون سے ہیں۔ جن میں ہلکے معیار سے اعلیٰ معیار تک مختلف قسم کی قابلیتیں ہوں (۲) ایسا نصاب تیار کیا جائے جو ثانوی مدارس کی موجودہ آبادی کی مختلف ذہنیتوں کو کافی حد تک مطمئن کرسکے (۳) ایسا اوقات نامہ تیار کیا جائے۔ جو ایسا لچکدار ہو۔ کہ نصاب کے مطلوبہ اختلاف کے لئے موزوں ہوسکے۔

جامعہ نیوزی لینڈ

جامعی کالجوں کے فروغ کے لئے اس سال ایک اور اقدام کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ دو ہزار پاؤنڈ سالانہ کی تنخواہ پر باقاعدہ وائس چانسلر (نائب میر جامعہ) مقرر کئے گئے ہیں خیال ہے۔ کہ ان نئے افسروں کے تقرر سے چار کالجوں کے روزانہ نظم و نسق کی کاملیت بڑھے گی۔ اور وہ بہت سے نئے مسائل جو بعد از جنگ تعلیمی رجحانات کی بنا پر پیدا ہو رہے ہیں۔ زیادہ مستعدی کے ساتھ حل کئے جاسکیں گے۔ کالجوں اور ان سے متعلق معاشروں میں زیادہ اچھے تعلقات قائم ہوں گے۔ اور طرز عمل کے امور میں چاروں کالجوں کی باہمی مشاورت کی سہولتیں مہیا ہوں گی۔

حال ہی میں جامعہ نیوزی لینڈ کی منتظمہ (سینٹ) نے یونیورسٹی گرانٹس کمیٹی مجلس امدادی جامعہ) قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے جامعی کالجوں کا باہمی فروغ اور بھی زیادہ موثق و مستحکم ہو جائے گا۔ اس کمیٹی کا اہم کام یہ ہوگا۔ کہ جامعہ کی ترقی کے لئے ایک لمبے عرصے کا لائحہ عمل تیار کریں۔ اور امداد کے لئے جامعہ کے مخصوص مدارس اور کالجوں کی درخواستوں کو باہم ربط و تنظیم دیں۔

تعلیم بالغان

۱۹۴۴ء کی تعلیمی کانفرنس کی درخواست پر جو مشاورتی کمیٹی قائم ہوئی تھی۔ اس نے سفارش کی تھی۔ کہ قوم کی ضرورت کے مطابق تعلیم بالغان کے شعبوں کی توسیع کو ممکن بنانے اور موجودہ مختلف شعبوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر ایک مؤثر اور با اقتدار محکمے کا قیام ضروری ہے۔ اس سفارش کے زیر اثر حکومت نے تعلیم بالغان کی نئی کونسل بنانے کے لئے ایک ایکٹ پاس کیا ہے۔ جس میں تعلیم بالغان کے موجودہ مقامی اداروں کے نمائندے ہوں گے۔ اور ناظم شعبہ تعلیمات، ناظم نشریات، جامعہ کے نمائندے اور مزدوروں کی تعلیمی جماعت کے نمائندے اور ماوری لوگوں کے مندوب بھی شامل ہوں گے۔ تعلیم بالغان کا ایک ناظم (ڈائرکٹر) مقرر کیا جا رہا ہے۔ جو اس نئی کونسل کا اعلیٰ کارکن یا عامل افسر ہوگا۔

۲۔ نصاب اور طریق تعلیم

(۱) تجربوں کا دور ہو چکا۔ اب تنظیمی دور ہے۔ اور کوشش کی جا رہی ہے۔ کہ نصاب کی تیاری اور طریق تعلیم کے مسائل کو حل کرنے کی بہت سی نئی راہوں کو جانچا جائے۔ مدارس کے نصاب کے عام پہلوؤں کے متعلق رپورٹ کرنے والی کمیٹیوں کی جگہ اب بہت سی ایسی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ جن کے امور تنقیح زیادہ واضح اور قطعی ہیں۔

حساب، زبانِ انگریزی، حفظانِ صحت (حفظِ صحت)، بچے، تاریخ وجغرافیہ وغیرہ کی تعلیم کے متعلق امتحانات کی روئداد پہنچ چکی ہے۔ اور محکمہ تعلیم نے ان مضامین کی مجلسوں کی روئدادوں کو منظور کر لیا ہے۔ اب کمیٹیاں مطالعہ، تحریر اور دوسرے مضامین کی تعلیم کے متعلق مصروفِ عمل ہیں موسیقی کے سوا ہر مضمون کے متعلق روئداد پہنچ چکی ہے۔ یا تیار ہو رہی ہے۔ ان کمیٹیوں کے کام کا اہم پہلو یہ ہے۔ کہ محکمہ تعلیم کے ناظرین مدارس، ٹیچرز ٹریننگ کالجوں کے اسٹاف اور کام کرنے والے اساتذہ کا مشترک مسائل کے غور وفکر اور جانچ پرکھ میں رابطہ استوار کر دیا گیا ہے۔

(ب) ثانوی مدارس کے طلبہ کے استعمال کے لئے معلومات سے بھرے پندرہ روزہ اخباروں اور رسالوں کا ذکر تو ۱۹۴۷ء کی رپورٹ میں کر دیا گیا تھا۔ ان رسالوں کو نمایاں کامیابی ہوئی ہے۔ اور یہ چیز یہاں قابلِ ذکر ہے کہ مفہوم ومقصد کے لحاظ سے یہ اسی طرح کے آرمی ایجوکیشن (فوجی تعلیم) کے محکمے کے تیار کردہ رسالوں سے زیادہ متاثر تھے۔ جنہیں جنگ کے زمانے میں فوجی خوب سراہا کرتے تھے۔ ان رسالوں میں ایسا مواد ہوتا ہے۔ جو مدرسی کتابوں میں عموماً نہیں ہوتا۔ اور ایسے ایسے عنوانات کے متعلق تازہ ترین معلومات ہوتے ہیں۔ جو بچوں کو آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اہم مضامین مندرجہ ذیل ہوتے ہیں:-

روزمرہ کے واقعات، یو این او، یونیسکو، مجلس کی صدارت کا طریق، کوئلے کی کان والا، شماریات کا طریق، مقامی جائزہ لینے کا طریق، نیوزی لینڈ کے فقری حیوانات، نیوزی لینڈ کے کھیتوں کی زندگی وغیرہ۔

(ج) محکمہ تعلیم باقاعدہ نئی درسی کتابیں شائع کر رہا ہے۔ اور یہ زیادہ تر طباعت کی دقتیں ہیں۔ جو اس کام کی رفتار تیز کرنے اور شعبہ تعلیم کی ضروریات پورے کرنے میں حائل ہیں۔

۳ - اساتذہ

(ا) تنخواہیں: نئے اصول و قوانین وضع کئے جا چکے ہیں جن کے ذریعے جہاں تنخواہوں میں عام اضافہ ہوا ہے۔ (اوسط تقریباً ۱۱ فیصدی اضافہ) وہاں ابتدائی مدارس کے اساتذہ کے میزان مشاہرہ کو بہت حد تک ثانوی مدارس کے اساتذہ کے میزان مشاہرہ کے برابر کر دیا گیا ہے۔

(ب) تربیت: مزید اساتذہ کے مطالبے کو پورا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اس سال آک لینڈ کے تعلیمی ضلعے میں ایک پانچواں ٹیچرز ٹریننگ کالج کھولا جائے۔ اس کالج میں زیادہ ماوڑی طلبہ ہیں۔ جو استاد بننے کی تربیت لے رہے ہیں۔ تعلیم کے مسائل میں خاص تربیت دینے کے علاوہ یہ کالج دیہاتی اسکولوں میں کام کرنے کے لئے بھی اساتذہ کو خاص تربیت دیگا ملازم اساتذہ کی تربیت کے لئے تجدیدی اسباق کا سلسلہ بھی مرغوب عام ہوتا جا رہا ہے حکومت نے اس کام کے لئے اب اپنی امداد ۴۰۰۰ پاؤنڈ سالانہ تک بڑھا دی ہے۔ یہ امداد اس امداد سے تقریباً دوگنی ہے۔ جو دو سال پہلے اس وقت مقرر ہوئی تھی۔ جب کہ اس سلسلے کی ابتدا ہوئی تھی۔

جن اسباق کا اساتذہ خود انتظام کرتے ہیں اُن میں اس سال جغرافیہ، لکڑی کا کام، تجارتی مضامین اور یک استادی دیہاتی مدارس کے ذمہ دار اساتذہ کے مخصوص مسائل بھی شامل ہیں۔

ویلنگٹن ٹیکنیکل کالج میں تجارتی مضامین پڑھانے کے لئے اساتذہ تیار کرنے کی خاطر ایک نیا تربیتی نصاب بھی جاری کر دیا گیا ہے۔ تجربہ کار دفتری کام کرنے والوں کو وظائف ملیں گے تاکہ وہ ایک سال ٹریننگ حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔

(ج) طلبہ کے لئے وظائف: اس سال طلبہ کے لئے وظائف میں کافی توسیع ہوئی۔ ٹیچرز ٹریننگ کالجوں میں تمام طلبہ کافی وظیفے لے رہے ہیں۔ اور جو ۲۱ سال سے زائد عمر کے ہیں۔ انہیں نیوزی لینڈ کے مزدوروں کی مزدوری کی شرح کے مطابق رقم ملتی ہے۔

ایک نیا اقدام اس سال یہ ہوا ہے۔کہ سہ سالہ سے چہار سالہ وظائف دئے جانے لگے ہیں۔جن سے ثانوی مدارس کے ہوشیار اساتذہ یونیورسٹی کی تعلیم لے سکیں گے۔ اور اپنی ڈگریاں حاصل کرسکیں گے۔اور اسکے بعد وہ ایک سال ٹیچرز ٹریننگ کالج میں معلمی کی تیاری میں صرف کریں گے۔

(د) جسمانی تعلیم: اس سال جامعہ اٹاگو میں جسمانی تعلیم کے نئے محکمے کا کام شروع ہوا۔ ناظم اور سٹاف مقرر کئے گئے۔

۴۔متفرقات

(ا) بہبودی اطفال: طفلانہ غلط شعاریوں اور جرموں کے ارتکاب میں جو کمی ۱۹۴۴ء میں واقع ہونی شروع ہوئی۔ اور جس کا مذکور گذشتہ سال کی رپورٹ میں کیا گیا تھا سلسل جاری رہی ہے۔ اس سال ان غلط شعاریوں کی شماریات پچھلے پندرہ سالوں کی شماریات کے مقابلے میں سب سے کم ہے۔ اس کمی کے اسباب بہت پیچیدہ ہیں۔اور کسی طرح سمجھ نہیں آسکتے۔لیکن غالباً دو سبب یہ ہیں۔ایک تو بہبودی اطفال کے شعبے کے افسروں کا انسدادی کام اور دوسرے "ناظر اساتذہ" (جو اب بہت سے بڑے مدارس کے ساتھ ملحق ہیں) کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں

(ب) دیہاتی تعلیم: نیوزی لینڈ میں دیہاتی تعلیم کے مسائل کو کسی قسم کی کم اہمیت نہیں دی گئی۔ ایسے اضلاع کے لئے جہاں آبادی بہت چھدری سی ہے۔ تعلیم کے مناسب طریقوں کو فروغ دیا گیا ہے۔اور ان طریقوں کے عام استعمال کا دلچسپ موقع حال ہی میں اس ضرورت کے عرصے میں پیدا ہوا۔جبکہ وبا کی شدت کے باعث تمام مدارس چھ ہفتوں کے لئے بند کرنے پڑے۔محکمہ تعلیم کے مراسلاتی اسکول، محکمہ مدرسی نشریات، والدین اور اساتذہ کے عظیم الشان اشتراک عمل سے تعلیم گھروں میں جاری رہی۔ ابتدائی جماعت سے لیکر ثانوی مدارس کی منزل تک کی تمام جماعتوں کے

اصلاحی نصاب پر نظر ثانی کی گئی۔ اور سارے ملک کے تمام طباعتی مطبع کو مجمع کے نیوزی لینڈ کے ہر بچے کے لئے اسباق کے مجموعے مہیا کئے گئے۔ ان مراسلاتی اسباق کے بہترین طریق عمل کو بچوں اور والدین پر واضح کرنے کے لئے اور کافی وسیع دائرے میں اسباق دینے کی خاطر نشریات (ریڈیو) کا استعمال کیا گیا۔ اس طرح ان تمام مدارس میں جو بچوں سے خالی تھے۔ اساتذہ کے کام کی گہما گہمی رہی۔ اور وہ بچوں کے انفرادی تفویضی کام کی درستی میں منہمک رہے۔ اس کام میں معقول توقعات سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی۔

نیوزی لینڈ کی تعلیمی تحقیقاتی کونسل اب اس بات کا جائزہ لے رہی ہے۔ کہ دیہات میں دور افتادہ چھدرے مقامات پر یک استادی مدارس کی جگہ دیہاتی قصبوں میں بڑے مرکزی مدارس کو نشو و نما دینا کس قدر زیادہ مفید ہے۔ چنانچہ دیہاتی اسکولوں کو مرابوط و یکجا کرنے کی طرف بہت حد تک پہلے ہی اقدام ہو چکا ہے۔ اور اس بات کا احساس ہو رہا ہے۔ کہ اس طریق کار کا جائزہ لینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا وقت آپہنچا ہے۔ اس کونسل کی روئداد دنیا کے اکثر حصوں کے ماہرین تعلیم کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

(ج) جزائر بحر الکاہل میں تعلیم: مغربی سموآ میں مقامی بچوں کو تعلیم دینے میں جدید معصوم گاہوں کے طریقوں کو استعمال کرنے کا ایک دلچسپ تجربہ کیا گیا نئی کتابیں اور نیا سامان تیار کیا جا رہا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مطالعۂ حساب وغیرہ کی علاماتی تعلیم کو ایسی ٹھوس مادی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ جو حقیقتاً بچوں کے ماحول سے تعلق رکھتی ہوں۔

(د) تعلیم میں علمی تحقیق: نیوزی لینڈ کی تعلیمی تحقیق کی کونسل نے حال ہی میں نیوزی لینڈ کی تعلیمی کتابوں کی فہرست شائع کی ہے۔ اور اعلٰے قابلیت کے

بچوں کی تعلیم پر ایک کتاب عنقریب شائع ہونے والی ہے۔
دوسری علمی تحقیقوں کے علاوہ جو جاری ہیں۔ ان اہم تجربات کا جائزہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ جو آک لینڈ کے تعلیمی بورڈ نے ابتدائی اور ثانوی مدارس کو ایک ہی نظام اور ضابطے میں لانے کے سلسلے میں کئے ہیں۔

اُردو انشا پردازی

شیخ محمد اسماعیل

(۱)

نظری پہلو

مقصد یہ ہے۔ کہ طلبہ اپنے خیالات کا اظہار تقریر و تحریر ہر دو طریق سے نہایت شستہ اور سلجھے ہوئے انداز میں کر سکیں۔ تقریباً دس پندرہ سال ہوئے کہ اُردو انشا پردازی پر بھی انگریزی کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ اور اردو انشا پردازی میں بھی بہت کچھ اُنہی طریقوں پر کام ہو رہا ہے۔ جن پر انگریزی کمپوزیشن میں ہوتا ہے۔ اِس سے قبل اُردو انشا پردازی کا کام صرف مضمون نویسی اور خطوط نویسی تک محدود تھا۔ لیکن جب سے انگریزی رَوِش کی تقلید شروع ہوئی ہے۔ سب سے بڑا فائدہ جو بچوں کو حاصل ہوا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ گرامر یا قواعد کے جو اصول وہ ازبر کیا کرتے تھے (اُن کا عملی استعمال نہ کرتے تھے۔ اور نہ اُنہیں کوئی موقع نصیب ہوتا تھا۔ جس میں وہ ان گرامر کے اصولوں کو عملی طور پر استعمال کر سکیں) اب وہ عملی طور پر استعمال کرنے لگے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اب بچے پرانے زمانہ کی طرح گرامر کے اصول رٹتے نہیں۔ بلکہ

ہر وہ بات جو گرامر میں پڑھ کر اخذ کرتے ہیں۔ اُس کو اپنے روزمرّہ کی بول چال کے ذریعے استعمال میں لاتے ہیں۔

اب ذیل میں وہ تمام امور جو عملی انشا پردازی میں شامل ہیں۔ یکے بعد دیگرے بیان کئے جائیں گے۔

۱۔مضمون نویسی ۔

۲۔ خطوط نویسی ۔

۳۔کہانی لکھنا ۔

۴۔فقرات کی درستی یا غلط عبارت کی تصحیح ۔

۵۔خالی جگہوں کا پُر کرنا ۔

۶۔ الفاظ و محاورات کا فقرات میں استعمال ۔

۷۔طویل عبارت کا اختصار۔

۸۔فقرات کے مقابل کا ایک لفظ تلاش کرنا۔

۱۔مضمون نویسی: اُستاد کے لئے ضروری ہے۔ کہ مضامین کا انتخاب طلبا کی عمر اور استعداد کو سامنے رکھ کر کرے۔ چھوٹی جماعتوں میں ایسے مضامین منتخب کئے جائیں۔ کہ جن کا تعلق بچّوں کی روزمرّہ زندگی کے ساتھ ہو۔ اور وہ اُن کے مشاہدہ میں آچکے ہوں۔ اِس سے یہ فائدہ ہوگا۔ کہ بچّوں کے پاس لکھنے کے لئے مواد ہوگا اُستاد بھی اپنے تجربہ کی بنا پر اِس مواد میں اضافہ کرے گا۔ اور اس کو ترتیب دے گا۔ ضروری ہے کہ پہلے مدرس اس مضمون پر جو جماعت میں اگلے روز لکھانا ہو۔ پورا غور و خوض کرے۔ اور مختلف خیالات کا پیراگراف کی صورت میں ربط قائم کرے۔ اِس طرح تمام پہلو جو اِس مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر لائے جائیں۔ پھر شروع میں زبانی گفتگو کے ذریعہ وہ خیالات جو بچّے لئے ہوئے ہیں۔ اپنے سانچے میں ڈھال لیں۔ پھر

تحریری انشا پردازی شروع کرائیں۔

۲۔ خطوط نویسی: اِس کا مفہوم یہ ہے کہ طلبا اپنے خیالات کا اظہار ایسی عبارت میں کریں۔ جیسی وہ عام معاشرت میں مہذّبانہ طور پر گفتگو کرتے وقت اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً وہ خط لکھیں۔ تو یوں معلوم ہو۔ کہ مخاطب سے گفتگو کر رہے ہیں۔ بچوں کو مختلف قسم کے خطوط سے واقفیت دلائی جائے۔ نجی، کاروباری اور سرکاری۔ ہر ایک کے القابات۔ لوازمات اور اختتام طلبا کے ذہن نشین کئے جائیں۔ اور اُن کو بتلایا جائے۔ کہ خطوط نویسی میں خواہ وہ کسی قسم کی ہو۔ لمبی تمہید کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ لکھنے والے کو بہت جلد اپنے مطلب کو سادہ اور عام فہم الفاظ میں بیان کرنا چاہیئے۔ طلبا کو رسیدات لکھنے کا ڈھنگ بھی بتایا جائے۔ اور مختلف عرضیوں کے لکھنے کا طریق بھی ذہن نشین کیا جائے۔ کیونکہ یہ اُن کی روزمرّہ زندگی میں کام آئے گا۔

۳۔ کہانی لکھنا: انشا پردازی کے فن میں اِس سُرخی نے ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا ہے۔ اِس سے بچّوں کے دل و دماغ پر کافی اثر پڑتا ہے۔ اُن کو سوچنے کی عادت ہوتی ہے۔ اور پھر وہ اپنے تخیّلات کو ایک عام فہم عبارت کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ جو باترتیب ہوتی ہے۔

کہانی لکھنا ایک فن ہے۔ اِنسان کی کہانی اِس فن کے بغیر نامکمل رہ جاتی ہے بعض آدمیوں کے لئے یہ قدرتی عطیّہ ہے۔ بعض اشخاص مشق سے لکھتے ہیں۔ بہرحال اچھی کہانی وہ سمجھی جائے گی۔ جو پڑھنے والے کو قائل کرے۔ کہ "یہ حقیقت ہے" اس میں کسی جگہ ہچکچاہٹ پیدا نہ ہو۔

یہ مختلف صورتوں سے پیش کی جا سکتی ہے:-

(ا) دِئے ہوئے پُورے خاکہ سے کہانی لکھنا۔

(ب) اہم نقاط سے کہانی لکھنا۔

(ج) نامکمل کہانی کو مکمل کرنا۔
(د) کسی ضرب المثل یا کہاوت کی تائید میں کہانی لکھنا۔

کہانی لکھتے وقت کن باتوں کا خیال رکھا جائے:-

۱۔ اُس کا خاکہ اور سُرخیاں عقلمندی سے ترتیب دی جائیں۔ اُنکی ترتیب منطقی ہو
۲۔ اپنے تخیّل سے کام لے کر وہ تمام تفاصیل مہیا کی جائیں۔ جو اس میں موجود نہیں۔ اور کہانی کو جس قدر حقیقی اور دلچسپ بنانا ممکن ہو۔ بنایا جائے۔
۳۔ واقعات کو مناسب پیرگراف کی صورت میں لکھا جائے۔
۴۔ زبان درست، سادہ اور عام فہم ہو۔
۵۔ کہانی کو ایک مناسب طریق سے ختم کیا جائے۔ تاوقتیکہ ضرورت محسوس نہ اس کو نہ لکھا جائے۔

۴۔ <u>غلط عبارت کی تصحیح</u> : روزمرہ کی بول چال اس بارے میں مشعلِ ہدایت کا کام دے گی۔ اکثر بچے جو زیادہ تر دیہاتی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر ایسی غلطیاں کرتے ہیں۔ جو سامعین سُن سُن کر ہنستے ہیں۔ استاد کا فرض ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کی ایک فہرست بنائے۔ اور اس قسم کے فقرات جو روزمرہ اُن کے تجربہ میں آتے ہیں۔ ان کو درست کرنے کے لئے دے۔ قواعد کے وہ اصول جو بچے زبان کی درستی کے متعلق مدرسہ میں پڑھتے ہیں۔ اس موقع پر اُن کا عملی استعمال کریں۔

۵۔ <u>خالی جگہوں کا پُر کرنا</u> : مختصر سی عبارت کتاب سے پڑھائی جائے۔ وہی عبارت تختۂ سیاہ پر لکھ کر "میں" "سے" "کو" چند اسی قبیل کے الفاظ درمیان سے مٹا دینے چاہئیں۔ پھر طلبا سے پوچھنا چاہیئے۔ کہ یہاں کون سا لفظ آئے گا۔ اسی کو بتدریج بڑھاتے بڑھاتے طلبا کو اس درجہ تک لے آنا چاہیئے۔ کہ وہ ایک فقرہ کے اندر ٹھیک بیٹھنے والے الفاظ [illegible] لگا سکیں

۶۔ الفاظ و محاورات کا استعمال (فقرات میں)؛ مدرس نیا لفظ آنے پر نئے فقرہ میں استعمال کرکے دکھائے۔ پھر طلبا سے استعمال کرائے۔ محاورات زبان لئے زیور کا کام دیتے ہیں۔ اکثر بچّے ان سے آشنا نہیں ہوتے۔ بعض کے رُو برُو ت محاورے روزمرّہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ ان کا صحیح اور بامحل استعمال جانتے۔ اُستاد کا فرض ہے کہ وہ اُن محاورات کو جو عام طور پر مروّج ہیں۔ یا روزانہ ال میں استعمال ہوتے ہیں۔ طلبا پر واضح کرے۔ اُن کا مطلب سمجھائے۔ اور ن محاورات کو عمدہ طریق سے برمحل فقرات میں استعمال کرکے اُن کے رُوبرُو پیش ۔ بچّے بہت کچھ اُستاد کی تصویر ہوتے ہیں۔ اگر اُستاد خود اپنی روزمرّہ کی گفتگو اورات کا برمحل استعمال کرتا رہے گا۔ تو طلبا کی مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی۔ اورات کے استعمال میں دلچسپی لیں گے۔ جس سے انشا پردازی کی زینت بڑھ جائیگی۔

طویل عبارت کا اختصار: یہ بھی انشا پردازی کا ایک اہم جزو ہے۔ اِس د یہ ہے کہ ایک لمبی عبارت کو پڑھ کر اُس کو چند سطور میں لکھنا۔ یا چند الفاظ میں کے مفہوم کو ادا کرنا۔ خلاصہ میں اُس عبارت کے تمام ضروری نقاط آجانے یں۔ اور غیر ضروری تفصیلات کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے۔

اس امر کے لئے مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرنا ضروری ہے:۔

دی ہوئی عبارت کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ تاکہ اُس کے نفس مضمون پر پورا را عبور ہو جائے۔

س کے ضروری نقاط کو نوٹ کیا جائے اور ضروری خیالات جو عبارت میں یں اُن کو بھی نوٹ کیا جائے۔

یہ ضروری ہے۔ کہ خیالات اپنے الفاظ میں آسان اور سادہ عبارت میں تحریر کئے جائیں۔ خلاصہ منتشر صورت میں نہ ہو۔ بلکہ یہ انشا پردازی کا ایک لگاتار

اور ترتیب دیا ہوا جزو ہو۔

۴۔ بہتر ہوگا۔ کہ خلاصہ میں خیالات کی ترتیب وہی ہو۔ جو اصل عبارت میں تھی۔

۵۔ تمام غیر ضروری امور یا تفاصیل ترک کر دی جائیں۔ اور زبان نہایت سادہ عام فہم اور تصنع سے پاک ہو۔

اِس سلسلہ میں خلاصہ کرتے وقت مندرجہ ذیل تجاویز پر عمل کیا جائے۔

۱۔ لمبے لمبے جملوں کا خلاصہ کرتے وقت ایک لفظ یا جملہ استعمال کیا جائے۔

۲۔ بجائے کئی فقرات کے ایک چھوٹا فقرہ جس میں اُن فقرات کا مفہوم ملے استعمال کیا جائے۔

۳۔ بے فائدہ الفاظ کو حذف کر دیا جائے۔ سادہ الفاظ استعمال کئے جائیں۔

۸۔ فقرات کے مقابل کا ایک لفظ تلاش کرنا: یہ طویل عبارت کے اختصار سے لے سکھانا چاہیئے۔ اُردو میں ایسے اسم فاعل اور اسمائے مفعول کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ جو ایک فقرہ کا مفہوم اپنے اندر پوشیدہ کئے ہوئے ہیں۔ مثلاً آٹا پیسنے والی عورت کے مقابل "پسنہاری"۔ عدالت میں دعوےٰ دائر کرنے والا "مُدّعی"۔ فرش بچھانے والا کے مقابل "فرّاش" وغیرہ۔

ایسے الفاظ کا ایک چارٹ بنا کر جماعت کے کمرے میں لٹکا دیا جائے۔ اور پھر مشق کے لئے گاہے گاہے مدرس ایسے چند فقرات بنانے کو دے دیا کرے۔ یہ چیز طویل عبارت کے اختصار میں بھی مدد دے گی۔

(ب)

عملی پہلو

۱۔ لکھنے کا طریق ۲۔ دیکھنا اور تصحیح کرنا ۳۔ ریکارڈ

لکھنے کا طریق

(ا) بہتر ہوگا۔ کہ طالب علم انشا پردازی کی ہر شاخ کا کام دائیں صفحہ پر کرے۔ ربایاں صفحہ اصلاح کے لئے خالی رکھا جائے۔ اغلاط کی درستی چھوٹی جماعتوں میں بایت اچھے خط کے ساتھ کی جائے۔ بہترین طریق یہ ہے۔ کہ غلطی کے نیچے یا اُوپر سُرخ یر لگا کر نمبر لگا دیں۔ اور بائیں صفحہ پر وہی نمبر دے کر اُس لفظ کی صحیح صورت لکھیں۔ تاکہ بچے وہاں اصلاح کی مشق کریں۔ یہ طریق زیادہ سُود مند ہوگا۔

اکثر مشاہدہ میں آیا ہے کہ جو اصلاح اُستاد کرتے ہیں بعض وقت وہ پڑھی ہیں جاتی: اگر وہ پڑھی بھی جاتی ہے۔ تو جس جگہ اصلاح کی جاتی ہے وہ ایسی تنگ ہوتی ہے کہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اُستاد اُس کو زیادہ روشن طور پر نہیں لکھ سکتا۔ بس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بچے غلط مشق کرتے ہیں۔ ہر مضمون کے خاتمہ پر ایک صفحہ یا نصف صفحہ اصلاح کی مشق کے لئے چھوڑ دینا انسب ہے۔

(ب) انشا پردازی شروع کرنے سے پہلے طلبا کو ہدایت کی جائے۔ کہ وہ تاریخ دائیں صفحہ کی دائیں جانب درج کریں۔ اِس سے طلبا۔ اُستاد اور حُکّام کو یہ معلوم ہو جائے گا۔ کہ آیا اُن کا کام ہفتہ وار باقاعدہ ہو رہا ہے یا نہیں۔ انشا پردازی درست کرنے کے بعد اُستاد کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے دستخط کرے۔ اور اُن کے نیچے تاریخ ڈالے۔ یہاں بعض اُستادوں کو خیال ہوتا ہے۔ کہ تاریخ وہی ہونی چاہیئے۔ جو طلبا نے اپنے مضمون کی ابتدا میں تحریر کرتے وقت ڈالی تھی۔ یہ ضروری نہیں۔ بلکہ اُستاد ایمانداری سے اپنا کام باقاعدہ کرتا رہے۔ اور ہفتہ کے دوران میں جس تاریخ کو اُس نے مضمون درست کیا ہے۔ وہی تاریخ ڈال دے۔

(ج) اصلاح ہمیشہ سُرخ روشنائی سے کی جائے۔ تاکہ وہ نمایاں طور پر بچوں کو نظر آجائے۔ بعض مرتبہ دیکھا گیا ہے۔ کہ اُستاد صاحبان اِس کام (یعنی مضمون کی اصلاح)

کی طرف پوری توجہ نہیں دیتے۔ اور خاص طور پر اُردو انشا پردازی کے متعلق تو یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ یہ بچّوں کی مادری زبان ہے۔ اور مضمون کے آخر میں سُرخ روشنائی سے دستخط کردئے جاتے ہیں۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اور ظاہر کرتا ہے کہ ہمیں اپنی ذمہ واری کا پورا پورا احساس نہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ مضمون تین صفحے کا لکھایا جائے۔ یہ چھوٹی جماعتوں میں اُن کی عمر اور استعداد کے مطابق ہوگا۔ جوں جوں اعلیٰ جماعتوں میں طلبا ترقی کرتے جائینگے مضمون کی ضخامت زیادہ ہوتی جائے گی۔

(د) انشا پردازی طلبا کے لئے ایک ایسا موقع مہیا کرتی ہے۔ جہاں اُستاد بچّوں کو نئے نئے الفاظ، اچھے اچھے جملے۔ عمدہ عمدہ محاورے سکھلا سکتا ہے۔ اِس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ تقریری انشا پردازی کراتے وقت ان الفاظ۔ جملوں اور محاوروں کا استعمال کرایا جائے۔ تاکہ طلبا تحریری انشا پردازی میں ان کا استعمال کرسکیں۔

اُستاد کی ذمّہ واری

مضمون لکھتے وقت اُستاد کی ذمہ داری بڑی بھاری ہے۔ مضمون جماعت کے کمرے میں اپنے رُوبرو لکھایا جائے۔ یہ وقت اُستاد کے لئے نگرانی کا وقت ہے۔ جب بچّے مضمون لکھ رہے ہوں۔ اُس وقت یہ خیال کرنا۔ کہ یہ وقت خالی ہے (کیونکہ طلبا مضمون لکھنے میں مشغول ہیں) بڑی بھاری غلطی ہے۔ کئی صاحب اِسی غلطی میں پڑکر اُس وقت اخبار بینی یا کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ ایسا کرنے سے بچّے لازمی طور پر اُستاد کی طرف سے بے فکر ہوجاتے ہیں۔ اور نقل کرلیتے ہیں۔ اِس کے یہ معنی ہوئے۔ کہ تمام وقت ضائع گیا۔ تمام محنت رائگاں گئی۔ اِس طرح اُن سے مضمون اسکول کے کمرہ میں لکھانے کے کوئی معنی نہیں۔ اِس سے بہتر ہے۔ کہ انہیں گھر پر لکھنے کے لئے دے دیا جائے جس مقصد کے لئے اِنشا پردازی کا کام کرایا جا رہا ہے۔ نگرانی میں غفلت کرنے سے وہ مقصد

فوت ہوجائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم بچوں کی ترقی نہیں چاہتے۔

میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں۔ کہ اگر آپ کسی اسکول کا تعلیمی معیار دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو اُس اسکول کے بچوں کی انشا پردازی کا کام دیکھ لیجے۔ بس یہ کافی ہے۔

ریکارڈ

انشا پردازی کا جو کام بھی کیا جائے۔ اُس کا ایک ریکارڈ کمپوزیشن چارٹ کی صورت میں رکھا جائے۔ اور وہ جماعت کے کمرے اور ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں آویزاں کیا جائے۔ اِس سے کئی فائدے ہوں گے:-

اُستاد (۱) اُستاد کو یہ معلوم ہوتا رہے گا۔ کہ وہ اِنشا پردازی کے کام کو ہفتہ وار کسی جماعت میں آیا باقاعدگی سے کرا رہا ہے یا نہیں؟

(۲) عام طور پر بعض اُستاد صاحبان مضمون کی کاپیوں پر نمبر دیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نمبر آپ دس رکھیں یا پانچ۔ اِس سے فرق نہ پڑے گا۔ بعض تین درجے مقرر کر لیتے ہیں۔ اوّل درجہ کے مضمون پر الف۔ دوسرے درجہ کے مضمون پر ب۔ تیسرے درجہ کے مضمون پر ج لکھ دیتے ہیں۔ یہی نمبر یا درجے کمپوزیشن چارٹ پر درج کرنے سے ایک نظر میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ طلبا کون سے ہیں۔ جو معیار سے کم ہیں۔ اِس طریق سے استاد اُن کی طرف خاص توجہ دے سکتا ہے۔

طلبا پر اثر

کمپوزیشن چارٹ کا طلبا پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ جو لڑکے کام چور اور اپنے کام میں غافل ہیں۔ یہ چارٹ اُن کی غفلت کا آئینہ بن جاتا ہے۔ اِس لئے وہ اپنی کمزوری دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ہی جن لڑکوں کو بار بار ج گریڈ ملتا ہے۔ یا کم نمبر ملتے ہیں۔ وہ اچھا درجہ اور زیادہ نمبر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک

آزمائی ہوئی نہایت اچھی تجویز ہے۔

حکام کے نقطۂ خیال سے

۱۔ جو افسر استاد کے انشا پردازی کے کام کی پڑتال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اِس چارٹ کے ذریعے ایک نظر میں اور بہت تھوڑے وقت میں یہ معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ آیا اُستاد اپنے فرائض کی انجام دہی میں باقاعدہ رہا ہے یا بے قاعدہ۔

۲۔ اُس نے تمام سال کا کام آیا مقدار کے لحاظ سے پُورا کیا ہے یا کم؟

۳۔ اُس کی جماعت کے بچّے شروع سال میں کس حالت میں تھے اور اُستاد کی تمام سال کی محنتِ شاقہ کے بعد انہوں نے کیا ترقی کی؟

خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا چارٹ ہے۔ جس کے ذریعے حکام مدرسین کے کام کو حقیقی معنوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

(نمونہ چارٹ مدا جماعت میں آویزاں کرنے کیلئے) نقشہ انشا پردازی جماعت پنجم سکول...... ابریل ۱۹۴۸ء

نمبر شمار	عنوانات / نام طالب علم / تاریخ	پیپل	تحریر یا	درخواست رخصت	کوہ ہمالیہ کے فوائد	بابر کی موت	
		۱ ۴/۴۸	۱۵ ۴/۴۸	۳۰ ۴/۴۸	۱۵ ۵/۴۸	۳۰ ۵/۴۸	
۱	سعید اختر	ج	ب	ب	ب	و	نوٹ (۱) سال بھر کیلئے مجوزہ عنوانات اور طلبا کے نام لکھ دئے جائیں تاریخیں اور درجہ وقت پر درج کریں۔
۲	محمود ہارون	ب	ب	و	ا	و	
۳	محمد یونس	ج	ب	ب	ا	ا	
۴	سعید احمد	ج	ج	ج	ب	ب	نوٹ (۲) اِس نقشہ سے مدرس اپنے کام کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اور ہر لڑکا کا بھی۔
۵	مسعود اختر	ج	ب	ب	ب	و	
۶	حمید احمد	ب	ب	ب	ا	ب	
۷	رحیم علی	ج	ج	ب	ج	ج	

(نمونہ چارٹ ۲ ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے لئے ۔)

نقشہ انشا پردازی اردو۔ گورنمنٹ ہائی اسکول...... سنہ ۱۹۴۸ء

نمبر شمار	جماعت کا نام / عنوان تاریخ	مضمون تاریخ	عنوان تاریخ	عنوان تاریخ	عنوان تاریخ	عنوان تاریخ
۱	پنجم					
۲	ششم					
۳	ہفتم					
۴	ہشتم					
۵	نہم					
۶	دہم	لاری کا سفر ۸ ۱۰/۴۸	چاندنی رات ۱۸ ۱۰/۴۸	کھانڈ کا کارخانہ ۲۸ ۱۰/۴۸	پاکستان کی معدنیات ۷ ۱۱/۴۸	سکاؤٹنگ ۱۸ ۱۱/۴۸

نوٹ (۱) اس چارٹ سے ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے پتہ لگا سکتے ہیں۔ کہ کس جماعت اور کس مدرس کا کام کہاں تک پہنچا ہے۔ اور کون پیچھے ہے۔

نوٹ (۲) نمونہ کے لئے جماعت دہم کے سامنے اندراج کرکے دکھایا گیا ہے۔ باقی جماعتوں کے محاذ میں اسی طرح سے کیجئے۔

اصطلاحی غور و فکر

(۱)

اصطلاحات

131. Precedence.

سبقت، ترجیح، تفوق، پیش روی، تقدم، حق تقدم، حق ترجیح، حق صدر نشینی، حق امتیاز۔

یہ مختلف ترجمے مختلف مواقع استعمال کے لحاظ سے درست ہیں۔ لیکن عام حیثیت سے "تقدم" زیادہ اچھا ہے۔ مگر "ترجیح" چونکہ عام مستعمل ہے۔ اس لئے یہی قابلِ ترجیح ہے۔

132. Priority.

افضلیت، اہمیت، تقدم اہمیت، فوقیت، تقدم، ترجیح، امتیاز۔

سوائے تقدم کے باقی تمام ترجمے Priority کے صحیح مفہوم سے بہت دُور ہیں۔ تقدم قریب ہے۔ لیکن حقیقی مفہوم ادا نہیں کرتا۔ Priority کے لئے ہمارے نزدیک صحیح لفظ "اوّلیت" ہے۔

133. Subvention.

مدد، معاونت، اعانت، وظیفہ۔

Subvention اصل میں وہ امداد ہے۔ جو حکومت کی طرف سے کسی ادارے کو دی جائے۔ چنانچہ اس کے لئے مندرجہ بالا الفاظ کی جگہ " سرکاری امداد " زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

134. Forwarding letter.

چٹھی، تعارفی مراسلہ، تعارفی خط، تعارفی چٹھی،

Forwarding کے لئے " تعارفی " کا لفظ اگرچہ قریب المفہوم ضرور ہے۔ لیکن اصل مفہوم ادا نہیں کرتا۔ ہمارے نزدیک Forwarding letter کے لئے موزوں ترجمہ " تقدیم نامہ " ہے۔ اس کی عربیت گراں خاطر نہ ہو۔ تو اس کا رواج بہت موزوں اور مفید رہے گا۔

135. Communique.

برنامہ، اعلان، سرکاری اطلاع،

ان تینوں کے مقابلے میں " سرکاری اعلامیہ " زیادہ اچھا ہے۔ جو Communique کا صحیح مفہوم ادا کرتا ہے۔

136. Accountant.

محرر، حساب نویس، جمع خرچ نویس، محاسب،

اس کے لئے اگرچہ مندرجہ بالا تمام الفاظ صحیح ہیں۔ لیکن چونکہ محاسب عام طور پر مستعمل ہے۔ اس لئے یہی قابل ترجیح ہے۔

137. Stenographer.

سٹینو گرافر، محرر، کلرک، زود نویس،

محرر عام ہے لیکن سٹینوگرافر ایک خاص قسم کا محرر ہے۔ اسی طرح کلرک کا بھی اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ زود نویس اگرچہ اس کے مفہوم کے قریب ہے۔ لیکن

اس میں یہ ضروری ہیں۔ کہ املا اختصار سے قلمبند کی جائے۔ سٹینوگرافر حقیقت میں ملفوظات کو مختصر الفاظ میں قلمبند کرتا جاتا ہے۔ اس لئے اس نسبت سے اسے "مختصر نویس" کہا جائے۔ تو بہتر ہوگا۔

138. Undersigned.

اس کے لئے ایک ترجمہ " زیر دستخط " بھی پہنچا ہے۔ جو بھدا اور غلط ہے Undersigned کا صحیح مفہوم تو وہ شخص ہے۔ جس نے نیچے دستخط کئے ہوتے ہیں۔ اس کے لئے تو " دستخط نگار " ہی زیادہ موزوں ترجمہ ہے۔

139. Interview

سوال و جواب ، باریابی ، ملاقات ، باضابطہ ملاقات ، جائزہ ، امتحان ، زبانی امتحان ، بالمشافہ گفتگو ، معائنہ ،

Interview کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ کسی اسامی کے لئے اُمیدوار کو سامنے بلاکر اس کا جائزہ لیا جائے کہ کہاں تک وہ اس اسامی کے لئے موزوں ہے۔ دوسرا عام ملاقات۔ عام ملاقات کے لئے تو " ملاقات " ہی موزوں ہے۔ لیکن پہلی صورت میں " انتخابی ملاقات " زیادہ اچھا ہوگا۔

140. Demonstrator.

مدلّل ، اثبات کنندہ ، مظہر ، مثبت ، مظاہر ، معلم تجرباتی ، معلم معاون ،

Demonstrator دراصل اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو سائنسی تجربات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور عمل و تجربہ سے مسائل کی وضاحت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے لئے موزوں ترجمہ " مہتمم عملیات " ہے۔

(ب)

اصطلاحات زیر غور

141. Athletics. 142. Tournament.
143. Sports. 144. Games.
145. Surplus. 146. Duplicate.
147. Head Clerk. 148. Enquiries
149. Passport 150. Ticket.
151. Record. 152. Dealing Clerk.
153. Typist. 154. Account.
155. Pending cases. 156. Gown.
157. Initials. 158. Up-to-date
159. Notice—Board. 160. Credit.
161. Welfare. 162. Intelligent.
163. Survey. 164. Precedent.
165. Abnormal. 166. Extra-mural activities.
167. Designation. 168. Propaganda.
169. Popularity. 170. Editor.

سرکاری جریدے کے اعلانات

صیغہ رجال ——— شعبہ کالج

شمارہ	نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
[illegible]	م۔ تقی الدین انجم ایم اے	قائم مقام لیکچرار اردو گورنمنٹ کالج راولپنڈی	قائم مقام لیکچرار اردو گورنمنٹ کالج جھنگ درجہ مشاہرہ (۱۵۰-۱۰-۳۵۰) شعبہ کالج	تاریخ حاضری سے	ایک خالی اسامی کی جگہ۔
۸۹	م۔ اکرام احمد بٹ ایم۔ اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازیخان۔ درجہ مشاہرہ (۱۵۰-۱۰-۳۵۰) شعبہ کالج		۱۴۔ اکتوبر [illegible]ء سے	اپنے منصب اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دیئے گئے ہیں۔
۹۷?	عبدالسلام ایم ایس سی بی ٹی	لیکچرار کیمیا ڈی مونٹ مورنسی کالج سرگودھا	لیکچرار کیمیا گورنمنٹ کالج لائل پور بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ بشیر شریف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
	محمد مسعود حسن خان ایم ایس سی II	ایک امیدوار جنکے بحیثیت لیکچرار کیمیا گورنمنٹ کالج لائلپور تقرر کے احکام صادر ہو چکے ہیں	لیکچرار کیمیا ڈی مونٹ مورنسی کالج سرگودھا۔ درجہ مشاہرہ (۱۵۰-۱۰-۳۵۰) میں ۱۵۰ روپے ماہوار پر (قائم مقام)	”	عبدالسلام ایم ایس سی بی ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

شمارہ	نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس درجہ پر تعین ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۹۱	س۔ لائق حسین نیّر ایم ایس سی	ایک امیدوار	لیکچرار طبیعیات گورنمنٹ کالج لائل پور (قائم مقام)	(۱۵۰-۱۰-۳۵۰) شعبہ کالج (قائم مقام)	یکم مئی ۱۹۵۹ء? سے	م فضل حسین کی جگہ جو فوجی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور جن کا حق عود اب گورنمنٹ کالج جھنگ کی طرف منتقل کیا جا رہا ہے۔

شمارہ	نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۹۲۰?	م فضل حسین ایم ایس سی	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائلپور (جو فوجی خدمات سرانجام دے رہے ہیں)	لیکچرار طبیعیات گورنمنٹ کالج جھنگ (بمشاہرہ سابقہ)	یکم مئی ۱۹۵۹ء? سے	خاور حسین ایم ایس سی کی جگہ جو [illegible]

نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں سے ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
م محمد اعظم قاضی ایم اے	لیکچرار تاریخ گورنمنٹ کالج منٹگمری	لیکچرار تاریخ گورنمنٹ کالج چکوال (بمشاہرہ سابقہ)	یکم [illegible] سے	ایک خالی اسامی کی جگہ۔
م۔م۔ یسٰ شریف ایم ایس سی	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائلپور	لیکچرار کیمیا گورنمنٹ کالج چکوال (بمشاہرہ سابقہ)	”	” ” ”
م منظور الٰہی ربانی ایم اے (تاریخ)	لیکچرار سیاسیات گورنمنٹ کالج منٹگمری	لیکچرار تاریخ گورنمنٹ کالج منٹگمری (بمشاہرہ سابقہ)	تاریخ دست بکاری	م۔ محمد اعظم قاضی ایم اے کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
م۔ شمس الدین ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائلپور۔ معہ مشاہرہ (۱۵۰-۱۰-۲۵۰)		۱۰ اکتوبر [illegible] سے	اپنے منصب اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔

صیغہ رجال ــــ شعبہ اسکول

نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں سے ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
م مستنصر باللہ ایم اے بی ٹی (نمبر ۸ (۲۳۰-۳۰۰))	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری (بمشاہرہ سابقہ)	تاریخ حاضری سے	مفتی عبد الحمید بی اے پی ای ایس کی جگہ جن کا بحیثیت نائب ناظر مدارس قسمت ملتان تبادلہ ہو چکا ہے
محمد رمضان عطائی ایم اے (نمبر ۴: ۲۳۰-۳۰۰)	معلم دوم گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان (بمشاہرہ سابقہ)	”	مستنصر باللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
م غلام دستگیر بی اے بی ٹی (نمبر ۱۵: ۲۳۰-۳۰۰)	معلم دوم گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کہوڑ پکا (بمشاہرہ سابقہ)	”	م۔ طالع مند کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں کی طرف ہو چکا ہے۔
م احمد خان بی اے بی ٹی نمبر ۲: ۱۵۰-۲۲۰ جو اب ۲۳۰-۳۰۰ میں ہیں	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کوٹ ادو (بمشاہرہ سابقہ)	”	م۔ عبد الستار خان بی اے کی جگہ جو بحیثیت زائد ناظر مدارس ضلع [illegible] تبدیل ہو چکے ہیں
م۔ نیاز الدین بی ایس سی بی ٹی نمبر ۳۴ (۲۳۰-۳۰۰)	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور (بمشاہرہ سابقہ)	”	م۔ محمد جان بی اے بی ٹی ای ایس کی جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں
س۔ نیاز احمد ترمذی بی اے بی ٹی ۲۳۰-۳۰۰	معلم دوم گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی (جن کی خدمات انجمن اسلامیہ راولپنڈی نے مستعار لی ہیں)	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی بمشاہرہ سابقہ۔ (تا حال خدمات مستعار برائے انجمن اسلامیہ راولپنڈی)	جس تاریخ سے نیاز الدین صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی سے فارغ ہوئے	م۔ نیاز الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
محمد عظیم خان (نمبر ۱۷: ۱۵۰-۲۲۰)	معاون ناظر مدارس ضلع میانوالی	قائم مقام صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی (بمشاہرہ سابقہ)	تاریخ حاضری سے	نیاز احمد ترمذی کی جگہ جن کی خدمات انجمن اسلامیہ راولپنڈی کو مستعار [illegible]
م محمد یوسف [illegible] (نمبر ۶: ۲۳۰-۳۰۰)	معاون ناظر مدارس ضلع جہلم۔	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو (بمشاہرہ سابقہ)	”	شیخ عبد الرشید بی اے کی جگہ جو ناظر مدارس ضلع منٹگمری مقرر ہوئے ہیں
م عبد المجید [illegible] بی اے بی ٹی (نمبر ۱۱: ۱۵۰-۲۲۰) [illegible] ۲۳۰-۳۰۰	معاون ناظر مدارس ضلع منٹگمری	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ (گجرات) بمشاہرہ سابقہ	”	[illegible]

نمبر و تاریخ احکام	نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
[illegible] ۹۵۰۱	م۔ تاج الدین غوری بی اے ایس اے وی۔ (نمبر ۶۵: ۲۳۰-۲۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازیخان (بمشاہرہ سابقہ)	تاریخ حاضری سے	م۔ عبدالحمید خالد ایم اے بی ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
〃	م۔ عبدالحمید خالد ایم اے بی ٹی (نمبر ۲۴: ۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازیخان	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور (بمشاہرہ سابقہ)	〃	م۔ تاج الدین غوری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
[illegible] ۱۰۰۰۶	س۔ فدا حسین شاہ بی اے ایس اے وی (نمبر ۱۱۹: ۱۵۰-۲۲۰)	معاون ناظر مدارس ضلع راولپنڈی	معاون ناظر مدارس ضلع جہلم (بمشاہرہ سابقہ)	〃	م۔ محمد یوسف علی خان بی اے بی ٹی کی جگہ جو صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو مقرر ہوتے ہیں۔
〃	شیخ عبدالرشید بی اے بی ٹی (نمبر ۹: ۹۰-۱۵۰ حال ۲۳۰-۳۰۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مری	معاون ناظر مدارس ضلع راولپنڈی (بمشاہرہ سابقہ)	〃	س۔ فدا حسین شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
[illegible] ۱۰۱۸۸	چودھری عبدالعزیز بی اے بی ٹی۔ (۹۰-۱۵۰)	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ۔ (لائلپور) بمشاہرہ سابقہ	〃	م۔ محمد عالم بی اے (۲۳۰-۳۰۰) کی جگہ جو گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ کے صدر معلم مقرر ہوئے ہیں۔
〃	چودھری محمد ابراہیم بی اے ایس اے وی (نمبر ۱۹۱: ۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم بمشاہرہ سابقہ	〃	چودھری عبدالعزیز کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
[illegible] ۱۰۱۹	م۔ غلام رسول ایچ اے اوٹی	معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول متھا ٹوانہ درجہ مشاہرہ سوم (۵۰-۳-۸۰-۴/۳-۱۰۰)		۲ جنوری ۱۹۴۸ء سے	اپنے منصب و درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
[illegible] ۱۰۱۹	م۔ مظفر الدین بی ایس سی بی ٹی (نمبر ۲: ۲۳۰-۳۰۰)	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیپ	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ (گجرات) بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	مفتی محمد زمان بی اے بی ٹی کی جگہ جو ڈپٹی ناظر مدارس ضلع سیالکوٹ مقرر ہوئے ہیں۔
[illegible] ۱۱۲۹	م۔ جعفر علی بی اے بی ٹی (نمبر ۱۹: ۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ (اٹک)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال (بمشاہرہ سابقہ)	〃	عبدالرشید خاں معلم انگریزی کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور کو ہو چکا ہے۔
[illegible] ۱۱۲۹	م۔ شاہ احمد خاں بی اے بی ٹی (نمبر ۲۶: ۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول جڑانوالہ (بمشاہرہ سابقہ)	〃	م۔ محمود حسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
[illegible]	م۔ محمود حسن بی اے ایس اے وی (نمبر ۱۹۷: ۱۵۰-۲۲۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول جڑانوالہ (رخصتی)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ بمشاہرہ سابقہ (رخصتی)	جس تاریخ سے شاہ احمد خاں چارج لیں	شاہ احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
[illegible] ۱۱۲[illegible]	م۔ اکرام الحق بی اے بی ٹی (۹۰-۱۵۰)	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈ دادن خان (جہلم)	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول جڑانوالہ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	چودھری دوست محمد ایم اے بی ٹی کی جگہ جو فوت ہو چکے ہیں۔
[illegible] ۱۱۲[illegible]	م۔ نظام بخش بی اے ایس اے وی (نمبر ۲۷: ۲۳۰-۳۰۰)	معاون ناظر مدارس ضلع ملتان (رخصتی)	معلم دوم گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازیخان (بمشاہرہ سابقہ) (رخصتی)	جس تاریخ سے [illegible] کا چارج لیں	محمد رمضان عطائی ایم اے کی جگہ جو ڈیرہ غازیخان کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے ہیں۔

نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
م۔ منظور احمد ہاشمی بی اے بی ٹی نمبر ۳۵: ۲۳۰۔۳۰۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول چنیاں۔	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان (بمشاہرہ سابقہ)	تاریخ حاضری سے	م۔ عبدالخالق خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
م۔ عبدالخالق خاں ایم اے بی ٹی (نمبر ۹۴: ۱۵۰۔۲۲۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان	معاون ناظر مدارس ضلع ڈیرہ غازیخاں۔ (بمشاہرہ سابقہ)	//	م۔ منظور احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا
م۔ منظور احمد بی اے بی ٹی (۹۰۔۱۵۰)	معاون ناظر مدارس ضلع ڈیرہ غازیخان	معاون ناظر مدارس ضلع ملتان۔ بمشاہرہ سابقہ	//	م۔ عبدالعلیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
م۔ عبدالعلیم بی اے بی ٹی نمبر ۳۳: ۲۳۰۔۳۰۰	معاون ناظر مدارس ضلع ملتان	معلم دوم گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر (میانوالی)	//	م۔ محمد ابراہیم بی اے بی ٹی معلم انگریزی کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم ہو چکا ہے۔
م۔ محمد اکرم بی اے ایس اے وی نمبر ۱۰۵: ۹۰۔۱۵۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال۔	معاون ناظر مدارس ضلع میانوالی (بمشاہرہ سابقہ)	//	م۔ محمد عظیم خاں بی اے ایس اے وی (نمبر ۱: ۱۵۰۔۲۲۰) کی جگہ جو صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی مقرر ہوئے ہیں
عبدالحمید خاں نیازی بی اے بی ٹی نمبر ۱۲: ۹۰۔۱۵۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی حال قائم مقام معاون ناظر مدارس ضلع جہلم	معاون ناظر مدارس ضلع جہلم بمشاہرہ سابقہ۔	۵ جنوری ۱۹۴۹ء سے	م۔ محمد بشیر بی اے ایس اے وی نمبر ۷۵: ۱۵۰۔۲۲۰ معاون ناظر مدارس ضلع جن کا تبادلہ لاہور ہو چکا ہے۔
م۔ غلام حسن طور بی اے ایس اے وی۔ ۹۰۔۱۵۰	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ	قائم مقام معلم سائنس گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	س۔ شمشاد علی (نمبر ۸۵: ۱۵۰۔۲۲۰) کی جو ۸ مارچ ۱۹۴۹ء سے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔
چودھری محمد صدیق بی اے بی ٹی نمبر ۷۴: ۱۵۰۔۲۲۰	معلم انگریزی سنٹرل موڈل اسکول لاہور	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مری۔ بمشاہرہ سابقہ	//	م۔ گلزار محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
م۔ گلزار محمد بی اے بی ٹی نمبر ۱۸۳: ۹۰۔۱۵۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مری۔	معلم انگریزی سنٹرل موڈل اسکول لاہور بمشاہرہ سابقہ	//	چودھری محمد صدیق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
م۔ عبدالرحمٰن ایم ایس سی نمبر ۱۲۲: ۹۰۔۱۵۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول حسن ابدال	//	//	م۔ محمد رمضان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
م۔ محمد عثمان بی اے بی ٹی نمبر ۳۶: ۱۵۰۔۲۲۰	معلم انگریزی سنٹرل موڈل اسکول۔ لاہور۔	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور بمشاہرہ سابقہ	//	م۔ عبدالمجید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
چودھری عبدالمجید ایم اے ایس اے وی ۲۳۰۔۳۰۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ بمشاہرہ سابقہ۔	//	م۔ غلام جیلانی ایم اے بی ٹی نمبر [illegible] ۹۰۔۱۵۰ جو معاون ناظر مدارس ضلع گجرات مقرر ہوئے ہیں
ش۔ عباس علی [illegible] اے بی ٹی نمبر [illegible] ۲۳۰۔۳۰۰	معاون ناظر مدارس ضلع راولپنڈی	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب بمشاہرہ سابقہ	//	م۔ مظفر الدین بی ایس سی کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول [illegible] صدر معلم مقرر ہوئے ہیں

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۹ جون ۱۹۴۹ء E-۱۲۸۹۵	م فلک شیر خان بی اے بی ٹی (۲۳۰-۱۵۰)	معاون ناظر مدارس ضلع لائل پور	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ۔ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	چودھری حاکم علی بی اے۔ بی ٹی۔ (نمبر ۲۰: ۲۳۰-۳۰۰) کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری کے صدر معلم مقرر ہوئے ہیں۔
۱۸ جون ۱۹۴۹ء E-۱۵۰۴۳	م سعادتمند بی اے بی ٹی امیدوار (نمبر ۲۶۴: ۵۰-۱۰۰)	معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم	قائم مقام معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع جھنگ۔ درجہ مشاہرہ (۹۰-۵-۱۵۰)	[illegible]	م۔ اللہ دتا نمبر ۱۵۵: ۱۵۰-۲۲۰ کی جگہ جو ۲ جون ۱۹۴۹ء سے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔
〃	م عبد الحمید پی ٹی	ایک امیدوار (جو پہلے قائم مقام معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم تھے)	قائم مقام معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم (درجہ مشاہرہ سوم ۵۰-۴-۸۰ / ۴-۱۰۰) شعبہ کلاسیکل و رنیکلر	〃	م۔ سعادت مند کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۲۳ جون ۱۹۴۹ء E-۱۵۵۸۱	س۔ شوکت حسین بی اے (نمبر ۱۴۸: ۱۵۰-۲۲۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ (رخصتی)	زائد معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ بمشاہرہ سابقہ (رخصتی)	۱۵ جون ۱۹۴۹ء سے	گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ کی ایک زائد خالی اسامی کی جگہ جو اب گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ کی طرف منتقل کی جا رہی ہے۔
〃	م۔ محمد شفیع میر ایس اے بی ٹی (۹۰-۱۵۰)	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کھوڑہ	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ (بمشاہرہ سابقہ)	تاریخ حاضری سے	س۔ شوکت حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
〃	م۔ برکت علی اوان ایم اے بی ٹی	ایک امیدوار	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کھوڑہ بمشاہرہ ۱۰۰ روپے ماہوار (۹۰-۵-۱۵۰)	〃	م۔ محمد شفیع میر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۲۵ جون ۱۹۴۹ء E-۱۵۷۹۵	خ۔ محمد عبد اللہ بی اے (۲۳۰-۳۰۰)	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول لیہ	صدر معلم جدید گورنمنٹ نارمل اسکول ڈسکہ ضلع سیالکوٹ بمشاہرہ سابقہ۔	۲۷ جون ۱۹۴۹ء سے	نارمل اسکول کی نئی اسامی کی جگہ۔
〃	م غفور اللہ لودھی بی اے بی ٹی (۱۵۰-۲۲۰)	معاون ناظر مدارس ضلع منٹگمری	صدر معلم جدید گورنمنٹ نارمل اسکول میانوالی بمشاہرہ سابقہ	〃	〃
۲ جون ۱۹۴۹ء E-۱۵۰۲۵	م غلام محمد (۵۰-۱۰۰)	معلم نقشہ کشی گورنمنٹ ہائی اسکول تونسہ	معلم نقشہ کشی گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازیخان۔ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م محمد حسن کی جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔
۲ جون ۱۹۴۹ء E-۱۵۰۴۳	م عبد الغنی (۵۰-۱۰۰)	معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کہروڑ پکا۔	معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ۔ بمشاہرہ سابقہ	〃	م۔ غلام قادر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا۔
〃	م۔ غلام قادر ایچ اے او ٹی ۱۰۵ تنخواہ	معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ	معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کہروڑ پکا۔ بمشاہرہ سابقہ	〃	م۔ عبد الغنی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا۔

شعبہ نسواں

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۴ جون ۱۹۴۹ء E-۲۵۴۴	آنسہ ق۔ قریشی بی اے بی ٹی نمبر ۱۰۵: ۱۵۰-۲۲۰	معاون معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول گجرات	معاون معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول منڈی بہاؤالدین بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	آنسہ ز۔ علی احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
〃	آنسہ ز۔ علی احمد اے بی ٹی ۹۰-۱۵۰	معاون معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول منڈی بہاؤالدین	معاون معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول گجرات بمشاہرہ سابقہ	〃	آنسہ ق۔ قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ

مارکس کے فلسفہ حیات اور نظریہ اقتصاد پر بصیرت افروز بحث
مارکس کے فلسفہ مادیت جیسے ادق مضمون کا آسان مرقع
بین الاقوامی سوشلزم کے ارتقاء اور اُس کے پس منظر پر حقیقت افروز تبصرہ
مختلف اقتصادی مسائل کی آسان اور عام فہم مثالوں سے وضاحت

———— زبان کے لحاظ سے ————

ایک معیاری کتاب جس میں مختلف اصطلاحات کیلئے آسان اور صحیح اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں۔
عام سیاسی مسائل کے علاوہ کارل مارکس کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے
ساڑھے چھ صد ۶۵۰ صفحات کی مجلد تاریخی روداد قیمت ۶ روپے

ایک عورت کے دِل کی داستان!

وہ عورت جو عشق کی آگ میں جلتی رہی لیکن جس کی زبان پر محبت کا لفظ کبھی نہیں آیا۔

ایک مرد کے دِل کی داستان!

وہ مرد جو عشق کی چنگاریوں سے تڑپتا رہا لیکن اظہارِ محبت کبھی نہ کرسکا

وہ عورت جو خود دار تھی ———— وہ مرد جو وفادار تھا
لیکن صلہ کی تمنا اور ستائش کی پرواہ سے بے نیاز

یہ ناول رئیس احمد جعفری کا تازہ شاہکار ہے،
جو اپنی افسانوی، معنوی اور ادبی خوبیوں کی وجہ سے
اُردو لٹریچر میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ضخامت ۶۰۸ صفحات سے زیادہ

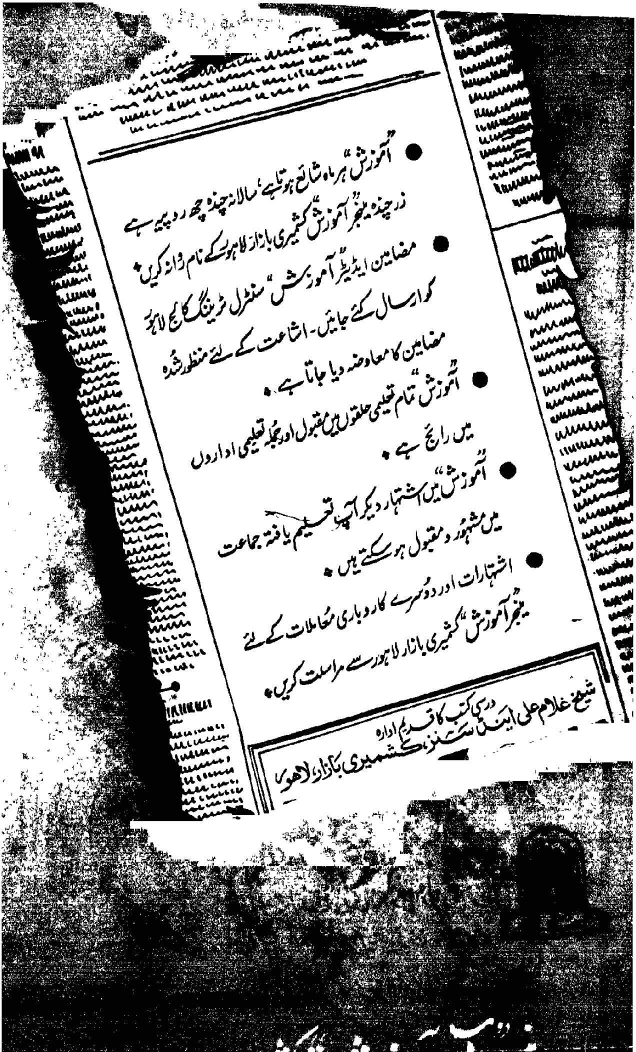
قیمت مجلد

کاغذ پہ لکھا رہا یہ نام کا لکھا!

(ناول)

(فہرست کتب مفت طلب فرمائیے)

[illegible]



• "آموزش" ہر ماہ شائع ہوتا ہے، سالانہ چندہ چھ روپیہ ہے
زرِ چندہ مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور کے نام روانہ کریں۔

• مضامین ایڈیٹر "آموزش" سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور
کو ارسال کئے جائیں۔ اشاعت کے لئے منظور شدہ
مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

• "آموزش" تمام تعلیمی حلقوں میں مقبول اور جملہ تعلیمی اداروں
میں رائج ہے۔

• "آموزش" میں اشتہار دیکر آپ تعلیم یافتہ جماعت
میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں۔

• اشتہارات اور دوسرے کاروباری معاملات کے لئے
مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور سے مراسلت کریں۔

درسی کتب کا قدیم ادارہ
شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

آموزش

اگست ۱۹۴۹ء

دُنیا کا معرکہ آرا تاریخی شاہکار

تاریخ عالم کی خونچکاں داستانیں اردو ادب میں بلحاظ موضوع اور تحقیق و تفتیش بے مثال تصنیف!!

تاریخِ انقلاباتِ عالم

دو جلدوں میں

از سید ابو سعید بزمی ایم اے

اردو ہی نہیں دنیا کی تمام زبانوں میں یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے پہلی کتاب ہے جو تاریخ انقلاباتِ عالم کے نام سے شائع کی گئی ہے ابتدائے آفرینش سے عہدِ حاضر تک کے تمام سیاسی، تمدّنی، مذہبی اور سماجی انقلابات کی جامع اور ہمہ گیر تاریخ ایسے محققانہ انداز سے لکھی گئی ہے جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ فاضل مصنف نے دس سال کی طویل محنت اور عرق ریزی سے کام لے کر ثابت کر دیا ہے کہ یہ تاریخ سیاست اور معیشت پر ایک "مستقل" انسائیکلو پیڈیا ہے جس کا مطالعہ ہر اہلِ علم کے لئے ناگزیر ہے خصوصاً اخبار نویسوں، طالبعلموں اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد معلومات افزا کتاب ہے۔ اور طرفہ یہ کہ مصنف کا نقطۂ نظر پارٹی پالیٹکس سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا اور اس درجہ غیر جانبدارانہ ہے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو گی۔

سائز ۱۸×۲۲ کاغذ دبیز۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب

قیمت۔ جلد اوّل دس (۱۰) روپے جلد دوم دس (۱۰) روپے

کتاب منزل لاہور

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

مدیر

محمد ناظر

ناشر

کتاب منزل

لاہور

اگست ۱۹۴۹ء
جلد :— ۲
شمارہ :— ۵

سالانہ چندہ :-
پاکستان کیلئے: ۶ روپے
غیر ممالک کیلئے: [illegible]

قیمت فی جلد دس آنے

اطلاعات

۱۔ اِس صفحہ کے سامنے آپ سے متعلق کوئی اطلاع تو نہیں ؟
شائد آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہو !

۲۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ اس سے آپ کو جواب جلد مِل سکے گا۔ بصورت دیگر تاخیر کے لئے دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔

۳۔ "آموزش" ہر ماہ باقاعدہ شائع ہوتا ہے۔ اور پہلے ہفتہ میں سپرد ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک پرچہ نہ ملے۔ تو اپنے ڈاک خانہ کو مطلع فرمائیں۔ اور دفتر "آموزش" کو بھی آگاہ کریں۔

۴۔ "آموزش" کے انتظامات یا دلچسپی میں کوئی کمی محسوس ہو۔ تو مطلع فرمائیں۔ اگر کوئی نئی تجویز آپ کے ذہن میں آئے۔ تو ہمیں آگاہ کریں۔ شائد کوئی عملی صورت پیدا ہو جائے۔

مینیجر "آموزش"
کشمیری بازار۔ لاہور

رموز

قوموں کے قیام و بہبود کے لئے جہاں تعلیم اہم ہے۔ وہاں "صحت" بھی اہمیت میں کم نہیں۔ جنگ و جدال سے تلخ کام دنیا دورِ جدید کی تعمیر میں تعلیمی ارتقا و اصلاح کے لئے بھی کوشاں ہے اور "قیامِ صحت" کی تدابیر بھی اختیار کر رہی ہے۔ بلکہ قومی زندگی کے پیشِ نظر "صحت کا مسئلہ" پہلے سے زیادہ توجہ حاصل کر رہا ہے۔ اس توجہ کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (عالمی تنظیم صحت) وجود میں آئی۔ اس تنظیم کا اہم مقصد حکومت کو اور عام ایسے اداروں کو جو "صحت عامہ" کے سلسلے میں مفید خدمات سرانجام دے رہے ہیں مختلف ممکن طریقوں سے امداد پہنچانا ہے۔ یوں تو صحت سے متعلق تمام امور کا اہتمام اس تنظیم کے لائحہ عمل میں ہے۔ لیکن اراکین تنظیم نے بہبودیٔ اطفال، تغذیہ اطفال، ملیریا، دق اور اسی قسم کی دوسری خطرناک متعدی بیماریوں کا انسداد اپنے اہم مقاصد میں رکھا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں اس تنظیم نے اپنے اجلاس منعقدہ جنیوا میں ۱۹۵۰ء کے لئے ۱۸۰۰۰۰۰ (اٹھارہ لاکھ) ڈالر کا بجٹ اس غرض سے منظور کیا ہے۔ کہ اس قسم کی مہلک بیماریوں کا انسداد کیا جائے۔

قیام صحت کے مقصد کے پیشِ نظر اس قسم کی تنظیمیں بظاہر بہت مفید ہیں لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ جب تک ان مہلک و متعدی بیماریوں کے انسداد اور امور صحت کے قیام کی ابتدائی مدارج میں تدارک نہ کیا جائے صحیح مقصد کا حصول ناممکن ہے۔ ان ابتدائی مدارج سے ہماری مراد وہ مدارس ہیں۔ جو حد اعتدال سے زیادہ بھرپور ہیں۔ اور جو پانی کے ناقص انتظام، نشستوں کی تنگی، مناسب تغذیہ کی عدم موجودگی اور طبی امداد کے فقدان کے باعث مختلف قسم کی متعدی بیماریوں کی تربیت گاہ بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے لئے مدارس سے متعلق قیام صحت کے اہتمامات کا مسئلہ تقسیم ہند کے بعد بہت اہم ہوگیا ہے۔ اپنے صوبے میں مدارس کی حالت یہاں تک پہنچی ہے۔ کہ جگہ کی قلت کے باعث چھوٹے چھوٹے کمروں میں گرمی کے موسم میں ستر ستر اسّی اسّی طلبہ بھرے ہوئے ہیں۔ اور کوئی ایسا انتظام نہیں۔ کہ جس سے میعادی بخار اور ہیضہ جیسے متعدی امراض کے پھیلاؤ کو روکا جاسکے۔ کبھی کبھار ٹیکوں کا انتظام کرلیا جاتا ہے لیکن ایسی بیماریوں کی روک تھام کے لئے باقاعدہ منظم مہم کی کوئی صورت نہیں۔ وقت کا تقاضا ہے۔ کہ مدارس کے لئے باقاعدہ تنظیم صحت یا صحتی ادارہ ہو۔ جس سے تعلیمی کام میں مصروف رہنے والے اساتذہ اور طلبہ فائدہ اُٹھائیں۔ یہی تنظیم، ادارہ طبی امداد، ٹیکوں، دوپہر کے کھانوں اور پانی وغیرہ کے مناسب انتظام کا ذمہ دار ہونا چاہیئے۔ صرف یہی ایک صورت ہے۔ جس سے مدارس میں بیماریوں کا پھیلاؤ روکا جاسکتا ہے۔ پاکستان کو صحت ور، طاقتور اور ہنس مکھ قوم مطلوب ہے۔ اور قوم بچوں کی ترقی یافتہ اجتماعی صورت ہے۔ قوم کی صحت کے لئے صحتور بچے اور ان کی صحت کے اصولوں کے مطابق نشوونما ضروری ہے۔ اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے۔ جب کہ مدارس میں قیام صحت اور انسداد امراض کا اہتمام باقاعدہ طریق سے ہو۔ صحت کا منظم اہتمام ہوگا تو ملت پاکستان کے بچے صحت ور شہری بنیں گے۔

یہ ہمارے مدارس رہی ہیں۔ جہاں سے منتظمین شہر، مشیر حکومت، تجارتی کمشنر اور فوج

سپاہی وغیرہ تیار کرتے ہیں جن پر قومی حیات کا دارومدار ہے۔ اگر ان مدارس میں بچوں کی صحت کے لئے مناسب اور صحیح اقدام و انتظام نہ کیا گیا۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا خطرناک اثر ساری قوم پر ہوگا۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ ہم اہتمام صحت کو باقی تمام چیزوں پر فوقیت دیں۔

طبیّ عملے کی کمی ہمارے صوبے کے لئے ازبس ہمت ربا ہے لیکن اس قلت کے دوران میں تین تین چار چار مدارس مل کر ایک ڈاکٹر کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ جو روزانہ ہر اسکول میں ایک ایک گھنٹہ کام کرے۔ اِس طرح بچوں کی صحت کی روزانہ نگرانی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ داخلے کے وقت بچوں کی صحت جسمانی کا امتحان ہو۔ اس کا وزن دیکھا جائے۔ اس کی نظر کو اچھی طرح جانچا جائے۔ کسی قسم کا مرض ہو۔ تو اس کا ازالہ کیا جائے۔ اور دوران تعلیم میں کمزور صحت والے بچوں کی نگرانی کی جائے۔ ان کی توانائی و تندرستی کے لئے مناسب تدابیر استعمال کی جائیں۔ جب تک کوئی بچہّ اسکول میں رہے۔ اسکی صحتی ترقی کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جائے۔ اور جب کسی تعلیمی امتحان کی رپورٹ اُس کے والدین کو بھیجی جائے۔ تو اُس کے ساتھ ہی صحت کی رپورٹ بھی منسلک ہو۔ جس میں اس بچّے کی صحتی خامیاں وضاحت کے ساتھ مذکور ہوں۔ اور اگر ممکن ہو۔ تو اس کی صحتی خامیوں کے تدارک کے لئے اس کے والدین کو ہدایات دی جائیں یا اسکول کے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے مناسب عمل پر آمادہ کیا جائے۔ مدرسوں میں صحت کے باقاعدہ مقابلے بھی ہونے چاہئیں۔ اور بہترین صحت والے طلبہ کو انعامات دئے جائیں۔ اس طرح بچے صحت اور جسمانی نشوونما میں دلچسپی لینے لگیں گے۔

ہمارے صوبے میں مدارس کا اہتمام تین قسم کی جماعتیں کرتی ہیں۔ حکومت، مقامی ادارے اور غیر سرکاری پرائیویٹ انجمنیں۔ جن مدارس کا اہتمام حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی عمارتیں موزوں، اساتذہ قابل، درسیات اور سامان [illegible]

ہر طرح سے مناسب اور کسی حد تک مکمل ہیں۔ ان کا معیار بھی بلند ہے۔ اور عوام کا ان کے نظم ونسق میں کسی قسم کا دخل نہیں۔ ان کی فضا خوشگوار رہے۔ اور ان کے اساتذہ بھی کافی دلچسپی سے کام کرتے ہیں۔ وہاں ترقیوں کے لئے کافی مواقع میسر آتے ہیں۔ اس لئے کام شوق سے کیا جاتا ہے۔ کوتاہی اور سستی کی سزائیں ملتی ہیں۔ اس لئے بد دلی سے وہاں کام کرنے والے اپنے آپ کو خطرے سے محفوظ نہیں سمجھ سکتے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ مدارس عوام کے فائدے کے لئے قائم کئے جاتے اور چلائے جاتے ہیں۔ کسی قسم کا مالی مفاد یا نفع کمانا مقصود نہیں ہوتا۔ ان کا عملہ اکثر وبیشتر مطمئن سا ہی ہوتا ہے۔

مقامی اداروں مثلاً میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے زیر اہتمام جو مدارس چلتے ہیں۔ وہ سرکاری مدارس کے معیار کے نہیں ہوتے۔ ہر ضلع میں ان کی تعداد محدود سی ہوتی ہے۔ ان مدارس کے اساتذہ کا تبادلہ یا تقرر اکثر سرکاری ناظرین مدارس کے صلاح مشورے سے طے پاتا ہے۔ ان کے اساتذہ اکثر شکایت کرتے ہیں۔ کہ ان کے روزمرّہ کام میں بہت کچھ دخل دیا جاتا ہے۔ اور تبادلہ، ترقی اور سزا میں عموماً اثر و رسوخ کام آتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اساتذہ کی حوصلہ افزائی کم ہوتی ہے۔ اور مدارس میں کام کی استعداد و کاملیت کو بہت حد تک ٹھیس لگتی ہے۔ مدرسوں کی عمارتیں بھی تو کوئی خصوصی امتیاز نہیں رکھتیں۔ سامانِ تدریس بھی اکثر ضرورت کے مطابق نہیں ہوتا لیکن طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ انجام کار مدارس کو نقصان پہنچتا ہے۔ ان مدارس کے اساتذہ کو ایک اور شکایت بھی رہتی ہے۔ اور وہ یہ کہ انہیں تنخواہیں باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ نہیں ملتیں۔ مقامی ادارے زیادہ تر ابتدائی تعلیم کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اور ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں پاکستان کا

بہترین شہر بھی مثالی انتظامات کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ پرائمری اسکولوں کی عمارتیں اکثر دو منزلہ سہ منزلہ مکان ہوتے ہیں۔ اور اکثر حالات میں نہ ان میں صحن ہوتا ہے، نہ کوئی کھیلنے کی جگہ۔ سامان بہت حد تک ناکافی اور بچوں کی نشستوں کا انتظام اکثر حالات میں نہایت قبیح۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اکثر والدین اپنے بچوں کو بجائے ان اسکولوں کے جہاں تعلیم مفت ملتی ہے۔ ایسے مدارس میں داخل کرنا پسند کرتے ہیں۔ جہاں انہیں کافی اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے۔ کہ حکومت نے ان عیوب کا احساس کیا ہے۔ اور اب اہتمامات ہو رہے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کا سارا انتظام اور مقامی اداروں کے بعض ہائی اسکول (ثانوی مدارس) حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس اقدام سے یقیناً صوبائی تعلیم کا معیار بھی بلند ہوگا۔ اور کاملیت بھی بڑھے گی۔

پرائیویٹ انجمنوں کے اہتمام میں جو مدارس ہیں۔ انہوں نے مغربی تعلیم کے ابتدائی زمانے میں بہت مفید کام سرانجام دئے۔ انہوں نے عوام کی توجہ مغربی تعلیم کی طرف مبذول کرائی۔ اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کہ مغربی تعلیم سارے صوبے میں پھیلی لیکن ان کا تعلق کسی خاص فرقے یا مذہب سے رہا ہے۔ جس سے فرقہ پرستی کو بھی کافی نشو و نما ملتی ہے۔ ایسے اسکولوں میں اساتذہ کی تنخواہیں کم ہیں۔ اور ترقی کے مواقع بہت محدود ہیں۔ اور وہ کام میں بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔ ان اداروں کے فنڈ بھی اکثر اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ حریصانہ طور پر زیادہ سے زیادہ ممکن تعداد میں طلبہ داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ فنڈ کی کمی فیسوں سے پوری ہو۔ عمارتیں ناکافی اور طلبہ بے شمار، سامانِ تدریس کم، تعلیم کا معیار ایسے حالات میں

س طرح تسلی بخش ہو سکتا ہے۔ ان میں سے بعض مدارس تو صرف زیادہ سے زیادہ تعداد میں کتابیں بیچنے کے لئے چلائے جاتے ہیں۔ اور وہاں دوسرے مقاصد پس پشت ڈال دئے جاتے ہیں۔ باوجود ان باتوں کے یہ مدارس ابھی تک تعلیم کے سلسلے میں بہت اچھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

تقسیم پنجاب پر مشرق میں بہت سے مدارس اکھڑ گئے۔ لیکن خوش قسمتی سے مغربی پنجاب کے محکمہ تعلیم کے قابلِ فخر صاحب اقتدار نے ان کو مغربی پنجاب میں بسانے کا ہر ممکن اہتمام کر دیا۔ ایسا کرنا ان حالات میں سخت ناممکن تھا لیکن ناظر تعلیمات کی قابلیت اور دور اندیشی نے ناممکن کو ممکن بنا کر رکھ دیا۔ تمام اساتذہ کو ملازمتیں دلانے میں بھی انہوں نے بہت حد تک امداد کی۔

اب مختلف فرقوں اور قوموں کا سوال تو جاتا رہا ہے۔ اب ہمیں پاکستان کی عظمت و برتری کی خاطر کام کرنا ہے۔ اس کے لئے بہترین اقدام یہی ہو سکتا ہے کہ حکومت تمام مدارس کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس طرح لوگوں میں اسکولوں کے حق میں اعتماد بھی پیدا ہوگا۔ اور یکساں معیار کی استعداد و کاملیت بھی پیدا ہوگی نیز تمام قسم کی بدعنوانیاں، بے اعتدالیاں اور دخل در معقولات کے قضیے بھی دُور ہو جائیں گے۔ عمارتوں، قابل استادوں اور سامانِ تدریس کا اہتمام حکومت سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ تمام مدارس کا اہتمام ہاتھ میں لینے کے بعد حکومت تعلیم بالغان، مدرسی نظام صحت وغیرہ کی اسکیموں کو بھی خوب چلا سکے گی۔ حکومت اس طرز عمل سے پاکستان کے لئے بہترین اسکولوں کے ذریعے بہترین شہری پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

توجّہ

(نفسیاتی نقطۂ نظر سے.....)

شمس بریلوی

یوں تو ہر فعل اور ہر عمل میں توجہ کو ایک اساسی حیثیت حاصل ہے مگر سب سے زیادہ ضرورت اس کی تعلیم میں ہے۔ ایک معلّم اس وقت تک اپنے سبق میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ شاگردوں کی توجہ اپنی طرف پورے طور پر مبذول نہ کرا سکے۔

اکثر تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ مدرسین کو یہ شکایت کرتے سنا ہے۔ کہ مدرسے میں بچے ان کے اسباق پر توجہ نہیں کرتے۔ اور اثنائے سبق میں وہ شرارت یا باہم چپکے چپکے باتیں یا اور قسم کی دیگر حرکات میں مشغول رہتے ہیں۔ استاد کی یہ سب سے بڑی ناکامی ہے کہ وہ طلبا کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے! اس ناکامی کے بعد وہ اس لائق نہیں رہتا کہ اس اہم خدمت یعنی کار تدریس کو انجام دے۔ استاد سے زیادہ نقصان طلباء کو اپنی اس نادانی اور استاد کی خامی سے پہنچتا ہے۔ وہ اسباق پر عبور تو درکنار تھوڑی سی بصیرت بھی اپنے آموختہ کے متعلق حاصل نہیں کر سکتے۔ امتحان کے زمانہ کی وقتی تیاری اس کا نقصان ادا نہیں کر سکتی۔

تربیت یافتہ مدرسین کی ناکامی کے وجوہ غیر تربیت یافتہ سے کچھ الگ سہی پھر بھی یہ کہنا ہی پڑے گا۔ کہ تربیت یافتہ مدرسین اپنی تربیت کے دوران میں یا تو خود اپنی توجہ اسباق تربیت پر مبذول نہ کرسکے۔ اور ان سے بہرہ ور نہ ہوئے یا ان کو کار تدریس سے دلچسپی نہیں اور ان کی عدم دلچسپی ان کو بچوں کا نفسیاتی جائزہ نہیں لینے دیتی۔ کہ وہ اس کے مطابق اپنے اسباق تیار کریں۔ بہرحال جو صورت بھی ہو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ تعلیم و تدریس میں توجہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ توجہ کے تمام نفسیاتی پہلو کا مطالعہ کئے بغیر مدرس کا اس راہ میں ایک قدم بھی اُٹھانا دشوار ہے۔

نفسیات میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ نفسِ انسانی ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا، کبھی ہم کو کسی شے میں اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ ہم بالکل کھوئے ہوئے سے ہوتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ متعدد تصورات و خیالات سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ تصورات اس تیزی سے ہمارے ذہن سے گذر جاتے ہیں۔ جیسے ایک تیز رفتار گاڑی۔ بسا اوقات نفس ایسی حالت انتشار میں ہوتا ہے کہ سامنے آنے والی اشیاء کا ہم کو بخوبی ادراک بھی نہیں ہوتا۔ ہم اشیاء کو دیکھتے ہیں، آوازیں کانوں میں آرہی ہیں، بہت سی چیزیں جسم سے مَس ہو رہی ہیں مگر ہمارے حواس کماحقہٗ ان کو محسوس نہیں کرتے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نفس کی حالت غیر انتشاری ہوتی ہے اور ہمارا نفس کسی مخصوص شے یا خیال کو اپنا لیتا ہے۔ اور ہم اس خیال یا شے کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ اور اس کے متعلق جس قدر معلومات حاصل کرنے کی ہمارے اندر قوت ہوتی ہے ان کو ہم حاصل کرلیتے ہیں۔ اس وقت نفس یا شعور تمام دوسری چیزوں سے ہٹ کر صرف ایک ہی چیز پر مرتکز ہوجاتا ہے۔ نفس کی اسی حالت کو ہم "توجہ" کہتے ہیں۔ مختصراً اس کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے۔ کہ نفسی قوت کا کسی خاص چیز (کیفیت یا عمل) پر مجتمع ہوجانے کا عمل "توجہ" کہلاتا ہے۔

توجہ کے اغراض:

توجہ کی ہمیشہ کچھ نہ کچھ غرض وغایت ضرور ہوتی ہے۔ (۱) ہم کسی شے پر اسلئے اپنی توجہ صرف کرتے ہیں۔ کہ اس شے کا مشاہدہ ہم کو مطلوب ہے اور یہ مسلمہ ہے کہ ادراک میں جب تک توجہ کا مسلسل عمل شامل نہیں ہوتا۔ اس وقت تک مشاہدہ جیسی اعلیٰ نفسیاتی قدر میسر نہیں ہو سکتی۔ (۲) ہم اپنے عمل توجہ سے اپنے دائرہ شعور کے تاریک پہلوؤں کو روشن کرنا چاہتے ہیں (۳) ہم اپنے دائرہ شعور کے بیشمار مدرکات اور ان کے منتشر و مخلوط ہجوم کو ایک نظم و سلسلہ میں لانا چاہتے ہیں۔ (۴) ہم ان بیشمار مدرکات میں سے کسی شے مدرکہ کو کسی غرض وغایت کے تحت انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال توجہ کی کوئی نہ کوئی غرض وغایت ضرور ہوتی ہے۔ توجہ کا معروض (جس پر توجہ کی جائے) تجسس (...Sensation) ادراک Perception شبیہ تصور Idia ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم مادی یا مرئی اشیاء پر اپنی توجہ صرف کرتے ہیں اور بعض اوقات اپنے ہی مختلف خیالات پر متوجہ ہوجاتے ہیں۔ اور ان کے اسباب و علل، خواص اور باہمی تعلقات پر غور و فکر کرتے ہیں۔ جب کبھی ہم کسی منصوبے کی تکمیل و تشکیل کے متعلق غور کرتے ہیں تو تحسسات و مدرکات سے مدد لیتے ہیں یا ذہنی تصاویر اور اپنے حافظہ کی یادداشتوں کو کام میں لاتے ہیں۔

بے توجہی اور عدم توجہی:

توجہ کے سلسلہ میں اِس خاص فرق کو بیان کر دینا ایک اہم نفسیاتی مسئلہ ہے۔ گو بظاہر دونوں کے مفہوم میں کوئی نمایاں فرق نہیں سمجھا جاتا۔ مگر حقیقتاً ان دونوں میں فرقِ عظیم ہے۔ جس کی وضاحت ہم یہاں کرتے ہیں۔

بے توجہی! میں توجہ معدوم نہیں ہوتی۔ بلکہ نفسی قوت کسی دوسرے پہلو پر معروف ہوتی ہے۔ مثلاً بچہ اپنے کل سبق کے مفہوم و معنی پر غور کرنے کے بجائے گذشتہ کی تقریب کی تفریحات اور اس کے خیالات میں کھو جائے۔ اور صرف رسمی طور پر کتاب پر نظر جمائے رہے

توہم اس کو بے توجہی سے تعبیر کریں گے۔ ایسی حالت میں اگر معلم درس دوران پر کوئی سوال کرتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتا ہے۔ اور پھر نہایت مستعدی سے سبق پر متوجہ ہو جاتا ہے عدم توجہ میں معروض سے نفس کی بیزاری پائی جاتی ہے یعنی اس کے لئے اس شے میں یا معروض میں جس پر اس کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور نہ کسی قسم کی غرض وابستہ ہے۔ عدم توجہ کے اسباب، بیزاری، کم علمی، ناسمجھی اور آلاتِ حسّی کے نقائص ہیں۔ بچّہ اس حالت میں بہت خفیف محسّسات اور خیالات میں پھنس کر انتشاری کیفیت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں مشاہدہ کے لئے مضر ہیں۔ خصوصاً بے توجہی زیادہ مضرت رساں ہے۔ بچّہ جب پورے انہماک اور جوش کے ساتھ توجہ کو کام پر نہیں لگاتا تو ایسی حالت میں گھنٹوں کام کرتے رہنے کے باوجود وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتا اور صرف وقت گذاری کرتا رہتا ہے۔

بے توجہی کے اسباب:

بے توجہی کے اسباب بے شمار اور لاتعداد ہیں۔ ہر وہ شے اس کا سبب بن سکتی ہے جو بچّہ کی توجہ کو کسی مرکز پر لگانے سے ہٹا دے۔ مدرسوں میں طلباء کی بے توجہی کا باعث عموماً مدارس کا محل وقوع یعنی آبادی، شاہراہوں، تجارتی منڈی وغیرہ کے قریب ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک جماعت جب ایک درجہ سے منتقل ہو کر دوسری جگہ جاتی ہے اور وہ شور و غل کرتی ہے۔ تو دوسری جماعتوں کے طلباء کی بے توجہی کا باعث بن جاتی ہے مشکل اسباق بغیر وضاحت کے طلباء کے سامنے پیش کرنا بھی بے توجہی کا باعث بن جاتے ہیں معلم کا سخت مزاج اور خوش خلق ہونا بھی ایک موجب ہے۔

توجہ کے اقسام:

توجہ کے اقسام سے مراد اس کی وہ مختلف حالتیں ہیں۔ جن کے ساتھ وہ کسی شے پر مرتکز ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ماہرین نفسیات میں اختلاف ہے۔ علمائے نفسیات کے ایک گروہ

نے 'غیرارادی یا مجہول' ارادی یا فعلی توجہ اور عادی مجہول توجہ اس کی قسمیں قرار دی ہیں۔ بعد مندرجہ ذیل تعریفات اس کی منضبط کی ہیں۔

غیرارادی یا مجہول توجہ:

جب کوئی شے ہمارے فطری میلان یا طبعی دلچسپی کے مطابق ہو۔ اور بلا کسی خواہش یا جبر کے ہم اس کی طرف متوجہ ہو جائیں تو ایسی توجہ غیرارادی یا مجہول کہلاتی ہے۔ کیونکہ اس میں ارادہ یا قصد کا عنصر مفقود ہوتا ہے جیسے بچوں کا رنگین کھلونے دیکھتے ہی تمام دوسری چیزوں کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو جانا' اس توجہ میں تکان بہت کم ہوتی ہے تعلیمی نقطہ نظر سے یہ بہت بکار آمد ہے مگر خود ضبطی Self control اور سیرت سازی Character formation کے لئے مضر ہے۔ اس لئے اس سے صرف تدریس و تدریب میں کام لیں۔

ارادی یا فعلی توجہ:

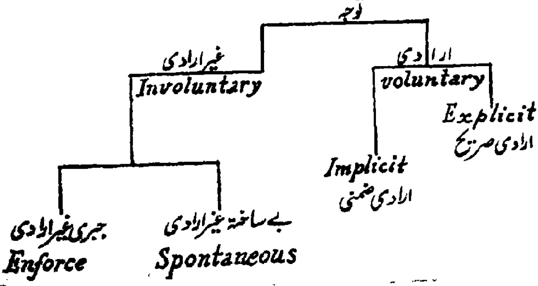
جب کوئی شے طبعاً دلچسپ اور جاذب نہیں ہوتی اور ہمارے فطری میلان و رجحان کے خلاف ہوتی ہیں۔ تو ہم بجہد وسعی اس پر اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں' یہی ارادی توجہ ہے۔ ارادی توجہ سے ہم کو اسی وقت کام لینا پڑتا ہے جب ہم کسی مرغوب طبع یا دلچسپ موضوع سے ہٹ کر کسی غیر پسندیدہ موضوع کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مثلاً بچوں کو قصہ کہانی سے ہٹا کر حساب نکالنے پر متوجہ کرنے میں ہم کو کافی جد وجہد کرنا پڑتی ہے۔ غیرارادی توجہ کے مقابلہ میں یہ بہت عارضی ہوتی ہے اور جبر و دباؤ کی جد وجہد ہٹتے ہی یہ پھر اپنا مرکز چھوڑ دیتی ہے۔ کار تدریس میں اسی سبب سے اس کو زیادہ قابل اعتبار نہیں سمجھا جاتا۔ اب اگر بچہ کی اسباق پر توجہ ارادی مبذول ہو جائے۔ تو پھر اس کے نتائج بہت فائدہ مند ہوتے ہیں۔

ثانوی مجہول توجہ: Secondary Passive attention

چونکہ ارادی اور غیر ارادی توجہ کو درس وتدریس میں زیادہ کارآمد نہیں سمجھا جاتا ہے اس لئے بسااوقات معلّم حسنِ تدبیر سے خشک اور غیر پسندیدہ موضوعات میں ایسی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جس کے باعث طالب علم اپنی توجہ اس پر مبذول رکھتا ہے ۔ اور کچھ زیادہ بار محسوس نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کی ابتدا تو اسی جبریہ یا ارادی توجہ سے ہوتی ہے مگر بتدریج یہ جبر دلچسپی سے بدل جاتا ہے، معروض میں اتنی دلچسپی پیدا کر دی جاتی ہے ۔ کہ نفسی حرکت کا میلان پھر خود بخود اس کی طرف ہو جاتا ہے ۔ کامیاب ماہرینِ تعلیم اس پر کاربند ہو کر خاطر خواہ نتیجہ پیدا کر لیتے ہیں ۔

ایسی مجہول توجہ جو دلچسپی کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے تعلیمی حلقوں میں بہت ہی ممتاز اور اعلیٰ درجہ رکھتی ہے ۔ ایسی توجہ پیدا کرنے کے لئے ہم کو ایسے محرکات سے کام لینا پڑتا ہے جس سے محصلین کی فطرت (یا نفس) کو تحریک ہوتی ہے اور ان کے فطری رجحانات اُبھر کر معروض کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ۔ چند دیگر ماہرینِ نفسیات نے ایک دوسری طرح پر توجہ کی تقسیم کی ۔ اِس سلسلہ میں اسٹاؤٹ (Stout) کی مندرجہ ذیل تقسیم کو اس طبقہ کے تمام ماہرینِ نفسیات نے پسند کیا ہے ۔

توجہ Attention



یعنی اسٹاؤٹ نے توجہ کی دو قسمیں کی ہیں۔ ارادی اور غیر ارادی۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ارادی: کی ۔ ارادی صریح ۔ ارادی ضمنی ۔

(۲) غیر ارادی: کی (۱) بے ساختہ غیر ارادی (۲) جبری غیر ارادی۔ اس تقسیم کو وضاحت سے اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی شے یا معروض! بذاتِ خود ہی توجہ اپنی طرف کھینچنے کے لئے کافی ہوتا ہے تو اس وقت توجہ غیر ارادی ہوتی ہے۔ اور جب کسی معروض پر اس اعتبار سے توجہ کی جائے کہ اس سے کسی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے تو اس صورت میں توجہ ارادی ہوتی ہے۔ مثلاً بچہ اپنا سبق امتحان کی تیاری کے لئے یاد کر رہا ہے تو یہ توجہ ارادی ہے اور اسی دوران میں اگر سڑک کے شور و غل یا باجے کے شور کو سن کر وہ اس طرف متوجہ ہو جائے تو اس کی توجہ غیر ارادی ہوگی۔ باجہ کا شور و غل اس کی مرضی کے بالکل خلاف تھا اور اس سے اس کے کام میں بھی ہرج واقع ہوا۔ مگر تہیج Stimulation اس شدت کا تھا کہ مجبوراً اس کو اُدھر متوجہ ہونا پڑا۔ یہ توجہ جبری غیر ارادی ہے۔

اسی اثنائے مطالعہ میں اگر وہ کسی ہم جماعت کی آمد کا منتظر ہے اور یکایک اس کی آواز کانوں میں پہنچتی ہے۔ اور وہ آواز سنتے ہی بے ساختگی کے عالم میں اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس قسم کی توجہ بے ساختہ غیر ارادی ہوگی۔ جبری غیر ارادی میں چونکہ طبعی لگاؤ نہیں ہوتا۔ بلکہ مہیج Stimulus کی خاصیت ہی ایسی ہوتی ہے۔ کہ بادل ناخواستہ ہی اس طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے بے ساختہ غیر ارادی میں اگرچہ مہیج کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا مگر طبیعت کو اس سے ایسا خاص انس یا لگاؤ ہوتا ہے جو توجہ کی اس بے ساختگی کا باعث بن جاتا ہے۔

ہم کسی شے کے مسلسل مشاہدہ سے اُکتا جاتے ہیں۔ مگر کسی منفعت کے خیال سے باوجود اُکتاہٹ کے بار بار اپنی توجہ پھر اسی معروض پر لگاتے ہیں، جیسے امتحان کے زمانہ میں

محنت مطالعہ کے باوجود تکان اور اکتاہٹ کے محض کامیابی کی اُمید اور توقع پر سر دھنتے ہیں ایسی توجہ صریح ارادی کہلاتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں صریح طور پر ارادہ موجود ہوتا ہے۔ ہاں اگر امتحان کی تیاری کا خیال اس قدر غالب ہے کہ ہماری توجہ کسی طرف نہیں بھٹکتی بلکہ برابر مطالعہ پر مرکوز ہے اور امتحان کے خیال کو بار بار تازہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس مسلسل توجہ کا مدعا مطالعہ کے ساتھ ساتھ ضمناً نفس میں موجود ہے۔ تو اس کو ضمنی ارادی توجہ کہیں گے۔

درس و تدریس میں ضمنی ارادی توجہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے کام اسی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے دِقّت طلب کاموں، مہمات اور مشکل امور میں نفس مطلب اور حقیقی مقصد ذہن میں اس طرح جاگزیں ہوتا ہے کہ نفس کو اس کے بار بار اعادہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مدرسہ میں اسی توجہ کا طلباء میں پیدا کرنا مدرس کی کامیابی کا راز ہے۔ اس کامیابی کا حصول اس صورت میں بہت آسان ہے۔ کہ مدرس کی رہنمائی سے طلباء کو اپنے کار درس و تدریس کی اہمیت و منفعت پر اس قدر وثوق ہو جائے کہ ان کے لئے تحریص و تشویق کی ضرورت باقی نہ رہے۔

توجہ کی تربیت:

توجہ ایک بڑی حد تک قدرت کا ایک عطیہ ہے۔ مگر پھر بھی جس طرح دیگر نفسیاتی قوتوں کی تربیت ضروری، مفید اور بکار آمد ہے اسی طرح توجہ بھی تربیت سے کچھ نہ کچھ اصلاح پذیر ہو سکتی ہے۔ اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ اس کی تربیت صرف اس کے مسلسل استعمال یعنی مشق سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر کسی میں لگا تار اور مسلسل توجہ کی قدرتی صلاحیت کم بھی موجود ہے۔ اور اس میں کام کرنے کا جوش و خروش زیادہ ہے۔ تو ہم اس کی توجہ کی تربیت کر سکتے ہیں۔ ایک ہی معروض کے مختلف پہلوؤں پر اس کو متوجہ کر کے اس کی توجہ مسلسل پیدا کیا جا سکتا ہے۔

بچے مدرسہ میں جب کسی شے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تو اوّلاً توجہ بہت تیزی سے بڑھتی ہے۔ مگر کچھ عرصہ بعد بھٹکنے لگتی ہے۔ اس لئے بچوں میں مسلسل توجہ کی عادت پیدا کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ ہر نئے کام پر بقدر ضرورت توجہ صرف کر سکیں۔ اس لئے ہر سابقہ بات میں کوئی نئی بات شامل کر کے اسے دلچسپ بنا لینا چاہیئے تاکہ جاذب توجہ بن سکے۔ اسباق روزمرّہ میں تنوع پیدا کرنا اس لئے بہت مفید ہے۔

دلچسپی کا توجہ کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ اس لئے وہ توجہ جس میں دلچسپی کا عنصر بہت کم ہوتا ہے کبھی ارادی نہیں ہوتی۔ بلکہ جبری ارادی یا غیر ارادی ہی ہوتی ہے جس میں کسی کا خوف یا کسی کی خوشنودی ملحوظ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ عارضی ہوتی ہے۔ مثلاً مدرسہ میں طلباءً زیادہ تر غیر ارادی توجہ ہی سے کام لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں درس و تدریس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اسی لئے مدرس کو ایسے بچوں کی تعلیم میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علی العموم مدرسہ میں بچوں کی توجہ کو ایسی اشیاء اور مشاغل کی طرف منعطف کرنا پڑتا ہے۔ جو بذاتہٖ دلچسپ نہیں ہوتیں۔ اور مدرس کو حاکمانہ اور آمرانہ طریقہ پر بچوں میں ارادی توجہ پیدا کرنا پڑتی ہے۔ اور وہ متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن ایسی جبری ارادی توجہ میں دلچسپی کے عنصر کا فقدان ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقتاً ارادی توجہ نہیں ہوتی۔

یہی سبب ہے۔ کہ ایسے مدرس جو اسباق کو دلچسپ اور مرغوب طبع نہیں بنا سکتے۔ مدتوں بچوں کی تعلیم پر سر دھنتے ہیں۔ مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ اور جو معلمین ہوشیار اور نفسیات سے آگاہ ہیں۔ وہ ان میں ارادی توجہ پیدا کرنے کے لئے اسباق کو دلچسپ بنا کر ان کی طبعی دلچسپی کو بیدار کر دیتے ہیں۔

طبعی دلچسپی اور اکتسابی دلچسپی:

طبعی دلچسپی کے متعلق تو ہم ابھی لکھ چکے ہیں۔ کہ حصول لذت کی توقع، مسرت و انبساط کا حصول کسی شے کی طرف توجہ کو طبعی دلچسپی کے ساتھ منعطف کر دیتا ہے مگر اکتسابی

دلچسپی میں یہ خوش گواری توجہ کے ساتھ مقرون نہیں ہوتی؛ بلکہ سبق کو دلچسپ بنانے کے لئے مدرس جو ندرت اور تنوع اس سبق میں پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا مقصد بچوں میں اکتسابی دلچسپی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ بچے اس کی طرف توجہ دے سکیں۔ اگرچہ یہ اکتسابی دلچسپی عارضی اور مستعار ہوتی ہے۔ مگر مسلسل تہیج سے اس کی عارضی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

اس خصوص میں یہ خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ اکتسابی دلچسپی جو پیدا کی جائے وہ ایسی مستحکم اور پائدار بنا پر ہونا چاہیئے کہ اس میں کمی نہ پیدا ہو بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہے تاکہ بچے آئندہ ارادی توجہ سے جو طبعی دلچسپی سے مقرون ہوتی ہے، کام لینے کے عادی بن جائیں۔ اور غیر دلچسپ مشاغل، ناخوشگوار فرائض کی انجام دہی مستعدی سے ساتھ کر سکیں اور اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکیں ۔

بچّے اور ان کے خواب

علاؤالدین اختر

ہر زمانہ میں خواب حیرت و دل کشی کا موجب رہا ہے۔ قدیم زمانے میں خواب کی تعبیر کرنے کی صلاحیت ایک ایسا جوہر تصور کیا گیا تھا جو فطرت صرف معدودے چند لوگوں کو سپرد کرتی تھی۔ آج کل بھی نفسیات میں خواب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور جو کام ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کے سمجھنے کے لئے خواب سے لیا گیا ہے۔ وہ شاید اس صدی کا حصّہ ہے۔ اس سے پہلے خواب کے متعلق یہی خیال رہا ہے۔ کہ اس میں آئندہ پیش آنے والے نیک و بد واقعات کی خوش خبری دی جاتی تھی یا ان سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ کسی فرد کی اپنی زندگی کے مسائل اور مشکلات اور ان کے حل کرنے کی تیکنیک پر اس کے خواب کیا روشنی ڈالتے ہیں۔ اس بات پر بھی کبھی باقاعدہ طور پر غور نہیں کیا گیا۔ البتہ خواب کی اشاراتی اہمیت پہلے بھی تسلیم کی گئی ہے۔ اور بسا اوقات یہ بھی مانا گیا کہ خواب میں خواہشات کی تسکین ہوتی ہے لیکن سائنٹیفک طور پر یہ جاننے کی کوشش کبھی نہ ہوئی۔ کہ خواب کیا ہے۔ خواب کی تحریک کیسے اور کیونکر ہوتی ہے کسی فرد کے ماحول و ذہانت' ذوق و شوق' صحت اور عمر وغیرہ کا اس کے خواب پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اور خواب کن کن تقاضوں اور تمناؤں

کو پورا کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ خواب کے ان سبھی پہلوؤں کے متعلق تفصیلاً کچھ لکھنا میرا مقصود نہیں۔ قطع نظر ان تمام بحث طلب امور کے جو ماہرین کے لئے تحقیق و جستجو ہی نہیں۔ بلکہ آپس کی رنجش کا باعث بھی ہوئے اور بایں ہمہ وہ انسانی علم میں اضافہ کا موجب بھی ہوئے۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ بچّے کے خوابوں کا مطالعہ اس کی عمر کے مختلف حصّوں میں اس کے خاص خاص فطری رجحانات کو حسن و سلیقہ سے سمجھنے یعنی اس کی زندگی کو بہاراں بنانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ خواب بچّے کے مزاج، ذہنی لگاؤ، فطری پسند و ناپسند، شعور کے روندے اور دبائے ہوئے واقعات و مشاہدات وغیرہ سبھی کا ایک حسین مگر عجیب و غریب مجموعہ ہوتے ہیں۔ یہی وہ عناصر ہیں جو الگ الگ باہمی میل ملاپ سے یا ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوکر دیگر موروثی و جبلی عناصر سے مل کر بچّے کی شخصیت بناتے، سنوارتے یا بگاڑتے ہیں۔ لہٰذا بچّے کی بھلائی چاہنے والے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ اور کون ہے جو بچّے کی بھلائی نہیں چاہتا۔ کہ اس کے خوابوں کی طرف دھیان دیا جائے بخصوصاً اس وقت جب کہ اپنی عمر کے لحاظ سے بچّے کا رویہ غیر طبعی ہو۔ خواب اس کی نفسی پریشانی، جذباتی تشنگی اور ذہنی کسک کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔

خواب اور ذہانت کا جو آپس میں تعلق ہے۔ اس کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ نسبتاً ذہین و فہیم بچّے زیادہ خواب دیکھتے ہیں۔ تجربات نے یہاں تک بتایا ہے کہ اگر پانچ سات سال کی عمر کے درمیان ایسے بچّے کسی وجہ سے اپنی بینائی کھو دیں۔ تو ان میں نظاروں کو دیکھنے اور ان کا تصور قائم کرنے کی استطاعت باقی رہتی ہے۔ خواب کی وضع قطع، تانا بانا بھی انہی تصورات کا مرہونِ منت ہے۔ جو خواب دیکھنے والا مہیا کرتا ہے۔ اور اس کا انحصار بھی ذہانت پر ہے۔ سات سال کی عمر تک سبھی بچّے خواہ وہ ذہین ہوں یا غبی۔ کم و بیش خواب دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد خوابوں سے محروم ہو جانا ذہانت کی بالیدگی کا رُک جانا ہے۔ یا اس کی عدمِ استعانت کا مترادف ہے۔ البتہ عمر کے مختلف حصّوں میں خوابوں کے تسلسل اور

کمی بیشی میں فرق و تغیّر بھی ہے۔ مثلاً ۱۲/۱۴ سال کے لڑکے لڑکیاں طفلی اور بلوغ کے دنوں کی نسبت کم خواب دیکھتے ہیں۔ اور ۱۶/۲۵ سال کے درمیان خواب گویا کارواں در کارواں چلے آتے ہیں۔

قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ ماحول کا خواب پر کیا اثر پڑتا ہے۔ لیکن یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل نہیں۔ کہ ماحول خواہ خارجی ہو یا داخلی۔ اس کا خواب پر ایک گونہ اثر پڑتا ہے۔ مثلاً خاموش اور پرسکون جگہ پر شور و غوغا والی جگہ کی نسبت خواب زیادہ صاف نظر آتے ہیں۔ ماحول کی تبدیلی خوابوں کے اضافے کا باعث ہوئی ہے۔ سونے سے پہلے لگاتار دماغی کام بھی خواب مہیا کر سکتا ہے۔ اگر سونے سے پہلے بچے کو شوخ و چنچل قسم کے بچے بچیوں کے قصّے کہانیاں سنائی جائیں۔ تو خواب میں وہ اکثر سب سے زیادہ دلچسپ کیریکٹر کا روپ دھار لیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اگر وہ لڑکا ہے تو لڑکے کا پارٹ کرے اگر قصّے میں اسے لڑکی کا کردار پسند ہے تو خواب میں وہ اس لڑکی کا پارٹ ادا کرے گا۔ ایسا کمرا جس میں روشنی اور ہوا کے انعکاس کا مناسب انتظام نہ ہو۔ خواب کو تحریک تو دے سکتا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے۔ کہ خواب روشن اور واضح ہونے کی بجائے دُھندلا دُھندلا دکھائی دے گا۔ سونے سے پہلے پیٹ بھر کر کھانا کھانا خوفناک خوابات کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ یہ سبھی چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ خواب اور ماحول کا بہت گہرا تعلق ہے۔

خوابوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز جو دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ ان میں روزمرّہ کی سوچ بچار اور استدلال کا کلی فقدان ہوتا ہے۔ گویا خواب کی اپنی ہی ایک منطق ہوتی ہے۔ اس کا اپنا ہی ایک استدلال ہوتا ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ نیند کے بعد اکثر ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارا نہیں ہوتا۔ کہ اپنے کئی خوابوں کو خلافِ عقل اور عجیب و غریب واقعات کا بے جوڑ مجموعہ سمجھیں۔ لیکن دورانِ خواب میں ایک ثانیہ کے لئے بھی تو ہمیں کبھی شک نہیں پڑتا۔ کہ ہم ایک مہمل اور فضول خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایسے بے شمار خواب

اکٹھے کئے گئے ہیں۔ جہاں "ان ہونی" چیزیں ظہور پذیر ہوئیں۔ مثلاً ایک لڑکی نے اپنے خواب میں اپنے بھائی کے جنازے کا جلوس دیکھا۔ لطف کی بات یہ تھی۔ کہ اس جلوس میں اس کا بھائی بھی شامل تھا۔ جلوس کے ساتھ ساتھ اس کی استانی بھی تھی۔ جو اس کے سوال دیکھ رہی تھی۔ اور غلطیوں پر نشان لگا رہی تھی۔ یا جبکہ ایک اور بچہ خواب میں دیکھتا ہے۔ کہ ڈاکو ان کے گھر میں گھس آئے ہیں۔ اس کی والدہ کا روپیہ چرانے کے بعد وہ چاقو مار کر خود اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ جب وہ ہلاک ہو چکتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ دو تین دیگر افراد بھی اسی طرح ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔

بچوں کے خوابوں میں خواب کے مخفی مواد اور ظاہر مواد میں چنداں فرق نہیں ہوتا ان کے ہاں ٹٹی کی آڑ میں بیٹھ کر شکار نہیں کھیلا جاتا۔ خواہشات اپنے اصل رنگ میں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ بچوں کے یہاں بالغوں کی نسبت ثانوی تکمیل زیادہ واضح اور نمایاں ہوتی ہے۔ وہ گذشتہ روز کے واقعات کو نسبتاً زیادہ دہراتے ہیں اور عموماً خواب میں اس خواہش کو پورا کرتے ہیں۔ جس سے ایک روز پہلے انہیں منع کیا گیا تھا۔ بچوں کے طبعی رجحانات اور ان کے خواب میں ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ بچے کے تخیلی خواب اکثر بالکل انوکھے اور تفصیلات سے پُر ہوتے ہیں۔ ڈرپوک اور شرمیلے بچے ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں، متلون مزاج بچے کے خوابوں میں شوخی اور رنگینی جھلکتی ہے۔ صحت مند بچے خوفناک اور ہراساں کرنے والے خواب دیکھنے میں بھی خوشی و مسرت محسوس کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے متعلق گفتگو کرنے اور ان کو اگر موقعہ دیا جائے تو لکھنے سے بھی گونا لطف اُٹھاتے ہیں مجموعی طور پر ان کے خواب یہ صاف ظاہر کرتے ہیں۔ کہ ان واقعات کو قلم بند کرنے میں جن میں ان کو دلچسپی ہے وہ خاص مہارت رکھتے ہیں۔ روزمرہ کے واقعات کو بیداری کی حالت میں جس طریق سے وہ دیکھتے ہیں۔ اور بیان کرتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ خواب کو بیان کرنے کی مہارت کہیں پختہ ہے۔ بسا اوقات طرز بیان اتنا سلجھا ہوا ہوتا ہے۔ کہ جیسے ان کو رقم

کرتے وقت کوئی نیا اور ممتاز ذہنی جوہر کارفرما ہے۔ البتہ بہت چھوٹی عمر کے یعنی ۵، ۶، ۷ سال کی عمر کے بچوں کے خواب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا مافی الضمیر کے اظہار کا طریقہ بہت کمزور ہے۔ کہنا وہ کچھ چاہتے ہیں اور کہہ کچھ اور جاتے ہیں۔ دیگر ان کے سلسلہ میں ایک امتیازی بات یہ ہے کہ وہ نیند اور بیداری کے واقعات کو بہت کم علیٰحدہ کرسکتے ہیں اور خواب بیان کرتے وقت خواب سے پہلے کے واقعات کو خواب میں سمولیا جاتا ہے۔ اور جو باتیں ان کے اپنے تجربے کے خلاف ہوتی ہیں۔ ان کو فضول سمجھ کر نظرانداز کردیتے ہیں۔ اگر کہیں بیان میں خلا رہ جائے۔ تو من گھڑت باتوں سے اس کو پورا کردیتے ہیں۔ چنانچہ اپنی آسانی اور ذرا تفصیل سے بات چیت کرنے کے لئے ہم بچوں کو دو یا تین گروہوں میں تقسیم کرلیتے ہیں۔
(۱) پانچ سے لے کر سات سال کی عمر تک کے بچے (۲) آٹھ سے لے کر گیارہ سال کے بچے۔
(۳) گیارہ سے لے کر ۱۶/۱۸ سال کے بچے۔

پانچ سال کی عمر میں خواب کا مرکزی کردار خود بچہ ہوتا ہے۔ سات سال کی عمر میں صرف وہی اپنے خواب کا مرکزی کردار نہیں رہتا۔ گھر کے دیگر افراد بھی اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اب وہ پہلے کی نسبت خواب اور بیداری کے واقعات میں زیادہ احتیاط سے تمیز کرتا ہے۔ اس کے خواب نسبتاً واضح اور نمایاں ہوجاتے ہیں۔ جبکہ ایک چھ سات سال کے بچے نے خواب میں دیکھا کہ کسی نے اس کو تین پیسے دئے ہیں۔ صبح بیدار ہوتے ہی اس نے اپنے بستر کو ٹٹولا۔ کہ وہ تین پیسے کہاں گئے۔ خواہشات کو تسکین دینے والے خواب عموماً اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کہ ان کو تحفے دئے جارہے ہیں۔ والدین، بہن بھائی قریبی رشتہ دار گھر کو واپس لوٹ رہے ہیں۔ لڑکیاں اپنے خوابوں میں کسی مشفق و مہربان پری کو بھی دیکھتی ہیں۔ لڑکے ہراساں کرنے والے خوابوں میں کسی ڈاکو یا خوفناک جانور کو دیکھتے ہیں لیکن لڑکیاں اس کے علاوہ کسی جادوگرنی کو دیکھتی ہیں۔ اوّل تو بچہ اس عمر میں اسکول کے متعلق کوئی خواب نہیں دیکھتا لیکن جب کبھی وہ خواب میں اسکول کے متعلق کچھ دیکھتا ہے۔ تو

اس کا تعلق کھیل کے میدان سے ہوتا ہے۔ یوں تو بچّے بہت کم کھانے کے متعلق خواب دیکھتے ہیں۔کیونکہ گھروں میں بڑوں کی نسبت ان کی خوراک کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔لیکن بچّہ اگر بار بار ایسے خواب دیکھے جن میں کھانے پینے کا ذکر ہو۔ تو اس کی خوراک کی طرف دھیان دینا لازمی ہے۔ اس طرح اگر ایک سال تک بچّے کے خوابوں کا ریکارڈ رکھا جائے۔ تو خواب میں بار بار دہرائے جانے والے عنصر کو حالتِ بیداری کے واقعات سے علیحدہ کر کے اسکے لاشعور سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔

آٹھ سے لے کر گیارہ سال کے بچّوں کے خواب پہلے گروہ کے بچّوں کے خوابوں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ اب نہ صرف ان خواہشات کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جو خواب میں تسکین پاتی ہیں بلکہ ان کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ قریبی رشتہ داروں کی آمد، تحائف کا پیش کیا جانا، سیر و تفریح بدستور خواب کا موضوع ہوتے ہیں۔ البتہ کھانے کے خواب دس سال کے بعد عموماً ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کی جگہ دوسرے شہروں میں جانے کے خواب کثرت سے نظر آتے ہیں۔خوف و ہراس کے خوابوں میں اگرچہ وحشی جانور، خوفناک بوڑھا آدمی، ڈاکو وغیرہ پہلے کی طرح بدستور موجود رہتے ہیں۔لیکن دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ اب وہ لڑکوں کے خواب کا ہی جزو ہوتے ہیں۔ لڑکیاں ان سے محفوظ رہتی ہیں۔ بڑے بڑے خوفناک جنگلی جانور مثلاً شیر۔ چیتا وغیرہ لڑکوں کے خواب میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ لڑکیوں کے خوابوں میں ان کی جگہ کتّے، چوہے اور سانپ دکھائی دیتے ہیں۔ مکانوں اور دکانوں کو جلتے ہوئے بھی پہلی بار اسی عمر میں دیکھا جاتا ہے۔ گرنے، پھسلنے، اُڑنے، تیرنے کے خواب بھی پہلی بار دس سال کی عمر میں آتے ہیں۔ اور ۱۴ سال کی عمر تک ان میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔جس طرح مفلس و غریب بچّے عمدہ عمدہ کھلونوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح فارغ البال والدین کے بچّے اپنے آپ کو اُڑتے، تیرتے اور ہوا کی مانند تیز دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جہاں تک اسکول کے کام کاج کا تعلق ہے۔ اس عمر میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی

یں ہوتی۔ اب بھی اسکول کے متعلق خواب کھیل کے میدان وغیرہ کے بارے میں ہوتے
یں لیکن جب کبھی کوئی بچہ اپنے سبق یا استاد کے متعلق خواب میں کچھ دیکھتا ہے ۔ تو
س کے ساتھ ساتھ کوئی اور دلچسپ واقعہ بھی وابستہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک گیارہ سال
ی لڑکی نے بتایا۔ کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ ان کی انگریزی کی کلاس ہو رہی ہے۔
س .... ہمیں پڑھا رہی تھیں۔ ہم اتنی بے وقوف تھیں کہ ہمیں لفظ "ٹانگیں" بھی سمجھ
یں نہ آیا۔ جب ہم نے پوچھا کہ ٹانگیں کیا ہوتی ہیں تو ہماری استانی نے ہمیں اپنی ٹانگیں
دکھائیں۔ اس پر میں اور میری سیٹ فیلو ہنس پڑیں۔ مس .... نے کہا۔ اتنی بدتمیز
تو نہ ہو۔ جس اسکول میں ڈرامے وغیرہ کھیلے جاتے ہوں۔ وہاں کے بچے عموماً خواب میں
یہ دیکھتے ہیں۔ کہ وہ اپنے پارٹ کا "ریہرسل" کر رہے ہیں۔ جنوں اور بھوتوں کا عنصر خواب
سے معدوم ہوتا جاتا ہے۔ اور دس سال کے بعد لڑکے پریوں کو خواب میں قطعاً نہیں
دیکھتے۔ البتہ لڑکیوں کے خوابوں میں مزید ۲/۳ سال پریاں جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں۔ پانچ
سال تک جبکہ اوپر لکھا گیا بچہ خود ہی خواب کا مرکز ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے بھی اسکے
خواب میں حصہ لیتے ہیں۔ مگر عجب اتفاق ہے کہ ۷ سال کے بعد جب کبھی بچے نے ایسا
خواب دیکھا۔ جہاں ہولناک مناظر، دنگا فساد، لڑائی جھگڑے کی بک بک، چیخ پکار سے
واسطہ ہو۔ یا جہاں کہیں اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ بچہ یا تو غائب ہوتا ہے یا اس کی
حیثیت محض ایک تماشائی کی ہوتی ہے۔ عمر کے اسی دور میں وہ پہلی بار ایسے خواب دیکھتا
ہے۔ جہاں کسی کی موت یا اس کی اپنی موت کا ذکر ہوتا ہے۔ مخالف جنس کے کسی فرد سے
بات چیت یا محبت کے خواب ۱۳/۱۴ سال کے بعد اکثر آتے ہیں۔ لیکن ۹/۱۱ کی عمر کے درمیان
ایسے خواب اگر کسی کو نظر آتے ہیں۔ تو وہ عموماً لڑکی ہوتی ہے۔ جبکہ ایک آٹھ سالہ لڑکی نے
خواب دیکھا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی، اس کی دو بچیاں تھیں، اس کا شوہر ایک زچی فسر
تھا۔ وہ خود ایک استانی تھی۔ دیگر کسی کی خوش بختی یا خوبصورتی نے خواب میں اگر کسی کو

چلایا ہے تو وہ چودہ سالہ لڑکی کو' البتہ خوابوں میں پیش آنے والے واقعات کو وضاحت سے بیان کرنا بھی لڑکی کے حصّے میں آیا ہے۔ مثال کے طور پر خواب میں اگر کسی کھیل تماشے کا ذکر ہے۔ تو لڑکوں کی نسبت لڑکیاں کھیل کے واقعات' اس میں حصّہ لینے والوں کے لباس' رنگ روپ وغیرہ کا زیادہ تفصیل سے ذکر کرتی ہیں۔

۱۱/۱۲ سال کی عمر میں اکثر اس قسم کے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ جہاں آدمی اور عورتیں جانوروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہیڈ مسٹرس گھوڑا بن جائے۔ بوڑھا آدمی سبز آنکھوں والی ارغوانی رنگ کی گائے۔ یا پھر جیسے ایک لڑکی نے دیکھا کہ اس کا اپنا بھائی کتا بن جاتا ہے۔ اس پر چڑھ کر وہ اسکول سے واپس آتی ہے۔ اور ۱۳/۱۴ سال کی عمر میں خواب میں چھوٹی چھوٹی چیزیں یک لخت قوی ہیکل اور جسیم چیزیں بن جاتی ہیں۔ اور بڑی بڑی بلند اور اُونچی چیزیں جیسے درخت' پہاڑ وغیرہ چھوٹے چھوٹے پودے' اینٹ اور کنکر' چوہے اور بلیاں بن جاتے ہیں۔ ۱۴ سال کی عمر کے بعد خوف و ہراس کے خواب لڑکوں میں کم ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن لڑکیوں کے ایسے خوابوں میں قدرے اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اجنبی عورتیں اور مرد ہی ان کے خوف و ہراس کا موجب ہوتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں گرنے' پھسلنے' اُڑنے' تیرنے' صدمہ پہنچنے کے خواب پہلے کی نسبت زیادہ دیکھتے ہیں۔ لڑکیاں خواب میں موت زیادہ دیکھتی ہیں۔ لڑکوں کے خوابوں میں موت کا عنصر آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اسکول کے کام کاج کے متعلق زیادہ خواب دیکھے جاتے ہیں۔ پریوں کا عنصر بالکل معدوم ہو جاتا ہے۔ پس آخر میں یہ نہایت آسانی سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس طرح کسی فرد کے شخصی کردار کی جھلک دیکھتا ہو۔ تو اس کے خوابوں کو بھی دھیان میں رکھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر بچے کے طبعی غیر طبعی طرز عمل کا جائزہ لینا ہو۔ اس کی دلچسپیوں اور دل بستگیوں کو دیکھنا ہو۔ تو اس کے خوابوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ان کا مطالعہ نہایت اہم اور ضروری ہے۔

جمہوریہ ترکی

(زراعت و صنعت اور کسان)

انور قریشی

جمہوریہ ترکی بحیرۂ روم کے خطے میں واقع ہے۔ بحیرۂ روم اس کے مغرب میں ہے اور بحیرہ اسود شمال میں۔ یہ تمام خطہ روائتی طور پر سردیوں کی بارش۔ پھل اور حسن و جوانی اور بہادری کے لئے مشہور ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے یہاں جمہوریت کی بجائے خلیفۃ المسلمین کی آمریت قائم تھی۔ اور موجودہ رقبہ کے علاوہ اسی ملک کے ساتھ شام فلسطین۔ عراق۔ آرمینیا اور عرب ساحلی علاقہ بھی شامل تھا۔ مگر اب جمہوریہ ترکی میں صرف ایشیائے کوچک یا اناطولیا اور کردستان کے علاقہ جات ہیں۔ ایشیائی ترکی کے علاوہ یورپ میں ترکوں کے پاس صرف دو شہر ہیں قسطنطنیہ اور اڈریانوپل۔ جمہوریہ کا کل رقبہ تقریباً تین لاکھ مربع میل ہے۔ مگر آبادی صرف ایک کروڑ اسی لاکھ ہے۔ آبادی کی اکثریت ترک نسل پر مشتمل ہے۔ مگر ان کے علاوہ یہاں کرد۔ آرمینی۔ یہودی اور یونانی بھی آباد ہیں۔ عرب نسل کے لوگ بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ اور چند ہزار بیرونی ممالک

کے باشندے بھی رہائش پذیر ہیں۔

اس خطے کو محض محل وقوع کے لحاظ سے ہمیشہ سے ایک بہت بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ علاقہ یورپ اور ایشیا کے مابین واقع ہونے کے باعث دونو براعظموں کی تہذیب کا اکھاڑہ بنا رہا ہے۔ بالخصوص جب یورپ کے تہذیب وتمدن نے تمام عالم کو گھیر لیا ہو تو ترکی کا اس کے لئے سب سے پہلی آماجگاہ ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ مصطفےٰ کمال پاشا کی رہنمائی میں ترک نوجوانوں کی آزادی اور حریت کی تڑپ رنگ لائی اور ۱۹۲۳ء میں یہاں سلطانی اور خلافت کی بجائے جمہوریت قائم ہوئی۔ چنانچہ خلیفہ کے گرتے ہوئے استعمار کی بجائے یہاں مقبولِ عام اور متوازن جمہوری سلطنت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اتاترک کی تمام سعی سے ملک "یورپ زدہ ہو گیا" مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اس خطے کے لوگوں میں ایک دم محنت کا مادہ پیدا ہوا۔ اور ملک زراعت، صنعت، تجارت اور علم وتعلیم غرضیکہ ہر لحاظ سے ترقی کی راہوں پر گامزن ہو گیا۔

مثال کے طور پر آپ کسان ہی کی زندگی کو لیجے۔ جمہوری حکومت سے مستفید ہونے میں وہ کسی دوسرے گروہ سے پیچھے نہیں ہے۔ وہ کون سی امداد ہے کہ حکومت کی طرف سے اسے حاصل نہیں ہے۔ زراعت سے متعلق حکومت کے ماہر کارندے اسے مفت مشورہ دینے پر مامور ہیں۔ اسے زراعتی اوزار اور مویشی خریدنے میں حکومت مالی امداد بہم پہنچاتی ہے۔ اور ٹریکٹر ایسی چیزیں کھیتی کے لئے حکومت کی طرف سے ملتی ہیں۔ ہر قصبے اور قریے میں کسان اور اس کے کنبے کی امداد کے لئے مراکز قائم کر دئے گئے ہیں۔ اسے کفایت شعاری اور امداد باہمی سے آشنا کیا گیا ہے۔ کسان کی مجموعی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اگر وہ نہیں بدلا۔ تو بیاہ شادی کے سلسلے میں نہیں بدلا۔ دیہات میں شادی کا گٹھ جوڑ کرانے والے بزرگ وہی دیرینہ اہمیت اور عظمت رکھتے ہیں۔ تعلیم کی نعمت سے دیہی علاقہ جات مالا مال ہیں۔ تمام ترکی میں پرائمری تعلیم جبری ہے اور بلا فیس۔

دیہات کی نسبت شہروں میں زیادہ تغیر نظر آتا ہے۔ کوئی زمانہ تھا کہ انقرہ دولاکھ
یک معمولی سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ جہاں ہفتہ میں صرف تین ریل گاڑیاں آتی اور جاتی تھیں۔
ور آبادی کے ہر طرف دلدل اور گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر اب ۲۵ یا ۲۶ سال کے عرصے
میں یہی شہر ایک اہم سرکاری مرکز میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کی آبادی اس وقت دو
ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ جس میں زیادہ تر دفتری لوگ آباد ہیں۔ یا سفارت خانوں
سے متعلق دنیا۔ اب دلدل، سڑاند اور گندگی کے بجائے ہر طرف فلک شگاف عمارات۔ بہت
حسین سڑکیں۔ بے نظیر اسکول اور کالج۔ ورزش گھر۔ ریڈیو اسٹیشن۔ تارگھر اور ڈاکخانہ جات۔
ہسپتال۔ زراعت اور صنعت کے ادارے نظر آتے ہیں تعلیمی ادارے بالخصوص اسکول بہت
اعلیٰ درجہ کے ہیں۔

استنبول جسے پہلے قسطنطنیہ کہا جاتا تھا تعلیمی لحاظ سے انقرہ سے بہتر ہے۔ ترکی کا
یہ بلدیہ مشرقی دنیا میں ہمیشہ سے علم کا مرکز رہا ہے۔ یونیورسٹی کے قیام کے باعث اس کی
اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ طلبا کے بسنے کے لئے یہ شہر بہت ہی عمدہ ہے۔ یہ باسفورس
کے دونو طرف آباد ہے۔ اور یہاں مشرق و مغرب کے تمدن ٹکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
پرانے استنبول میں مساجد' مقبرے' گنبد اور مینار سر بلند ہیں۔ اور اس کے برخلاف
نئے شہر میں سمندر میں نہانے کے تالاب' جہازوں کے ٹھہرنے کی جگہیں' بنکوں کی عمارات'
تجارتی مرکز اور دفاتر قابلِ دید ہیں۔ شہر کی آبادی دس بارہ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ زیادہ تر
رونق یا تو طلبا کے باعث ہے یا صنعت کاروں کے مشاغل کی وجہ سے۔ صنعت زیادہ تر
مندرجہ ذیل اشیا کی ہے۔ تمباکو کو صاف کرنا اور باہر بھیجنے کے لئے تیار کرنا۔ سگریٹ سازی۔
شیشہ سازی۔ جہازوں کی مرمت۔ چمڑہ رنگنا اور اسے کمانا۔ الکحل اور تیزاب تیار کرنا۔ اسکے
علاوہ ماہی گیری کا کام بہت وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے۔ ترکی کی مچھلی کی ایک دو قسمیں دنیا میں
اعلیٰ ترین شمار کی جاتی ہیں۔

جمہوریہ ترکی میں سب سے زیادہ پیداوار پھل کی ہے۔ لہذا یہاں کی صنعت میں
پھل اور زیتون کا تیل بہت ہی مشہور ہے۔ تجارت خارجہ زیادہ تر انہی دو اشیا پر
ہے۔ ہر سال ۲۳۰۰۰ ٹن تیل اور ۴۱۰۰۰ ٹن انجیر خشک دساور کو بھیجی جاتی ہے۔
ت زیادہ تر ازمیر کے راستہ ہوتی ہے۔ جسے پہلے سمرنا کہا جاتا تھا۔ اس بلدیہ میں
کافی تعداد میں آباد ہیں۔ مگر پھلوں کا تمام کام ترک کسانوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی
سادہ تو ہے مگر ہے مطمئن۔ وہی پھلوں کو توڑتے ہیں۔ چنتے ہیں اور باہر بھیجنے کے لئے
میں بند کرتے ہیں۔ یہ کام زیادہ تر عورتیں کرتی ہیں۔ فیکٹریوں میں بنچوں کے اوپر بیٹھ کر وہ
ن مصروف رہتی ہیں۔ اکثریت کا لباس وہی مشرقی وضع کا ہے۔ مگر نوجوان طبقہ یورپین
اختیار کرتا جا رہا ہے۔ زیتوں کے تیل کا کام بھی ترک مزدوروں کے ہاتھ میں ہے تیل
فی مقدار ملکی استعمال کے لئے رکھ لی جاتی ہے۔ اور باقی باہر بھیجی جاتی ہے۔ ترکی میں یہی
صابون بنانے کے کام بھی آتا ہے۔ ازمیر گو خشک پھلوں کی تجارت کے لئے مشہور ہے
ہاں دیگر اشیا کی تجارت بھی بکثرت ہوتی ہے۔ مثلاً انجیر، تمباکو، گندم، جو، مکی، بغیر بیج
پھل، تربوز، افیون اور قالین۔

ازمیر ترکی میں شہری زندگی کے لحاظ سے تیسرے درجہ پر ہے۔ تاہم اس میں
ری پن کم ہے۔ اور دیہی زندگی کی جھلک زیادہ ہے۔ استنبول۔ انقرہ اور ازمیر کو چھوڑ کر
تمام ملک کسانوں سے آباد ہے۔ اگر تینوں شہروں کی ۱۶ لاکھ آبادی کو نکال دیا جاوے
اقی ملک کی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ آبادی کسانوں پر مشتمل ہے یعنی ۹۰ فی صدی آبادی کا
ارہ زراعت پر ہے۔ شہروں میں مغربی تہذیب و تمدن کے آثار نظر آتے ہیں۔ مگر دیہات
مشرقی وضع نمایاں ہے۔ ہر دو طبقوں میں انداز بود و باش اور تعلیم کے باعث بھی امتیاز
یاں ہے۔ مگر دونو طبقوں کا قومی مطمح نظر اور نسلی خاصہ ایک سا ہے۔

گرمیوں میں کسان علی الصباح اٹھتا ہے اور کھیتوں میں شام تک کام کرتا ہے۔ مگر

موسم سرما میں گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سردی کے ختم ہوتے ہی وہ زمین کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے کھیتوں میں راتیں گذارنے کے لئے مٹی اور پتوں کی اپنے لئے جھونپڑی تیار کرلیتا ہے۔ اگرچہ یہ مسکن غریبانہ ہوتا ہے۔ مگر اندر سے صاف ستھرا اور پُرسکون ہوتا ہے۔ چھت کو بارش کے پانی سے محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ کسان کا تمام کنبہ فوراً اپنی چارپائیاں بھیڑ کی کھالیں اور کمبل لے کر وہاں پہنچ جاتا ہے۔ کنبہ عام طور پر پانچ سے دس افراد تک کا ہوتا ہے۔ ہر فرد کھیت میں کام کرتا ہے۔ کسان اور بیکاری تو دو متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں بعض اوقات کام کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دوسرے کسانوں کو بھی مدعو کرلیا جاتا ہے۔ اور انہیں منافع میں سے یکساں حصّہ دیا جاتا ہے۔ کنبے کے مختلف افراد میں سے عورتیں سب سے زیادہ جسمانی کام کرتی ہیں۔ مرد تو زیادہ تر اتنا ہی کرتا ہے کہ گذشتہ سال کی کمائی میں سے بیج اور کھاد وغیرہ خرید دے۔ بعض کسان انگور کی بیلوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ بعض تمباکو کے کھیتوں میں اور دوسرے گندم اور جو وغیرہ اُگانے میں۔ خواہ کوئی بھی زراعتی کام ہو۔ کسان بیحد محنت سے کام لیتا ہے۔ آبپاشی کی نہروں کو درست کرتا ہے۔ یا کنوؤں اور ندیوں سے پانی کھینچتا ہے۔ اگر پانی کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکے۔ تو نقصان کا احتمال بھی ہے۔ کیونکہ ترکی میں بعض اوقات گرمیوں میں قطعاً کوئی بارش نہیں ہوتی۔

کسان کو مالی امداد زراعتی بنکوں سے بھی ملتی ہے۔ اور دیہی امداد باہمی کی انجمنیں تو عام ہیں۔ مگر تمام مالی امداد لاحاصل ہوجاتی ہے۔ اگر کسان خود کھیتی باڑی میں رات دن کی محنت سے کام نہ لے۔

کسان کی شام و پگاہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ لہذا ہم اس کا تھوڑا سا اور ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ صبح صادق سے کچھ لمحات بعد کسان کام شروع کردیتا ہے۔ دن کے شروع ہوتے ہی ترکی قہوہ پیا جاتا ہے۔ قہوے کے ساتھ سادہ ڈبل روٹی کا پھانک بکری کے دودھ کا پنیر اور کچھ زیتون استعمال کیا جاتا ہے۔ دوپہر کے وقت سب کنبہ پھر کھانے

کے لئے جمع ہوجاتا ہے۔ یہ کھانا زیادہ تر اناج (روٹی) پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ خشک پھل کا شوربہ۔ اُبلے ہوئے گوشت کا ٹکڑا یا بُھنا ہُوا چوزہ کھایا جاتا ہے۔ رات کے کھانے میں زیادہ تر دہی اور دُودھ استعمال کیا جاتا ہے۔ تمام تر کھانا کوئلوں کی انگیٹھی پر تیار کیا جاتا ہے۔ روٹی یا ڈبل روٹی بھٹی میں تیار کی جاتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کسان چائے، قہوہ اور کھانڈ کے علاوہ باقی تمام ایسی اشیاء خوردنی استعمال میں لاتا ہے۔ جو اس کی جائے رہائش کے ۵۰ گز اندر پیدا ہوتی ہوں۔ مکی کا آٹا اگر پاس نہ ہو۔ تو چکی والے سے کسی اور شے کے عوض لے لیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ کہ قریب ہی کھیتوں میں ندیوں کے اُوپر جگہ جگہ آٹا پیسنے کی چکیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ کسان بکریوں سے دُودھ حاصل کرتا ہے۔ بھیڑوں سے گوشت۔ اور مُرغ تو کسی وقت بھی پکڑ کر ہنڈیا میں ڈالے جاسکتے ہیں۔ بہیتِ مجموعی ترکی کے کسان کی زندگی معاشی لحاظ سے اچھی ہے۔ اور اسے وہ خود بھی پسند کرتا ہے۔

فصل کے پکنے پر اسے کاٹ کر منڈی میں بھیج دیا جاتا ہے۔ سال بھر کی محنت برآنے پر ایک اچھی خاصی دعوت رچائی جاتی ہے۔ ایک بھیڑ کو ذبح کر کے بھونا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ راکی (انگور سے نکالی ہوئی شراب) کی چند بوتلیں رکھی جاتی ہیں۔ کھیتوں میں ایک جگہ کام کرنے والے تمام افراد اس دعوت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس جشن کے فوراً ہی بعد کسان کا کنبہ سب کچھ سیٹ کر اپنے گھر کی راہ لیتا ہے۔ تاکہ موسم سرما آرام سے گذار سکے۔ مویشیوں کے لئے چارہ جمع کر لیا جاتا ہے۔ چائے، قہوہ اور چینی اور کافی مقدار میں آٹا بھی ذخیرہ کر لیا جاتا ہے۔ اگر حالات اجازت دیں تو کسان ایامِ سرما میں بھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ مثلاً بھیڑ اور بکری کے دُودھ سے پنیر بنانا ہی ان دنوں اس کا محبوب مشغلہ ہوجاتا ہے۔

اساتذہ کی تربیت گاہوں میں تحقیق و تدقیق کے شعبہ کی ضرورت

قاضی عبدالقدیر

موجودہ زمانے میں جبکہ تمام اقوام عالم علمی ارتقاء کے مدارج نہایت سرعت کے ساتھ طے کر رہی ہیں۔ اور جملہ ممالک میں تعمیم تعلیم کا چرچا ہے۔ یہ امر مسلّم الثبوت ہے کہ "قومی زندگی کی روح تعلیم ہے"۔ ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ ہر ملک کی ترقی کے لئے کئی ایک اور ضروری امور بھی ہیں۔ مگر جہاں تک مجموعی ترقی کا سوال ہے۔ صرف تعلیم ہی ایک اشد طور پر ضروری چیز دکھائی دیتی ہے۔ جس پر قومی اور ملکی ترقی کا دارومدار ہے۔ اِسی کی بدولت ملک میں قابل منتظم اور مہتمم پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اور انجینئر بنتے ہیں۔ وکلا اور اُدبا نکلتے ہیں۔ بساطِ سیاست و تجارت کی رونق اِسی سے ہے۔ اختراعات اور ایجادات اِسی کی مرہونِ منت ہیں۔ غرضیکہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی اِسی کی روشنی میں کامیاب ہے۔ یہ ایک بیّن حقیقت ہے۔ کہ جو قوم تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئی وہ کشمکشِ حیات میں گویا پسماندہ اور ناکام رہی ایسے زمانے میں اہلِ پاکستان کی تعلیمی حالت کا جائزہ صاف صاف بتا رہا ہے۔ کہ یہاں اَن پڑھوں کی اکثریت ہے۔ بالخصوص ہمارے مغربی پنجاب میں تو یہ تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ

ہے۔ لوگوں میں تعلیم کے حصول کے لئے دلچسپی ہی نہیں پائی جاتی۔ اس کے اسباب وعلل تو بہت سے ہیں مگر یہاں اُن کے شمار اور تشریح کا محل نہیں ہے۔ اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے مدارس کی دقیانوسی ڈگر اور رائج الوقت طریقہ ہائے تعلیم کی ناکامی ہی ہمارے لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے سے متنفر کر رہی ہے۔ موجودہ تعلیم کے محاسن و معائب پر بھی یہاں بحث نہیں کی جاسکتی۔ مگر یہ کہنے کے بغیر چارہ کار نظر نہیں آتا کہ موجودہ تعلیم زمانہ قدیم کی تعلیم کی طرح خشک اور بے فائدہ ہے۔ معلم اپنا فرض یہی کچھ سمجھتا ہے کہ بچوں کو درسی کتابیں رسمی طور پر پڑھادے۔ اور بوقت ضرورت رٹے ہوئے اسباق سُن لے۔ اُس کی سب سے بڑی غرض بچوں کو آنے والے امتحان کے لئے تیار کر دینا اور اچھا نتیجہ دکھا کر سالانہ ترقی کے ملنے کا جواز پیدا کرنا ہے۔ غرض حصولِ تعلیم کا ایسے پست درجہ میں جامد ہو کر محدود ہو جانا کسی حد تک استاد کی مفلسی اور قوم کی اس کی طرف سے بے توجہی کی وجہ سے بھی ہے۔ مگر سب سے بڑا سبب اساتذہ کی اپنی ناقص تربیت ہے۔

ہمارے ہاں تربیت لینے والے اساتذہ کا حال بہت زیادہ محتاجِ وضاحت نہیں ہے انہیں بھی دورانِ تربیت میں چند ایک فرسودہ کتابوں پر عبور حاصل کرنے کے سوائے اور کوئی فکر نہیں ہوتا۔ اُن کی توجہ اِسی تنگ دائرے میں سارا سال محدود رہتی ہے۔ کہ کسی طرح اُن طرقِ تعلیم کو رٹ لیا جائے۔ جن کے بارے میں امتحانی سوالات پے درپے آرہے ہیں۔ جہانتک میرا ذاتی تجربہ ہے اساتذہ کی تربیت مدارس کے تلامذہ کی تعلیم وتربیت سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ کیونکہ جو کتب اور اصولِ تعلیم ترقی یافتہ ممالک ترک کر چکے ہوتے ہیں اُنہیں ہمارے ہاں رواج دے دیا جاتا ہے۔ اور ہم ہیں کہ اندھا دُھند اُن کی تقلید میں اُن کی مسترد کی ہوئی تجاویز پر بڑے زور و شور سے عمل پیرا ہیں۔ اوّل تو ہمارے بننے والے اساتذہ میں جنہیں تربیت گاہ سے نکلتے ہی قوم کی کشتی کا ناخدا بننا ہے بنیادی قابلیت کا مکمل فقدان ہے جس شخص کو تلاشِ معاش میں اور کوئی شعبہ قبول نہیں کرتا۔ وہ بچارہ مدرس بننے کے لئے سعی کرتا ہے۔ گویا پیٹ

کی پرورش کا آخری حربہ یہی ہے کہ جلد اور کچھ نہ ہی استاد ہی بن جاؤ۔ اسی سے اس قابل قدر فن کی کس مپرسی اور بیچارگی کا اندازہ کیجیے۔ جہاں استاد کے سامنے تصویر ہی ہو۔ وہاں ایسے اساتذہ سے تربیت یافتہ طلبا کی قابلیت کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور وہ طلبا آئندہ پروگرام میں قوم کا ہاتھ کیا بٹا سکتے ہیں کیسی فن کی ادنٰے سے ادنٰے تربیت گاہ میں چل کر دیکھئے تو معلوم ہوگا۔ کہ تربیت کے دوران میں اصولِ فن عملی طور پر سیکھنے والے کے سامنے ہوتے ہیں۔ اور زیادہ وقت اُن کا عملاً کام کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ جس سے مقصود کئی ایک چیزیں ہوتی ہیں۔ اور سب سے ضروری یہ کہ اُن کو آئندہ چل کر عملی مشکلات نہ پیش آئیں۔ دوسرے یہ کہ فن کی خاصی مشق حاصل ہو اور وُہ عملی طور پر ماہر ہو کر تربیت گاہ سے باہر جائیں۔ تاکہ مفید کام بخوبی کرنے کے قابل ہوں۔ تیسرے یہ کہ حواس کی تربیت پوری طرح ہو سکے۔ دُور کیوں جائیں۔ ایک معمولی لوہار یا درزی کے شاگرد کو اس کی دکان پہ تربیت حاصل کرتے ہوئے مشاہدہ کرنے سے یہ امور بخوبی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اِس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ڈاکٹروں اور انجنیئروں کی تربیت گاہوں کا مشاہدہ بتا سکتا ہے۔ کہ تربیت سے مُراد عملی تحقیق ہے۔ حالانکہ استاد کی اچھی اور مکمل تربیت ڈاکٹروں اور انجنیئروں سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہی ڈاکٹر اور یہی انجنیئر ابتدائی طور پر انہی اساتذہ سے تعلیم پاتے ہیں۔ اور اُن کے بنیادی جوہر اُنہی استادوں کی کوشش سے بیدار ہو سکتے ہیں۔ مگر ہمارے اساتذہ کی تربیت سراسر یہیں تک محدود ہوتی ہے۔ کہ وُہ محض قیاسات اور آرائے متقدمین کو ازبر کر لیں۔ اور کمرۂ امتحان میں اُگل دیں۔ چنانچہ مشاہدہ بتا رہا ہے۔ کہ وہ اصولِ تعلیم اور نفسیات کے مقالات جو تربیت گاہوں میں بڑی جانفشانی سے رٹے جاتے ہیں۔ امتحان کے بعد بیکار تصور ہو کر طاقِ نسیان کی زیبائش ہو جاتے ہیں۔ اور استاد پھر وہی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ جو آج سے ایک صدی پیشتر رائج تھا۔

| بچہ آئندہ ہونے والی قوم کی بنیاد ہے۔ استاد کے تغافل اور اُس کی اپنی تعلیمی فروگی

کے باعث یہ بنیاد اگر خام رہ جائے۔ تو تعجب کا مقام نہیں ہے۔ بچہ ہی دراصل توجہ کا مرکز ہونا چاہیئے۔ مگر ہمارے ہاں کتابیں ساری توجہ کا مرکز بن کر رہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدرسین خود بھی امتحانات کی تیاری کے لئے صرف یہی کچھ کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اساتذہ کو بجز اسکے اور کوئی چیز معلوم ہی نہیں ہوتی۔ بچہ تو استاد کے ہاتھ میں خام مصالحہ کی طرح ہوتا ہے۔ آپ نے کوئی کاریگر دیکھا ہے جس نے بلا سوچے سمجھے اپنے مصالحہ کو کاٹنا چھانٹنا اور کوٹنا گھڑنا شروع کر دیا ہو۔ درزی کپڑے کو لے کر ناپتا ہے۔ اس کے طول و عرض کو مطلوبہ لباس کے مطابق پاکر پھر قطع و برید کے لئے غور و فکر کرتا ہے۔ سیدھا اُلٹا پہچان کر گاہک کے قد و قامت کا جائزہ لے کر پھر کام شروع کرتا ہے۔ یعنی ایک عرصہ اُسے اپنے خام مصالحہ پر غور کرنے کے لئے درکار ہے۔ مگر مدارس میں جا کر دیکھئے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ بچوں کا استاد۔ استاد نہیں ہے بلکہ سب کو ایک سا ہانکنے کے لئے ڈنڈا ہی استاد ہے۔

اب وقت اور قومی مفاد کا اقتضا ہے کہ استادوں کی تمام تربیت گاہوں میں تحقیق و تدقیق بھی ساتھ ساتھ ہو۔ تربیت لینے والے اساتذہ کو درسی اصولوں کے پرکھنے کا عملی موقع حاصل ہو وہ جستجو کر کے نئے اصول وضع کریں۔ اس شعبے میں مفید مطلب چیزیں مہیا رکھی جائیں۔ اسی شعبہ کے ساتھ ایک معمل کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جہاں تجربات کئے جائیں۔ ہر قسم اور ہر عمر کے بچوں کا نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے۔ اور نتائج کو جمع کیا جائے۔ تاکہ کسی خاص طریقہ تعلیم کی کامیابی کا پورا پورا اندازہ ہو سکے۔ فن تحقیق و تدقیق کے نتائج شائع کئے جائیں۔ مقالات لکھے اور پڑھے جائیں تحقیقاتی مضامین کا سلسلہ جاری کیا جائے۔ مروجہ طریقہ ہائے تعلیم میں مفید اضافہ کرنے والوں یا اصول دریافت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ انہیں حصولِ ملازمت میں اور ترقی دینے میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔ جسمانی اور اخلاقی تربیت کے معاملات بھی اسی غور و تفحص اور اہتمام کے مستحق ہیں۔

اگر ایسے ضروری اور سود مند شعبے قائم کر لئے جائیں۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ اساتذہ

غفلت شعاری کو چھوڑ کر تجسس اور تفکر کے زیور سے آراستہ ہو کر تربیت گاہ سے نہ نکلیں۔ تجسس کی بدولت ہی محنت کی عادت پیدا کی جا سکتی ہے۔ محنت کی عادت سے بے کار مشاغل سے نجات ہو سکتی ہے۔ اور بے کار اور بیہودہ مشاغل سے باز رہ کر اساتذہ بلند ہمت اور با اخلاق ہو سکتے ہیں۔ گویا صحیح معنوں میں قومی راہنمائی کے لئے استاد بن سکتے ہیں ٭

"پنیری کلاس"

مفتی محمد اقبال

جب سے محکمۂ تعلیم کے ارباب بست وکشاد نے جماعت اوّل کے تعلیمی کورس کو ایک سال کی قید میں مقید کر دیا ہے۔ اکثر مدارس میں پنیری کلاسوں کا ظہور ہوا ہے۔ چنانچہ جب مدارس میں معائنہ کے لئے جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ تو کئی بچے غیر داخل شدہ بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بیکار بیٹھے نظر آتے ہیں۔ جن کے متعلق استفسار پر بتلایا جاتا ہے۔ کہ یہ ننھی پود بطور پنیری کے تیار کی جا رہی ہے۔ ان میں سے اکثر بچے اِسی پنیری جماعت میں ایک سال سے لے کر تین سال تک رہنے کے بعد یا تو مدرسہ کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ یا اگر قسمت اُن کی یاوری کرے تو وہ باقاعدہ طور پر جماعت اوّل میں داخل کر لئے جاتے ہیں۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سال کے قلیل عرصے میں جماعت اوّل کے تعلیمی کورس کو انتہائی شاندار کامیابی سے مکمل کر کے مدرسہ اور مدرس ہر دو کے لئے باعثِ عزت و افتخار بنتے ہیں۔

ذیل کے مضمون میں ہمیں اِن پنیری کلاسوں کے فوائد اور مضرت رسانی پر بحث کرنا ہے اور سوچنا ہے کہ کیا ان جماعتوں کا موجودہ حیثیت میں قائم رکھنا مفید ہے۔ یا انہیں فی الفور بند کر دینا مناسب ہے۔ ہمارے مدارس جن میں مکانیت۔ سامان اور مدرسین کی ہمیشہ سے کمی چلی آ رہی ہے

ایسے تجربے ہرگز مفید نہیں ہیں۔ کہ ننھے بچوں کو بغیر نگرانی اور توجہ کے اُن میں بٹھا جاوے۔ چنانچہ جب بچے بغیر داخلہ کے مدرسہ میں بٹھلائے جاتے ہیں۔ تو اوّل تو اُن کی طرف کبھی یہ دھیان ہی نہیں دیا جاتا۔ کہ وہ کب آتے ہیں۔ کیوں آتے ہیں اور کب چلے جاتے ہیں۔ نہ ہی مدرسہ میں کوئی مدرس اس کام کے لئے موجود ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کاہل۔ لڑاکے۔ آوارہ مزاج اور کھلنڈرے بن جاتے ہیں۔ مدرسہ اُن کے لئے ایک ایسا کھیل کا میدان بن جاتا ہے جہاں وہ مدرس کی جھڑکیوں۔ گالیوں اور تھپڑوں کے درمیان کبھی کبھار ایک آدھ حرف پڑھ لیتے ہیں۔ اور لکھ لیتے ہیں۔ ورنہ جب تک وہ مدرسہ میں رہتے ہیں۔ جبری طور پر خاموش اور گم سُم بیٹھے رہنے پر مجبور رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ عام طور پر مدرسہ کے لئے اُن کے دل میں کوئی شوق اور دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اور اگر قوت انجذاب اُن کو اپنی طرف کھینچے بھی تو چونکہ وہ ایک عرصہ تک بیکاری کے خوگر بن چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی بہتر نتائج مترتب نہیں ہوتے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے۔ کہ جماعت اوّل سے جماعت دوم میں ترقی پا چکنے کے بعد ایک طالب علم نہ تو آسان الفاظ کو درست پڑھنے پر قادر ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اُس کی تحریر میں کچھ ترقی کے آثار ہویدا ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جماعت اوّل کی تعلیم خام رہی ہے۔ اور بنیاد ناپختہ رہی ہے۔ اپنی خامی اور ناپختگی کی بڑی وجہ نیری کلاسوں کا وجود ہے۔

محکمہ ایک عرصے سے اس فکر میں ہے کہ پرائمری کورس بجائے چار سال کے پانچ سال کا کر دیا جائے۔ اور محکمہ کے منشا کے مطابق جماعت پنجم کو بھی پرائمری کورس میں شامل کر لیا جانا ضروری ہے۔ میری ناقص رائے میں جس پنج سالہ کورس کی اِس وقت پاکستان میں ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جماعت اوّل میں ادنےٰ جماعت کے لئے ایک سال وقف کر دیا جائے۔ اور جماعت اعلےٰ کے لئے دوسرا سال اور اس دوسرے سال میں قاعدے کے علاوہ اُردو کی ایک کتاب کی تعلیم بھی ضروری قرار دی جائے۔ گویا بالفاظ دیگر

جماعت دوم میں اُردو کا قاعدہ حصہ دوم اور اُردو کی پہلی کتاب ہر دو پڑھائے جائیں جماعت سوم میں جماعت دوم کے معیار کی ایک کتاب اور جماعت سوم کے معیار کی ایک کتاب پڑھائی جائے۔ اور جماعت چہارم میں جماعت سوم کے معیار کی ایک کتاب اور جماعت چہارم کے معیار کی ایک کتاب پڑھائی جائے۔ جماعت پنجم میں جماعت چہارم کے معیار کی ایک کتاب اور جماعت پنجم کے معیار کی ایک کتاب تدریس میں شامل کی جائے۔ اِس طرح جماعت پنجم پاس کر چکنے کے بعد ایک لڑکا ضرور اِس قابل بن جائے گا کہ وہ آسان خطوط۔ آسان مضامین اور آسان کہانیاں لکھ سکے۔ اور اپنے مافی الضمیر کو آسان الفاظ میں ادا کر سکے۔ موجودہ وقت میں اِن امور کے فقدان کی بڑی وجہ ہماری جماعت اوّل کی ناپختگی اور باقی جماعتوں میں بہت تھوڑی درسی کتب کی تعلیم ہے۔

پنیری کلاسوں کے بند کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہمیں جماعت اوّل کے لئے داخلہ کے لحاظ سے مدارس میں مدرسین مقرر کرنے ہوں گے۔ اور اس طرح بچے بیکار نہ رہنے پائینگے نیز داخلہ کے متعلق بھی محکمہ کو اِس بات پر زور دینا ہوگا۔ کہ سہ ماہی اول یعنی اپریل۔ مئی اور جون کے مہینوں میں داخلہ مکمل کر لیا جاوے۔ تاکہ اکتوبر اور نومبر تک کے مہینوں کیلئے کوئی لڑکا خواہ مخواہ غیر داخل شدہ نہ بٹھلایا جاوے۔ بلکہ اور بھی انسب ہوگا۔ اگر جماعت اوّل میں داخلہ کے لئے وقت کی قید اُڑا دی جائے یعنی جب کوئی لڑکا داخلہ کے لئے آئے اُسے اُسی وقت داخل کر لیا جائے۔ ایسا کرنے میں ایک دشواری ضرور ہوگی۔ اور وہ یہ کہ جو لڑکے ستمبر کے بعد داخل ہوں گے۔ اُن کو ایک مختلف گروپ میں رکھنا پڑے گا۔ اور اس طرح جماعت اوّل مختلف ٹولیوں اور مختلف الاسباق بچوں میں منقسم ہو کر رہ جائے گی لیکن میری ناقص رائے میں یہ خطرہ محض خیالی ہے۔ مدرسین کو جب یہ معلوم ہو جائیگا کہ وہ کسی بچے کو غیر داخل شدہ حالت میں نہیں رکھ سکتے تو پھر وہ یہ کوشش کریں گے۔ کہ داخلہ سال کے شروع میں ہی مکمل کر لیا جاوے۔

لازمی تعلیم کے رقبہ کے مدارس میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ افسران لازمی تعلیم
زمی تعلیم کو مفید اور کامیاب ظاہر کرنے کے لئے مدرسین کو مجبور کرتے ہیں۔ کہ وہ چھوٹی عمر
ے بچوں کو بڑی عمر کے بچے ظاہر کر کے مدرسہ میں داخل کر لیں۔ ایسا کرنے سے تعداد میں
ستدبہ اضافہ تو ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن تعلیمی پستی کے لئے میدان ہموار ہو جاتا ہے۔ اور
س کا نتیجہ "تا ثریا می رود دیوار کج" پر منتج ہوتا ہے۔

لہٰذا میں سفارش کروں گا۔ کہ

۱۔ نرسری کلاسوں کو بالکل بند کر دیا جاوے اور کوئی لڑکا جماعت اوّل میں چھوٹی
ُرکا اور غیر داخل شدہ ہرگز بیٹھنے نہ دیا جاوے۔

۲۔ جماعت اوّل کا داخلہ تمام سال کھلا رہے لیکن مدرسین کو ہدایت یہ ہو کہ وہ سہ ماہی
وّل میں ہی داخلہ مکمل کریں۔ جو لڑکے اِس کے بعد داخل کئے جائیں اُن کے لئے رجسٹر
حاضری کے خانہ کیفیت میں وجہ درج کی جاوے کہ وہ سہ ماہی اوّل میں ہی کیوں داخل
نہ کئے گئے۔

۳۔ جماعت اوّل میں اُردو کا قاعدہ حصہ اوّل ختم کیا جاوے۔ اور خوشخطی۔ ۱۰ × ۱۰
ک پہاڑے اور سَو تک گنتی کو مکمل کیا جاوے۔ قاعدہ جوڑ کے ذریعہ سے پڑھایا جاوے۔
رطے کی طرح رٹنا موقوف کیا جاوے۔ بچے حروف شناسی میں ماہر ہوں اور جو حروف
ور الفاظ اُنہوں نے پڑھے ہوں۔ وہ جہاں کہیں اُن کو لکھے نظر آئیں۔ وہ پڑھ سکیں۔

۴۔ جماعت اوّل میں تعداد ۳۵ سے زیادہ نہ ہو۔ اور تمام مدارس ہی جماعت
اوّل کی تعلیم کے لئے تعداد کے لحاظ سے سٹاف مکمل دیا جاوے۔

۵۔ جماعت اوّل میں ادنےٰ اور اعلےٰ فرق کی تفریق مٹا دی جائے۔ جو لڑکے
سہ ماہی اوّل میں داخل ہوں۔ وہ سب کے سب مزید اگلی جماعت میں ترقی
پائیں۔

۶۔جماعت اوّل کی تعلیم دینے والے مدرسین کو دوسرے مدرسین کے مقابلہ میں
زیادہ تنخواہ دے کر اس جماعت کی اہمیت اور فوقیت کو واضح کیا جاوے۔

۷۔جماعت ہائے دوم۔سوم۔چہارم۔پنجم کے موجودہ نصاب میں مناسب
تبدیلیاں کی جاویں۔جیساکہ اُوپر بیان کیا جاچکا ہے۔اور زیادہ کام نصاب میں تج
کیا جاوے۔موجودہ وقت میں بہت تھوڑا کام کرایا جاتا ہے۔

۸۔تعلیم بذریعہ کھیل۔چارٹس۔کھلونے۔متحرک کہانیاں تعلیمی لحاظ سے
نمائش کی حیثیت رکھتی ہیں۔اِن کی بجائے جماعت اوّل میں حروف کے جوڑ پر
دیا جاوے اور حروف شناسی میں اتنی مشق کرائی جاوے۔کہ لڑکے اُن حروف
ہر جگہ اور ہر وقت بلا دِقّت پہچان سکیں۔

چونکہ جماعت اوّل ہماری بنیادی جماعت ہے۔اور ننھی پود کو مدرسہ
روشناسی کرنے کی پہلی منزل ہے۔لہٰذا اِس طرف ہماری بہت زیادہ توجہ
ضروری ہے۔جو موجودہ وقت میں نہیں دی جارہی ؏

جنگلات کی اہمیت

صلاح الدین احمد

تاریخِ عالم میں شروع ہی سے حضرتِ انسان کی وابستگی جنگلات سے پائی جاتی ہے۔ کسے معلوم نہیں کہ انسان کی پہلے پہل بودوباش جنگلوں میں تھی۔ انسان جنگل سے ہی خوراک حاصل کرتا تھا۔ پہلے پہل تو جنگلی پھلوں میں بسر اوقات کیا کرتا تھا مگر کچھ عرصہ بعد جنگلی جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتا رہا۔ اُن دنوں انسان کی پوشاک یا تو درختوں کے پتوں اور چھلکوں تک محدود تھی اور یا جنگلی جانوروں کی کھال پہن لی جاتی تھی۔ براعظم افریقہ کے بعض گھنے جنگلوں میں آج تک ایسے انسان رہتے ہیں۔ جو کہ پہلے کی طرح اپنی بودوباش جنگلوں میں رکھتے ہیں۔

جُوں جُوں انسان کی آبادی بڑھتی گئی تُوں تُوں اس کی ضروریات بڑھتی چلی گئیں۔ اب انسان نے کھیتی باڑی کے طریقے سیکھ لئے تھے۔ چنانچہ جنگلات کاٹ کاٹ کر یا آگ لگا کر زمین کو کاشت کیا جانے لگا۔ بعض اوقات جنگلوں کو صرف اِس لئے آگ لگا دی جاتی تھی۔ کہ جنگلی جانور آبادی سے دُور بھاگ جائیں۔ یہ سلسلہ بہت عرصہ تک

جاری رہا ۔ آبادی بڑھتی چلی گئی ۔ اور انسان کی ضروریات بھی ۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ جنگلات کم ہونے شروع ہو گئے ۔ جب سطح زمین کے ہر حصے میں انسان آباد ہو گیا ۔ تو ممالک کا ظہور پذیر ہوا ۔ اور پھر جب ایک ملک کی آبادی بہت بڑھ جاتی تھی ۔ یا اُس ملک کے حالات لوگوں کے لئے زیادہ خوشگوار نہیں رہتے تھے ۔ تو ایسے لوگ دوسرے ملکوں پر حملہ آور ہوتے تھے ۔ اور اپنے سے کم طاقتور لوگوں پر غلبہ پا لیتے تھے ۔ انسان کی اِس جنگ و جدل سے بہت سے جنگلات کا خاتمہ ہوا ۔ جنگلات میں عام طور پر دشمن پناہ گزین ہوتے تھے ۔ اور اُن کو زیر کرنے کے لئے یہ ضروری تھا ۔ کہ جنگلات کو تباہ کر دیا جائے ۔ موجودہ دور کی جنگِ عظیم نمبر ۲ میں بھی برما کے محاذ پر جنگلات کی موجودگی سے لڑائی کی رفتار اور ڈھنگ پر بے حد اثر پڑا تھا ۔

آج کل آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے ۔ اور حضرتِ انسان اپنے خیالات کے مطابق اس قدر ترقی پا گیا ہے ۔ کہ دُنیا کے ہر حصے سے جنگلات بالکل ہی غائب ہوتے جا رہے ہیں ۔ اور اقوام نے اس کمی کو محسوس کیا ہے ۔ اور کسی حد تک حالت سدھر رہی ہے ۔ وہ اقوام جنہوں نے موجودہ تہذیب کا عروج دیکھ لیا ہے ۔ اب جنگلات کے بہت زیادہ قائل ہیں ۔ مثال کے طور پر امریکہ کو لیجئے ۔ شروع میں زراعتی اور صنعتی ترقی کو اِس قدر فروغ دیا ۔ کہ جنگلات کا صفایا کر دیا گیا ۔ مگر جب جنگلات کی عدم موجودگی کے نقصانات ظاہر ہونے لگے ۔ تو کفِ دست ملنے لگے ۔ ملک چونکہ دولتمند تھا ۔ اس لئے دوبارہ جنگلات لگائے گئے ہیں ۔ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے ۔ اگر یہ درست ہے ۔ تو کوئی زمانہ ایسا بھی ہو گا ۔ کہ انسان کی آبادی پھر بہت کم ہو جائے گی ۔ اور انسان پھر سے جنگلات میں قدرتی حالات کے زیرِ اثر رہنا سہنا شروع کر دے گا ۔ یہ کیسے ہو گا؟ اِس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ ممکن ہے ۔ موجودہ تہذیب کا مہلک ترین ہتھیار ایٹم بم دُنیا کی بیشتر آبادی کو تباہ کرنے کا باعث ہو ۔ بقول علامہ اقبالؒ کہ ایسی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی ۔

جنگلات صرف ایندھن اور عمارتی لکڑی ہی نہیں مہیا کرتے۔ بلکہ ان کا ملک کی آب و ہوا پر بے اندازا اچھا اثر پڑتا ہے۔ بارشیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور آندھیاں کم آتی ہیں۔ پہاڑوں پر جنگلات کی موجودگی سے بارش کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور پھر ٹھنڈے چشموں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر درخت نہ ہوں۔ تو بارش کا پانی تیزی کے ساتھ ندی نالوں میں بہہ جاتا ہے۔ اور اپنے ساتھ پہاڑوں کی زرخیز زمین بہا لے جاتا ہے۔ درختوں کی موجودگی سے ملک خوبصورت اور شاداب بن جاتا ہے۔ باغات اور درختوں کا ذکر ہر مذہب کی کتابوں میں ہے۔ اس سے انکی اہمیت ظاہر ہے اور درختوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے۔ کم ہے۔ قوم کے ہر فرد کا فرض ہے۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ درختوں کو لگائے۔ تاکہ ملک کا اور آنے والی نسلوں کا فائدہ ہو۔

خطبہ استقبالیہ کُل سرحد تعلیمی کانفرنس

(سید یحییٰ شاہ صاحب)

(کُل سرحد تعلیمی کانفرنس ۲۰-۲۱-۲۲ جون ۱۹۴۹ء کو ایبٹ آباد میں منعقد ہوئی۔ اس کے افتتاح پر سید یحییٰ شاہ صاحب نے یہ خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا۔ جو ادبی اور تعلیمی اہمیت کے لحاظ سے قارئین آموزش کی خاطر شائع کیا جاتا ہے ——— مدیر)

حضرات! یہ امر میرے لئے کتنا باعث مسرت ہے۔ کہ کُل سرحد ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے آپ کو خوش آمدید کہنے کا خوشگوار فرض میرے سپرد کیا گیا ہے۔ مَیں آپ حضرات کے اس جذبۂ خلوص و ایثار کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس کے ماتحت سرحد کے گوشہ گوشہ سے، آپ یہاں تشریف لائے ہیں میں مجلس استقبالیہ کی طرف سے آپ تمام مندوبین کا پرجوش خیر مقدم کرتا ہوں۔ ہمارے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے۔ کہ آج ہمارے درمیان وہ عالی نظر اور روشن خیال ماہرین تعلیم تشریف فرما ہیں۔ جنہیں ہماری مملکت کے مستقبل کی بنیاد رکھنا ہے۔ اس پر مستزاد یہ حقیقت کتنی مسرت انگیز ہے۔ کہ ہماری ان تعمیری سرگرمیوں میں ہماری ایسی مہربان ہستیاں

بھی دِل چسپی لے رہی ہیں۔ جن کی موجودگی ہمارے عزائم کو بلند سے بلند تر کر دیتی ہے۔ اور جن کی ذات ہائے گرامی ہماری کامیابی کی واضح دلیل ہیں۔ یہاں صوبہ سرحد کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر اور آنریبل وزیر تعلیم صوبہ سرحد نے بھی قدم رنجہ فرمایا ہے۔ یہ نہ صرف ان کی بڑی عنایت ہے۔ بلکہ ہماری انتہائی حوصلہ افزائی ہے۔

حضرات! وقت کی ایک تیز گردش نے ہماری دنیا کا نقشہ بدل دیا ہے۔ ہمیں وہ سنگین زمانہ گویا صدیوں پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ جب ہمارے ملک اور بالخصوص ہمارے صوبہ میں تعلیم کا جال محض سیاسی غرضمندی کے ماتحت بچھایا جا رہا تھا۔ ہمارے ماحول میں ایک زہریلی گھٹن بسائی جا رہی تھی۔ اور ہمارے دل و دماغ سے عزم و ارادہ کی آخری حس بھی نچوڑی جا رہی تھی۔ اب ہم آزاد ہیں! اور اس آزادی نے بڑی عظیم ذمہ داریاں ہم پر عائد کر دی ہیں۔ ہمارے سامنے ایک واضح منزل آگئی ہے۔ اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہمیں بڑے جتن کرنا ہیں۔ ہمارا ملک سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے۔ اور اس حیثیت میں اسے تمام اسلامی ممالک سے قریب تر ہونا ہے۔ ان سے یگانگت اور مؤانست کا رشتہ جوڑنا ہے۔ ادھر دنیا کی دوسری قومیں تیزی کے ساتھ ارتقاء کے مراحل طے کر رہی ہیں ہمیں شب و روز ایک کر کے ان کے درمیان اپنے لئے ایک باعزت جگہ بنانا ہے۔۔۔ اور یہ سب کچھ تعلیمی ترقی کے بغیر محال ہے۔ کیونکہ تعلیم ہی عمرانی، مدنی، ثقافتی اور سیاسی عروج کی ضامن ہے۔

معزز حاضرین! یہ حقیقت بڑی دل خوش کن ہے۔ کہ ہمارا ملک تعلیم کی اس اہمیت سے بیخبر نہیں ہے حصول آزادی کے بعد سے آج تک وقتاً فوقتاً جگہ بہ جگہ ایسی تعلیمی کانفرنسیں منعقد ہوئی ہیں جن میں ایسے مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا گیا۔ کہ کیونکر ہم پاکستان کے عوام کو صحیح اور مفید تعلیم سے بہرہ ور کر کے اپنے ملک کی ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہماری یہ کانفرنس اپنی متعین منزل کی طرف پہلا قدم نہیں ہے۔

مگر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ایک بہت بڑا تعمیری مرحلہ ہے۔ ہمارے ایجنڈے کی نوعیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے۔ کہ ہماری کانفرنس آئندہ ہونے والی تمام کانفرنسوں کے لئے شاہراہِ ترقی پر سنگِ میل کا کام دے گی۔

حضرات! آخر یہ کانفرنس سنگِ میل کیوں نہ ہوگی؟ آپ ایسے روشن دماغ اور عالی نظر مندوبین کی مخلصانہ کاوش رنگ لائے بغیر نہ رہے گی۔ پھر ہمیں اپنے رہنماؤں پر فخر ہے۔ وہ رہنما جنہوں نے حال ہی میں ہمیں اقتصادی الجھنوں سے نجات دلائی ہے۔ کل تک ہم میں احساسِ کمتری کا جذبہ ہماری زندگیوں کو گھن لگا رہا تھا۔ ہماری ہمت پست تھی۔ ہمارا عزم کمزور۔ آج ان کی بدولت ہم باوقار ہیں۔ آج ہمیں سوسائٹی میں ہمارا مقام مل گیا ہے اب ضمیر مطمئن ہے۔ ذہن مطمئن ہے۔ دل مطمئن ہے۔ تو پھر نظر بالغ اور ارادہ کامیاب کیوں نہ ہوگا یہی نہیں۔ ہمارے وہ مہربان ناخدا آج بھی ہماری کشتی کی رہنمائی پر کمربستہ ہیں۔ ان حالات میں میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ ہماری یہ سہ روزہ کانفرنس ملک کے تعمیری ارتقاء میں ضرور سنگِ میل کا کام کرے گی۔

معزز مندوبین! ہماری کانفرنس کے سامنے بڑا واضح اور ٹھوس پروگرام ہے۔ حالات بدل گئے ہیں۔ اور ہمیں بدلنا ہے۔ زمانہ ایک نئی روش پر ہو لیا ہے۔ اور ہمیں لپک کر اس کے ساتھ ہونا ہے۔ ہمارے راستہ میں دشواریاں ہیں۔ مگر ہماری ہمت دشوار پسند کو نہ ٹھٹکنا ہے، نہ جھجکنا۔ کیونکہ ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا ہے۔ اور ضرور چلنا ہے۔ ہمیں ایسے صحت مند تعلیمی رجحانات کو اپنانا ہے۔ جو اس دوڑ میں ہماری ہمت بندھاتے ہیں۔ جہاں تک تعلیم کے مقاصد کا تعلق ہے۔ میرے نزدیک اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ہر سکول میں طالب علم کی صحت اور قوت کو نشوونما پانا چاہیئے۔ اس میں کیریکٹر کی سنجیدگی اور پختگی پیدا کرنی چاہیئے۔ تعلیم کی قدر و نوعیت کے بارے میں ہمارے ہاں کتنا ہی شدید اختلاف کیوں نہ ہو۔ مگر اس نقطہ پر ہم سب متفق ہیں۔ کہ لڑکے یا لڑکی کی تعلیم میں ذہانت کا خاصہ پیدا کرنے کا ہو...

موجود ہونا چاہیئے۔ طالب علم میں محنت کا شوق، خود اعتمادی، وقت پسندی اور مستقل مزاجی اس حد تک پیدا ہو جائیں۔ کہ جب وہ اسکول سے رخصت ہونے لگے۔ تو اس کا ذہن بالکل بیدار ہو۔ اس میں سیکھنے کی ایسی خواہش پیدا ہو گئی ہو۔ جو تا زندگی مطمئن نہ ہو سکے۔

انسانی زندگی کے پیش نظر تین عظیم مقاصد ہیں۔ اور میری دانست میں تعلیم کے ہر قومی منصوبے کی تحریک انہی مقاصد کو ہونا چاہیئے۔ پہلا مقصد سیرت یا کیرکٹر کی تربیت اور اس کی مضبوطی ہے۔ دوسرا مقصد طلباء کی وہ تربیت ہے جس کے بعد وہ سعی سے محظوظ اور حصول سے مطمئن ہونے لگیں۔ ان میں موسیقی اور آرٹ کی رغبت بڑھے۔ انہیں ادبیات اور انسانی تاریخ سے لگاؤ پیدا ہو۔ تاکہ جب کبھی زندگی ان کے لئے حد سے زیادہ سنجیدہ ہونے لگے۔ تو یہ لگاؤ اور رغبت بار حیات کو ہلکا کر دیں۔ اور ان کی تنہائی کو ناقابل برداشت نہ ہونے دیں۔ زندگی کا تیسرا مقصد انسان کی طبعی ذہانت کو جاگر کرنا ہے۔ کچھ ایسے پیرائے میں کہ وہ قوم کی گوناگوں ضروریات اور پیچیدہ حالات میں کارآمد ہو سکے۔ تعلیم نہ صرف ذہن کو وسعت دیتی ہے۔ اور رجحانات میں جدت کا رنگ بھرتی ہے۔ بلکہ ان تھک اور ماہر فنی کاروں کی تخلیق بھی کرتی ہے۔

جسمانی تربیت کو ابھی تک مناسب اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ مدرسہ کا کلی فرض ہی نہیں ہے۔ کہ وہ ذہن کی تازگی اور سیرت کی پختگی کا سامان فراہم کرے۔ بلکہ وہاں جسمانی نشوونما کا کام بھی بطریق احسن سرانجام دینا چاہیئے۔ اگر مدرسہ اس شعبہ سے یونہی اغماض برتے گا۔ تو اس کا افادی حیثیت پر حرف آئے گا۔ اور وہ پھر ذہنی اور اخلاقی تکمیل بھی نہ کر سکے گا۔ کھیل کود یا ورزش سے نہ صرف بدن بنتا اور صحت ٹھیک رہتی ہے۔ بلکہ انسان کی فطری صلاحیتیں بھی روشن ہو جاتی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر تعلیم کے میدان میں پڑھائی کے علاوہ کوئی اور اہم فرض ہے۔ تو صرف یہ کہ عمدہ کھیلوں کے مذاق کو پروان چڑھایا جائے۔

تعلیم کا صحیح اور صحت مند نظریہ تو یہ ہے۔ جو ابھی میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ مگر یہاں ہمیں اپنے اساتذہ کے بارے میں بھی کچھ غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان تمام خوش آئند

خوابوں کی تعبیر انہیں کی ذات سے وابستہ ہے مجھے پورا یقین ہے۔ کہ اگر وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر لیں اور انہیں کچھ سہولتیں مل جائیں۔ تو وہ اسکول کے ڈسپلن کے تاثرات کو ہر طالب علم کی خانگی زندگی پر حاوی کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اور یوں ان کی محنت شاقہ کے طفیل ایک ایسی نسل کی تخلیق ہو جائے گی۔ جو کردار، مذاق، تربیت اور ہنر میں ان کی اَن تھک کاوشوں کا کامیاب حاصل کہلائے گی۔ صحیح تعلیم کی مؤثر تحریک اسکول کی حدود کے اندر صرف استاد کی شخصیت میں مخفی ہوتی ہے۔ ڈسپلن کا ضابطہ، درسیات کا اسلوب، پڑھائی کا سلیقہ، خواہ کتنا اکمل وغیرہ ہو۔ اس شخصیت کی جھلکیوں سے عاری نہیں ہوتے۔ جو پس منظر میں کارفرما ہوتی ہے۔ اسکول کی زندگی کے ہر شعبہ پر استاد کی شخصیت اور محنت کے اثرات حاوی ہوتے ہیں۔

استاد کے ساتھ ہی اسکول کا تخیل بھی وابستہ ہے۔ مدرسہ طبعیاتی ماحول بھی ہے تربیت ذہن کا رہنما اور روحانی معاشرہ بھی۔ مگر سوچئے تو سہی۔ کیا اس ضمن میں ہمارے ہاں اطمینان کی شمہ بھر بھی گنجائش ہے۔ کہ مشرق میں اسکول ایسا ہی ہوتا ہے۔ یا ہم میں اتنی استطاعت ہے۔ کہ اس ذخیرۂ علم اور دیگر ذرائع کی مدد سے جو ہمیں میسر ہیں۔ ہم اپنے مدارس ایسے بنا دیں۔ ذرا غور کیجئے۔ آیا ہمارے مدارس عمارت و نواح کے اعتبار سے اسی قدر صحت بخش ہیں۔ جتنا فی الواقع ہونا چاہئیں۔ کیا ان کی درسیات ہمدردانہ اور حقیقت نگارانہ ہے؟ کیا وہ تجربہ و تفحص کا نتیجہ ہے؟ کیا وہ طالب علم کی ضروریات کو ذہن نشین کر کے ترتیب دی گئی ہے۔ کیا اس میں رجعت قہقہری کا انداز نہیں ہے؟ ذرا فکر فرمائیے! کہ تنظیم و آراستگی کا سلیقہ، اساتذہ کی تعداد، تعمیر کا انداز، کیا یہ سب نپے تُلے ہیں۔ اور ہماری تعلیمی اغراض کو پورا کرتے ہیں۔ زیور علم سے مزین کرنا کوئی ساختہ پرداختہ بات نہیں ہے۔ اس میں بڑی ہوشیاری اور دانشمندی سے شاگردوں کو تجربے اور آزمائش کی باتیں سکھانی پڑتی ہیں۔ تاکہ متمدن انسانیت کی بھلائی کے لئے وہ اپنی ذہنی خصوصیات کو پروان

چڑھا سکیں۔

اس نظریہ کے مقابلے میں ہماری آج کل کی تعلیمی کیفیات کا ملاحظہ فرمایئے۔ یہ تعلیم شاگردوں میں زندگی کی امنگ تو کیا پیدا کرے گی۔ ان میں زندگی کے تجزیہ کرنے کی اہلیت بھی پیدا نہیں کر سکتی تعلیم کا یہ فرسودہ نظام اس کے اعصاب کو تشنج کا شکار کر رہا ہے۔ اس کے احساس کو زائل اور جذبات کو مردہ بنا رہا ہے۔ اس تعلیمی چکر میں الجھ کر اس کی زندگی، اس کی شخصیت فروغ نہیں پا سکتی۔

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو　　　کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

ہماری موجودہ تعلیم نے ہماری قوم کے قویٰ مضمحل کر دئیے ہیں۔ اس کی فطری صلاحیتوں کو بے کار کر دیا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ نوجوان جو اس شعر کے مصداق

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ　　　آں بہ پیری کودکے ایں پیر در عہد شباب

جوانی میں بوڑھا ہو چکا ہے۔ پھر سے تندو تیز جذبۂ زندگی سے سرشار ہو جائے۔ وہ حادثات پر مسکرا سکے۔ انقلابات سے ٹکر لے سکے۔ واقعات سے ہار ماننے پر آمادہ نہ ہو۔ اس کا قدم ہمیشہ آگے بڑھنے کے لئے اٹھے۔ اور اس کا عزم کبھی ڈوبنے کو نہ ابھرے۔ دنیا نے حال میں دو بڑی ہولناک جنگیں لڑی ہیں۔ حیاتِ انسانی کا شیرازہ پراگندہ ہو چکا ہے۔ انسان کو از سرِ نو انتشار اور ابتری میں زندگی کا مکمل حل مہیا کرنا ہے۔ اسے مقصد و مقدر کے تعین کی ضرورت ہے۔ زندگی کی ہر منطق مسائل حیات کے بارے میں تعلیم کے فلسفہ کی شرط لگائی ہے۔ تعلیم اور فلسفہ نفسیات مترادف ہیں۔ زاویۂ نظر و فکر کے اعتبار سے ان میں مشترک نکات و مسائل مماثل ہیں۔ دونوں حیات کے مفہوم و منشاء، فرد و ملت کے ربط، فرد و ماحول کے تعلق، اقدار کے قضیوں پر یکساں روشنی ڈالتے ہیں۔ لہٰذا یہ بڑی ہی فطری بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ نئی انسانی تنظیم کی منصوبہ بندی میں ہم اپنی تعلیم کے اغراض و مقاصد پھر سے مقرر کریں۔ مادیت کی ہمہ گیر کامیابی اور جدید سائنس کی کامگاری نے اگرچہ منتقدین کی ...

ستیاناس نہیں کر دیا۔ تو انہیں پسِ پشت ضرور ڈال دیا ہے۔ یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ دارالعلوم اور مذہبی تجربات کی یہ قدریں جو ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں۔ یوں درہم برہم ہوجائیں اور اس کے برعکس زندگی کا محل ظاہری خرد دری کی بہت کھوکھلی بنیاد پر اُٹھایا جائے۔ ایسا محل منہدم ہوکر رہے گا۔ علامہ اقبال نے اس مہلک اقدام کے خلاف ہمیں آگاہ کیا ہے

عصر حاضر را خرد زنجیر پاست ✣ جان بے تابے کہ من دارم کجاست

ایسی نمائشی خرد ارتقائے انسانیت کی راہ میں سنگِ گراں ہے۔ ایسا انسانی تعقل معراج کے آخری مراحل میں بھی محض معذور ولاچار ہے۔ اور ہمیں اس سے زیادہ تعمیری جذبے کو اپنانا چاہیئے۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور ✣ چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

ہمارا مادی شعور اور ہمارا یہ خطرناک سائنسی فہم وادراک ہماری مہیب تباہی کا دیباچہ ہیں انسان انسان کو اپنی غرض برآری کا آلہ کار بنانے کی فکر میں ہے۔ یہ ذہنیت جو اصول و مذاق سے تہی وعقیدہ سے آزاد اخلاقی قدروں سے عاری ہے۔ بڑی خطرناک ہے۔ اسی ذہنیت نے یورپ کو ایک ظالمانہ معاشی نظام بخشا ہے۔ اسی کھوکھلے پن کے باعث یورپ غیر منصفانہ معاشری خلفشار، طبقاتی آویزش، اسلحہ سازی کے جنون اور جنگ کے خوف و ہراس کا مستقل اکھاڑہ بن چکا ہے۔ نتیجۃً ہماری زندگی میں ہڑلونگ ہے، فرسودگی ہے، نامرادی ہے، نکماپن ہے۔ ہم میں مدنیت کے حقیقی ثمرات سے بہرہ دری کی اہلیت کا فقدان ہے۔ یہ ماہرینِ تعلیم کا فرض ہے۔ کہ وہ اِس توازن کو بحال کریں۔ وہ اس قوت میں جس کا سرچشمہ علم ہے۔ اور اس وسعت نظر میں جس کا ماخذ مذہب و مدرسہ ہیں۔ مصالحت کرادیں۔ اقبال کا عقیدہ ہے۔ اگر عزم وقوت نہ ہو۔ تو نظر صرف اخلاقی بلندی پیدا کر سکتی ہے۔ پائیدار تمدن نہیں وجود میں لاسکتی۔ عزم وقوت میں اگر عقیدہ کی صداقت مفقود ہو۔ تو وہ ہلاکت آفرین اور غیر انسانی بن جاتے ہیں۔ آج کا انسان اپنی ذہنی تکمیل کے

بارجود متین و سنجیدہ جذبات سے عاری ہے۔ اس کی ساری کوششیں بے نتیجہ کی حامل ہیں۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

سائنس کی افادی حیثیت کے بارے میں جو عام غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب رفع ہو رہی ہے۔ یہ احساس بھی کثرت سے پیدا ہونے لگا ہے۔ کہ انسان کے طبعی مشاغل اگر طبعی سائنس کے مطالعہ سے زیادہ نہیں تو اس کے برابر ضرور اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ذہن کی متوازن تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ وہ طاقت جو ہم فطرت سے چھین رہے ہیں۔ ان کے طفیل اور مذہبی اسپرٹ کے ذریعے قابو میں رکھی جا سکتی ہے۔

یہ بڑا مبارک امر ہے۔ کہ ہمارے مدارس میں اسلامیات و دینیات لازمی قرار دئے جا چکے ہیں۔ یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ ہم اس کی افادیت کو حتمی طور پر تسلیم کر چکے ہیں ہمیں دنیا میں آج روحانی اور اخلاقی قدروں کو سربلند کرنا ہے۔ اس کے بغیر ہماری تعلیم خواہ وہ کیسی ہی باضابطہ کیوں نہ ہو۔ قطعاً بے روح اور بے مقصد ہو کر رہ جائے گی۔ ایسے عظیم نئے نظام کی کامیابی کا انحصار ہمارے اساتذہ پر ہے۔ یہ ان تک ہے کہ وہ مذہب کو توہمات، قدامت اور ملائیت کا نمونہ بنا کر پیش نہ کریں۔ بلکہ اسے ایک زندہ اور جاوید قوت ثابت کریں۔ ایسی قوت جو ہماری آنے والی نسلوں کی رگوں میں تند و تیز خون بن کر دوڑ جائے۔ ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرے۔ ان کی شخصیت کو پُروقار اور مؤثر بنائے۔ اور انہیں زمانے پر حاوی و مسلط کر دے۔

حضرات! تعلیم، اس کا مفہوم و منشاء، استاد اور اس کا رتبہ و نصب العین، مدرسہ اس کا ماحول اور نوعیت، جدید نظریے اور رجحان، مادیت اور اس کا سد باب، روحانیت اور اس کی افادیت، ان سب پر میں نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ مگر ایک بہت قابل ذکر

نکتہ ابھی پیش کرنا باقی ہے۔ اور وہ ہے قومی زبان کی اہمیت اور ضرورت۔ ہمارے پیش نظر بہت عظیم لائحہ عمل ہے۔ مگر ہمیں کامیابی صرف اسی صورت ہو سکتی ہے۔ جب ہم پاکستان میں اپنی قومی زبان کو اس کا حقیقی مقام دے دیں۔ ہم اپنا نصاب اُردو میں مرتب کریں۔ قومی زبان کی اہمیت پر کسی قسم کا تبصرہ بھی تحصیل حاصل ہے۔ اس کے باعث حب الوطنی کا جذبہ، یک جہتی کی اسپرٹ، اخوت کا رنگ قوم میں زیادہ تیزی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہماری قومی زبان اُردو ہمارے تمدن، ہماری روایات، ہمارے مذہب، ہمارے ماضی و حال کی زندہ و جاوید تاریخ ہے۔ ہمیں اس کی روشنی میں اپنی منزل تک پہنچنے میں سہولت ہوگی۔ یہ ہماری آنکھوں سے مانوس ہے۔ ہمارے جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ ہمیں ایک پاکستانی کلچر اور پاکستانی قومیت کی داغ بیل ڈالنا ہے۔ ہمیں پاکستانیت کو پروان چڑھانا ہے۔ جو ایک پاکستانی لنگوا فرانکا کے ذریعے ہو سکے گا۔ اور وہ لنگوا فرانکا ہماری اُردو ہے۔ ہمیں یہ عزم مصمم کر لینا ہے۔ کہ ہم اپنا سارا تعلیمی نظم و ضبط اسی زبان میں ترتیب دیں گے۔ یہ ہی ہمارا پاکستانی نصب العین ہوگا۔

حضرات! میں نے آپ کا خاصا وقت لیا ہے۔ مگر میں یہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کہ آپ حضرات کے سامنے کانفرنس کا مقصد، لائحہ عمل اور پروگرام کے اہم نکات ضرور پیش کر دوں۔

میں ایک مرتبہ پھر مجلس استقبالیہ کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور مکرمی و محترمی ڈائریکٹر محکمہ تعلیم خان محمد اسلم خان خٹک کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ کہ ان کی سعی و کاوش سے آج ہمارا صوبہ تعلیم کے میدان میں ایک زبردست تعمیری کارنامہ سرانجام دے رہا ہے۔

اصطلاحی غور و فکر

(ک)

اصطلاحات

141. Athletics

جسمانی ورزش، کسرت، تنومندی، ورزش، ریاضت۔

اصطلاحی لحاظ سے تنومندی تو صحیح ترجمہ نہیں۔ باقی تمام الفاظ میں سے "کسرت" ہی زیادہ موزوں ہے۔ لیکن Athletics کے لئے بجائے "کسرت" (واحد) استعمال کرنے کے (جمع) "کسرتیں" استعمال کرنا چاہیئے۔ اور Athletics Tournament کے لئے "کسرتی مقابلے" موزوں ترجمہ ہوگا۔

142. Tournament

ٹورنامنٹ، ورزش کا مقابلہ، کھیلوں کا مقابلہ، نمائش، نمود، کھیل کھیل تماشے، مقابلہ۔

ان تمام الفاظ میں سے مؤخر الذکر یعنی مقابلہ ہی بہترین اور موزوں ترین ترجمہ ہے

جمع کی صورت میں "مقابلے" استعمال کرنا بہتر ہوگا۔

143. Sports.

تفریحیں، کھلونے، کھیلیں، دل بہلاوے، خوش طبعیاں، کھیل تماشے، چہل بازی، ریاضتی تفریحیں، ورزشی کھیلیں، تفریحی ورزشیں۔

ان میں سے دل بہلاوے، خوش طبعیاں، کھیل تماشے، چہل بازی، کھلونے بھونڈے ترجمے اور Sports کے اصطلاحی مفہوم سے بہت دُور ہیں۔ Sports کے متعلق ہمارے نزدیک "تفریحی کھیلیں" زیادہ مناسب اور قابل ترجیح ترجمہ ہے۔

144. Games

کھیل، بازیاں، منصوبے، چالیں، مضحکے، ورزشی مقابلے، ریاضتیں۔

منصوبے، چالیں اور مضحکے مضحکہ خیز ہیں۔ اور اصطلاحی مفہوم سے بہت دُور ہیں۔ ورزشی مقابلے، ریاضتیں Athletics کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ Games کے لئے "کھیلیں" ہی زیادہ موزوں ترجمہ ہے۔

145. Surplus.

فالتو، بیشی، زائد، فاضل، توفیر، زائد مقدار، فاضل مقدار۔

اس کے لئے یہ تمام لفظ صحیح مفہوم ادا کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام کے مقابلے میں ہمیں "سَرحاصِل" زیادہ اچھا اور جچتا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ مفہوم صحیح ادا کرنے کے علاوہ یہ کچھ Surplus کی لفظی ساخت اور آواز سے بھی ملتا جلتا ہے۔

146. Duplicate

نقل، جواب، ہو بہو نقل، نقلِ خط، نقلِ دستاویز، مُثنّیٰ۔

"مُثنّیٰ" قابلِ ترجیح ہے۔ اس پر عربی ثقالت کا اعتراض بھی بے جا ہوگا۔

کیونکہ یہ عام مستعمل ہے۔

147. Head clerk

صدر محرر، ہیڈ کلرک، رئیس التحریر۔

ان میں سے رئیس التحریر عام طور پر ایڈیٹر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے Clerk کے لئے محرر کا لفظ اختیار کر لیا جائے تو Head Clerk کے لئے ہمارے نزدیک "سرمحرر" نہایت موزوں لفظ ہوگا۔ یہ بھی Head Clerk کی لفظی ساخت سے ہم آہنگ سا ہے۔

148. Enquiries.

استعلامات، سوالات، دریافت حال، تحقیقات، چھان بین، پوچھ گچھ، استفسارات۔

سوالات یا استفسارات تو Questionair کی صورت میں موزوں ہوسکتا ہے۔ استعلامات البتہ صحیح ترجمہ ہے۔ اور ممالک عربیہ میں رائج ہے۔ لیکن اس پر عربی ثقالت کا فتویٰ صادر ہوگا۔ اس لئے Enquiries کے لئے "تحقیقات" کا عام اور مروّج لفظ قابل ترجیح ہے۔

149. Passport.

حکمی ذریعہ، پاسپورٹ، پروانہ راہداری، بندرگذر، تذکرہ مرور۔ تذکرہ مرور عربی ممالک میں مستعمل ہے۔ لیکن یہاں اس کا چلنا آسان نہیں کیونکہ عام فہم سے یہ بہت بالا ہے۔ پروانہ راہداری البتہ عام ہے۔ لیکن Passport میں Port کے لفظ سے جو مفہوم مدنظر ہے۔ وہ پروانہ راہداری میں ظاہر نہیں۔ پروانہ راہداری Certificate of clearance کے لئے مناسب ہے۔ لیکن پاسپورٹ کے لئے ہمارے نزدیک موزوں یہی ہے کہ انگریزی

کا لفظ ہی قائم رکھا جائے۔ لیکن اس میں تارید کے اصول کے مطابق کچھ تصرف کر لیا جائے۔ تو بہتر ہوگا۔ یعنی پاسپورٹ کی بجائے اسے "پاس پورہ" کہا جائے۔ ورنہ اس کے لئے ہم "بندر پاس" کو ترجیح دیں گے۔

150. Ticket.

ٹکٹ ، پرچی ، کارڈ ، تذکرہ ، مذکرہ۔

پرچی اور کارڈ سے Ticket کے مفہوم کے بجائے ذہن دفتری کاغذ کے پرزے یا ڈاک کے کارڈ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ تذکرہ اور مذکرہ میں وہی عربی ثقالت ہے۔ یہ عربی ماحول ہی کے لئے موزوں ہے۔ Ticket کے لئے تو "ٹکٹ" کا لفظ ہی قائم رکھا جائے۔ تو بہتر ہوگا۔

(ب)

اصطلاحات زیر غور

151. Record.	152. Dealing Clerk
153. Typist.	154. Account
155. Pending cases.	156. Gown.
157. Initials.	158. Up-to-date
159. Notice—Board.	160. Credit.
161 Welfare.	162 Intelligent.
163. Survey.	164. Precedent.
165. Abnormal.	166. Extra-mural activities.

167. Designation.

168. Propaganda.

169. Popularity.

170. Editor.

171. Hall

172. Drawing Master

173. Science Room.

174. Library.

175. News Board.

176. Notice Board.

177. Money Order.

178. Letter Box.

179. Tag.

180. Primary School.

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ــــــ شعبہ اسکول

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۹ جون ۱۹۴۹ء ۱۴۲۴-E	م۔ محمد علی نمبر ۱۴۰ (۱۵۰-۲۲۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول جڑانوالہ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ علی محمد بروالا بی اے بی ٹی (۹۰-۱۵۰) کی جگہ جو فوت ہو گئے ہیں
"	م۔ عبد المجید خان بی اے (آنرز) بی ٹی نمبر ۲۴۸ (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ بمشاہرہ سابقہ۔	"	م۔ محمد علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	م۔ محمد اشرف بی اے۔ بی ٹی	ایک امیدوار جو اب معلم انگریزی سی۔ ایم۔ ٹریڈ ہائی اسکول گجرات ہیں۔	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب بشاہرہ ۹۰ روپے ماہوار درجہ سوم (۹۰-۵-۱۵۰)	۱۲ ستمبر ۱۹۴۹ء سے یا تعطیلات گرما کے بعد اس کے بعد کسی تاریخ سے جب وہ حاضر ہوں	م۔ عبد المجید خان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۹ جولائی [illegible] ۱۴۲۱-E	مسٹر بی۔ ایم۔ بجل نمبر ۵ ۵۰/۱۰۰	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع جہلم	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع کیمبلپور۔ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ برکت علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

تاریخ صدور احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
لائی ۱۹۷۳ء ۱۶۷۳	م۔ برکت علی نمبر ۲۵ ۵۰/۱۰۰	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع کیمبلپور۔	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع جہلم بشاہر سابقہ	تاریخ حاضری سے	مسٹر بی۔ ایم۔ چیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

تاریخ صدور احکام	نام	منصب	کس منصب سے ترقی ہوئی	کس منصب پر تعینات ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
لائی ۱۹۷۳ء ۱۶۸۷۲	مسٹر بی۔ ایم چیل نمبر ۵۶: ۵۰/۱۰۰	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع جہلم جو اب اسی منصب پر کیمبلپور تبدیل ہو گئے ہیں۔	درجہ سوم ۵۰-۴-۸۰-۴/۲-۱۰۰ شعبہ تحتانی کلاسیکل ورنیکلر	درجہ سوم ۹۰-۵-۱۵۰ شعبہ تحتانی انگلو ورنیکلر (قائم مقام)	یکم اپریل ۱۹۷۳ء سے	شعبہ انگلو ورنیکلر درجہ ۹۰/۱۵۰ کی ایک خالی اسامی ہیں۔
〃	م۔ خیر محمد نمبر ۸۲: ۵۰/۱۰۰	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ڈیرہ غازیخان قائم مقام	〃	〃	〃	〃
〃	راؤ ریاست علیخان نمبر ۱۵۹: ۵۰/۱۰۰	نگران تربیت جسمانی سنٹرل موڈل اسکول لاہور قائم مقام	〃	〃	〃	〃
〃	م۔ محمد اصغر نمبر ۱۲۲: ۵۰/۱۰۰	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع سرگودھا۔ قائم مقام۔	〃	〃	〃	〃
〃	راؤ منصور علیخان نمبر ۱۶۲: ۵۰/۱۰۰	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع لاہور۔ قائم مقام۔	〃	〃	〃	〃
〃	م۔ شاہ محمد خان سیال نمبر ۲۲۸: ۵۰/۱۰۰	نگران تربیت جسمانی گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ۔ قائم مقام				
〃	م۔ برکت علی نمبر ۲۵: ۵۰/۱۰۰	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع کیمبلپور جو اب اسی منصب پر جہلم تبدیل ہو چکے ہیں (قائم مقام)	〃	〃	〃	〃
〃	م۔ محمد سعید نمبر ۳۶۲: ۵۰/۱۰۰	قائم مقام معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع راولپنڈی	〃	〃	〃	〃
〃	م۔ حبیب اللہ نمبر ۲۶۵: ۵۰/۱۰۰	معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع گوجرانوالہ (قائم مقام)	〃	〃	〃	〃
〃	م۔ محمد یسین حسن نمبر ۴۷۹: ۵۰/۱۰۰	قائم مقام نگران تربیت جسمانی سنٹرل ماڈل اسکول لاہور	〃	—	〃	〃

تاریخ	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس عہدہ پر تعین ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۹۴۰	م۔ محمد اکبر یاسین نمبر ۱۲۹: ۵۰/۱۰۰	قائم مقام معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع سیالکوٹ	درجہ سوم ۵۰-۴/۸۰-۱۰۰ شعبہ تحتانی کلاسیکل ورنیکلر	درجہ سوم ۹۰-۵-۱۵۰ شعبہ تحتانی اینگلو ورنیکلر (قائم مقام)	یکم اپریل ۱۹۴۰ء سے	شعبہ اینگلو ورنیکلر ۹۰/۱۵۰ کی ایک خالی اسامی میں۔
〃	س۔ نذیر علی شاہ نمبر ۱۴۲۸: ۵۰/۱۰۰	قائم مقام معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع شیخوپورہ	〃	〃	〃	〃

ب) م۔ عبد الغنی شیدا (نمبر ۱۸۸: ۵۰/۱۰۰ ج ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء سے درجہ سوم (۹۰-۵-۱۵۰) میں بحیثیت قائم مقام معاون ناظر مدارس برائے تربیت جسمانی ضلع منٹگمری کام کر رہے ہیں۔ ۹۰/۱۵۰ کی ایک خالی اسامی میں کام کرتے جائیں گے۔

تاریخ و نمبر احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
جولائی ۱۹۴۰ء ۱۸۳۶۶	م۔ نجم الدین بی اے ایس اے وی نمبر ۱۳: ۲۵۰-۳۰۰	معاون ناظر مدارس ضلع شیخوپورہ	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول لیہ۔ بشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	ش۔ محمد عبد اللہ بی اے (۲۲۰-۳۰۰) کی جگہ جو تبدیل ہو کر گورنمنٹ سکول نارووال (ضلع سیالکوٹ) کے صدر معلم مقرر ہوئے ہیں۔
〃	م۔ محمد شفیق بی اے ایس اے وی ایل ایل بی نمبر ۲۰۸: ۱۵۰-۲۲۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ	معاون ناظر مدارس ضلع سیالکوٹ۔ بشاہرہ سابقہ	〃	م۔ محمد ارشاد کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال کے صدر معلم مقرر ہوئے ہیں
〃	م۔ غلام نبی بی اے بی ٹی (۳۰—۳۰۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور۔ بشاہرہ سابقہ	〃	م۔ محمد عبد اللہ قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
〃	م۔ محمد عبد اللہ قریشی بی اے بی ٹی نمبر ۱۴۳: ۹۰-۱۵۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ بشاہرہ سابقہ	〃	م۔ غلام نبی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۱۸ جولائی ۱۹۴۰ء ۱۸۴۹۳-E	م۔ عزیز بخش بی اے بی ٹی نمبر ۲: ۲۳۰-۳۰۰	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول پاکپتن۔ بشاہرہ سابقہ	[illegible] کی کسی تاریخ حاضری سے	س۔ خورشید حسن بی اے بی ٹی ایس کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور کی طرف تبدیل ہو گئے ہیں۔
〃	م۔ ارشاد محمد ایم اے ایل ایل بی بی ٹی نمبر ۱۵: ۱۵۰-[illegible]	معاون ناظر مدارس ضلع سیالکوٹ	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال۔ بشاہرہ سابقہ	〃	م۔ عزیز بخش کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے

تاریخ و نمبر احکام	نام	منصب	کس عہدہ سے ترقی ہوئی	کس عہدہ پر تعین ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۵ جولائی ۱۹۴۰ء ۱۸۶۲۲-E	چودھری عبد السلام بی اے بی ٹی (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی سنٹرل ماڈل اسکول لاہور	شعبہ تحتانی اینگلو ورنیکلر درجہ سوم (۹۰-۵-۱۵۰)	شعبہ تحتانی درجہ دوم (۱۵۰-۱۰-۱۹۰/۱۰-۲۲۰)	یکم اپریل ۱۹۴۰ء سے	درجہ دوم ۱۵۰-۱۰-۲۲۰ میں ایک خالی اسامی کی جگہ۔
〃	محمد طالب [illegible] بی اے بی ٹی (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول [illegible] خرد	〃	〃	〃	〃

چھپ گئی
تاج محل تاریخ ہند و پاکستان

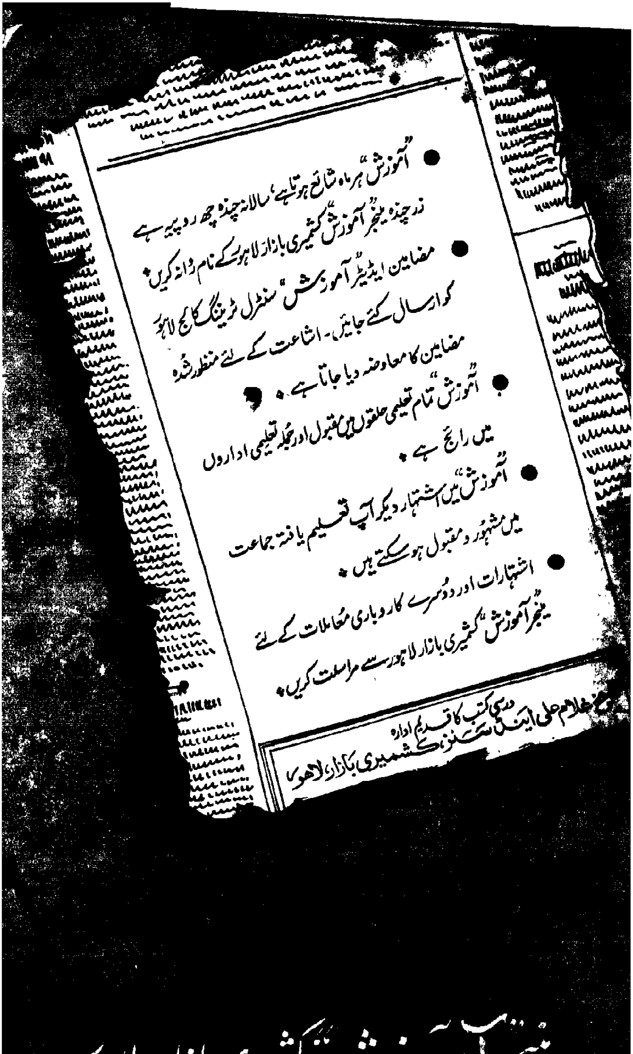
(سوالاً جواباً) برائے طلبا ہائی کلاسز

تعلیمی حلقوں کیلئے یہ اطلاع باعث مسرت ہوگی۔ کہ طلبا میٹرکولیشن کیلئے قیام پاکستان کے بعد علم تاریخ میں جن اہم ضروریات کو محسوس کیا جارہا تھا۔ انکو پورا کرنے کیلئے ہماری شہرۂ آفاق تاریخ ۱۹۴۹ء تک نئے انداز میں ترمیم کے ساتھ تیار ہوگئی ہے جسمیں ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تحریک قیام پاکستان اور آجتک کے واقعات نہایت وضاحت سے شامل کردئے گئے ہیں۔ اسمیں جملہ خصوصیات کے علاوہ مندرجہ ذیل اوصاف بھی ہیں :۔

۱۔ کتاب ہذا پنجاب یونیورسٹی کے جدید سلیبس کے عین مطابق مرتب کیگئی ہے۔ ۲۔ سوالات یونیورسٹی کے گذشتہ سالوں کے امتحانات میں سے دئے گئے ہیں۔ اوراُن میں تاریخی واقعات کا تسلسل قائم رکھا گیا ہے۔ ۳۔ جوابات واضح اور مکمل ہیں غیر ضروری تفصیل اور طویل جواب کو طلبہ کی سہولت کیلئے نظر انداز کردیا گیا ہے۔ ۴۔ زبان اور طرز تحریر نہایت دلکش ہے۔ کتاب سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں تحریر کیگئی ہے۔ ۵۔ کتاب کے آخر میں ہندوپاکستان کی مشہور ہستیوں کے مختصر حالات اور مشہور سنین کی فہرست کا اضافہ کیا گیا ہے علاوہ ازایں اُردو زبان کے محاورات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ ۶۔ طلبہ کی سہولت کیلئے کتاب کے آخر میں یونیورسٹی سلیبس اور ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک کے یونیورسٹی کے پرچجات بھی شامل کردئے گئے ہیں۔ گویا یہ کتاب طلبہ کو باقی تمام کتب تاریخ و پرچہ جات تاریخ سے بے نیاز کردینے والی ہے۔ ۷۔ یہ کتاب موجودہ تمام کتب تاریخ ہند و پاک میں بہترین ہے۔ اور طلبہ کے لئے امتحان میں کامیابی کی مکمل طور پر ضامن ہے۔

غرض آپ اسے ہر لحاظ سے جامع اور مکمل پائیں گے۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلیشرز کشمیری بازار۔ لاہور



• "آموزش" ہر ماہ شائع ہوتا ہے، سالانہ چندہ چھ روپیہ ہے
زر چندہ مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور کے نام روانہ کریں۔

• مضامین ایڈیٹر "آموزش" سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور
کو ارسال کئے جائیں۔ اشاعت کے لئے منظور شدہ
مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

• "آموزش" تمام تعلیمی حلقوں میں مقبول اور مجلہ تعلیمی اداروں
میں رائج ہے۔

• "آموزش" میں اشتہار دیکر آپ تعلیم یافتہ جماعت
میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں۔

• اشتہارات اور دوسرے کاروباری معاملات کے لئے
مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور سے مراسلت کریں۔

درسی کتب کا قدیم ادارہ
غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار لاہور

آموزش

ستمبر ۱۹۴۹ء

دُنیا کا معرکہ آرا تاریخی شاہکار!

تاریخ عالم کی خونچکاں داستانیں! اُردو ادب میں بلحاظ موضوع اور تحقیق و تفتیش بے مثال تصنیف!!!

تاریخِ انقلاباتِ عالم

دو جلدوں میں

از سید ابو سعید بزمی ایم اے

اُردو ہی نہیں دُنیا کی تمام زبانوں میں یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے پہلی کتاب ہے جو تاریخ انقلاباتِ عالم کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے عہدِ حاضر تک کے تمام سیاسی، تمدنی، مذہبی اور سماجی انقلابات کی جامع اور ہمہ گیر تاریخ ایسے محققانہ انداز سے لکھی گئی ہے جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ فاضل مصنف نے دس سال کی طویل محنت اور عرق ریزی سے کام لے کر ثابت کر دیا ہے کہ یہ تاریخ، سیاست اور معیشت پر ایک مستقل "انسائیکلوپیڈیا" ہے جس کا مطالعہ ہر اہلِ علم کے لئے ناگزیر ہے۔ خصوصاً اخبار نویسوں، طالبعلموں اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد معلومات افزا کتاب ہے۔ اور طرفہ یہ کہ مصنف کا نقطۂ نظر پارٹی پالیٹکس سے دُور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا اور اس درجہ غیر جانبدارانہ ہے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہو گی۔

سائز ۲۲×۱۸ کاغذ دبیز۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب

قیمت: جلد اوّل دس (۱۰) روپے۔ جلد دوم دس (۱۰) روپے

کتاب منزل لاہور

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس، ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

مدیر "آموزش" کی تسلیم کے ساتھ

ناشر
کتاب منزل
لاہور

ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء
جلد:— ۲
شمارہ:— ۶

قیمت فی جلد دس آنے

سالانہ چندہ:
پاکستان کے لئے: ۶ روپے
غیر ممالک کیلئے: ۸ روپے

رموز

ہر تعمیر کے لئے بنیاد اہم ہوتی ہے۔ بنیاد کی نوعیت، استواری اور خوبی پر ساری تعمیر کی نوعیت، استواری اور خوبی کا انحصار ہوتا ہے۔ بنیاد کے سلسلے میں بے توجہی اور بے احتیاطی کے نتائج عمارت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ عام تعمیرات کی طرح قومی تعمیر میں بھی بنیاد ہی بہت اہم ہے۔ اور اس کی طرف خاص توجہ قومی معماروں کا اولین فرض ہے۔

قومی تعمیر کی بنیاد بچہ ہے۔ دُور اندیش قومیں اپنی تمام کوششیں بچے کی اصلاح و بہبود میں صرف کرتی ہیں۔ اور اپنی قومی زندگی کو جو رنگ دینا مطلوب ہو۔ اس کی نیو بچّوں کی تعلیم و تربیت میں ہی جماتے ہیں۔ جوانوں اور بُوڑھوں کی اصلاح کا یقین نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو عادات راسخ ہو جائیں۔ ان کا بدلنا مشکل ہوتا ہے لیکن جب عادات پیدا ہو رہی ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں صحیح قسم کی عادات پیدا کرنے کے لئے سامان کرنا اور پھر اس کوشش میں کامیاب ہونا آسان ہوتا ہے۔ بچے کا زمانہ عادات پڑنے کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں جس قسم کی عادات وہ اختیار کرے گا۔ تاحینِ حیات اس کے ساتھ قائم و دائم رہیں گی۔ ان عادات کا اثر فقط اس کی انفرادیت پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے معاشرہ بھی بہت متاثر ہوتا ہے۔

اور یہ معاشرتی تاثر اس کے انفرادی تاثر کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتا ہے۔ مغربی اقوام جو ترقی کی راہوں میں تیزی کے ساتھ گامزن ہیں۔ اور جو اپنے مستقبل کی بہتری کے لئے انتہائی دُور اندیشی سے عمل پیرا ہیں۔ وہ بچے کی اہمیت کی اس قدر قائل ہیں۔ کہ ان کی زیادہ تر توجہ بچوں کی اصلاحی تدابیر پر مرکوز رہتی ہے۔ اور اُن کے مفکر آئے دن نئے نئے تجربات کے نتائج کے طور پر بچوں کی بہتری کے لئے جدید سامان کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ اِس سلسلے میں اقدامات یہاں تک پہنچے ہیں۔ کہ اب ان کے مفکر بے تاب ہیں۔ کہ کسی طرح بچے کی مناسب نگہداشت کا اسی لمحے سے سامان ہونے لگے۔ جب وہ اس دُنیا میں آکر سانس لینے لگتا ہے معصوم گاہوں، تربیت گاہوں، ریاض الاطفال اور ننھوں کے اسکولوں کا انکے ملک کے طول و عرض میں جال سا بچھ ستا اور روز بروز تربیت گاہوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بچے کے ابتدائی دو سالوں کا اہتمام بہت عام نہیں۔ لیکن تین سال کے بچوں کی تربیت کے اہتمامات بہت مناسب اور تسلی بخش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بھلا جس قوم کے بچے تیسرے سال سے ہی صفائی، وقت کی پابندی، اخلاقی جرأت، معاشرتی ہمدردی، اجتماعی زندگی، اشتراکِ عمل، حُسنِ سلوک، حُسنِ اخلاق، حفظِ صحت، خود اعتمادی، قومی شعور، ملکی احساس اور فکر و تدبر کے صحیح اور اپنے ملک کی خواہش کے مطابق عادات پیدا کرنے لگیں۔ وہ قوم اپنے مستقبل کے سہانے خوابوں کی دلپسند تعبیریں کیوں نہ دیکھے بلکہ وہ قوم اپنے مستقبل سے کیوں بے فکر نہ ہو جائے۔ اور غالب اقوام کی صف میں فاخرانہ کیوں کھڑی نہ ہو۔ ہمارے ملک میں پانچ برس کے بچوں کے لئے تعلیم کا تو انتظام ہے۔ لیکن اس قسم کا انتظام شاذ و نادر ہی کہیں ہے۔ جو ریاض الاطفال میں ہوتا ہے۔ ملک و قوم کی بہتری کے لئے ضروری ہے۔ کہ بچوں کی تربیت کا مناسب اہتمام ہو۔ نہ صرف یہ کہ ریاض الاطفال کی قسم کے جونیئر اسکول کھولے جائیں۔ بلکہ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے بھی تربیت گاہیں اور معصوم گاہیں (نرسری اسکولز) قائم کی جائیں۔ اس کام کی ...

فقط حکومت پر ہی عائد نہیں ہوتی۔ بلکہ اس قومی کام میں نجی انجمنیں اور صاحب استطاعت حضرات بھی کافی حصہ لے سکتے ہیں۔ دونوں کے باہمی تعاون سے یہ اہم ضرورت بہت حد تک پوری ہو سکتی ہے۔

جہاں بچوں کے لئے صحیح تربیتی اداروں کی ضرورت ہے۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی تربیت صحیح اصولوں پر ہو۔ اس سلسلے میں تعلیمی نفسیات بہت مفید چیز ہے۔ لیکن غضب یہ ہے کہ جہاں مغرب کے مفکرین نے مغرب کے بچوں کے حالات و طبائع کا صحیح جائزہ لے کر نفسیات اطفال کی تعمیر کی ہے۔ وہاں مشرق نے محض ان کی نقالی اور کورانہ تقلید ہی پر اکتفا کر کے ان کے اصول و تدابیر کو جوں کا توں اپنے لئے قبول کرنا چاہا ہے۔ غلامانہ دور حیات میں تو شاید یہ چیز قابل ستائش بھی ہو۔ لیکن آزاد ممالک اس طرح کرنے سے اپنا امتیاز کھو بیٹھتے ہیں۔ اور نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ آزاد ممالک کبھی ایسا لائحۂ عمل اختیار نہیں کرتے وہ ہر چیز کو اپنے طور پر پرکھتے اور اپنی ضروریات کے مطابق اس میں اختراع و اصلاح کر کے اسے اپناتے اور اختیار کرتے ہیں۔ ان کی شان اسی میں ہے کہ وہ اپنے طرز عمل میں خود سوچ کے امام ہوں مقتدی نہ ہوں۔ مجتہد ہوں، نقال نہ ہوں۔ مخترع ہوں کورِ مقلد نہ ہوں۔ مغربی تقلید میں ہمارے ہاں تعلیمی نفسیات کا بڑا چرچا ہے لیکن اس چرچے کی حقیقت کیا ہے۔ مغرب کی ترجمانی، مغرب کی تشریح، مغرب کی توضیح، مغرب کی نقالی اور مغرب کی باتوں کا اعادہ۔ اور پھر غضب یہ ہے کہ مغرب میں تو نفسیات اطفال کے علمبرداروں کا [illegible] اطفال سے براہ راست واسطہ پڑا ہے۔ یا جنہوں نے اطفال کے حالات کا خود اپنے تجربوں سے جائزہ لیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے نقال و ترجمان حضرات میں شاید ہی کوئی ایسا [illegible] جس نے کبھی بچوں کو پڑھایا ہو یا بچوں کے حالات کا تجربات کے [illegible] [illegible] تعلیم [illegible] کی [illegible] [illegible]

البتہ بعض چیرہ دو چالاک ایسے مل جائیں گے۔ جو اپنے بیان میں فرضی تجربات اور وہ بھی مغربی ماہر نفسیات کی مخلصانہ نقالی کرتے ہوئے ذکر کر جاتے ہیں۔ لیکن تحقیق پر ان تجربات کا واقعات ثابت ہونا مشکوک ہوگا۔ آزاد ملک کی لاج کی خاطر ہمیں نقالی سے گریز کرنا چاہیئے۔ اور تعلیمی نفسیات اور نفسیات اطفال کی خاطر ایسے ماہرین پیدا کرنے چاہئیں جو محض کاغذی اسناد کے حامل نہ ہوں۔ بلکہ عملاً مشرقی بچوں کے دقیق اور مخلصانہ مطالعہ سے اپنے تجربات کی بنا پر پاکستانی نفسیات تعلیم یا نفسیات اطفال کی تعمیر کریں۔ جو ہمارے لئے یہاں کے حالات کے مطابق یہاں کے بچوں کی ایسی تربیت و تعلیم میں رہنما ثابت ہو۔ جو ملک و قوم کے لئے انہیں مفید بنا سکے۔ کیا ضروری ہے کہ مغربی ممالک ہی ماہرین نفسیات پیدا کر سکتے ہیں؟ پاکستان اگر دنیا کے لئے قابل تقلید شاعر پیدا کر سکتا ہے۔ تو کیا ایسا ماہر نفسیات نہیں پیدا کر سکتا۔ کہ جس کے سامنے مغرب سر تسلیم خم کرے۔ مگر ایسا کب ہو سکتا ہے؟ جب نقالی اور کورانہ تقلید ترک کر کے اپنے ماحول کے مطابق صحیح تجربات کے میدان میں مصروف عمل ہونے کی کوششیں ہوں گی۔

صرف نفسیات ہی نہیں کہ جس کے متعلق ہمیں اپنے طور پر تجربات کرنا اور سوچنا ہے۔ بلکہ سارے تعلیمی نظام میں اسی قسم کے طرز عمل اور فکر کی ضرورت ہے۔ اب تک مغرب نے جو کچھ کہا ہم نے اس کی وفاداری سے تقلید کی۔ اپنے ماحول کو بھول کر اپنے حالات سے بے نیاز ہو کر ہم نے ہر عمل میں اپنی پرانی روش ترک کر دی اور مغرب کا کہا مانا۔ پڑھنا سکھانے کے لئے اپنا آبائی طریق الف بائی چھوڑا۔ مغرب کا طریق بین دگو سراہا۔ اور تقلیدی نمود و نمائش سے اپنے آپ کو بھی دھوکہ دیا اور اپنے جائزہ لینے والوں کو بھی۔ اسی طرح لکھائی، حساب اور دیگر مضامین کی تعلیم بلکہ ترتیب مضامین و طرز تعلیم میں اپنے طریق کی مذمت اور مغربی طرز کی مدح کی لیکن کبھی نہ سوچا۔ کہ گرم مقامات کے نونہال سرد مقاموں کے نونہالوں کے طریق پر کس طرح پروان چڑھ

سکتے ہیں؟ خیر مضلی یا معنی۔ اب وقت ہے کہ اس لندھادھند تقلید کا خاتمہ ہو۔ اور سب لوگ ہوش وحواس کچھ اپنے حالات کے مطابق تدابیر سوچیں۔ سوچیں کہ ہمارے ہاں کے بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کا بہترین طریق کون سا ہے؟ حساب اور دیگر مضامین پڑھانے کے لئے کون سا طریق موزوں ہے؟ ہمارے بگڑے بچے کس طرح سدھر سکتے ہیں؟ ہمارے ہاں ضبط کے قیام کی کیا صورت ہونی چاہیئے؟ ہمارے ہاں اساتذہ اور طلبہ کے تعلقات کس طرح ہونے چاہئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ارباب تعلیم اور اساتذہ کی توجہات اب ان مسائل کی طرف مصلحانہ اور موجدانہ طریق پر ہونی چاہیئے۔ انہیں تجربات کرنے چاہئیں۔ اور اپنے تجربات کے نتائج تعلیمی فکر و غور کے لئے تعلیم کے شائقین کے سامنے پیش کرنے چاہئیں۔ تاکہ مزید غور و خوض سے مسئلہ نکھر جائے۔ اور اصول و نتیجہ مستحکم ہو جائے۔ آموزش اس قسم کے مفکرین کے نتائج کے لئے چشم براہ ہے۔

تعلیم کے مشکل مسائل میں سے ایک مسئلہ بچوں کی قابلیت و صلاحیت جانچنے کا ہے مختلف قسم کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے بچوں کو ایک ہی طبقے میں یکساں قسم کی تعلیم دینا ایک بہت بڑی ناانصافی ہے۔ اس ناانصافی سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ بچوں کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا صحیح جائزہ لینے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ مروجہ امتحانات کا سلسلہ تو اس سلسلے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ روش ہو چلی ہے۔ کہ ماہرین نفسیات بچوں کا جائزہ لے کر ان کے معیار قابلیت کی حد مقرر کریں۔ یہ اقدام کسی حد تک درست ہے لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے۔ کہ ماہرین نفسیات صرف علمائے نفسیات ہوتے ہیں۔ اور ایسے علمائے نفسیات جو نظریوں کے دلدادہ تقلید کے حامی اور لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ بچوں کی قابلیت کا جائزہ لینے کے لئے تو ایسے ماہر نفسیات کی ضرورت ہے جو بچوں کا اُستاد بھی ہو جسے بچوں کی مختلف طبائع اور رجحانات کا تعلیمی فضا میں مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہو۔ ایک بار نہیں۔ بار بار۔ اور وہ اپنے تجربات کی بنا پر کوئی نتائج پیدا کر سکا ہو۔ ایسے ماہرین کی ایک مشاورتی کمیٹی مدارس کے لئے بنانی کا کام

بھی ہے۔ اس کمیٹی میں طلبہ کے متعلق اساتذہ کو رائے دینے کا حق ہونا چاہیئے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ مدارس میں نالائق طلبہ کی اصلاح و ترقی کی تدابیر مہیا کرنے کی طرف توجہ مبذول ہوا کرتی ہے لیکن قابل طلبہ کی طرف توجہ کم ہوتی ہے بلکہ بعض قابل طلبہ کی طرف سے اساتذہ بے نیاز سے ہو جاتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہوئے کہ وہ اپنی محنت و قابلیت سے امتحانی منزل آسانی سے طے کر جائیں گے۔ ان کی چنداں پرواہ نہیں کرتے حالانکہ جس قدر کمزور طلبہ کی اصلاح کی طرف توجہ کی ضرورت ہے اس سے زیادہ قابل طلبہ کی طرف توجہ کی ضرورت ہے قابلیت و صلاحیت کیلئے آزادانہ خود روی کی جگہ رہنمائی زیادہ مطلوب ہے تاکہ ایسے طلبہ صحیح راہوں پر چل کر اپنے جوہر پوری طرح دکھا سکیں۔ اساتذہ کی قابلیت جہاں ناقابل بچوں کے قابل بنانے میں ظاہر ہوتی ہے اس سے زیادہ قابل بچوں کے جوہر چمکانے اور انہیں ترقی کی راہیں طے کرانے میں ظاہر ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے پاکستانی اساتذہ اب اپنی قوم کی خاطر اس اہم امر کو ملحوظ رکھیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی بنا پر اُن سے قوم کی امیدیں خاص طور پر وابستہ ہیں۔

مدارس میں بچے داخل ہوتے ہیں تعلیم پاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن اپنے طالبعلمانہ فرائض سے مطلقاً نابلد رہتے ہیں۔ انکے سامنے اگر طالبعلمانہ زندگی کے فرائض اور حدود واضح ہوں اور کسی بہتر ذریعے سے یہ فرائض انکے ذہن نشین ہوتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس زندگی کو صحیح طور پر بسر کر سکیں۔ کبھی کبھار کی اُستاد کی نصیحت اور صدر معلم کی سرزنش اس سلسلے میں مستقل اثر نہیں ڈال سکتی۔ بچوں کیلئے تو ایسا ماحول چاہیئے کہ جس میں چاروں طرف سے انہیں اپنے فرائض سے آگاہی شعوری یا غیر شعوری طور پر ہوتی رہے۔ انکے ترانے انکے فرائض سے لبریز ہوں ان کے مدرسے میں انہیں ہر جگہ اپنے فرائض سے متعلقہ ماٹو نظر آئیں۔ اطلاعی تختہ سیاہ پر انہیں ہر روز اپنے کسی نہ کسی فرض سے نمایاں طور پر آگاہ کیا گیا ہو۔ آپس ہی سے انکے فرائض کے متعلق تقاریر، مکالمے، مناظرے، ڈرامے وغیرہ کرائے جائیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس فضا میں وہ اپنے فرائض سے آگاہ ہو کر اپنی طالبعلمانہ زندگی میں صحیح دلچسپی نہ لیں۔ اب جبکہ ہمیں پاکستان کے مستقبل کو اپنی نئی راہ دیکھنے کے اصول پر تعمیر کرنا ہے طالبعلمانہ فضا میں طلبہ کو ان کے فرائض سے آگاہ کرانا اور ان کے مطابق عمل کرنے پہ آمادہ کرنا لازمی نہیں ناگزیر ہے۔ اساتذہ کرام مدد دینگا ہوں کے ارباب اہتمام کی توجہ اس امر کی طرف

ذریعہ تعلیم کا مسئلہ

پروفیسر قاضی محمد اسلم

انگریزوں کے زمانے میں ہماری تعلیمی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ یہ بیان کی جاتی تھی۔ کہ ہماری اعلیٰ تعلیم ساری کی ساری انگریزی کے ذریعے ہوتی رہی۔ کہا جاتا تھا کہ انگریزی کے پڑھنے والوں کے دماغوں پر ناروا بوجھ رہتا ہے۔ اس سے فکر میں آزادی اور طبیعت میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہوتی۔ اور بھی کئی عیب انگریزی کے بیان کئے جاتے تھے۔ اور بالعموم یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جب بھی ہمیں تعلیمی نظم و نسق کا پورا اختیار ملا۔ ہم انگریزی کی پوزیشن کو بدل دیں گے۔ اور کم از کم اسے ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے باقی نہ رکھیں گے۔ لیکن جب ہم آزاد ہوئے تو معلوم ہوا کہ انگریزی کی حیثیت کو بدلنا اور اس کی جگہ اُردو کو دینا کوئی آسان کام نہیں۔ جس مسئلے پر پہلے کوئی اختلاف نہ تھا اور اگر تھا تو ناقابلِ ذکر اسی مسئلے پر اختلاف [illegible] ہوگئے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انگریزی اُردو کے مسئلے پر پہلے ہمیں حقیقی [illegible] [illegible]۔ انگریزی [illegible] اس بات سے ہم [illegible]

اور کمزوریاں ان سے منسوب کرتے تھے۔ اِس لئے ہر شخص جو تعلیم کے متعلق کچھ کہتا یا لکھتا تھا۔ انگریزی ہی کو کوستا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو انگریزی ذریعۂ تعلیم کو بہت اہم جانتے تھے۔ وہ بحثوں میں بھی حصّہ لیتے تھے اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے تھے۔ لیکن چونکہ انگریزی کی حیثیت قائم و دائم معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے وہ ایک حد سے زیادہ اظہارِ خیال ضروری نہ سمجھتے تھے۔ اب آزادی سے صورت حال میں کچھ تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ پہلے ہم میں سے اکثر کو انگریزی میں نقص ہی نقص نظر آتے تھے۔ اور اپنی زبان میں فائدہ ہی فائدہ۔ اور ہم میں سے بعض جو انگریزی کے دل سے قائل تھے۔ انگریزی کو ہر طرح سے محفوظ سمجھ کر دوسروں سے اختلاف کرنا ایسا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ لیکن اب انگریزی کی جگہ اپنی زبان کو دینا ہمارے اختیار میں ہے۔ اور اس تبدیلی کے نیک و بد نتائج کی ذمہ داری ہمارے اپنے فیصلوں پر ہے۔ اب ہم جو کچھ کہتے ہیں سمجھ سوچ کر کہتے ہیں۔ پہلے ہم انگریزی میں نقص ہی نقص بتاتے تھے تو اب ہمیں اس کے فائدے بھی نظر آنے لگے ہیں۔ اور پہلے اگر ہمیں انگریزی کی جگہ اُردو کو لانے میں کوئی دِقّت معلوم نہ ہوتی تھی۔ تو اب یہ تبدیلی اتنی ایسی آسان معلوم نہیں ہوتی۔ پہلے اگر ہم انگریزی کے حق میں زبان کھولنا غیر ضروری سمجھتے تھے۔ تو اب جبکہ تبدیلی خیالی نہیں حقیقی صورت میں سامنے آتی ہوئی نظر آرہی ہے تو ہم بھی یہ ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ ہوسکے تو اس تبدیلی کو روکیں۔ اِس لئے انگریزی ـــ اُردو کے مسئلے پر پہلے ایسا اختلاف نہ تھا۔ لیکن اب آزادی کے زمانے میں یہ اختلاف بڑھ گیا ہے۔ گو ہو سکتا ہے اور انشا اللہ یہی ہوگا۔ کہ یہ اختلاف جلد ہی ایک متفقہ قومی پالیسی میں تبدیل ہو کر ختم ہو جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان بننے کے بعد جلد ہی ایک بڑی نمائندہ کانفرنس نے اس بات کا اعلان کردیا کہ پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اُردو ہوگا (مشرقی پاکستان میں اُردو کے متعلق کچھ مشکلات ہیں۔ وہاں اُردو کے مقابلے میں بنگالی کو پیش کیا جاتا ہے لیکن اس مضمون میں اُردو بنگالی کی بحث کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے) اور اس حیثیت سے

جلد سے جلد انگریزی کی جگہ اُردو کو مِل جائے گی۔ اس متفقہ اعلان کے بعد ہمارے صوبے میں بھی اور ہماری یونیورسٹی میں بھی اس مسئلے پر بحثیں ہوئیں۔ اور اب تک ہو رہی ہیں۔ اور باوجود اس کے کہ آزادی سے بہت پہلے کا یہ خیال ہے کہ انگریزی ایک غیر ملکی اور غیر قومی زبان ہے۔ اِس لئے یہ ذریعۂ تعلیم نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی جگہ اُردو کو ملنی چاہیئے باوجود اس کے کہ آزادی کے معاً بعد ہماری ایک قومی نمائندہ تعلیمی کانفرنس نے یہ اعلان کیا۔ کہ اب ہمیں جلد سے جلد انگریزی کی جگہ اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنا دینا چاہیئے۔ باوجود اس کے کہ ہماری اپنی صوبائی کمیٹیوں میں اور یونیورسٹی کی مختلف مجالس میں اکثر لوگ اس بات کا اعادہ کرتے ہیں۔ کہ اصولاً یہ درست ہے کہ ذریعۂ تعلیم اب انگریزی نہ رہنا چاہیئے۔ بلکہ اس کی جگہ اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا چاہیئے۔ اگر سوال کچھ باقی ہے تو صرف رفتار اور طریق کا سوال ہے یعنی یہ سوال ہے کہ انگریزی کی جگہ اُردو کس رفتار اور کس طریق سے آئے۔ باوجود ان تمام باتوں کے ابھی تک ہمارے تعلیمی حلقوں میں ایسے دوست ہیں جو کہہ دیتے ہیں کہ وہ سرے سے اِس بات کے قائل ہی نہیں۔ کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کو چھوڑ کر اس کی جگہ اُردو کو اختیار کیا جائے۔ اور کچھ ایسے دوست ہیں جو ایسا کہتے تو نہیں لیکن جب وہ اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی رفتار اور اس کے طریق پر بحث کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رفتار کے پردے میں اُردو کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ اُردو ہمارا ذریعۂ تعلیم ہو۔ ان دلائل کو دوبارہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جن کی وجہ سے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہمارا ذریعۂ تعلیم اُردو ہو نہ کہ انگریزی۔ میرے نزدیک کم از کم تین دلائل اس تبدیلی کو لازمی و ضروری قرار دیتے ہیں۔ اگر ہم ان دلائل کو سمجھ لیں گے تو پھر ہم اُردو کی ضرورت کے قائل ہو جائیں گے۔ اور ہمارے دماغ اعلیٰ تعلیم میں اُردو کو رواج دینے کے متعلق تدبیریں سوچنے میں لگ جائیں گے۔ اور ایسی تدبیریں ہمیں سُوجھنے بھی لگیں گی۔

اوّل دلیل یہ ہے کہ غیر زبان میں تعلیم پانے سے ہمارے دماغ مفلوج ہو جاتے ہیں ان میں ایجاد کا مادہ نہیں رہتا۔ بلکہ غیر ملکی علوم کو پورے طور پر اخذ ہی نہیں کر سکتے۔ اور ان کو اپنی طبیعتوں میں راسخ کر کے ان سے پورے طور پر فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتے۔ یہ مضمون بہت لمبا ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے۔ کہ سو ڈیڑھ سو سال کی انگریزی تعلیم کا نتیجہ کیا نکلا ہے۔ ہم کسی مسئلے پر آزادانہ غور نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنی مشکلات اور اپنے مسائل کا علم نہیں۔ ہمارے اقتصادی حالات، تمدنی حالات ہماری زبانوں، ہمارے علوم، ہماری آبادیوں کی تقسیم، ہمارے رسم و رواج، ہماری تاریخ، ہمارا جغرافیہ ان سب کے متعلق غیروں نے مواد جمع کیا۔ اور اسے علمی شکل میں پیش کیا۔ یہ علمی ذوق اس زمانے کا امتیاز تھا ہم میں سے ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے اس علمی ذوق سے کچھ حصہ پایا۔ لیکن یہ ذوق ہماری طبیعتوں کا جزو نہ بنا۔ اور ہم اسے آزادانہ طور پر بروئے کار نہ لا سکے۔ اس لئے یہ ذوق نہ ہونے کے برابر رہا۔ سائنٹیفک ریسرچ کا ہمیشہ ہی ایک رنگ میں ہمارے اعلیٰ علمی اداروں میں چرچا رہا۔ کئی ایک بزرگ ہمارے یہاں ایسے پیدا ہوتے رہے۔ جن کے متعلق کہا جاتا رہا کہ وہ ریسرچ کا مادہ رکھتے ہیں یا ریسرچ کرتے رہتے ہیں۔ چند ایک افراد کو چھوڑ کر قومی طور پر ہمارے سائنٹیفک ریسرچ کا خلاصہ سوائے نقالی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ یورپ کی کسی ریسرچ کا ہمیں پتہ لگ گیا۔ ہم نے اسی کی نقل میں کچھ مشاہدات اپنے انتظام میں جمع کر لئے۔ اور انہیں شائع کر دیا۔ بس یہی ہماری ریسرچ رہی ہے حقیقی ریسرچ یہ ہوتی ہے کہ انسان کسی حقیقی سوال کو لے کر اٹھے۔ وہ سوال اس کے اپنے ماحول سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے جواب سے اس کی اپنی قوم اس کے اپنے ملک کو فائدہ ہوتا ہے۔ پھر اس سوال کے متعلق مسلسل اور باقاعدہ تحقیق کرے اور اپنے نتائج دوسروں کے فائدے کے لئے ان کی پرکھ کے لئے شائع کر دے اسے ریسرچ کہتے ہیں۔ ہمارے [illegible] سائنٹیفک ریسرچ کا ذکر کیا کہنا

ہمارے ہونہار اور ذہین ادیب، غیروں کے ادب، اور غیر کے اسلوب اور غیروں کے قرائن سے اس قدر مرعوب و متاثر ہوتے ہیں۔ کہ جب وہ بظاہر اپنی زبان میں کچھ لکھتے ہیں تو سوائے نقالی کے کچھ کر نہیں سکتے۔ ان کے خیالات میں، جذبات میں اسلوب میں، مذاق میں ایسا رنگ اختیار کرتے ہیں کہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان تحریر کا خمیر ان کی اپنی زبان اور اپنی روایات میں نہیں بلکہ کوئی اور زبان اور روایات میں۔ انسان میں ایجاد اور جدت فکر کا مادہ اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب اُس کے مہیجات سب یا اکثر اس کی اپنی زبان میں ہوں۔ جب وہ ان مہیجات کو اپنے دماغ میں آزادی کے چکر دے سکے۔ اور پھر ان کو چکر دے کر اس میں کوئی نئی بات پیدا کر سکے۔ انگریزی تعلیم میں یہ ناممکن ہے۔ استاد سبق انگریزی میں انگریزی اصطلاحات کے ذریعہ پڑھاتا ہے۔ شاگرد جب گھر میں جاتا ہے۔ تو انگریزی کتابوں اور انگریزی خیالوں کے چکر میں ہوتا ہے۔ وہ اس ماحول سے ہمیشہ الگ رہتا ہے۔ جسے اس کا اس کی قوم کا ماحول کہا جا سکے۔ اس صورت حالات کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ ہماری تعلیم انگریزی کے بجائے اُردو میں ہو۔

دوسری دلیل یہ ہے۔ کہ اس وقت ہماری روزمرّہ کی تعلیم میں ایک زبردست تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے۔ ہر استاد کی یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ شاگرد اس کی انگریزی کی تعریف کریں۔ اس کی توجہ بے شک مضمون کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ کریا اس کے برابر انگریزی کی طرف ہی ہوتی ہے۔ حالانکہ چاہیئے یہ کہ اس کی توجہ مضمون کی طرف رہے اور اظہار خیالات کے تابع ہو نہ کہ خیالات اظہار کے۔ ادھر شاگردوں کا یہ حال ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی انگریزی کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ استاد انگریزی کیسی بولتا ہے۔ اچھی انگریزی بولنے والے استاد کو زیادہ نمبر دیتے ہیں۔ جب شاگردوں کو نفس مضمون کی طرف کچھ توجہ ہوتی ہے

اور وہ چاہتے ہیں کہ اُستاد سے کوئی سوال پوچھیں تو اگر اُنہیں انگریزی میں سوال بنانا آتا ہے۔ تو سوال زبان پر لے آتے ہیں۔ ورنہ اسے اندر ہی اندر دبا جاتے ہیں۔ اس لئے پڑھنے اور پڑھانے کا حق بالکل پورا نہیں ہوتا۔ اگر اُردو میں پڑھائی ہو تو استاد بھی سارا زور مضمون پر لگائے۔ شاگرد بھی سوال پوچھنے میں حجاب محسوس نہ کریں۔ اور پڑھائی کا وقت ٹھکانے لگے۔

ان دلائل کے نتیجے کے طور پر ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ انگریزی کی وجہ سے ہماری تعلیم معلومات اور اخذ مضامین کے لحاظ سے بہت کمزور رہتی ہے۔ ہمارے بچے معلومات کے لحاظ سے انگلستان اور امریکہ کے ہم عمر بچوں سے بہت پیچھے ہیں۔ ان کے سیکھنے کی رفتار ہی سست نہیں ہوتی بلکہ وسعتِ معلومات کے لحاظ سے بھی وہ کمزور رہتے ہیں۔ انگلستان کا بچہ ہمارے بچے کی نسبت بہت جلد جلد سیکھتا ہے۔ اور بہت زیادہ سیکھتا ہے۔ اس فرق کا اثر ہمارے بڑی عمر کے معلمین محققین مصنفین اور مؤلفین کے کام پر پڑتا ہے۔ انگریز اور امریکن پروفیسر سب کچھ کام کر لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے پروفیسر ایسا نہیں کرتے اور نہیں کر سکتے۔ یہاں بھی میرا روئے سخن افراد کی طرف نہیں بلکہ قوم کی مجموعی حالت پر ہے۔ ہماری علمی پسماندگی کے کئی اور وجوہ بھی ہیں۔ لیکن ایک بہت بڑی وجہ غیر ملکی ذریعۂ تعلیم بھی ہے۔ جس سے ہمارے بچوں کی ذہنی نشوونما رکی رہتی ہے۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ کم از کم دو سال کا نقصان ہمارے بچوں کا ضرور ہوتا ہے یعنی جو مضامین اور جو علوم وہ آج سے دو سال بعد اخذ کریں گے۔ وہ آج ہی اخذ کر سکتے تھے۔ بشرطیکہ ذریعۂ تعلیم کی روک درمیان میں نہ ہوتی۔ اگر آج ذریعۂ تعلیم اُردو ہو جائے تو ہمارے بچوں کے دماغوں میں اور اُن کی معلومات میں محض اس تبدیلی کی وجہ سے دو سال کا اضافہ ہو جائے۔

جب ہم اس بات کے قائل ہو جاتے ہیں کہ ذریعۂ تعلیم اُردو ہی ہو تو پھر یہ سوال

پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی کی جگہ اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ تو کس رفتار اور کس طریق سے بنایا جائے؟ اس سوال پر کچھ عرصہ سے بحثیں ہو رہی ہیں۔ جہاں تک میں نے ان بحثوں کو سمجھا ہے۔ دو قسم کے خیالات کی آپس میں کش مکش معلوم ہوتی ہے۔ ایک گروہ جلدی کا خواہاں ہے اور اس تبدیلی کو جبر سے رائج کرنا چاہتا ہے۔ یعنی کوئی مانے یا نہ مانے سب کو مجبور کیا جائے۔ کہ فلاں تاریخ سے درس و تدریس میں، امتحانوں میں اُردو کو بطور ذریعۂ تعلیم اختیار کرلیں۔ دوسرا گروہ جلدی کے خلاف ہے۔ اور چاہتا ہے کہ پہلے بعض شرائط یعنی مناسب کتابوں کا مہیا کرنا۔ اصطلاحات کی تعیین۔ اُستادوں کی ٹریننگ وغیرہ پُوری ہو جائیں تو پھر اُردو کو کسی سکیم کے مطابق جاری کیا جائے۔ جب ان دونوں گروہوں میں بحث شروع ہوتی ہے۔ تو ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف دلائل ہیں۔ اور حقیقت غالباً (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) بین بین ہے۔

جو لوگ جبر سے اور جلدی اُردو کو انگریزی کی جگہ ذریعۂ تعلیم بنانا چاہتے ہیں وہ اس بات کو نظرانداز کرتے ہیں۔ کہ کوئی قانون فائدہ نہیں دے سکتا۔ جب تک ایک حد تک قوم کا تعاون حاصل نہ ہو۔ دنیا میں دیرپا فوائد انہی قواعد اور انسٹی ٹیوشنز سے ہوتے ہیں۔ جن کی بُنیاد آزادی اور اختیار پر رکھی جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اچھے سے اچھے کام میں انسان کسل دکھاتا ہے۔ اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دور رس فوائد کو فوری سہولت اور وقتی آرام پر قربان کر دیتا ہے۔ لیکن سو فیصدی جبر سے دنیا میں کبھی کوئی کام نہیں ہوتا۔ مذہبی تعلیمیں ہزاروں ہزار سال تک قوموں کے رسم و رواج پر اُن کے روزمرہ کے اخلاق پر اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے۔ کہ شروع میں لوگ ان تعلیموں کو اپنی مرضی سے اختیار کرتے ہیں۔ پھر وہ قوم میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ اور نسلوں کی نسلیں اُن سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرتی چلی آتی ہیں۔ ان تعلیموں کا

کچھ ایسا عنصر بھی ہوتا ہے۔ کہ بڑے بڑے عقیدت مند انہیں اپنے لئے بار سمجھتے ہیں۔ یا
عقیدت مندوں کا کچھ حصہ ایسا ہوتا ہے جو خوشی خوشی ہر بات کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا
اس حصے کے لئے جبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ جبر درحقیقت جبر نہیں بلکہ انسانی کمزوری
کو ذرا سہارا دینا ہے۔ ہم اپنی تعلیم میں ایک ضروری اصلاح جاری کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم
چاہتے ہیں کہ وہ اصلاح کامیاب ہو تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد لوگوں کی
مرضی پر رکھیں۔ ذریعۂ تعلیم پر جو بحثیں حال ہی میں یونیورسٹی کی مختلف مجالس میں ہوئی
ہیں۔ اُن سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے۔ کہ اساتذہ عام طور پر اُردو ذریعۂ تعلیم اختیار
کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بعض تو صرف ہچکچاتے ہیں لیکن ایسے بھی ہیں جو دیانتداری سے
یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اُردو سے معیارِ تعلیم گر جائے گا۔ اب اُردو اگر ذریعۂ تعلیم بنے گی۔ تو اس کے
بنانے والے اساتذہ ہی ہوں گے نہ کہ کوئی اور۔ اور یہی طبقہ اُردو کے متعلق پس و پیش
سے کام لے رہا ہے۔ کیا جبر سے اُستادوں کا تعاون حاصل ہو سکے گا؟ جبر سے تو اور
مقابلے کا میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہی استاد جو اس وقت قیاساً یہ کہہ رہے ہیں کہ
اُردو سے معیارِ تعلیم گر جائے گا۔ اپنی دانستہ و نادانستہ کوششوں سے معیارِ تعلیم
کو گرا کے چھوڑیں گے۔ معیارِ تعلیم اُردو سے گرے گا نہیں بلکہ اونچا ہوگا۔ اور جب اُردو اپنی
جگہ پورے طور پر بنا لے گی۔ اور قوم نے اور اساتذہ نے معمولی ساتھ بھی اس تبدیلی کا دیا اور
باقی پہلوؤں سے ہماری تعلیم میں اور کوئی غیر معمولی اصلاح یا غیر معمولی کوشش نہ بھی ہوئی۔
تب بھی محض اُردو سے ہماری تعلیم میں ترقی کی ایک رو پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اس ترقی
کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کہ ہم ضرور اُستادوں کی ایک بڑی جماعت کو
اس کے خلاف اکسائیں۔ بلکہ ضروری یہ ہے۔ کہ ہم ان کا تعاون حاصل کریں اور یہ اسی طرح
ہو سکتا ہے۔ کہ ان کو قائل کریں اور جب تک ان کو قائل نہیں کر سکتے۔ ان کو آزاد چھوڑ
دیں۔ اور کوئی قانون ایسا نہ بنائیں جس سے وہ اُردو کے اختیار کرنے پر مجبور ہوں

چند اُستاد جو اس وقت اُردو کے قائل ہیں۔ اُردو میں پڑھائی شروع کردیں۔ اُردو میں کتابیں لکھیں۔ لیکچر دیں اور پھر دیکھیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اُردو کی حقیقی اور مستقل کامیابی کی یہی صورت ہوگی کہ اُردو اپنی طبعی ضرورت کو خود منوائے۔ اور انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ ایک بحث کے دَوران میں اُردو کے بعض حامی یہ کوشش کر رہے تھے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ مضامین میں اُردو کو بطور ذریعۂ امتحان تسلیم کروالیا جائے۔ ایک سائنسی مضمون پر غالباً زوآلوجی پر آکر یہ سلسلہ رُک گیا۔ اس پر ایک صاحب بولے کہ آخر ہم یہ تو نہیں کہتے کہ انگریزی نہ ہو اس کی جگہ اُردو ہو۔ ہم تو صرف یہی کہتے ہیں کہ انگریزی بھی ہو۔ اور اُردو بھی۔ اس میں انگریزی کے حامیوں کا کیا ہرج ہے؟ اس پر انگریزی کے ایک حامی بولے کہ یہی آپ کی (یعنی اُردو والوں کی) چالاکی ہے۔ اس طرح اُردو یونیورسٹی تعلیم پر مسلّط ہو جائے گی۔ تو اصل بات بھی یہی ہے۔ اُردو کو راستہ دو۔ اپنی طبعی ضرورت اور اس ضرورت کو پُورا کرنے کی صلاحیت اُردو خود منوالے گی۔

پھر دوسری بات یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ ایک لمبا عرصہ اعلیٰ تعلیم سے اُردو غائب رہی ہے۔ اور شروع ہی سے اعلیٰ تعلیم اور جدید علوم کے پڑھانے کا ذریعہ انگریزی رہی ہے۔ یک لخت اُردو کو ذریعہ بنا دینا کوئی آسان بات نہیں۔ اِس میں کئی دِقّتیں ہیں۔ اِن دِقّتوں کا پُورا علم ہی تب ہوگا۔ جب ہم سنجیدگی سے اُردو میں تعلیم کا کام شروع کردیں گے۔ اگر فوراً یہ قانون بنا دیا جائے۔ کہ فلاں تاریخ سے سب پڑھائی اور سب امتحان اُردو میں ہوں گے تو ہو سکتا ہے کہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہمیں نقصان زیادہ ہو۔ اور فائدہ کم۔ انگریزی کی سہولتیں ہم فوراً کھو بیٹھیں اور اُردو کے فوائد حاصل کرنے کا بھی موقعہ نہ ملے۔ اگر فوراً اُردو کو کامیاب کرنے کے لئے ہم کسی زبردست منصوبہ پر بھی عمل کریں۔ اور ہر مضمون کی درسی کتابیں تیار کرنے کے لئے کچھ وقت مقرر کردیں اور اُستادوں کو اس کام پر لگا دیں۔ تو اس کے نتائج بھی اچھے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ قریباً سب اُستاد

ناتجربہ کار ہوں گے۔ درسی کتابوں کی تیاری بھی تجربہ چاہتی ہے۔ ابھی ہمارے استادوں کی زبانوں پر اُردو الفاظ جاری نہیں ہوئے۔ اُردو طرزِ بیان۔ اُردو اصطلاحات اور اُردو محاورے سے ابھی وہ غیر مانوس ہیں۔ جب چند ایک سال وہ اُردو بھی پڑھالیں گے تو خود بخود اُردو میں لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ آخر ارتقائی اور تدریجی طریق تبدیلی کے یہی تو فوائد ہوتے ہیں۔ کہ جو کچھ ہوتا ہے۔ سہولت سے ہوتا ہے۔ پُرانی چیزوں کے فوائد بھی مدِ نظر رہتے ہیں۔ اور نئی چیزوں کے نقصان سے انسان بچا رہتا ہے اور جو تبدیلی بھی ہوتی ہے مستقل اور حقیقی ہوتی ہے۔

جبر کے حق میں جو لوگ اس وقت ہیں وہ بھی اپنی آواز آرٹس کے مضامین تک محدود رکھتے ہیں یعنی تاریخ، فلسفہ، اقتصادیات، پولٹیکل سائنس وغیرہ۔ فزکس، کیمسٹری، بایالوجی وغیرہ پر آکر وہ بھی رُک جاتے ہیں۔ اور محسوس کرتے ہیں کہ سائنسی تعلیم میں جبر چل نہیں سکتا۔ اس وقت یونیورسٹی کے حلقوں میں جو رائے آخری سفارش کے طور پر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے سامنے بغرض فیصلہ پیش ہے۔ غالباً یہ ہے کہ آرٹس کے مضامین میں جبری طور پر اور سائنسی مضامین میں اختیاری طور پر اُردو کو ذریعہ تعلیم و امتحانات بنا دیا جائے پس معلوم ہوا کہ جہاں کوئی تبدیلی اپنے اندر مشکلات رکھے۔ وہاں صحیح طریق یہی ہوتا ہے کہ جو تبدیلی کے قائل ہوں اُن کو آزادی دی جائے۔ کہ وہ اس تبدیلی کو اختیار کریں اور اس پر عمل کر کے دکھائیں کہ اس سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ جبر سے آرٹس اور سائنس میں خواہ مخواہ اس قسم کا امتیاز پیدا ہو جاتا ہے اور ایک رنگ میں اُردو کی بے بسی کا اقرار اور اظہار ہوتا ہے۔ اُردو کے حامیوں کو چاہیئے کہ وہ اختیار کے اصول کو اپنا اصول بنالیں۔ اور اسے سب مضامین پر آرٹس، سائنس، ٹیکنیکل، پروفیشنل پر جاری کر دیں۔ پھر دیکھیں کہ اُردو اپنی جگہ بناتی ہے یا نہیں۔ یقیناً بنائے گی۔ ہاں بعض مضامین میں جلدی بعض میں دیر سے لیکن ایک بہت بڑی تبدیلی کی بنیاد رکھدی جائے گی۔ جو اپنی ذاتی [illegible]

پائے گی۔ اختیار کے اصول کے تحت سب مضامین ایک سطح پر آجاتے ہیں۔ اور یہ احساس ہٹ جاتا یا بہت کم ہوجاتا ہے۔ کہ سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم اُردو میں نہیں ہوسکتی۔ سب مضامین کے لئے ایک ہی قانون اور ایک ہی طریق ہوگا۔ اس سے مضمون مضمون میں جو فرق اُردو کو اپنانے کے لحاظ سے ہے۔ وہ زیادہ سامنے نہیں آئے گا۔ اور طبیعت پر گراں نہیں گزرے گا۔

ایک اہم سوال اصطلاحات کا بھی ہے۔ اصطلاحات کے متعلق شرط عام طور پر جو لگائی جاتی ہے وہ کچھ ایسی زیادہ ٹھوس نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک اصطلاحات کا معین کیا جانا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ اُستاد ایک اصطلاح استعمال کرے اور کتاب کچھ اور یونیورسٹی کا نصاب کچھ اور' اور امتحان میں بیٹھنے والا اُمیدوار کچھ اور۔ اس ابتری کو دُور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک حد تک اصطلاحات معین ہو جائیں مثلاً یہ ہوسکتا ہے کہ یونیورسٹی کے نصاب میں جو اصطلاحات شامل کی جاتی ہیں۔ اُن کے اُردو مترادفات طیار کر لئے جائیں۔ تاکہ امتحان لینے والوں اور امتحان دینے والوں میں کسی ایک مضمون یا کسی ایک علم کی زبان کے متعلق یعنی اس کی اصطلاحی زبان کے متعلق ایک اشتراک پیدا ہو جائے۔ اور وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ اور سمجھا سکیں۔ اس سے زیادہ اصطلاحات کی طیاری پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ یونیورسٹی کی سینٹ کے ایک اجلاس میں ایگریکلچرل کالج کے پرنسپل صاحب نے بیان کیا تھا۔ اصطلاحات کی تعین کا کام ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ اور ہر وقت ہوتا رہنا چاہیئے۔ یہ اس لئے کہ ایک حد تک اشتراک زبان ہو جائے اور علمی الفاظ اور علمی محاوروں کے مفہوم میں استقلال پیدا ہو جائے اور کوئی یہ نہ کہہ سکے۔ کہ میں فلاں مضمون یا فلاں لفظ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا' اصطلاحات کے استعمال میں کچھ آزادی بھی باقی رہنی چاہیئے' بلکہ علوم کے جو حصے زیر تحقیق ہوتے ہیں ان میں ایسی آزادی ضروری ہے علوم کا ترقی [illegible]

ہوسکتی ہیں۔ جو معین علوم کا حصہ بن چکی ہیں۔ ہماری یونیورسٹی نے میٹرک کی اساسی تعلیم کے لئے اصطلاحات مقرر کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا رکھی ہے۔ اور یہ بالکل صحیح اقدام ہے، لیکن آگے کالجی تعلیم اور یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں کی تعلیم کے لئے یہ ایسا ضروری نہ ہوگا؛ صرف نصاب ہی کی ضروری اصطلاحات کو اُردو میں ڈھال دینا کافی ہوگا؛ باقی اصطلاحات کے لئے سب کو آزاد کر دیا جائے گا؛ کتابیں انگریزی کی استعمال ہوتی رہیں گی۔ جب تک اور جب بھی ان کی ضرورت محسوس ہو۔ اُردو کتابیں بھی استعمال میں آتی جائیں گی۔ اور پڑھانے والے آزاد ہوں گے۔ پڑھنے والوں کو دونوں زبانوں میں اتنی لیاقت ضرور پیدا کرنی ہوگی کہ وہ لیکچرار کا منشا سمجھ سکیں۔ اور یہ ہماری مخصوص اور موجودہ حالات میں اور آئندہ جو حالات ممکن ہیں ان کے لحاظ سے کوئی مشکل بات نہیں، ہم بہرحال سیکھتے دونوں زبانوں کو ہیں چاہے سیکھتے اور بولتے وقت ایک کو دوسری کی نسبت زیادہ آسان سمجھیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اب اُردو کے لئے صرف راستہ کھولنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسے جاری رکھنے کی ضرورت ہے لیکن ذریعہ تعلیم اب انگریزی نہیں رہ سکتا؛ اُردو کو موقعہ دینا ہی کافی ہے۔ اور یہ موقع آپشن یعنی اختیار کی صورت سے دیا جا سکتا ہے۔ شروع شروع میں یہ اختیار اُردو کے حق میں استعمال کیا جائے گا۔ اور اس کے استعمال کرنے والی ایک اقلیت ہوگی لیکن بعد میں یہی اقلیت اکثریت بن جائے گی۔ اور انگریزی کے حق میں جو اکثریت اس وقت ہے وہ اقلیت بن جائے گی۔ ایسی اقلیت کے وجود سے ہمیں یا ہماری قومی تعلیم کو یا ہماری قومی زبان کو کوئی نقصان نہیں؛ اپنے اعلیٰ علمی رسائل اور اپنی اعلیٰ علمی تحقیقات کو اُردو میں ڈھالنے کا سلسلہ ابھی سے شروع ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ اس سے اُردو کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی۔ اور کئی مشکلات جو اس وقت اُردو کو روکے ہوئے ہیں بڑی جلدی دور ہو جائینگی۔ جو لوگ صبر سے اُردو کو نظامِ تعلیم میں داخل کرنا چاہتے ہیں اور جو لوگ انتہائی احتیاط کا سبق دیتے ہیں افراط اور تفریط کے پہلوؤں کو اختیار کئے ہوئے ہیں درمیانی راستہ یہی ہے کہ آپشن کے طریق کو جاری کر کے اُردو کے لئے سامان

بچّوں کی طبعی خصوصیات

محمد شکوراللہ خان

چھوٹے بچّوں کی فطرت آزاد ہوتی ہے اور ان میں جبلّی تحریکات (Instincts) اصلی اور قدرتی حالت میں پائی جاتی ہیں۔ ان تحریکات میں سے کچھ سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اور بعض غیر مفید۔ غیر مفید تحریکات کا صحیح طریقہ پر استعمال سکھانا ہی ایک مدرس کا فرض ہے۔ اِس مقصد کے حصول میں ہر مدرس کو بچّے کی ابتدائی عمر کی کثیر تحریکات میں سے چند مخصوص تحریکات تلاش کرنا اور پھر ان کا صحیح استعمال بچّوں کو سکھانا ضروری ہے۔ مثلاً ہر بچّہ میں خود نمائی کا جذبۂ جنگ و جدل میں حصّہ لینے کا شوق اور ایک گروہ بنا کر اُس میں رہنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ مدرس کو چاہیئے کہ مدرسہ میں ایسا ماحول پیدا کرے جس میں مفید تحریکات کی تکمیل ہو اور باقی ماندہ غیر مفید تحریکات جبلّی کسی صحیح مقصد کے حصول میں تبدیل ہو کر تکمیل پائیں۔ متذکرہ بالا چند تحریکات بطور مثال دی گئی ہیں۔ ان کو اگر اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ تو بچہ ظالم اور خود غرض بن جاتا ہے۔ لیکن اگر بچّوں کو کھیل کے مواقع دیئے جائیں اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ جنگ و جدل کی خواہش اپنی جماعت کا دوسری جماعت سے مقابلہ کر کے کسی کھیل

بیتنے کی کوشش میں تبدیل ہو جائے۔ اور اپنی جماعت کی فتح پر بچے خوش ہوں، اپنے مدرسہ
ب نامی پر ایک فخر یہ مسرت محسوس کریں اور متفق ہو کر کھیلیں اور ایمانداری سے کھیل کے
ن کو مانیں۔ تو وہی خراب جذبہ بہتر مقاصد کے حصول میں تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ اوائل عمری کا
بچوں کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی زمانہ میں ان کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اور کئی
ید صفات والدین اور مدرسین کی باہمی کوشش سے ان میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اور یہ سب
یل کھیل میں ہو سکتا ہے۔

بچوں کے مزاج کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ عام طور پر بچے دو قسم کے مزاج کے ہوتے ہیں۔
۔ تو وہ جو کہ فطرتاً خاموش ہوتے ہیں (.Introvert) اور دوسرے وہ جو ذرا سی بات پر
بگولا ہو کر پھوٹ پڑتے ہیں (Extrovert)

ہر بچہ ظاہری چیزوں کو دیکھ کر اُن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اُسے حرکت کرنے والی چیزیں
ت مرغوب ہوتی ہیں۔ کیونکہ اِس کی ذاتی فطرت حرکت کو پسند کرتی ہے۔ اِس عمر میں بچوں
لئے کھیل اور کھیل کا میدان زیادہ مفید ہے۔ یہاں انہیں بہترین اخلاق کی تربیت دی
تی ہے۔

<u>ہ میں رہنے کی جبلت:</u>

مدرسہ میں عموماً بچے گروہ بنا کر کھیلتے ہیں۔ اور بہت خوش نظر آتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ
ے ساتھ کھیلنے والوں کی تلاش رہتی ہے۔ یہ فطرت ان میں اس حد تک پائی جاتی ہے کہ وہ
ے گروہ کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ ہم اِس جبلت سے زیادہ سے زیادہ
یکام لے سکتے ہیں۔ اگر مدرسے کا کام بجائے ایک بچہ کے ایک گروہ کے سپرد کر دیا جائے اور
ں کام کی ذمہ داری سب پر عائد کر دی جائے تو بچے ایسے کام کو قدرتی چیز سمجھ کر بہت عمدگی
ے کرتے ہیں۔ اِسی طرح ہم ایسے ایک گروہ کی بہ حیثیت اجتماعی، اخلاقی تعمیر بہت کامیابی
ے کر سکتے ہیں۔ مدرسہ میں اسکاؤٹنگ کی تحریک جاری کرکے گروہ بنانے اور اس میں مدد کام

کرنے کی جبلّی تحریک سے بہت مفید نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ اسی ذیل میں بچّوں کی تعمیری جبلّت سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انہیں مٹی یا کاغذ کے نمونے بنانا وغیرہ اپنے گردہ میں بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

ہر مدرس کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ بچّے کی کسی بھی قسم کی جبلّی تحریک کو براہ راست کچل دینا اس بچّے کے لئے سخت مُضر ہے اِسی لئے ایسی غیر مفید جبلّی تحریکات کو کئی طریقہ سے بہتر مقاصد کے حصول میں منتقل کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم تمثیلاً پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور اسی اصول پر والدین کو خصوصی توجہ کرنا چاہیئے۔ اگر ان کا بچّہ کسی گندی دوکان پر مٹھائی دیکھ کر اس کی ضد کرتا ہے اور والدین یہ مٹھائی اس کے لئے نقصان دہ خیال کرتے ہیں۔ تو انہیں اس بچّے کو بُرا بھلا کہنا درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح سختی سے انکار اس بچّہ کی اُبھرتی ہُوئی صلاحیتوں کو فنا کر دے گا۔ ایسے موقعہ پر گھر کی بنی ہُوئی صاف مٹھائی اس بچّے کو دی جائے یا کوئی دوسری مفید چیز خرید کر اُسے کھلائی جائے۔ اس طرح اس کی جبلّی تحریک براہ راست نہیں کُچلی جائے گی۔ اور بہتر صورت میں اس کی تکمیل ہو سکے گی۔

سِن بلُوغ کی خصُوصیات :

یہ زمانہ بارہ سال کی عُمر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔ عُمر کا ہر درجہ دوسرے سے اِس قدر متعلق اور وابستہ ہوتا ہے کہ کوئی سا درجہ نہ تو یکایک شروع ہوتا ہے! اور نہ ختم ہوتا ہے۔ ہم جب انسانی زندگی کی ان تبدیلیوں کو بنظر غائر دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ چھوٹا بچّہ جو پہلے ہر ظاہری چیز کی نمائش کو دیکھتا تھا۔ اب جب بڑا ہوتا ہے۔ تو ان چیزوں کی تصویر اس کے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس حالت تک پہنچنے میں اُسے کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ بڑا ہو کر وہ ایک ریلوے انجن کا نام سنتا ہے اور اس چیز کی تصویر اس کے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے۔

[illegible]

بڑا ہوتا ہے تو اسے پوری دنیا سے مطابقت کرنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اب اس کے لئے میدانِ عمل بہت وسیع ہو جاتا ہے اور اسے نئے سرے سے اسی قدر دقتیں درپیش ہوتی ہیں جس قدر پہلے اُسے بچپن میں اپنے ماحول سے مطابقت کرنے میں پیش آچکی ہوتی ہیں۔ بڑا ہو کر جب وہ سن بلوغ کی منزل میں قدم رکھتا ہے۔ تو خاموش رہنے لگتا ہے۔ کبھی وہ دنیا سے مطابقت کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور بہت ہی مسرور نظر آتا ہے۔ کبھی اس کی یہ کوشش سعیٔ لاحاصل بن جاتی ہے۔ اور وہ غمگین نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ کبھی موجودہ کامیابی کی مسرت سابقہ ناکامی کے صدمہ پر غالب آجاتی ہے۔ اور کبھی موجودہ ناکامی سابقہ کامیابی کی مسرت پر حاوی آجاتی ہے۔ اب وہ اپنی خیالات کی دنیا الگ بنا لیتا ہے۔ وہ دِن میں زندگی کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ اسی طرح ہر زندگی کی ابتدائی منزل رفتہ رفتہ بڑی کشمکش کے ساتھ ختم ہوتی اور دوسری منزل شروع ہو جاتی ہے۔

سن بلوغ کی پہچان:

جب لڑکا چودہ سال کی عُمر میں قدم رکھتا ہے۔ اور لڑکی تیرہ سال کی عُمر میں پہنچتی ہے تو سن بلوغ کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ لڑکے لڑکیاں بڑی تیز رفتاری سے جسمانی نشو ونما پاتے ہیں۔ لڑکی تیرہ سال کے ختم پر مکمل نشوونما حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن لڑکا سولہ سال کی عُمر میں اسی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس حد پر پہنچ کر ان دونوں کی جسمانی نشوونما سست پڑ جاتی ہے اور بیس سال کی عُمر تک ان میں کوئی غیر معمولی ترقی نہیں ہوتی۔ اِس طرح ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سن بلوغ کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ پہلے حِصّہ میں نشوونما بہت تیز ہوتی ہے۔ لیکن خیالات میں غیر یقینی کیفیت پائی جاتی ہے۔ دُوسرے حِصّہ میں یہ نشوونما سست پڑ جاتی ہے۔ لیکن نصف زمانہ اپنی قوتوں کو ترتیب دینے میں صرف ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں بچّہ پر بہت زور پڑتا ہے۔ اگر اس زمانہ میں والدین اور مدرسین کی طرف سے نگرانی میں خامی رہ جائے تو بچے میں ہمیشہ کے لئے غیر ضروری جھجک اور شرم پیدا ہو جاتی ہے۔ اس زمانہ میں جسم کے مختلف حِصّے

غیر مناسب طریقہ پر بڑھتے ہیں۔ آواز بھاری اور غیر استوار ہو جاتی ہے۔ بچپن کی سابقہ تربیت شدہ قوتیں منتشر ہو کر جدید تربیت حاصل کرتی ہیں۔ انسانی زندگی کی انتقالی منزل یہی ہوتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ایک فرد اپنی قوم کی وسیع زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ اسی لئے ماہرین نے اس زمانہ کو نزاکت اور اہمیت میں یکتا تسلیم کیا ہے۔ اس زمانہ میں اگر والدین اور مدرسین صحیح طریقہ پر اخلاق کو تربیت دیں اور نگرانی کریں تو ہر بچہ معاشری، مذہبی اور سیاسی لحاظ سے قوم کا بہترین فرد بن سکتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ہر بچہ اپنے سابقہ مشغلوں کو طفلانہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے "میں نئی دنیا میں آ گیا ہوں۔ جہاں میں بالکل اجنبی ہوں۔ اور میرے جسمانی اور دماغی سب ہی عمل اس نئی دنیا کے لئے ناکافی اور غیر ضروری ہیں" اس کا یہ خیال درست ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا جسم غیر متناسب اور بھدا ہوتا ہے اور دماغ میں فیصلہ کن خیالات نہیں پائے جاتے۔

اس زمانہ میں بچوں کو کھیل کھلائے جائیں تاکہ ان کی جسمانی نشو و نما کی تکمیل ہوتی رہے اور تخیلات کے نشو و نما کی تکمیل کے لئے اسکاؤٹنگ کی تحریک میں انہیں مصروف اور شامل کر دینا چاہیئے کیونکہ کھیل اور اسکاؤٹنگ میں بہت سی ایسی باتیں شامل کر دی گئی ہیں جن کی مدد سے بہ آسانی ترقی کی طرف طبیعت مائل ہو جاتی ہے۔ اس عمر میں ہوم ورک (گھر کا کام) بہت کم دینا چاہیئے۔

سن بلوغ میں دماغی تغیرات:

جب بچہ اس منزل میں قدم رکھتا ہے تو اس کے دماغ میں نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پروفیسر ونیلر نے اس سلسلہ میں کافی تجربہ کیا اور ظاہر کیا ہے۔ کہ اس زمانہ میں ۳۴ فی صدی لڑکے صنف نازک کی طرف متوجہ پائے گئے۔ دوسرے تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس منزل میں ۸۴ فی صدی لڑکے کتب بینی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ۳۳ و ... [illegible]
[illegible]

میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس عمر میں اکثر مذہبی دلچسپیوں اور دستکاریوں کی طرف بھی خاص توجہ پیدا ہو جاتی ہے۔

جذبات کا فروغ:

فرائڈ کا قول ہے کہ اس زمانہ میں فطرتاً ہر لڑکا صنفِ نازک کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ فرائڈ نے اس جذبہ کو ایک قدرتی بات ثابت کیا ہے۔ اور ایک جگہ وہ مثال دیتا ہے۔ کہ ایک چھوٹی بچی فطرتاً اپنے باپ سے اور چھوٹا بچہ اپنی ماں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ بچوں کو کم عمری میں اپنے ہم عصروں سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن سن بلوغ پر پہنچ کر وہ صنفِ مخالف سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ ان مدارج کو فطری ثابت کر کے ظاہر کیا گیا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی والدین یا مدرسین کو براہ راست پامال نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن ایسی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہیں جن کی مدد سے یہ نفسیاتی کشش جو کہ سوسائٹی میں ممنوع ہے، دوسرے اصلاحی اور بہتر راستوں کو اختیار کرے۔ مثلاً اس زمانہ میں بچوں کو ہر وقت کام میں مشغول رکھا جائے۔ ورزشی کھیل کھلائے جائیں تاکہ یہ فاضل طاقت اس طرح صرف ہو جائے۔ نفسانی خواہش ایک دماغی طاقت ہے اور کھیل ــــ دماغ کو مصروف رکھتے ہوئے اس کی تکمیل کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس جذبہ میں بہت قوت ہوتی ہے۔ اس لئے عمدہ مدرسین اس جذبہ کو بہتر طریقہ پر تبدیل کر کے طلبا کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ کئی مثالیں پیشتر دی جا چکی ہیں۔ اس کوشش کو ارتفاع تحریکات جبلّی (Sublimation of Instincts) کہتے ہیں۔

اس زمانہ میں بڑی شدت سے معاشری جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ سیاست اور خودی کے جذبات نئی شان سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب عمر کا سولہواں سال گذر جاتا ہے تو مذہب پر نکتہ چینی کرنے کا خیال جاگ اٹھتا ہے۔ حُسن پرستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور لڑکا ہر چیز میں حُسن تلاش کرتا ہے۔ شاعر بن جاتا ہے۔ یہی زمانہ اس کے چال چلن قائم ہونے کا ہوتا ہے۔ اگر اس زمانہ میں مدرس عمدہ اور تعمیری جذبات پیدا کر دے تو لڑکے میں یہی جذبات

اعلیٰ اخلاقی اور بلند کردار کی بنیاد بن جاتے ہیں۔

سن بلوغ کی تعلیمی اہمیت :

کسب معاش کا اہل بنا دینا یا علمیت اور تمیز ہی تعلیم کا منشاء نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم کا منشاء ہے کسی میں زندگی ہر نقطۂ نظر سے عمدہ اور وسیع پیمانہ پر گذارنے کی اہلیت پیدا کر دینا۔ اور یہ وہ زندگی ہوتی ہے جو کہ دوسروں سے ہمدردی کرنے اور روحانی ارتقا حاصل کرنے میں صرف ہو۔ اسی لئے جب بچے سن بلوغ کی منزل میں ہوں۔ تو ہمیں ان کی تعلیم میں مختلف اخلاقی پہلوؤں کی رعایت رکھنا چاہیئے۔ اور اس عمر کے بچوں کی ضروریات اور خواہشات کا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس عمر میں بچوں کی جسمانی ورزش اور ان کے کام اور آرام کا وقت مقرر ہونا چاہیئے۔ ہوم ورک ان کو زائد نہیں دینا چاہیئے۔ جن بچوں کو دستکاری اور صنعت و حرفت سے دلچسپی پیدا ہو تو ان کے اس جذبہ کی تکمیل کا انتظام کرنا چاہیئے۔

بوائے اسکاؤٹس، گرلز گائڈ، ڈراما کلب اور دوسری ہی ایسی انجمنیں طلباء میں معاشری احساس کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ اس لئے مدرسہ میں ایسی تحریکات بہت اعلیٰ پیمانہ پر جاری رکھنا ضروری ہیں۔ آج ہمیں ہر شہری میں معاشری جذبات پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اور ـــــ میرا خیال ہے مدرسین ہی اس ضرورت کو زیادہ سے زیادہ پورا کر سکتے ہیں۔

ہم جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟

راز ق نُور

بہت لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے تمام عمر میں ایک دفعہ بھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ آپ ذرا اپنے حافظے پر زور ڈالیں اور دل ہی دل میں یاد کرنے کی کوشش کریں۔ واہ آپ جھینپ گئے۔ ایک۔ دو۔ چار دفعہ جھوٹ بولنا بھی کوئی بڑی بات ہے؟ لیجئے میں آپ سے منوانا نہیں چاہتا۔ آپ اپنے راز سینے ہی میں رکھیں۔ کیونکہ جو راز سینے سے باہر ہو جائے وہ راز نہیں رہتا۔ لیکن اگر آپ ذرا اچھی طرح سوچیں گے۔ تو آپ کو بالآخر یاد آہی جائے گا کہ آج یا آج سے دو۔ چار۔ بیس سال پہلے (مجھے مدت سے کوئی غرض نہیں) آپ نے فلاں فلاں موقع پر (محض بزم آرائی کی خاطر ہی سہی) جھوٹ بولا۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ مَیں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ وہ بہت جھوٹا ہے۔ اور بالخصوص آج کل جب کہ بیسویں صدی ہے۔ یہ دعوے کرنا پیغمبری کا دعوے کرنے سے کسی صورت کم نہیں ہے۔ بلکہ فی زمانہ دروغ گوئی کو ایک آرٹ سمجھا جاتا ہے۔ اور فیشن میں داخل ہے۔ مگر احتیاط لازم ہے۔ کیونکہ جب سب لوگ ایک ہی کام کرنے لگ پڑیں۔ تو جب تک

ایک شخص کافی ہنرمند نہ ہو۔ وہ کیسے کامیابی کا مُنہ دیکھ سکتا ہے ؟

بہرحال ہم جھوٹے۔ بڑے۔ مرد۔ عورتیں سب جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ کوئی "سفید" جھوٹ بولتا ہے۔ تو کوئی "دروغِ مصلحت آمیز" اور کوئی "رنگین جھوٹ" بولتا ہے۔ جھوٹ بولنا چاہئے نوشی کی طرح ایک بُری عادت بلکہ نشہ ہے جو ہمیں لاحق ہو گیا ہے۔ ہم اسے تسلیم کریں یا نہ۔ مگر یہ ایک کھُلی حقیقت ہے۔

پس یہ امر قابلِ غور ہے۔ کہ ہم جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ سچ پُوچھئے۔ تو جھوٹ ایک مہلک دماغی مرض ہے۔ اس سے حافظہ تک بگڑ جاتا ہے۔ چنانچہ مشہور فارسی مثل ہے کہ "دروغگو را حافظہ نباشد"۔ یعنی اگر اس مرض کا تدارک نہ کیا جائے۔ تو یہ اِس حد تک بڑھ جاتا ہے۔ کہ مریض کو یہ خیال بھی نہیں رہتا۔ کہ جو کچھ مَیں بک رہا ہُوں اُسے کوئی مانتا بھی ہے یا یُونہی میرا مضحکہ اُڑانے کے لئے ہاں میں ہاں مِلائی جا رہی ہے۔

صحیح تربیت سے بچپن میں دروغگوئی کا مؤثر طریقہ پر انسداد کیا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ بچے کے قوائے ذہنی اُس وقت نہایت نازک ہوتے ہیں۔ اس لئے اِس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ زیادہ سختی سے یہ شاخِ نازک کہیں ٹُوٹ نہ جائے۔ کیونکہ ایسے حالات میں اگر بہت زیادہ احتیاط اور کافی سُوجھ بُوجھ سے کام نہ لیا گیا۔ تو شدید نقصان واقع ہونے کا قوی احتمال ہے۔ مثلاً ایک بچہ جو کہ خوشنویس نہیں ہے ممکن ہے کہ یہ دعویٰ کرے کہ وہ بہت خوش نویس ہے۔ اِس دعویٰ کی وجہ یہ ہو گی۔ کہ فطرت اُس کو مغموم ہونے سے بچانے کے لئے اُس کی تسکین کی خاطر اُس سے یہ دعویٰ کرائے گی۔ چنانچہ اُس کو اندر سے آواز آئے گی "نہیں! تم بڑے خوش نویس ہو"۔ بچہ یہ الفاظ دُہراتا ہے۔ بیرونی دُنیا اِسے جھُوٹ سمجھتی ہے۔ اور یہ دعویٰ واقعی غیر صحیح ہے۔ مگر اس کا یہ علاج نہیں۔ کہ بچے سے صاف صاف کہہ دیا جائے۔ "نہیں، تم خوش نویس نہیں ہو"۔ ایسا کہنے سے بچے [illegible]

اِتنا بُرا تو نہیں ہے۔ کافی اچھا اور روشن لکھتے ہو۔ لیکن اگر تم بُرا بھی لکھتے۔ تو اِس میں ہرج ہی کیا تھا۔ "دُنیا کے اکثر بڑے لوگ مثلاً نپولین بہت ہی بدنویس تھے" جب بچّہ سمجھ جائے گا۔ کہ خوش نویسی کوئی بڑی خُوبی نہیں ہے۔ اور بدنویسی اتنا بڑا عیب نہیں ہے۔ تو اُس کا خیال رفتہ رفتہ بدل جائے گا۔ اور عین ممکن ہے۔ کہ آخرکار وہ یہ دعویٰ ترک ہی کر دے۔ اور یہ خیال ہی دِل سے نکال دے۔

اکثر والدین بچّے کو جُھوٹ بولنے پر سزا دیتے ہیں۔ یہ نہایت سنگین غلطی ہے جُھوٹ یا سچ بولنا بچّے کے اختیار میں نہیں ہے۔ بچّے کے اکثر جُھوٹ غیر اِرادی ہوتے ہیں۔ لہٰذا جُھوٹ کا کھوج نکالنا چاہیئے۔ اور پھر نہایت سنجیدگی کے ساتھ اِس پر غور کرنا چاہیئے۔ کہ یہ جُھوٹ کیوں بولا گیا۔ اور اِس نقص کو کیسے رفع کیا جا سکتا ہے۔ انگلینڈ اور امریکہ میں ان امور کے ماہرین موجود ہیں۔ والدین اپنے بچّوں کو ضرورت کے وقت اِن ماہرین کے پاس لے جاتے ہیں اور علاج کے لئے بڑی بڑی فیس ادا کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں اِس قسم کی سہولتیں کہاں۔ اور اگر ایسی سہولت میسّر بھی ہو۔ تو پھر فیس ادا کرنے کے لئے ہر کس و ناکس کے پاس اتنی رقم کہاں۔ تاہم کچھ بھی نہ کرنے سے کچھ نہ کچھ کر لینا بہتر ہے۔ ایسے مواقع پر ہمیں چاہیئے۔ کہ معاملے پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اپنے فہمیدہ دوستوں سے مشورہ لیں۔ اور بچّے کو صحیح راستے پر ڈالنے کے لئے بیش از بیش غور و فکر اور کافی احتیاط سے کام لیں۔

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ لاٹھی چلانا بجائے فائدہ نقصان کرے گا۔ کان کھینچنے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ گالیاں دینا۔ دھتکارنا۔ دھمکانا اور جھڑکیاں سب بیکار چیزیں ہیں اس سے بچّہ محض ڈھیٹھ بن جاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ کہ سزا تمام امراضِ ذہنی کا واحد علاج ہے۔ کیونکہ اگر سزا ہی کی بات ہوتی۔ تو ہم ہندوستانیوں سے زیادہ نیک اور اچّھا دنیا میں اور کوئی نہ ہوتا۔ بلکہ سزا سے کئی مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کی اِصلاح معمولی

والدین کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اور پھر یہ پیچیدگیاں نسلاً بعد نسل چلی آتی رہتی ہیں۔ اور سوسائٹی مستقل طور پر بگڑ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے مُلک کے نوّے فی صدی باشندے بے دھڑک جھوٹ بولتے ہیں۔ اُن کو اِس سے بھی غرض نہیں۔ کہ اُن کے جُھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ بھی ہے۔ کوئی موقع بھی ہے یا نہیں۔ بس یونہی جُھوٹ بول دیں گے۔ اور اگر کہیں بدقسمتی سے سُننے والوں کو معلوم ہوگیا۔ کہ کہنے والا ایمان پر کلہاڑی مار گیا۔ تو جھٹ تھُوک نگلتے ہُوئے فرمادیں گے "یا رو گپ لڑائی تھی۔ ناراض نہ ہونا محسوس نہ کرنا۔ خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است"۔ اِسی لئے تو اہلِ مغرب کہتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں (بدقسمتی سے اہلِ یورپ کے نزدیک ہندوستان سے مطلب ہندوستان اور پاکستان دونوں ہیں) پچاس فیصدی رابجے رہتے ہیں اور پچاس فیصدی مداری۔ گویا سب جُھوٹے ہیں اور سچا ایک بھی نہیں۔

ہمارے لئے یہ بات کتنی قابلِ افسوس ہے۔ جُھوٹ بولنا کسی مذہب میں روا نہیں ہے۔ کیونکہ جُھوٹا ہر کسی کا اعتماد کھو بیٹھتا ہے۔ اور اس طرح نہ صرف اپنے لئے بلکہ معاشرے کے لئے بھی بیکار بلکہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ مان لیا۔ کہ اغیار ہم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتے لیکن اگر پوری راست گوئی سے کام لیا جائے۔ تو کچھ نہ کچھ نقص ہم میں بھی ضرور ہے۔ ہم بھی جُھوٹ کو اِتنا بُرا نہیں سمجھتے۔ جتنا کہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ اکثر لوگ کسی کی جُھوٹ بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتے ہیں۔ اور بعض شریف لوگ تو ہم میں ایسے بھی ہیں۔ کہ جو جھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "فلاں آدمی بہت مصالحہ دار باتیں کرتا ہے" ایسا نہیں کہتے۔ کہ "فلاں آدمی بہت جھُوٹا ہے۔ ہر وقت بکواس کرتا رہتا ہے۔ سوسائٹی کے لئے مضر ہے۔ شریفوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہے"

بچے قوم کے باپ ہیں۔ کسی قوم کی ترقی کا دارومدار اُس کے بچوں کی صحیح تربیت پر ہے۔ قائدِ اعظم مرحوم پر دُشمنوں نے بہت سے الزامات لگائے۔ لیکن دُشمنوں کو یہ کہنے کی جراٗت نہ ہوسکی۔ کہ قائدِ اعظم جُھوٹے بھی تھے۔ ہمیں اپنے بچوں کے سامنے قائدِ اعظم کی نیک مثال پیش کرنی چاہیئے۔ تاکہ پاکستان مستقبل قریب ہی میں صحیح معنوں میں پاکستان بن سکے۔

جُھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اور سب سے پہلے اسی کا قلع قمع کرنا نہایت ضروری ہے۔ خُدائے تعالیٰ ہماری سب مُشکلات آسان فرمائے۔

کھیل کے متعلّق نظریئے

محمد مظفر الدین

پُرانے زمانہ کے لوگ کھیل کو محض تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ مطلقاً حیوانات کا کام تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان کے بچے محض حیوانات کی دیکھا دیکھی کھیلتے ہیں۔ اور اِس سے کوئی فائدہ نہیں۔

اُنیسویں صدی میں لوگوں نے باقاعدہ اس پر غور کرنا شروع کیا اور اس دَور کے ایک ماہر تعلیم اور مشہور فلاسفر مسٹر ہربرٹ سپنسر (Herbert Spenser) نے کھیل کا مطالعہ کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ (کھیل) زائد قوتِ کار (surplus energy) کا نتیجہ ہے۔ اِس کے بیان میں گو کچھ صداقت تو ضرور ہے کیونکہ تندرست بچہ نچلا نہیں بیٹھتا۔ اور کچھ نہ کچھ ضرور کرتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے کھیل کچھ نہ کچھ کرتے رہنے سے مراد ہے۔ لیکن زندگی میں ایسی مثالیں کئی ملتی ہیں۔ جن پر اس نظریئے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مثلاً دیکھا گیا ہے کہ بچے فاصلے طے کر کے آنے اور تھک کر چُور ہو جانے کے باوجود کھیلنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی تھکان دُور ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں بیمار بچے اپنے ہم عمروں کو کھیلتے دیکھ کر ...

کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اِن دونوں حالتوں (سفر اور بیماری) میں گو ان کی طاقت کا بہت سا حصّہ سلب ہو چکا ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ کھیلتے ہیں۔ پس اگر کھیل زائد قوت کار کا نتیجہ ہوتا تو یہ بچّے کھیلنے کی بجائے صرف آرام ہی کرتے حالانکہ واقعتہً ایسا نہیں ہوتا۔ نیز بچّے مختلف کھیل مختلف عمروں میں کھیلتے ہیں۔ مثلاً تیرنا جو عام طور پر آٹھ سال کی عمر سے پہلے نہیں آتا۔

اس کے بعد ایک اور فلاسفر سٹینلے ہال (Stanley Hall) اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ بچّوں میں اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کو کھیل ذریعے دُہرانے کی قدرتی طور پر خواہش ہوتی ہے۔ اِس کو اعادہ کا نظریۂ (Recapitulation Theory) کہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے مطابق بچّوں کی زندگی انہی مراحل میں سے گذرتی ہے جن میں سے ان کے آباؤ اجداد کی گذری ہے۔ اور مؤخر الذکر کے کاموں کی رُوح بچّوں میں ودیعت ہوتی ہے۔ اجداد نے گھر بنائے۔ گاڑیاں بنائیں۔ بچّے بھی کھیلتے وقت مٹّی کے گھر۔ بیل اور گڈّے وغیرہ بناتے ہیں۔ لیکن یہ خیال بھی چنداں درست نہیں۔ کیونکہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ بچّے کے کھیل مختلف منزلوں پر اس کی نشو و نما کے مطابق مختلف ہوتے ہیں۔

اس کے بعد پروفیسر کارل گروس (Carl Groos) نے جو اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس کے نزدیک کھیل کا مدعا قدرت کی طرف سے بچّوں کو زندگی کی آئندہ کشمکش کے لئے تیار کرنا ہے۔ اور کھیل میں ان فطری تحریکوں کی نشو و نما مقصود ہے۔ جن کی بچّے کو آئندہ زندگی میں ضرورت ہوگی۔ ان کی آئندہ زندگی میں کام آنے والی فطری قوتوں کی تیاری کا وقت بچپن ہے۔ چنانچہ لڑکیاں گڑیوں سے اور رنگدار کپڑوں کے ٹکڑوں سے کھیلتی ہیں مٹّی کی ہنڈیاں۔ چولہے اور ہانڈیاں وغیرہ بناتی ہیں۔ اور زنانہ امور سیکھتی ہیں۔ لڑکے اس کے برعکس ایسے کھیل کھیلتے ہیں۔ جو مردانہ ہوتے ہیں۔ اور جن میں عموماً چستی اور طاقت کی نسبتاً زیادہ ضرورت ہوتی ہے مثلاً گلی ڈنڈا۔ گیند بلّا اور کبڈّی کھیلنا۔ کشتی لڑنا۔ تیر و کمان سے کھیلنا ... مارنا د

ان کھیلوں میں اُن کی وہ قوتیں بڑھتی ہیں۔ جن کی اُنہیں آئندہ کشمکشِ حیات میں ضرورت ہے۔ یہ خیال کسی حد تک درست ہے لیکن ہر پہلو پر حاوی نہیں۔ کیونکہ بچپن کی تحریکات شباب کی تحریکات کے عین مطابق نہیں ہوتیں۔ ان میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ مثلاً بچپن میں بطورِ کھیل لڑتے وقت کتوں کے پلے ایک دوسرے کو ایسا نقصان نہیں پہنچاتے۔ جیسا کہ وہ زندگی میں پہنچاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر ایک گھر میں بہت سی لڑکیاں ہوں۔ اور ان کے بعد لڑکا پیدا ہو۔ تو وہ لڑکا بھی شروع میں اپنی بہنوں کے ساتھ گڑیوں سے کھیلتا ہے۔

اِس کے بعد ایک اور فلسفہ دان مسٹر میکڈوگل (Mr. Mcdougal) نے یہ قیاس کیا کہ بچے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی قدرتی خواہش کی وجہ سے کھیلتے ہیں۔ لیکن یہ خیال بھی درست نہیں۔ کیونکہ بچے ایسے کھیل بھی کھیلتے ہیں۔ جن میں مقابلہ مقصود نہیں ہوتا۔ مثلاً کاغذ کاٹنا۔ گھوڑا بنانا۔ صفحے اُلٹانا وغیرہ۔

بعد ازاں ایک اور فلاسفر مس ایپلٹن (Miss Appelton) نے بڑے غور و خوض کے بعد یہ نظریہ پیش کیا کہ بچہ اپنی جسمانی بناوٹ اور فطری نشوونما کی خاطر کھیلتا ہے۔ اس کے کھیل مختلف اوقات میں اس قسم کے ہوتے ہیں جو اس کی موجودہ حالت میں اس کے بڑھتے ہوئے جسم و دماغ کو درکار ہوتے ہیں۔ مثلاً نوزائیدہ بچہ کے مُنہ کے ساتھ اگر کوئی چیز لگائی جائے تو وہ اس کو چُوسنے لگتا ہے۔ اور اس کو مُنہ میں لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ یہ فعل اس کے لئے خوراک (دُودھ) حاصل کرنے کی غرض سے لازمی ہے۔ جس کی اُسے اُس وقت ضرورت ہوتی ہے۔ جب دُودھ پینا اُس کو آجاتا ہے تو پھر وہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اور مختلف اقسام کی بلا ارادہ یا بلا ارادہ حرکات کرتا ہے۔ کیونکہ اُس کی فطرت اُس وقت اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں مار کر خوراک ہضم کرنے کے علاوہ اعضا میں طاقت پیدا کرے۔ اس کا کھیل اس وقت ہاتھ پاؤں ملنا ہی ہے۔ جب اُس میں مزید طاقت آجاتی ہے۔ تو وہ شوخ رنگدار گڑیوں۔ گیند اور متحرک چیزوں کے ساتھ کھیلتا ہے یا چاہتا ہے۔ کیونکہ اُس وقت

اسے اپنے حواس کی نشو و نما منظور ہوتی ہے۔ پھر جُوں جُوں اُس کا دماغ سمجھ دار ہوتا جاتا ہے اُسی نسبت سے وہ پیچیدہ کھیلوں کی طرف متوجہ ہوتا جاتا ہے۔ اُس وقت اُس کی فطرت کا تقاضا نئی نئی باتیں سیکھنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس میں کہانیاں سُننے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ جو اس منزل میں اس کی دماغی ترقی اور تصورات کے لئے ضروری ہے۔

یہ نظریہ دوسرے نظریوں کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہے کیونکہ انسان دراصل فکر و عمل کا مجموعہ ہے۔ بچّے کی یہ قوتیں (فکری و عملی) نہایت محدود ہوتی ہیں۔ قوتِ مفکّرہ عملی قوّت پر کماحقہٗ کنٹرول نہیں کر سکتی۔ اور قوت عملی کا خاصہ حرکت ہے۔ اِس لئے وہ بے کار نہیں رہ سکتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بچّے کی حرکات ابتدا میں بے قاعدہ سے ہوتی ہیں۔ جسمانی نشو و نما کے ساتھ ساتھ ذہنی ارتقا کا سلسلہ بھی شروع ہوتا ہے۔ جُوں جُوں یہ قوتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ باہم مربوط ہوتی جاتی ہیں۔ تا آنکہ بچّے کی قوتِ عملی اس کی قوتِ مفکّرہ کے کنٹرول میں آنے لگتی ہے۔ اور اسی نسبت سے اُس کی حرکات کسی اندرونی محرک یا خارجی تاثر سے اثر پذیر ہوتے ہُوئے باقاعدہ ہوتی جاتی ہیں۔ بالآخر وہ حرکات کھیلوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہیں یا اگر وہ بچّے کے کسی نصب العین اور مقصد کا نتیجہ ہیں۔ تو اُس کے لئے کام بن جاتی ہیں۔ جُوں جُوں یہ قوتیں ارتقا کی منزلیں طے کرتی چلی جاتی ہیں۔ بچّے کے کھیل جو پہلے بے قاعدہ حرکات تھے کام کی شکل میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ چونکہ تفریحِ طبع کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے اس لئے بچّہ اپنے تقاضائے عمر کے مطابق نئے نئے کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ جو اس کی فکری اور عملی قوتوں کے ارتقا کے متناسب ہوتے ہیں۔ اور سابقہ منزلِ عمر کے کھیلوں کا چارج وہ بچّے لیتے ہیں۔ جو اُس درجۂ عمر میں آکر داخل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ فطرت کسی بچّے کو دماغی قوت اسی کی قوتِ عملی کی بہ نسبت زیادہ عطا کر دیتی ہے۔ اس صورت میں بچّہ ایسے کھیل کم کھیلتا ہے جو جسمانی طاقت کے خواہاں ہوتے ہیں یا اس کے برعکس معاملہ ہوتا ہے۔ بہرحال بچّہ فطرتاً کھیلنے پر مجبور ہے۔ خواہ کھیل دماغی طاقت کے چاہنے والے ہوں یا عملی قوت

کے خواہاں یا بیک وقت دونوں قوتوں کے طالب ہوں۔

گزشتہ بحث کے بعد ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں :۔

۱۔ بچّے چونکہ نقّال ہوتے ہیں۔اس لئے ان کے کچھ کھیل ان کی اس جبلت کا تقاضا ہوتے ہیں۔

۲۔ اُن میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کے بعض کھیل اس جذبہ کا نتیجہ بھی ہوتے ہیں۔

۳۔ چونکہ بچّے کا بچپن اس کی کتابِ زندگی کا دیباچہ ہے اس لئے اس کی آئیندہ زندگی کے کارناموں کی تفصیل اس کی طفولیت کے کھیلوں کے اجمال میں مضمر ہے اور یہ کھیل اس کی تربیت کی غرض سے فطرت کی طرف سے ہیں۔

۴۔ بچّے کے کھیل اس کے جسمانی نشوونما اور ذہنی ارتقا کے متناسب ہونے سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔کہ وہ اس کے جسم ودماغ کی ترقی کے محرکات ہیں۔

۵۔ یہ کھیل بچّے کی فطرت اور ماحول کے اثرات کا مشترکہ نتیجہ ہیں۔ اور ان کی مدد سے بچّے کے طبعی رجحان کا پتہ چل سکتا ہے۔ اور بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔کہ آئیندہ وہ کس سانچے میں ڈھلنے والا ہے۔ مختصراً ہمیں یوں کہنا چاہئیے۔کہ بچّہ اور بچپن کے کھیل ایسے خواب ہیں۔جن کی تعبیر بچّے کی آئیندہ بلند یا پست شخصیت اور اس کے اعلیٰ یا ادنیٰ کارنامے ہیں۔ نیز فطرت اور ماحول ایسے صنّاع ہیں۔ جو بچّے کے معلّم اور مربّی ہیں۔ اور اسے ایسے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔جس کا نتیجہ اس کا کیریکٹر اور آئیندہ زندگی کے کاروبار ہیں۔

انگلینڈ اور ویلز میں تعلیم

کی روئداد

متعلقہ سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء

ترجمہ:- سلیم فارانی

انتظام و نسق مدرسہ

۱- بنیادی اصطلاحات-

مدرسہ چھوڑنے کی عمر:

(۱)- اِسس سال انگلینڈ کے تعلیمی ڈھانچے میں بڑی اصلاح یہ ہوئی- کہ یکم اپریل سنہ ۱۹۴۷ء سے مدرسہ چھوڑنے کی عمر پندرہ سال تک بڑھادی گئی- چنانچہ اب انگلینڈ اور ویلز میں پانچ سال کی عمر سے لے کر پندرہ سال کی عمر تک مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنا لازمی ہے-

(۲)۔ کوئی نصف صدی تک مدرسی تعلیم بالعموم چودہ سال تک مطلوب رہی ہے۔ موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں بڑی عمر کے لڑکوں کو بسا اوقات مستثنیٰ قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۱۸ء کے ایکٹ نے اس استثنا کا خاتمہ کر دیا۔ اور مدرسہ چھوڑنے کی عمر چودہ ہی مقرر کر دی۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں اس عمر کو پندرہ تک بڑھانے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن ناکام رہیں۔ اس ناکامی کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ ان مدارس کے لئے جو رضاکارانہ طور پر چل رہے تھے۔ اور جو طویل مدرسی زندگی کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر تھے۔ مالی امداد مشکل تھی۔ اور دوسری وجہ ۱۹۳۱ء کی عام اقتصادی بدحالی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ایک ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے مدرسی عمر پندرہ سال کر دی گئی۔ لیکن جنگ شروع ہو جانے کے باعث اس ایکٹ کا اجرا معرض التوا میں پڑ گیا۔

(۳)۔ پندرہ سال تک عمر بڑھانا ۱۹۴۴ء کے تعلیمی ایکٹ کا پہلا نتیجہ ہے۔ اس کے فوائد قدرتی طور پر جلدی ظاہر نہیں ہونے کے۔ اور مدرسوں کے بعض طلبہ کے سلسلے میں یہ مزید ایک سال حقیقتاً کوئی نئی چیز بھی پیش نہیں کر سکے گا لیکن سوائے اس کے کہ بہت سے بچے جن کی مدرسی تعلیم جنگ کے باعث پہلے ہی بُری طرح ٹوٹ رہی ہے۔ ان پر اس کا فوری طور پر منافی اثر ہوگا۔ صرف اعتراض کی خاطر یہ خیال کرنا کہ اس اضافی سال کو مفید ثابت کرنے کی خاطر اس میں کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور ہونی چاہیئے۔ سراسر غلطی ہے۔ بعض مضامین مثلاً تاریخ و جغرافیہ اور جسے بعض اوقات "شہریت" کہا جاتا ہے۔ ایسے ہیں جو چودہ سال کے بچوں کو تو پڑھائے جا سکتے ہیں لیکن کم عمر کے بچوں کو نہیں پڑھائے جا سکتے۔ کیونکہ وہ اس کے لئے پختہ فہم نہیں ہوتے۔ بہرحال مدرسہ کے نصاب کو لمبا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تک مدرسے کچھ تین سالوں میں [illegible] طلبہ پڑھا کر [illegible]

تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مؤثر پیرائے میں چار سالوں کے اندر پڑھایا کریں۔ اس سلسلے میں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس ایک سال کے اضافے سے اُستادوں کو اُن طلبہ کے دل و دماغ پر جو تعلیم پاکر جاتے ہیں کسی حد تک مستقل اثر پیدا کرنے کا موقعہ ملے گا۔ جیسا کہ ہیڈو رپورٹ نے بیان کیا ہے "تعلیم میں بھی صنعت کی طرح بڑھتے گھٹتے منافع کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ اُستاد اُس موقعہ پر اپنے شاگرد کو کھوبیٹھتا ہے۔ جب اس کی پہلی کوششیں بارآور ہونے کو آتی ہیں۔ اور جب کہ وہ قوتیں جو بہت مدت سے خوابیدہ ہوتی ہیں۔ زندہ ہو کر سرگرمیاں دکھانے لگتی ہیں۔ ممکن ہے کہ موجودہ مدرسی زندگی میں چند ہی مہینوں کا اضافہ اسے اس قابل بنادے۔ کہ وہ اس چنگاری کو بھڑکا کر شعلہ کردے جو شاید اس اضافہ کے نہ ہونے کے باعث بُجھ جائے۔

(۴)۔ مدرسہ چھوڑنے کی عمر میں اضافے کے باعث نئے سال تعلیمی کے آغاز تک مدرسی آبادی میں تقریباً چار لاکھ بچوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ زائد عمر کے طلبہ کے لئے کچھ تو موجودہ عمارتوں میں گنجائش پیدا کی جارہی ہے۔ اور کچھ فوری تعمیری پروگرام کے ذریعے ۶۰۰۰ کے قریب عارضی کمرے تعمیر کئے جارہے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مستقل عمارتیں بھی بنائی جارہی ہیں۔

ب۔ مدرسے کے نظم ونسق میں اصلاحات۔

ابتدائی اور ثانوی مدارس کے لئے توسیعی تجاویز:

(۵)۔ سنہ ۱۹۴۴ء کے تعلیمی ایکٹ کی رو سے تمام مقامی تعلیمی محکموں سے کہا گیا تھا۔ کہ یکم اپریل سنہ ۱۹۴۶ء تک یا اس کے بعد کی کسی ایسی تاریخ تک جس کی وزیر معارف کسی خاص محکمے کے حق میں اجازت دیں ایک توسیعی سکیم تیار کرکے وزیر معارف کو بھیج دیں جس میں یہ ظاہر کریں۔ کہ وہ اپنے علاقے میں ابتدائی اور ثانوی مدارس کی

کافی تعداد حاصل کرنے کی خاطر کس قسم کا اقدام کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس کام کی تکمیل کے لئے اُن کا کیا پروگرام ہوگا؟

(۶)۔ ان اسکیموں کی تیاری کی خاطر جن میں نہ صرف اس نقصان اور تباہی کی جو جنگی استعمال کے باعث بمباری اور بوسیدگی سے ہوئی تھی۔ تلافی کی تدابیر اور ان عام ضروری ترمیموں کی تکمیل جو جنگ کے دوران میں معرض التوا میں رہ گئی تھیں دکھانی مقصود تھی۔ بلکہ ایک زیادہ ترقی یافتہ نظامِ تعلیم کی تعمیر کا طویل عرصے کا پروگرام بھی پیش کرنا تھا۔ تمام مقامی تعلیمی اداروں کو اپنے علاقے کی ضروریات کا پورا پورا جائزہ لینا پڑا۔ چنانچہ جن امور پر ان مقامی تعلیمی اداروں کو اپنی توجہات مرکوز کرنا پڑیں۔ اُن میں سے چند یہ تھے۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں، تمام قسم کے مدارس کے لئے زیادہ فراخ اور جاذب توجہ عمارتیں، پانچ سال سے کم عمر کے بچّوں کے لئے مناسب خوراک، اور بڑے بچّوں کے لئے تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کی خاطر از سرِ نو عام تنظیم تاکہ گیارہ سال سے زیادہ عمر کے تمام بچّوں کو صحیح ثانوی تعلیم میسّر ہو۔

(۷)۔ گیارہ سال سے زیادہ عمر کے تمام بچّوں کے لئے ثانوی تعلیم میسّر کرنے کے اہتمام سے ثانوی تعلیم کا ایک بالکل نیا تصوّر قائم کرنا پڑا ہے۔ مقامی تعلیمی افسروں اور اُستادوں کی رہنمائی کی خاطر اِس نئی قسم کی ثانوی تعلیم کے مقاصد اور طرقِ تعلیم کے مکمل مباحث شائع کئے گئے ہیں۔ وزیرِ معارف کی انتہائی خواہش ہے۔ کہ تمام بچّوں کو ثانوی تعلیم دینے کا جو مسئلہ پیدا ہوا ہے اس کے مختلف حل میسّر آئیں۔ اور توسیعی تجاویز اور اسکیموں کو غور سے دیکھنے کا مقصد وزیرِ معارف کے نزدیک یہی ہے کہ یہ تمام تجاویز صحیح تعلیمی اصولوں اور صحیح طرزِ عمل کے مطابق ہوں۔ اور ان میں موجودہ اعلیٰ معیار کو ہر ممکن طریق سے قائم رکھنے اور اس میں ترقی کرنے کا سامان ہو۔

(۸)۔ ایک سو چالیس کے قریب توسیعی اسکیموں پر غور کرنے کا بڑا کام کسی حد تک

پہلے ہی مکمل ہو چکا ہے۔ اور وزارت کو اُمید ہے کہ ۱۹۴۸ء کے اختتام تک سارا کام ختم ہو جائے گا۔

اعلےٰ تعلیم:

(۹)۔ ۱۹۴۴ء کے ایکٹ کی رو سے مقامی تعلیمی محکموں کو ہدایت کی گئی تھی۔ کہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک اپنے علاقوں کے متعلق اعلےٰ تعلیم کی اسکیمیں تیار کر کے وزیر معارف کے پاس بھیج دیں۔ اور ان اسکیموں میں یہ ظاہر کریں۔ کہ وہ محکمے مدرسوں سے فارغ ہونے والے طلبہ کی تعلیمی ضرورتیں مہیا کرنے کے لئے کیا اہتمام کرنا چاہتے ہیں۔ جب یہ اسکیمیں منظور ہو جائیں گی تو پھر یہ ان اداروں کا فرض ہو جائے گا۔ کہ ان کو عمل میں لائیں۔ مقامی اداروں کو اعلیٰ تعلیم کے متعلق معلومات کا ایک مناسب پس منظر دینے کے لئے اور اپنے علاقے کی تعلیمی ضرورتوں کے جائزے میں رہنمائی کے لئے اور ان ضرورتوں کی تکمیل کے ذرائع ڈھونڈھنے کے متعلق مشورہ اور ہدایات دینے کے لئے اعلیٰ تعلیم پر ایک رسالہ شائع کر دیا گیا ہے۔ اور جن راہوں پر اسکیمیں تیار کرنی مقصود ہیں۔ ان کا ایک خاکہ بھی دے دیا گیا ہے۔ اِس میں ایسے موضوع بھی ہیں۔ مثلاً ہمسایہ محکموں، یونیورسٹیوں اور صنعتوں سے اشتراک عمل کے طریقے، کالجوں میں تحقیقی کام، بڑے کالجوں کے انتظام کے طریقے، نیز اعلیٰ تعلیم کے مختلف حصّوں کے لئے نصاب مہیا کرنے کے متعلق ضروری امور۔ مقامی محکموں کی تیار کردہ یہ اسکیمیں وسیع ہوں گی۔ اور ان میں مثال کے طور پر یہ بھی شامل ہوگا۔ کہ جو لوگ کوئی ملازمت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یا اپنے پیشے میں ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے لئے کون سے پیشہ ورانہ نصاب ہونے چاہئیں؟ جو لوگ پہلے ہی ملازم ہیں۔ ان کے لئے روزانہ یا شبانہ اسباق کیا ہوں؟ نیز فرصتی ضرورتوں کے لئے ہر قسم کے اسباق اور رفتہ رفتہ ضلع وار کالج مہیا کرنے کے لئے

محکمے کی تجاویز میں مذکور ہوں گی۔

(۱۰)۔ اعلیٰ تعلیم کے متعلق مقامی محکموں کی اسکیمیں اب پہنچ رہی ہیں۔ اس دوران میں اعلیٰ تعلیم کی تسلی بخش اسکیم تیار کرنے کے لئے سہولتیں مہیا کرنے کی خاطر اقدامات کر لئے گئے ہیں۔ اور سارے ملک کے لئے دس علاقہ جاتی تعلیمی بورڈ قائم کر دئے گئے ہیں۔ علاقہ جاتی کونسلیں اعلیٰ تعلیم کے متعلق عام سابقہ رکھیں گی۔ اور بورڈ اعلیٰ صنعتی شعبوں کی ضرورتوں پر توجہ دیں گے۔

ان کونسلوں اور بورڈوں کا کام یہ ہوگا۔ کہ ایک تو یہ صنعتی عملے کی ضرورتیں معلوم کرنے اور ان کے متعلق اہتمامات کو باہم ربط دینے کے لئے علاقے کے مقامی تعلیمی محکموں اور مقامی یونیورسٹیوں میں گہرا اشتراک عمل پیدا کریں۔ اور دوسرے تعلیمی اور صنعتی مقاصد میں مستقل ربط قائم کریں۔ تاکہ صنعتی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اہتمام ہوتا رہے۔ اِس سارے نظام کے لئے انتہائی ادارہ وہ قومی مشاورتی کونسل ہوگی جو صنعت و تجارت کی تعلیم کی خاطر حال ہی میں قائم ہوئی ہے۔ یہ اقدامات اس بات کا آئینہ ہیں۔ کہ برطانیہ میں اقتصادی بہتری کے قومی پروگرام میں صنعتی تعلیم کو جو کام سرانجام دینا ہے۔ وہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہاں مختصر طور پر ان قومی کالجوں کے قیام کا بھی حوالہ دینا چاہیئے۔ جو سو فی صدی سرکاری امداد سے چلتے ہیں۔ اور جو بعض ایسی صنعتوں کی اعلیٰ تعلیم دیتے ہیں۔ جو قومی اقتصادیات کے لئے خاص طور پر اہم ہیں۔ ان کالجوں میں سے کچھ تو قائم کئے جا چکے ہیں۔ مثلاً علم ہوابازی، گھڑی سازی کا فن، صفاری (ڈھالنے کا کام)، روشنی اور گرمی کا اہتمام، ربڑ اور اُون کے متعلق۔

۲۔ نصاب اور طرق تعلیم۔

(الف) مختلف مضامین کے نصاب اور طرق تعلیم میں اصلاحات:

(۱۱): کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔

(ب) مضامین کی کمی یا بیشی:

(۱۲): مدرسی نصاب میں جو مضامین شامل ہیں۔ وہ سرکاری طور پر مقرر شدہ نہیں ہیں اس سلسلے میں بھی کوئی عام یا خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔

(ج) طُرقِ تعلیم میں اصلاحیں:

(۱۳): پچھلے سال سے کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ کانفرنس کے لئے اس سلسلے میں ایک علیحدہ نوٹ دے دیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ جماعت میں طریق تعلیم اور نصاب کے متعلق موجودہ رجحانات کس قسم کے ہیں۔

(د) تعلیم میں نئی تکنیکوں کا استعمال:

(۱۴): نظری تعلیم کے لئے سہولتیں بڑھانے کی خاطر اس سال بہت کچھ ہؤا تعلیم میں نظری طریقوں کی اہمیت جنگ سے پہلے ہی وسیع طور پر تسلیم کی جا چکی تھی۔ اب زیادہ توجہ سینما فلم کی طرف دی جا رہی ہے۔ یہ عصرِ حاضر کی زندہ طاقت ہے۔ جسے تعلیم کی خاطر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نظری تعلیم کی اس تحریک کے محرکات دو مختلف سمتوں سے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ شوق کہ اِس صنعتی دَور کی صنعتوں کو بچوں کی ضروری تعلیم کے لئے بہتر طور پر استعمال کیا جائے۔ دوسری یہ خواہش کہ عام تعلیم کو کم علمی بنایا جائے۔ کتابوں کا کام کم ہو۔ اور اس کی بجائے حواس کی تربیت کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔

(۱۵): یہی پس منظر تھا۔ جس کی بنا پر وزارت معارف نے تعلیم میں نظری طریقوں کو فروغ دینے کی حکمت عملی اختیار کی۔ اور اس سلسلے میں عملی اقدام اُس وقت ہؤا جب ۱۹۴۳ء میں وزارت معارف نے کچھ تجربی فلمیں خود تیار کرانے کا انقلابی فیصلہ کیا۔ جنگ کے دَوران میں وزارت اطلاعات کی جو تنظیم ہوئی تھی۔ اس کی

وجہ سے ایسا انقلابی فیصلہ کرنا ممکن ہوگیا تھا۔ پہلے پہل نقط فلموں تک کام محدود رہا۔لیکن رفتہ رفتہ یہ ممکن ہوگیا کہ ایک مکمل پالیسی اختیار کی جائے۔جس کے مطابق نقط فلمیں ہی تیار نہ ہوا کریں۔بلکہ ان کے ساتھ ان کے موضوع کی وضاحت و توسیع کی خاطر فوٹو، نقشے، قلمی قطعے، موڈل وغیرہ بھی ہوں۔یہ "نظری واحدے" کہلاتے ہیں۔اور اب ملک کے مختلف حصّوں میں تجربے کے طور پر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ان کے استعمال کی رپورٹ آخر کار شائع ہوگی۔

(۱۶) : وزارت کا خود فلم تیار کرانا بہر حال ایک آغاز تھا۔اور اس کا یہ ہم احساس کیا گیا کہ اُستادوں اور فلم تیار کرنے والوں میں اشتراک عمل ضروری ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔کہ دو مجلسیں بنا دی گئی ہیں۔پہلی تعلیم میں نظری امدادوں کی قومی مجلس۔یہ مجلس اساتذہ کی تنظیموں اور مقامی تعلیمی اداروں کی نمائندہ ہے۔اور اس کے ساتھ وزارت کے حُکّام بھی ہیں۔یہ مجلس مدرسوں کے سامان، اُستادوں کی مخصوص تربیت، مقامی فلمی لائبریریوں کے قیام اور دیگر متعلقہ امور پر غور کرنے کے علاوہ فلموں کے پروگرام تیار کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔ دوسری یعنی نظری تدابیر اور فلموں کی تیاری کی ذمہ دار مجلس جو براہ راست وزارت کی مقرر کردہ ہے جس میں مرکزی دفتر اطلاعات کے نمائندے، سرکاری نمائندے اور قومی مجلس کے اراکین شامل ہیں۔اس کا کام یہ ہے۔کہ قومی مجلس کے پروگرام کو عمل میں لائے۔اس سال دونوں مجلسیں باقاعدہ اپنے اجلاس منعقد کرتی رہی ہیں۔

(۱۷) : قومی مجلس نے نظری امدادوں کا ایک عارضی پروگرام تیار کیا ہے جس میں کوئی سو کے قریب مختلف موضوع ہیں۔یہ پروگرام جون ۴۷ء کو فلم تیار کرنے والی مجلس کو دے دیا گیا۔اب کوئی پچاس کے قریب موضوع فلمائے جا رہے ہیں -

یہ دونوں مجلسوں کا کام ہے کہ اسکولوں میں فلموں اور نظری امدادوں کو کافی مقدار میں تقسیم کریں۔ اور وزارت نے اس سلسلے میں ایک نئی تنظیم کے قیام سے معاونت کرنا منظور کرلیا ہے۔ اس تنظیم کا نام نظری امدادوں کے لئے تعلیمی اساس" ہے۔ اس تعلیمی اساس کو پبلک فنڈ سے قرضے کی صورت میں امداد ملے گی۔ جو فروخت کی آمدنی سے واپس ادا ہوگا۔ دونوں مجلسوں نے اس بات کا بھی اہتمام کرلیا ہے کہ کافی سامان مہیا ہوتا رہے۔ قومی مجلس نے ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ جس میں مدارس کے استعمال کے لئے مناسب سامان کی فہرست دی گئی ہے۔ نظری تعلیم کے متعلق تحقیق کی ضرورت بہت محسوس کی گئی ہے۔ اور اس تحقیق کے لئے تعلیمی اساس کی مجلس نے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے اپنی تحقیقات میں نظری تعلیم کو سب سے پہلا موضوع قرار دینا منظور کرلیا ہے۔

(د) مدرسہ کی درسی کتابیں:

(۱۸): اِس کے متعلق سوائے اِس کے اور کوئی بات قابلِ ذکر نہیں۔ کہ باوجود کچھ اصلاح کے ابھی تک کتابوں کے مہیا کرنے کا مسئلہ بدستور پریشان کن ہے۔

(ھ) مدرسی امتحانات:

(۱۹)؛ ثانوی مدرسوں کے امتحانات کا موجودہ نظام ۱۹۱۷ء میں جاری ہوا۔ اور اب تک بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہا ہے۔ البتہ ان تیس سالوں میں امتحانوں کی حدود اور اثر میں کافی توسیع ہوئی ہے۔ خاص طور پر ان امتحانات کی اس لحاظ سے بڑھتی ہوئی اہمیت کہ یہ جامعی وظائف اور اسناد کا ذریعہ ہیں۔ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے اثرات پورے طور پر پہلے نہیں بھانپے جاسکتے تھے ان چیزوں اور ان کے ساتھ مدرسی نصاب میں خارجی امتحانات کے موقف کے متعلق ترقی پذیر خیالات نے یہ ضروری کردیا ہے۔ کہ تمام مسئلے پر از سر نو غور

کیا جائے۔

(۲۰) ثانوی مدارس کے امتحانات کی کونسل نے اگست ۱۹۴۷ء میں وزیر معارف کو ایک رپورٹ پیش کی۔ کونسل کے فیصلے متفقہ تھے۔ اور وسیع طور پر پسند کئے گئے۔ مختصر طور پر ان کی تجاویز یہ تھیں:۔

(ا) ہر طالب علم کو ثانوی مدرسہ چھوڑنے پر ایک وسیع مدرسی رپورٹ دی جائے جس میں جہاں تک ممکن ہو اس کے متعلق، اس کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے متعلق مکمل اثباتی اطلاع ہو۔

(ب) ثانوی مدرسے کے اندر باقاعدہ وقفوں پر مختلف قسم کے امتحانات لئے جائیں۔ اور ان کے نتائج مدرسی ریکارڈوں میں درج کئے جائیں اور ان سے اِس طرح فائدہ اُٹھایا جائے۔ کہ وہ مناسب مضامین انتخاب کرنے یا موزوں ملازمت اختیار کرنے میں طلبہ کی رہنمائی میں امداد دیں۔

(ج) ثانوی مدارس انفرادی طور پر باقاعدہ داخلی امتحانات لیں۔ جو اُن کے طلبہ اور مخصوص نصاب کے مطابق اور ان پر مبنی ہوں۔ وزارت اور مقامی تعلیمی ادارے داخلی امتحانات کے قائم کرنے اور نتائج تیار کرنے کے تجربات کو فروغ دیں۔ اور اِس سلسلے میں معاونت کریں۔

(د) یکم ستمبر کو جن کی کم از کم سولہ سال عمر ہو۔ ایسے اُمیدواروں کے لئے ہر سال "عام"، "اعلےٰ" یا "وظیفے کا" امتحان ضرور ہونا چاہیئے۔ کم از کم عمر مطلوبہ بڑھائی جائے اور "عام" حیثیت کے امتحان کا معیار مناسب طور پر داقعات کے مطابق مقرر کیا جائے۔

(ہ) تمام مضامین ان تمام امتحانی معیاروں کے لئے مطلقاً اختیاری ہونے چاہئیں۔

(و) ایک "عام سند تعلیم" دی جائے جس میں ان مضامین کا ذکر ہو۔
جس میں اُمیدوار نے ممتحن کی تسلّی کر دی ہے۔ نیز ہر مضمون میں کامیابی
کا معیار "عام یا اعلیٰ" بھی اس سند میں ظاہر کیا جائے۔

ایک سرکاری سرکلر کے ذریعے جو اپریل میں نکلا تھا۔ وزیر معارف نے اعلان کیا تھا۔ کہ انہوں نے خارجی امتحانات کے متعلق کونسل کی موٹی موٹی سفارشات کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ اور انہیں عمل میں لانے کی تجویز کی ہے۔ اُن کی تجویز یہ ہے۔ کہ موجودہ امتحانات اُڑا دئے جائیں۔ اور ۱۹۵۱ء سے نیا انتظام رائج کیا جائے۔ ان تجاویز کا عام اثر یہ ہوگا۔ کہ امتحانی نظام بہت کچھ لچکدار ہو جائے گا۔ اور مدرسوں کو زیادہ آزادی ہوگی کہ اپنے طلبہ کے مطابق نصاب بنا سکیں۔

(ز) تحقیق:

(۲۱): اس سال تعلیمی تحقیق کے لئے تعلیمی اساس کی مجلس نے وزارت کے کہنے پر تین مسئلے اختیار کئے ہیں۔ ثانوی تعلیم کے لئے بچّوں کا انتخاب، نظری تعلیم، انعامات اور سزائیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مسائل جو زیر غور ہیں۔ ان میں اندھے بچّوں کے لئے عقلی جانچ کے طریق کی تلاش اور دیہاتی تعلیم کے مسائل کا جائزہ شامل ہے۔

۳: اساتذہ: تربیت، تقرر اور مشاہرہ۔

(۲۲): ۱۹۴۷ء کے اختتام تک اُستادوں کی تربیت کے متعلق فوری اسکیم پُورے طور پر چل رہی تھی۔ اور ۵۵ کالجوں میں ۱۳۰۰۰ طالب علم زیر تربیت تھے۔ اس اسکیم پر کام ۱۹۴۴ء کی ابتدا میں شروع ہوا تھا۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ ان

اُمیدواروں کو جو جنگ کے دوران میں کوئی قومی خدمت سرانجام دے رہے تھے۔ ایک سال کے جامع اسباق دئے جائیں۔ یہ اُمیدوار قابلیت و استعداد کے لحاظ سے بہترین ہیں۔ اِس اسکیم کی تکمیل تک ان ۱۲۰۰۰ سے بھی زیادہ تعداد میں اُستاد تیار ہو جائیں گے۔ جو مدرسہ چھوڑنے کی عُمر بڑھانے کے سلسلے میں مطلوب ہیں۔ اور اس طرح اساتذہ کی وہ عام کمی بھی کافی حد تک پوری ہو جائے گی جس سے اختتام جنگ پر ملک دوچار ہُوا۔ اور دیگر ضروریات خاص طور پر جماعتوں کی جسامت کم کرنے کی ضرورت بھی پُوری ہو سکے گی۔

(۴۳): اس وقتی اور فوری اسکیم کے ساتھ ساتھ مستقل تربیت کے اہتمام میں بھی ترقیاں ہوئیں۔ خاص طور پر ایک طرف تو علاقہ جاتی تربیتی تنظیموں کا قیام ان اصولوں پر عمل میں آیا جن کی میکینر کمیٹی نے سفارش کی تھی۔ تاکہ یونیورسٹیوں اور تربیتی اداروں میں گہرا ربط قائم ہو۔ اور دوسری طرف نئے کالجوں اور یونیورسٹی کے تربیتی محکموں کی توسیع کی گئی۔ تربیت گاہوں اور طالب علموں کو امداد دینے کے نظام کو ازسرِ نو ڈھالا گیا۔ اور اسے بہت حد تک بہتر بنا دیا گیا۔ اساتذہ مہیا کرنے کے مسائل ابھی چند سالوں تک مشکل اور پیچیدہ رہیں گے۔ کیونکہ ایک تو ۱۹۴۹ء سے آگے اسکولوں میں داخل ہونے والے بچوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ دوسرے فوری اسکیم کے ماتحت جو اُمیدوار تربیت کے لئے آئے۔ ان میں خواتین کی بہت قلیل تعداد تھی۔ وزارت ایک مہم شروع کرنے لگی ہے۔ تاکہ فوری تربیتی اسکیم کے لئے اور خواتین آئیں۔ اور خواتین کے لئے مزید مستقل تربیتی ادارے کھولے جائیں۔

(۴۴): اس سال ملازموں اور اُستادوں کی ان مجلسوں نے جن کا کام اساتذہ کے لئے تنخواہوں کے پیمانوں کے متعلق سفارش کرنا ہے۔ اجلاس منعقد کیا تاکہ ۱۹۴۸ء سے [illegible] کے بعد جاری ہونے والے نئے میزان ہائے [illegible]

وہ سکیل جو یکم اپریل ۱۹۴۵ء سے جاری ہوئے تھے۔ اس تاریخ کو ختم ہو رہے تھے۔ موجودہ اسکیلوں کے سلسلے میں چند اہم تبدیلیوں کے متعلق سال کے اختتام سے پہلے سفارشات بھیجی گئیں اور وہ آخر کار منظور ہو گئیں۔ سند یافتہ معاون اساتذہ کے لئے مردوں کی صورت میں ۳۰۰ پاؤنڈ اور خواتین کی صورت میں ۲۷۰ پاؤنڈ مقرر ہوئے۔ جو سالانہ ترقیوں کے ساتھ علیٰ سبیل الترتیب ۵۵۵ پاؤنڈ اور ۴۴۴ پاؤنڈ تک پہنچیں گے۔ ان اسکیلوں میں تربیت کے لئے، یونیورسٹی کی ڈگریوں کے لئے اور مخصوص ذمہ داری کی ملازمتوں کے لئے اضافوں کی اجازت ہے۔

۴ : امدادی اور دیگر خارج از مدرسہ شعبے

(ا) مدرسی بچوں کی جسمانی نشوونما اور حفظِ صحت کے متعلق اقدامات:

(۲۵) جولائی ۱۹۴۸ء میں جو قومی صحتی شعبہ قائم ہوا۔ اس سے اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ کسی حد تک اس نئے قائم شدہ شعبہ اور مدرسی طبّی شعبہ میں مناسبت پیدا کی جائے۔ لیکن یہ اقدام مقامی تعلیمی محکمہ کے اس فرض پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ جو ۱۹۴۴ء کے تعلیمی ایکٹ کی رو سے اس پر عائد ہوتا ہے یعنی اس بات کا جائزہ لینا کہ ہر ایک بچہ اپنے والدین کی طرف سے کسی قسم کے خرچ کے بغیر اپنا ضروری علاج کرا سکتا ہے؟

(ب) مدرسی طبّی شعبوں کی توسیع :

(۲۶) تازہ ترین شماریات سے پتہ چلتا ہے کہ معائنے اور معالجے کا کام علی الخصوص دانتوں کے معائنے اور معالجے کا کام جو جنگی حالات کے باعث انحطاط پذیر تھا۔ پھر سے سنبھالا گیا ہے۔

(ج) مدرسی تغذیہ گاہوں کی تعداد میں اضافہ:

(۲۷): جنگ کے دوران میں مدرسی غذاؤں میں جو توسیع ہوئی تھی۔ اس سال بھی جاری رہی۔ مدرسی آبادی کا باون فی صدی حصہ یعنی پچیس لاکھ طلبہ کو اب مدرسی غذائیں مل رہی ہیں ۱۹۴۵ء میں یہ تعداد پندرہ لاکھ تھی۔ مدرسی غذاؤں کی قیمت عام طور پانچ پینس ہوتی ہے۔ اِن مدرسی غذائیں لینے والے بچّوں میں سے تقریباً آٹھویں حصّے کو افلاس کی وجہ سے غذاؤں کی قیمت بھی معاف ہے۔ حکومت کا عہد ہے کہ ہر بچّے کے لئے جو مدرسے میں غذا چاہتا ہے۔ اسے جلد مہیا کرے۔ اب تغذیہ گاہوں کی تعداد بیس ہزار سے زائد ہے۔ جو ۲۵ ہزار اسکولوں اور محکموں کی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ مدرسی بچّوں کو دُودھ مفت دیا جاتا ہے۔ اسکول جانے والے تمام بچّوں میں سے تقریباً ۸۸ فی صدی دُودھ حاصل کر رہے ہیں۔

(د) مدرسی نفسیاتی اور ہدایتی شعبے:

(۲۸): اِس سلسلے میں اِس سال کوئی خاص نشو و نما نہیں ہوئی۔

(ہ) معذور بچّوں کی بہبود و تعلیم:

(۲۹): جنوری ۱۹۴۶ء میں ۵۳۷ مخصوص مدرسے تھے۔ جن میں چالیس ہزار سے زیادہ بچّے داخل تھے۔ ان خاص اسکولوں کی تین بڑی قسمیں وہ ہیں۔ جو جسمانی طور پر معذور، تعلیمی لحاظ سے غیر معتدل اور نازک و کمزور بچّوں کے لئے ہیں۔ معذور بچّوں کی تمام قسموں کے لئے تعلیم کا اہتمام مکمل کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اور اس سال وزارت نے مقامی تعلیمی محکموں کے مشوروں کے مطابق علاقہ جاتی بنیاد پر کافی شعبوں کا انتظام کرنے کے متعلق اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

(و) نوجوانوں کی تحریکیں:

(۳۰): اِس کے فروغ کے سلسلے میں صرف ایک چیز قابلِ ذکر ہے۔ وزیرِ معارف نے کیمپ

کی تنظیم و ساخت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی خاطر ایک مجلس قائم کی تھی۔ اس مجلس نے حال ہی میں *Organized Camping* کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا ہے۔

(ز) متفرقات۔

تعمیری پروگرام:

(۳۱): اس سلسلے میں تعلیمی عمارتوں کا وہ وسیع پروگرام قابلِ ذکر ہے۔ جس پر ۱۹۴۷ء میں ۳۲۰ لاکھ پاؤنڈ صرف ہوئے۔ یہ خرچ مزدوری اور سامان کے دوسرے اخراجات کے علاوہ دونوں عظیم جنگوں کے درمیانی عرصہ کے انتہائی خرچ کے برابر ہے۔

مالیات پر اشارہ:

مالی سال رواں کے متعلق وزارت کا تخمینہ ۱۶۲۰ لاکھ پاؤنڈ ہے۔ جو پہلے ہر سال کے تخمینہ سے زائد ہے۔ یہ زیادتی ۱۹۴۴ء کے تعلیمی ایکٹ کے نفوذ اور اس کے ساتھ توسیع کو ظاہر کرتی ہے۔ ایسے زمانے میں جب کہ سامان اور مزدوری کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اور ایسے وقت میں جب کہ برطانیہ کو بڑی اقتصادی مشکلات کا سامنا ہے۔ یہ اور دیگر اخراجات تیز اعتراضات سے بچے ہی رہے ہیں۔

اصطلاحی غور و فکر

(الف)
اِصطلاحات

151. Record.

یادداشت، شہادت، روداد، کاغذات، فرد، کارنامہ، اعمال نامہ، آثار، مآثر، دفتر، دستاویز، تحریر، ضبط، قلم بندی، اندراج، مسل وغیرہ۔

گراموفون ریکارڈ یا تھالی۔

انتہائی سعی، انتہا، امتیاز۔

جہاں تک دفتری اصطلاح کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق دیکھئے نمبر ۱۴ آموزش نومبر ۱۹۴۸ء۔

"یادداشت" ڈائری یا میمورینڈم کے لئے زیادہ اچھا ہے۔ "شہادت" میں گواہی کے مفہوم کا التباس ہے۔ "روداد" کارگذاری کا تذکرہ ہے۔ "کاغذات" بہت وسیع ہے۔ ریکارڈ کے مفہوم تک محدود نہیں۔ "کارنامہ" اور "اعمال نامہ" بھی مخصوص معانی رکھتے ہیں۔ "آثار" اور "مآثر" سے تاریخی شواہد کی طرف تو ضرور ذہن منتقل ہوتا ہے لیکن دفتری فائلیں

کی طرف توجہ کم ہوتی ہے۔ "دفتر" اگرچہ ترجمے کے لحاظ سے درست ہے۔ لیکن آفس کے لئے مخصوص ہے۔ "دستاویز" بہت محدود ہے۔ "تحریر" "ضبط" "قلم بندی" اور "اندراج" بھی دفتری ریکارڈ کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ البتہ ایک لفظ "مسل" ہے۔ جو موزوں ہے مگر اسے جمع کی صورت میں استعمال کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ دفتری ریکارڈ کے لئے "مسلیں" موزوں ترجمہ ہوگا۔ عام مستعمل بھی ہے۔

گراموفون ریکارڈ کے لئے "ریکارڈ" ہی کو رائج رکھنا چاہیئے۔ "تھالی" عوام کی زبان پر تو ضرور ہے لیکن موزوں نہیں۔

جہاں تک اِس اِصطلاح سے مراد انتہائی معیار کامیابی ہے۔ اس کے لئے انتہائی سعی، انتہا اور امتیاز کے علاوہ "حدِ سبقت" حدِ امتیاز، حدِ کامیابی، حدِ تحصیل، حدِ سعی، یا حدِ کمال تجویز کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں "حدِ فضیلت" زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ اِس کے بعد "حدِ سبقت"۔

152. Dealing Clerk

محرر برسرکار، محرر بہ کار، کاروباری کلرک، متعلقہ کلرک، محرر متعلق، محرر خصوصی، ان سب میں سے "محرر متعلق" یا "محرر خصوصی" قابلِ ترجیح ہے۔

153. Typist

طبّاع، ٹائیپسٹ، طرح نگار، میں سے تو ٹائیپسٹ ہی اچھا ہے۔ لیکن اس کے لئے اگر "مشینی محرر" کہا جائے۔ تو زیادہ موزوں ہوگا۔

154. Account

آمد و خرچ، حسابی تفصیل، فردِ حساب، تفصیل، چالو کھاتا، کھاتا، گنتی، شمار، حساب۔

ان میں سے "حساب" زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ اور اِس کے بعد "حسابی تفصیل"

لیکن اگر نظرِ غائر سے دیکھا جائے۔ تو "حسابی تفصیل" قابلِ ترجیح ہوگا ۔ کیونکہ Account سے اصل مقصود حساب کا تفصیلی اندراج ہی ہوتا ہے۔

155. Pending Cases

امورِ مرجوعہ، امورِ معلّقہ، امورِ غیر منفصلہ، امورِ زیرِ سماعت، امورِ زیرِ تجویز، امورِ زیرِ غور، امورِ ملتویہ۔

امورِ معلّقہ Pending Cases کا مخلصانہ ترجمہ ہے۔ لیکن اس پر عربیت کی ثقالت کا اعتراض ہوگا۔ جو نازک طبائع پر گراں ہوگی۔ اس لئے بہتر ہے کہ "امورِ زیرِ غور" ہی کو ترجیح دی جائے۔ سہل بھی ہے۔ اور عام مستعمل بھی۔

156. Gown

گوَن، چغہ، جامہ، پیشواز، ان سب کے مقابلے میں ہمیں "قبا" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ Academic Gown کے لئے "قبائے فضیلت" بہت موزوں رہے گا۔

157. Initials

دستخط، دو حرفی دستخط، اکھّر، مخفف دستخط، مختصر دستخط، نشان، مُہر،

ترجمے میں Signatures اور initials میں امتیاز مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے۔ Signature سے مراد مکمل یا پُورے دستخط ہیں۔ اور initials سے مخفف دستخط یا وہ دستخط جس میں نام کے ابتدائی حروف لکھے جاتے ہیں۔ Signature کے لئے اگر "دستخط" کا لفظ مخصوص کردیا جائے۔ تو پھر initials کے لئے "نشان" ہی موزوں ہوگا۔

158. Up-to-date

تازہ ترین علم کے مطابق، تازہ ترین ضروریات کے مطابق، تازہ ترین،

الی الآن -

"الی الآن" عربی ہے - اور ثقالت کے اعتراض سے محفوظ نہیں "تازہ ترین" کے علاوہ باقی دو لیے ترجمے ہیں۔ "تازہ ترین" اگرچہ مناسب ترجمہ ہے - لیکن اِس کے مقابلہ میں "ہنوزی" زیادہ موزوں ہوگا - مختصر بھی ہے - اور اصل مفہوم پر حاوی بھی -

159. Notice-Board

تختۂ آگاہی ، تختۂ تنبیہ ، نوٹس بورڈ ، تختۂ اعلان ، تختۂ خبریہ ، تختۂ اشتہار -

ان سب کے مقابلے میں "تختۂ اطلاعات" زیادہ اچھا ہے -

160. Credit

یہ مختلف معنوں میں آتا ہے - اور محل استعمال کے مطابق اس کے لئے مندرجہ ذیل ترجمے موزوں ہوں گے :-

(۱) مجرائی رقم -
(۲) قرض -
(۳) جمع -
(۴) نفع -
(۵) امتیاز -
(۶) وقعت -

(ب)

اصطلاحات زیرِ غور

161 Welfare.
162 Intelligent.
163. Survey.
164. Precedent.
165. Abnormal.
166. Extra-mural activities.
167. Designation.
168. Propaganda.
169. Popularity.
170. Editor.
171. Hall.
172. Drawing Master.
173. Science Room.
174. Library.
175. News Board.
176. Notice Board.
177. Money Order.
178. Letter Box.
179. Tag.
180. Primary School.
181. Middle School.
182. High School.
183. College.
184. University.
185. At par.
186. Above par.
187. Below par.
188. Agent.
189. Amount.
190. Assessment.

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ——— شعبہ کالج

تاریخ و شمارہ اعلان	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تقرر ہوا	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
[illegible] ۱۴ر جولائی ۱۹۴۷ء	ڈاکٹر غلام جیلانی برق ایم اے پی ایچ ڈی	لیکچرار اعلیٰ گورنمنٹ کالج کیمبلپور	درجہ مشاہرہ دوم عملہ فوقانی (پی ای ایس) نیم مستقل	درجہ دوم عملہ فوقانی (پی ای ایس) مستقل	لیکچرار اعلیٰ گورنمنٹ کالج کیمبلپور۔	۱۵-اگست ۱۹۴۷ء سے	عملہ فوقانی کے درجہ دوم کی ایک موجودہ اسامی میں
؍؍	م۔ غلام احمد ایم ایس سی (کیمیا)	لیکچرار اعلیٰ گورنمنٹ کالج لاہور	؍؍	؍؍	لیکچرار اعلیٰ گورنمنٹ کالج لاہور	؍؍	؍؍
؍؍	م۔ محمد یونس ایم ایس سی (کیمیا)	قائم مقام لیکچرار اعلیٰ گورنمنٹ کالج لاہور	درجہ مشاہرہ دوم عملہ فوقانی (پی ای ایس) قائم مقام	؍؍	لیکچرار اعلیٰ گورنمنٹ کالج لاہور	؍؍	م۔ الف مخدومی کی جگہ جن کی پی ای ایس درجہ اول میں ترقی ہوئی ہے۔
؍؍	م۔ عبدالعظیم ایم ایس سی	لیکچرار اعلیٰ گورنمنٹ کالج لاہور	درجہ مشاہرہ دوم عملہ فوقانی (پی ای ایس) نیم مستقل	؍؍	؍؍	۱۱ر نومبر ۱۹۴۷ء سے	م۔ غلام عباس کی جگہ جن کی پی ای ایس درجہ اول میں ترقی ہوئی ہے۔
؍؍	م۔ کرامت حسین ایم اے	لیکچرار اعلیٰ ڈی مونٹ مورنیسی کالج سرگودھا ہوا، اب گورنمنٹ کالج لاہور میں ہیں۔	؍؍	؍؍	لیکچرار اعلیٰ ڈی مونٹ مورنیسی کالج سرگودھا حال گورنمنٹ کالج لاہور	یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء سے	پیر غلام وارث کی جگہ جن کی پی ای ایس درجہ اول میں ترقی ہوئی ہے

یخ و ارہ احکام	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تقرر ہوا	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۹ جولائی سنہ ۱۸۹۲ء	س۔ غلام رضا ایم اے	قائم مقام اعلےٰ لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور	درجہ مشاہرہ دوم عملہ فوقانی (پی ای ایس) قائم مقام۔	درجہ مشاہرہ دوم عملہ فوقانی (پی ای ایس) نیم مستقل	لیکچرار اعلیٰ گورنمنٹ کالج لاہور	۱۵ اگست ۱۹۴۹ء سے	م۔ محمد جمیل واسطی کی جگہ جن کی خدمات سندھ مدرسۃ کالج کراچی نے مستعار لی ہوئی ہیں۔ اور جن کا حق عہدہ اب ختم کر دیا گیا ہے۔
؍؍	م۔ محمد رشید ایم اے	؍؍	؍؍	؍؍	؍؍	؍؍	م۔ تاج محمد خیال ایم اے کی جگہ جن کی خدمات زمیندار کالج گجرات نے مستعار لی ہوئی ہیں اور جن کا حق عہدہ اب ختم کر دیا گیا ہے
۹ جولائی سنہ ۱۸۹۱۸	ڈاکٹر غلام حسین خان نیازی ایم اے پی ایچ ڈی	لیکچرار گورنمنٹ کالج منٹگمری (جو اب ناظر مدارس ضلع لائل پور ہیں)	درجہ مشاہرہ عملہ تحتانی (۱۵۰۔۔۱۰۔۔۲۵۰) شعبہ کالج	درجہ مشاہرہ دوم عملہ فوقانی (پی ای ایس) قائم مقام	قائم مقام اعلیٰ لیکچرار گورنمنٹ کالج منٹگمری (حال ناظر مدارس ضلع لائل پور)	۱۵۔۱ اگست ۱۹۴۹ء سے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۹ء تک	م۔ حشمت خان کی جگہ جو پی ای ایس درجہ اول میں گورنمنٹ کالج لائل پور کے پرنسپل کی حیثیت سے قائم مقامی کر رہے ہیں۔
۹ جولائی سنہ ۱۸۹۲۲	خواجہ الطاف حسین ایم ایس سی (طبیعیات) II بی ٹی	لیکچرار طبیعیات گورنمنٹ کالج لائل پور	درجہ مشاہرہ عملہ تحتانی شعبہ کالج (۱۵۰۔۔۱۰۔۔۲۵۰)	درجہ مشاہرہ دوم عملہ فوقانی (پی ای ایس) (۲۵۰۔۲۵۔۷۵۰) ایک سال کی آزمائش پر	لیکچرار اعلیٰ طبیعیات گورنمنٹ کالج لائل پور	یکم اپریل ۱۹۴۹ء سے	پی ای ایس درجہ دوم کی ایک موجودہ اسامی میں۔
؍؍	م۔ سلطان احمد ایم ایس سی (باٹنی) بی ایس سی (آنرز سکول)	لیکچرار نباتیات گورنمنٹ کالج لاہور	؍؍	؍؍	لیکچرار اعلیٰ نباتیات گورنمنٹ کالج لاہور	؍؍	؍؍
؍؍	ڈاکٹر چراغ حسن ایم ایس سی (کیمیا) I (علیگ)۔ پی ایچ ڈی (علیگ)	لیکچرار کیمیا گورنمنٹ کالج لاہور	؍؍	؍؍	لیکچرار اعلیٰ کیمیا گورنمنٹ کالج لاہور	؍؍	؍؍
؍؍	م۔ بشیر احمد ایم ایس سی (حیاتیات) II بی ایس سی (آنرز) حیاتیات [illegible]	لیکچرار حیاتیات گورنمنٹ کالج لاہور	؍؍	؍؍	لیکچرار اعلیٰ حیاتیات گورنمنٹ کالج لاہور	یکم جون ۱۹۴۹ء سے	؍؍

آموزش

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	کس درجے سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تقرر ہوا	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
[illegible] ۱۹۴۹ء	م۔ [illegible] حسین ایم اے (اردو) بی ٹی (علیگ) ایم اے (فارسی) [illegible] ایل ایل بی (علیگ)	لیکچرار اردو گورنمنٹ کالج راولپنڈی	درجہ شاہرہ عملہ تحتانی شعبہ کالج (۱۵۰-۱۰-۲۵۰)	درجہ مشاہرہ دوم عملہ فوقانی (پی ای ایس) (۲۵۰-۲۵-۷۵۰) ایک سال کی آزمائش پر	لیکچرار اعلیٰ اردو گورنمنٹ کالج لاہور	یکم جولائی ۱۹۴۹ء سے	پی ای ایس درجہ دوم کی ایک موجودہ اسامی میں۔

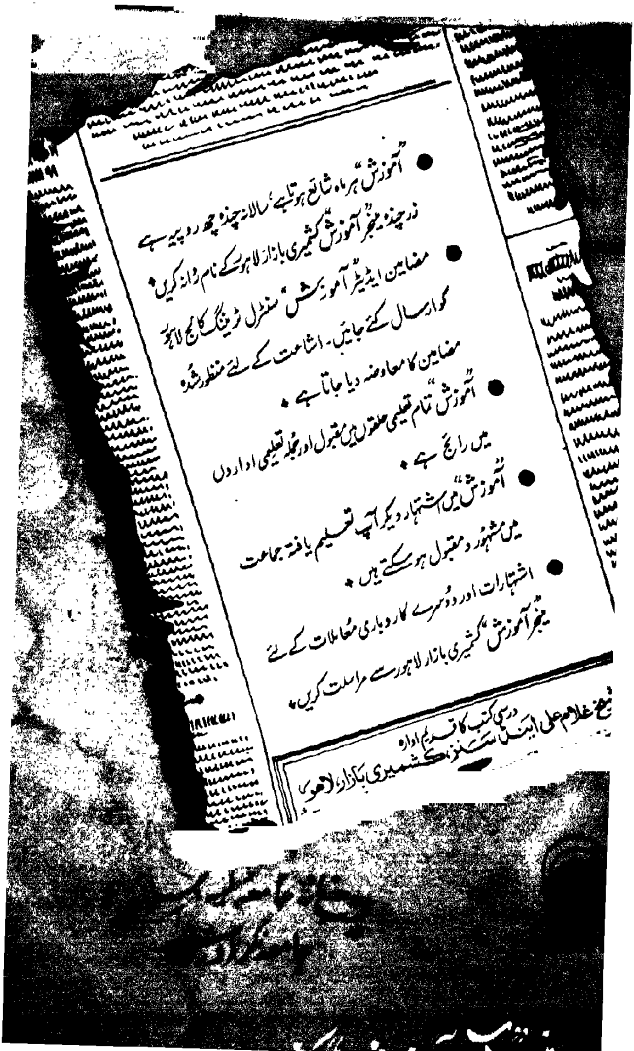
صیغہ رجال ـــــــ شعبہ اسکول

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲-جولائی ۱۹۴۹ء	م۔ عبدالرشید بی اے (نمبر ۴۹: ۱۵۰-۲۲۰)	معاون ناظر مدارس ضلع شاہپور	معاون ناظر مدارس ضلع میانوالی بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ محمد اکرم کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
"	م۔ محمد اکرم بی اے ایس اے وی (نمبر ۱۰۵: ۹۰-۱۵۰)	قائم مقام معاون ناظر مدارس ضلع میانوالی	قائم مقام معاون ناظر مدارس ضلع جہلم بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ محمد ظریف کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔ اور م۔ محمد عظیم خان بی اے (نمبر ۱۷: ۱۵۰-۲۲۰) کے حق عود میں جو اب گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی میں صدر معلم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں
"	م۔ محمد ظریف ایم اے، بی ٹی (نمبر ۱۳۲: ۱۵۰-۲۲۰)	معاون ناظر مدارس ضلع جہلم	معاون ناظر مدارس ضلع شاہپور۔ بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ عبدالرشید کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
۳۰-جولائی ۱۹۴۹ء	م۔ محمد اسمٰعیل (۵۰-۴-۸۰/۴-۱۰۰)	معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور	معلم تربیت جسمانی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ محمد علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
"	م۔ محمد علی (نمبر ۴۰۹: ۵۰-۱۰۰)	معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری	معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ محمد اسمٰعیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
۹-اگست ۱۹۴۹ء	م۔ محمد عارف (۱۰۵-۱۴۰)	معلم نقشہ کشی گورنمنٹ ہائی اسکول پیپلز [illegible]	معلم نقشہ کشی گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ محمد مظفر کی جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہوچکے ہیں۔
۱۰-اگست ۱۹۴۹ء	ق۔ نور حسین ایس وی (۵۰-۱۰۰)	قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال	قائم مقام معلم گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ اللہ بخش کی جگہ جن کا تبادلہ ہو[illegible]

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہؤا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۹-اگست ۱۹۴۹ء ۱۲۳۰۹-E	م-الہٰی بخش ایس وی نمبر ۱۸۳ : (۵۰-۱۰۰)	معلم اُردو گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ	معلم اُردو گورنمنٹ ہائی اسکول شاہپور-بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م-فیض حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

صیغہ دفاتر

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	کس درجہ پر تقرر ہؤا	تبادلہ یا تقرر کہاں ہؤا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۸-اگست ۱۹۴۹ء ۱۲۲۶۸-E	م-محمد منیر حسین میٹرک (مخصوص جنگی قوانین کے ماتحت)	اُمیدوار جنگی خدمات	(۵۰-۳-۸۰-۴/-۱۰۰) میں ۵۰ روپے ماہوار پر	قائم مقام ادنیٰ محرر دفتر ناظر مدارس قسمت راولپنڈی	تاریخ حاضری سے	م-عزیز الرحمٰن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۱۹-اگست ۱۹۴۹ء ۱۲۳۰۷-E	م-غلام احمد طالب میٹرک II	ایک اُمیدوار	"	قائم مقام ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی اسکول عیسےٰ خیل	"	م-محمد امیر خان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۴-اگست ۱۹۴۹ء ۶۶۶۴-E	م-محمد سعید بیگ	ادنیٰ محرر دفتر ناظر مدارس قسمت لاہور	۵۰-۳-۸۰-۴/-۱۰۰			اپنے عہدے اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
۴-اگست ۱۹۴۹ء ۱۰۰۰-E	میاں محمد شریف	ایک اُمیدوار جس کی محکمہ تبادلہ ملازمین منٹگمری نے سفارش کی ہے۔	۵۰-۳-۸۰-۴/-۱۰۰ میں ۵۰ روپے ماہوار پر	قائم مقام ادنیٰ محرر گورنمنٹ کالج منٹگمری	۲۷-مئی ۱۹۴۹ء سے	چوہدری حبیب الرحمٰن کی جگہ جن کی ترقی ہو گئی ہے۔
۱۵-جولائی ۱۹۴۹ء ۶۷۳۷-E(G)	م-محمد افضل خان ایف اے (۵۰-۱۰۰)	ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ		ادنیٰ محرر دفتر ناظر مدارس ضلع مظفر گڑھ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م-مشتاق احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
"	م-مشتاق احمد (۵۰/۱۰۰)	ادنیٰ محرر دفتر ناظر مدارس ضلع مظفر گڑھ		ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ بمشاہرہ سابقہ	"	م-محمد افضل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے



- "آموزش" ہر ماہ شائع ہوتا ہے، سالانہ چندہ چھ روپیہ ہے
زرِ چندہ مینیجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور کے نام روانہ کریں۔
- مضامین ایڈیٹر "آموزش" سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور
کو ارسال کئے جائیں۔ اشاعت کے لئے منظور شدہ
مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔
- "آموزش" تمام تعلیمی حلقوں میں مقبول اور جملہ تعلیمی اداروں
میں رائج ہے۔
- "آموزش" میں اشتہار دیکر آپ تعلیم یافتہ جماعت
میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں۔
- اشتہارات اور دوسرے کاروباری معاملات کے لئے
مینیجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور سے مراسلت کریں۔

آموزش

اکتوبر ۱۹۴۹ء

دُنیا کا معرکہ آرا تاریخی شاہکار!

تاریخ عالم کی خونچکاں داستانیں اُردو ادب میں بلحاظ موضوع اور تحقیق و تفتیش بے مثال تصنیف!!

تاریخِ انقلاباتِ عالم

دو جلدوں میں

از سید ابو سعید بزمی ایم اے

اُردو ہی نہیں دُنیا کی تمام زبانوں میں یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے پہلی کتاب ہے جو تاریخ انقلاباتِ عالم کے نام سے شائع کی گئی ہے، ابتدائے آفرینش سے عہدِ حاضر تک کے تمام سیاسی، تمدنی، مذہبی اور سماجی انقلابات کی جامع اور ہمہ گیر تاریخ ایسے محققانہ انداز سے لکھی گئی ہے جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ فاضل مصنف نے دس سال کی طویل محنت اور عرق ریزی سے کام لے کر ثابت کر دیا ہے کہ یہ تاریخ، سیاست اور معیشت پر ایک مستقل "انسائیکلوپیڈیا" ہے جس کا مطالعہ ہر اہلِ علم کے لئے ناگزیر ہے خصوصاً اخبار نویسوں، طالبعلموں اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد معلومات افزا کتاب ہے۔ اور طرفہ یہ کہ مصنف کا نقطۂ نظر پارٹی پالٹکس سے دُور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا اور اس درجہ غیر جانبدارانہ ہے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوگی۔

سائز ۲۲×۱۸ کاغذ دبیز۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب

قیمت: جلد اوّل دس (۱۰) روپے۔ جلد دوم دس (۱۰) روپے

کتاب منزل لاہور

ایڈیٹر — بشیر ہاشمی

[illegible]

جامعہ نگر (دہلی)

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

ناشر

اکتوبر ۱۹۴۹ء	کتاب منزل	سالانہ چندہ :-
جلد :- ۲	لاہور	پاکستان کیلئے : ۶ روپے
شمارہ :- ۷	قیمت فی پرچہ دس آنے	غیرممالک کیلئے : ۸ روپے

اطلاعات

۱ اِس صفحہ کے سامنے آپ سے متعلق کوئی اطلاع تو نہیں ؟ شائد آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہو !

۲ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ اس سے آپ کو جواب جلد مل سکے گا۔ بصورت دیگر تاخیر کے لئے دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔

۳ "آموزش" ہر ماہ باقاعدہ شائع ہوتا ہے۔ اور پہلے ہفتہ میں سپرد ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو اپنے ڈاک خانہ کو مطلع فرمائیں۔ اور دفتر "آموزش" کو بھی آگاہ کریں۔

۴ "آموزش" کے انتظامات یا دلچسپی میں کوئی کمی محسوس ہو۔ تو مطلع فرمائیں۔ اگر کوئی نئی تجویز آپ کے ذہن میں آئے تو ہمیں آگاہ کریں۔ شائد کوئی عملی صورت پیدا ہو جائے۔

مینجر "آموزش"
کشمیری بازار ۔ لاہور

رموز

سندھ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیمِ اسناد کے موقعہ پر محترم وزیر اعظم پاکستان نے ذریعہ تعلیم کے اہم موضوع پر مندرجہ ذیل الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔

"ہم اعلیٰ تعلیم کے لئے اُردو کو اس وقت تک ذریعہ تعلیم نہیں بنا سکتے جب تک اس زبان میں ہر قسم کی کتابیں موجود نہ ہوں۔ انگریزی میں تمام علوم کی کتابیں موجود ہیں جبتک یہ سارا مواد اُردو میں منتقل نہ ہو جائے ہم انگریزی زبان نہیں چھوڑ سکتے۔"

ہمیں محترم وزیر اعظم مملکتِ پاکستان کے اس بیان سے ضرور اتفاق ہے لیکن اس احساس کے ساتھ ہی دل میں ایک خلش بھی ہوتی ہے کہ آیا نئی پود کی تربیت بھی اسی راہ پہ کی جائے گی جس پر ہم اور ہمارے بڑے ٹھوکریں کھاتے رہے۔

اگر ہمیں ذریعہ تعلیم کے کام کا بیڑا اُٹھانا ہے تو اسے شروع کرنے کے لئے کسی استخارے کی ضرورت نہیں۔ اس کی داغ بیل جتنی جلد پڑ جائے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ ہماری رائے میں اس کے لئے فوری اور نہایت اہم اقدام ایک دارالترجمہ کا قیام اور اس کا انصرام ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ملک کے بہترین اہلِ علم اور ماہرینِ فن کو دعوت دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ انگریزی زبان کے علمی اور فنی سرمایہ کو ہی نہیں بلکہ دیگر یورپی زبانوں مثلاً فرانسیسی، جرمن

وغیرہ سے بھی علوم و فنون کو اُردو زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کردیں۔ ان مترجمین کو جو محض ترجمہ کرنے والے ہی نہیں بلکہ اپنے مخصوص علمی دائرے میں ماہرینِ فن بھی ہوں گے۔ محض معاوضہ ہی نہیں بلکہ مخیرانہ اور فیاضانہ صلہ کی پیشکش کی جائے۔ اس معاوضہ کے معیار کو ہم کسی سرکاری خدمت کی تنخواہ کے اسکیل پر نہیں جانچ سکتے۔ اس کی قدر و قیمت کا معیار اس کام کی وقعت اور اہمیت کے مناسب حال مقرر کیا جاسکے گا۔ یہ کام اس قدر گراں بار، اس کے نتائج اتنے شاندار ہوں گے کہ اس کے لئے ہمیں تن من ہی نہیں بلکہ دھن کی بازی بھی لگادینا ہوگی۔

دیکھنا یہی ہے کہ ایسے بنیادی کام کو شروع کرنے کے لئے بھی ہمیں کب تک انتظار کرنا ہوگا!

اُستاد خواہ ابتدائی مدرسہ کا ہو یا ثانوی ادارے کا۔ یونیورسٹی کا ہو یا ہائی اسکول کا۔ ادنےٰ تعلیم کا یا اعلےٰ کا، ہمارے تعلیمی کاروبار کا سب سے اہم پرزہ ہے۔ بادی النظر میں تو یہ حقیقت سطحی اور بے حد عامی معلوم ہوتی ہے لیکن اکثر ان کی 'سطحیت' کی بنا پر اسی جنرل کی جانب بار بار توجہ مبذول کرانے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ہمارا روئے سخن اعلےٰ تعلیم کے اساتذہ کی طرف نہیں بلکہ مدرسے کے اساتذہ کی جانب ہے۔

ہمارے دل میں ان کے لئے عزت کا احساس ہے لیکن اس احساس کے ساتھ ساتھ ایک سوال بھی رہ رہ کر زبان تک آتا ہے۔ کیا ہم میں بہت سے ایسے نہیں جو اپنا کام بے دلی نہیں بلکہ بد دلی سے کرتے ہیں۔ کیا ہم میں بہت سے ایسے نہیں ہیں جن کے لئے اپنے پیشہ میں مسرت کی کوئی جھلک نہیں۔ ایسے افراد جو کام ختم کرکے رخصت ہوتے وقت ایک مرتبہ گھوم کر نظر دوڑائیں تو کہہ اُٹھیں "آج کا کام کیا خوب رہا"۔

ہمارے ہاں کے اساتذہ کی انجمنیں جب اُستادوں کی تنخواہوں کے گریڈ اگلے

ڈلنس کے تعین پر بحث کرتی ہیں تو ان کی گفتار میں تندی اور ان کے لہجے میں بلا کی بڑی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے شاذ و نادر ہی اس موضوع پر غور و فکر کیا ہے کہ انہیں پنے کام کے معیار، اس کی رفتار کو کیسے بلند کرنا چاہیئے۔

ہم ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اساتذہ، ہمارے صوبے کے بعض اہم داروں کے اساتذہ ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جو شرافت کے معیار سے گری ہوتی ہے۔ لتر ایسی پوشاک پہنتے ہیں جو موزونیت کے اعتبار سے مناسب حال نہیں ہوتی - یہ لمحوظِ خاطر رہے کہ ہمارا اشارہ لباس کی موزونی، اس کی خوش ذوقی کی جانب ہے نہ کہ کپڑے کی عمدگی یا اس کی زیبائش کی طرف۔

ان لوگوں کا نقطۂ نظر ایک مشقت کرنے والے مزدور کا سا ہے جو صبح کے ایک مخصوص وقت سے لے کر شام تک کام میں جُتا رہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اس ڈگر سے ہٹے ہوئے بھی ہیں مگر وہ مستثنیات میں سے ہیں اور ایک تاریک گھٹا کی نقرئی سنجاف سے بیشتر نہیں۔

ہمارے دیس کی نئی زندگی کا یہی تقاضا ہے کہ ہم ایک مرتبہ اپنے دلوں کا جائزہ لیں۔ ایک کڑی جانچ اور آزمائش کریں اور اگر کہیں اصلاح کی ضرورت ہو تو ایک نئے عزم و ارادے سے اس کے لئے تیار ہو جائیں۔

اساتذہ سے دو باتیں

{ پرنسپل بشیر ہاشمی صاحب کی ایک تقریر جو ۷ ستمبر ۱۹۴۹ء کو
سنٹرل ماڈل ہائی اسکول کے اساتذہ کے سامنے کی گئی }

اساتذہ کرام! پچھلے سال میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے تجویز کیا تھا کہ کبھی لمحاتِ فرصت میں آپ لوگوں سے تبادلۂ خیالات کروں۔ اُس وقت یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اب دوبارہ میں آپ لوگوں کے درمیان ہوں اور میرے خیالات آپ کے سامنے ہیں۔

آج صبح جو بیدار ہؤا تو سب سے پہلے میرے ذہن میں اس صحبت کا خیال آیا۔ مَیں نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ آخر مجھے اس جلسہ میں کیا کہنا ہے۔ زیادہ زور دے کر سوچنے کی کوشش کی تو معلوم ہؤا کہ میرے پاس کہنے کو کوئی نئی چیز نہیں۔ ایسی چیز جو آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود نہ ہو لیکن اچھے کھانے کو دوبارہ چبانے میں لطف آتا ہے اور اچھے خیالات کو دوہرانے میں۔

ع بسا کین دولت از گفتار خیزد

پاکستان بنے ہوئے دو سال گذر گئے۔ زندہ قوموں کی زندگی میں دو سال کا عرصہ کوئی

قلیل مدت نہیں۔ ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کیجیے اور ماضی کا تصور کیجیے ہم نے اس زمانہ میں کیا کچھ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کچھ نہیں کیا۔ ہمارے ارادے ویسے ہی شکست۔ ہماری ہمتیں ویسی ہی پست ہیں۔ اِدھر اُدھر کہیں کہیں نئے رنگ کے چھینٹے ضرور پڑ گئے کہیں کہیں دھبے بھی آ گئے لیکن تعلیمی پس منظر کا انداز وہی رہا۔ اس بیان میں نہ تو انکسار ہے نہ غلو نہ مبالغہ!

ہماری تعلیمی حالت آج بھی وہی ہے جو دو سال پیشتر تھی۔ ہمارے محکمہ کا نام آج بھی (Department of Public instruction) ہے اس کا مقصد تعلیم نہیں تدریس ہے۔ ہمارے عمل تدریس کا کام آج بھی تعلیمی "ہتھوڑے اور چھینی" کے ذریعہ بچوں کے ذہن میں وہ کتابی معلومات پہنچانا ہے جو ہم نے حاصل کی تھیں۔

میں آپ کو آج سے تینتیس سال پہلے لئے چلتا ہوں۔ اپنے ذہن میں اس زمانے کے اُستاد کا تصور کیجیے۔ اک روکھا سوکھا سا چہرہ۔ کٹ کھنا سا بُشرہ۔ کٹ کھنا ضرور تھا لیکن اس کے ساتھ اس کا دل محبت سے بھرپور تھا۔ چانٹی مارتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ درد کا احساس بھی تھا۔

میری نگاہوں کے سامنے اس وقت اپنے پرانے ہیڈ ماسٹر مولوی فضل الدین صاحب ہیڈ ماسٹر عربک اسکول دہلی کی تصویر پھر رہی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے Oundle اسکول کے سینڈرسن اور رگبی کے آرنلڈ کی یاد تازہ ہو گئی۔ ایسی ہستیوں کی یاد جو روح کو بالیدہ کرتی ہیں اور دل پر علم و فن کی پھوہار برسا دیتی ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ تم کسی بڑی ہستی پر کتاب لکھو تو اس کا عنوان ہوتا "عربک اسکول کے مولوی فضل الدین"۔

مولوی صاحب کا خاکہ ملاحظہ ہو کھچڑی داڑھی کے معمر بزرگ۔ زندگی بھر بُوٹ نہیں پہنا ہمیشہ نری کی جوتی استعمال کی سر پر ٹوپی کی جگہ پگڑی۔ محبت اور دلسوزی کا پیکر۔ خلوص اور جانفروشی کا مرقع۔ ہر بچے کا نام حفظ۔ اس کے باپ کا نام ازبر۔ خاندان۔

ذریعہ معاش سبھی کے پست کنندہ حالات یاد ہیں کہیں کوئی بچہ ناکام ہو گیا صحت خراب تھی۔ اس کے گھر پہنچ گئے۔ غریب گھرانا۔ بے سایہ سے لوگ۔ بچے کا باپ باہر بیٹھا گھٹی کاٹ رہا ہے۔ یہ بھی جاکر پاس بیٹھ گئے۔ دیکھو بھئی تمہارا بچہ اب کے فیل ہو گیا ہے۔ آئندہ خیال رکھ اور دیکھو مدرسے کے بعد ہمارے ہاں بھیج دیا کرو۔ وہاں کمی پوری ہو جائے گی۔ تعلیمی کام شوق کا یہ حال اور تفریحی کام کے ذوق کا تو کہنا ہی کیا۔ مدرسے میں فٹ بال کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ مولوی صاحب کے انہماک کا یہ حال ہے کہ گیند کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ پہ ان کی ٹانگ بھی برابر چل رہی ہے۔

مولوی صاحب آج دنیا میں زندہ نہیں۔ لیکن میرے اور ان کے ہزارہا اور شاگردوں کے دل میں ان کی یاد اب تک تازہ ہے۔ ان کے خلوص، ان کی فرض شناسی کی یاد اب تک محفوظ ہے۔ محکمہ جب بھی Public instruction کا محکمہ تھا اس کا کام زیادہ تعلیمی گفتار ہی رہا لیکن مولوی صاحب کے کردار کا اثر ان کے طلبا میں گھر کر ہی گیا۔ ان کے شاگردوں میں اکثر لوگ بڑے صاحب مقدور تھے۔ جو چاہتے پیشہ اختیار کرتے۔ لیکن ہم میں بیشتر اُستاد بنے۔ کروڑپتی کا لڑکا تھا وہ بھی اُستاد ہی بنا۔

اس بے پناہ اثر کا راز کیا تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ ابھی تک انگریز ہمارے جسم کا حاکم تھا اس کی حکومت کا اثر دل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ زہر مادہ جسم سے گذر کر روح میں بھی سما گیا۔ اس کی مثال ہماری نسل ہے۔

وہ دَور گیا الحمدللہ کہ چلا گیا اب ایک نئے زمانے، نئی زندگی کی آمد آمد ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس نئے دَور میں ہم لوگوں میں کیا تبدیلی ہوئی۔ ہمارے تصورِ حیات میں کیا انقلاب رونما ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو کوئی نمایاں تبدیلی ہوئی۔ نہ کوئی نیا انقلاب بروئے کار آیا۔ اس کے ثبوت میں آپ کے سامنے ایک انفرادی نہیں اجتماعی زندگی کی مثال پیش کردوں۔ پچھلے دو سال کے عرصہ میں صوبے میں Board Teachers Unions کے متعدد جلسے

وئے کانفرنسیں ہوئیں لیکن ایک نشست میں بھی کبھی انہوں نے ایک مرتبہ اس مسئلہ پہ غور وفکر نہ کیا کہ وہ بچوں کو بہتر طریق پر کیسے پڑھائیں۔ بچوں کے تعلیمی دیوتا اپنے ان ننھے بجاریوں کو کیسے پروان چڑھائیں۔ ان معصوموں کی زندگی کے تقاضوں کو کیسے پورا کریں۔

ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم اچھے استاد کیسے تیار کریں آخر مدرس بنتا کیسے ہے ؟ سول سروس کا رکن مقابلے کا امتحان دیتا ہے۔ ایک تاجر گھریلو روایات اور طبیعت کے رجحانات سے تیار ہوتا ہے۔ لیکن استادگری کا عمل کیا ہے ؟

س پر مجھے ویلز کا ایک ناول یاد آگیا۔ ہیرو کا والد اس کے ایک ہم جماعت سے اپنے بچے کے بارے میں مشورہ لے رہا ہے۔ کتابیں پڑھنے لکھنے میں اچھا خاصہ ہے لیکن ایسا نہیں کہ کامل فن بن سکے۔ بدن کے لحاظ سے بھی ایسا جیدار نہیں کہ تن کر چل سکے۔ اتنا کچھ کہہ کر پوچھنے لگا کہ بھئی تمہاری رائے میں یہ شخص دنیا میں کچھ کر لے گا ؟ بیٹے کا ہم جماعت بولا۔ جی کچھ اور نہیں کر سکے گا تو کہیں نہ کہیں اُستاد تو ہو ہی جائے گا۔ آج میرے ذہن سے اس ناول کی سبھی جزئیات غائب ہو گئی ہیں لیکن میں اس جملہ کو کبھی نہیں بھولا اور کبھی نہیں بھولوں گا۔ یہ ہے عام آدمی کی رائے۔ میرے اور میرے پیشہ بلکہ میری زندگی کے نصب العین کے بارے میں یعنی معلمی کے پیشہ میں شریک ہونے والا فرد زندگی میں یہ بھی کر لے گا۔ وہ بھی کر لے گا لیکن ڈھنگ سے کوئی ایک چیز بھی نہیں کر سکے گا۔

یہ تو تھا ایک انگریز مصنف کا افسانہ۔ اب ذرا اپنی روئداد حیات بھی سن لیجیے ۔ مدرسے کی تعلیم ختم ہوئی تو کالج کا رخ کیا۔ خدا خدا کر کے بی اے ہو گئے۔ تو تلاش روزگار میں مارے مارے پھرنے لگے۔ گلی کوچوں میں 'کام بڑھئی' کی آواز لگاتے پھرے۔ اسی میں عمر کا پچیسواں سال چڑھا۔ تو لامحالہ مدرسے کا رخ کیا۔ یہ زندگی کا کوئی ایسا رخ نہیں جس سے ہمیں کوئی مایوسی یا شرمندگی ہو۔ تلاش روزگار کی سنگلاخ سرزمین میں بڑے بڑوں کو ٹھوکریں کھاتے دیکھا ہے۔ ہماری ان آزمائشوں پر جو ہنستا ہے وہ اپنے گریبان میں منہ

ڈال کر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ کن

'ہزار مرحلۂ ہائے خوشامدانہ روی'

سے اس نے یہ دشوار گذار راستہ طے کیا۔ جو راستہ ہم نے اختیار کیا اس پہ ہنسنے کی گنجائش نہیں۔ ہاں سوال تو یہ ہے کہ راستہ اختیار کرنے کے بعد ہم نے کیا کیا۔ جو سول سروس میں آگیا اس سے بھی پوچھئے کہ اس کے بعد اس نے کتنے خیبر فتح کئے کتنی مہمیں سر کرلیں۔

ہماری زندگی کا سب سے اہم سوال یہی ہے کہ ہم نے مدرس ہونے کے بعد کیا کیا؟ ہم میں سے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اُستاد کی معاش قلیل ہے اس کا سماجی رتبہ اس قدر ذلیل ہے کہ ہم کسی قسم کا معیاری کام پیش ہی نہیں کر سکتے۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے جو اگرچہ تلخ ہے لیکن ممکن ہے۔ بہ ضمیر یں رکھتا ہو۔ اگر ہمیں یہ پیشہ پسند نہیں تو ہمیں اسے آج سے چھوڑ دینا چاہیئے۔ بقول ڈاکٹر صاحب مرحوم

"گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن"

ہمارے خدا اور رسول۔ ہمارے دیس اور ہماری سماج کا مطالبہ یہی ہے کہ جب تک ہم اس پیشہ پہ کاربند ہیں اپنا فرض ادا کرتے رہیں۔ میرے لئے یہ مطالبہ اتنا ہی عزیز ہے۔ جیسے کوئی مذہبی عقیدہ۔ اس کی گرمی میری رگ رگ میں رواں ہے میری نس نس میں رواں ہے ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا عقیدہ ہے کہ روزِ قیامت کو ہر انسان کی پرسش ہوگی۔ اگر نمازیں گنڈے دار ہوئیں تو ممکن ہے چھٹکارا ہو جائے۔ اگر روزے چھوٹ گئے۔ تو بھی بخشش کی اُمید ہو سکتی ہے۔ لیکن سب سے خوفناک سوال جس کے تصور سے میری روح کانپ اُٹھتی ہے وہ یہ ہے کہ آیا میں نے اپنا کام بھی اچھی طرح سے انجام دیا کیونکہ اگر ہم نے زندگی کے پیشہ ورانہ فرائض کے اہتمام میں کوتاہی کی تو اس کے لئے کسی بھی درگذر کسی معافی کی گنجائش نہیں۔

سب سے پہلا سوال جو ہمیں اپنے آپ سے کرنا ہے وہ یہی ہے کہ آیا ہمیں اس

نام سے کوئی جذباتی لگاؤ۔ کوئی محبت ہے۔ اس پر مجھے اپنے ایک پُرانے شاگرد کا قصہ یاد آگیا جنہوں نے محض تفریحاً معلمی چھوڑ کر کاروباری پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اور ایک سال کے اندر اندر پچیس ہزار روپیہ پیدا بھی کر لیا۔ ایک سال کے بعد وہ پھر سے دوبارہ ملا۔ اب وہ اس پیشہ میں دوبارہ آنا چاہتا تھا۔ مَیں نے اُسے کہا دیکھو ابھی واپس نہ آؤ۔ پہلے اپنے جذبۂ دولت اندوزی کی تسکین کر لو۔ یا پھر اپنے دل کی آواز سنو۔ اگر تمہاری روح اس پُرانے کام کے لئے بے تاب ہے تو مدرسہ کا رخ کرو ورنہ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو۔ یہ ہے میری اجمالی رائے اپنے پیشہ کے بارے میں ۔

اب ہمیں اس پیشہ کے ان نئے تقاضوں کا جائزہ لینا ہے جو نئی زندگی اور نئی تبدیلیوں کے ماحول میں پیدا ہو گئے ہیں ۔ اس میں چند موٹی موٹی باتیں تو آپ کو خود معلوم ہیں بعض کی میں تصریح کئے دیتا ہوں ۔ اُمید ہے آپ اس صراحت کی تلخ نوائی کو معاف فرمائینگے۔

چند سال ہوئے فوج اور ہائر سول سروس کی تربیت، تعین نصاب اور لائحۂ عمل کے لئے ایک کمیٹی بنی ۔ جس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ تربیت کا مقصد کردار کی تشکیل اور تعمیر ہے ۔ جب کمیٹی نے مجھ سے مشورہ کیا تو مَیں نے ان سے پُوچھا کہ آپ پہلے بتائیں کہ کردار کی تشکیل کیسے ہوتی ہے اور اس کی تعمیر کن خطوط پر اُٹھائی جا سکتی ہے؟ پہلے تو کمیٹی نے اسے مذاق سمجھا گویا ایسے بنیادی اصولوں پر سوال کرنا ہی مذاق ہے لیکن جب مَیں نے بار بار اسی سوال پر زور دیا تو وہ سمجھے کہ یہ سوال کمال سنجیدگی سے پوچھا جا رہا ہے ۔ ان میں اس احساس کے پیدا ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ کمیٹی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی میری کیفیت اس شریر بچے کی سی تھی جو ایک بڑے میاں کو برآمدے میں سے گزرتے دیکھ کر ان کے راستے میں کیلے کا چھلکا پھینک کر چھُپ چھُپ کر تماشا دیکھتا ہے۔ اب وقت پر کمیٹی نے ایک بھاری بھرکم رپورٹ بھی مرتب کر دی ۔ اس میں اصولِ تعلیم کی کتابوں سے اچھے اچھے جملے بھی آ گئے لیکن کردار کی تشکیل کی بحث جہاں تھی وہیں رہی !

کردار کی تشکیل کا راز یہی ہے کہ ہم بچّے کے سامنے کردار کا اچھا نمونہ پیش کریں۔ حضرت پیران پیر کے پاس ایک بڑھیا اپنے بچّے کو لے کر آئی اس بچّے کو زیادہ میٹھا کھانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بڑھیا نے عرض کی یا حضرت اس کے حق میں دعائے خیر کیجیے۔ اور اسے نصیحت کیجیے کہ اس عادتِ بد کو ترک کر دے۔ آپ نے بچّے کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ اس کے حق میں دعا کی اور رخصت کر دیا۔ چلتے ہوئے اتنا کہا کہ اسے اگلے چاند دوبارہ لے آنا۔ وہ اگلے مہینہ پھر آئی اور کہنے لگی حضور اس نے تو ابھی تک میٹھا نہیں چھوڑا ۔ اس مرتبہ آپ نے پھر اس کے حق میں دعا کی اور اس کے ساتھ ساتھ نصیحت بھی فرمائی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ چڑھتے چاند تک بچّے نے میٹھا چھوڑ دیا۔ ایک مرید نے دریافت کیا کہ حضور آپ نے بچّے کو پہلی مرتبہ ہدایت نہیں فرمائی۔ تو جواب دیا۔ اس وقت تک مجھے خود میٹھا بہت مرغوب تھا۔ ایسے میں بچّے کو کیسے ہدایت کرتا۔ اس دن سے مَیں نے میٹھا کھانا چھوڑ دیا تو اس کا اہل ہُوا کہ اسے بھی نصیحت کر سکوں۔

یہ کہانی اخلاقی مردانگی اور فرزانگی کی عجیب و غریب مثال ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی میں اخلاقیات کا کوئی رُخ کلیتہً اور صلابتہً پیش نہیں کرتے تو ہمیں بچّوں کو بھی یہ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اس کو اپنی زندگی میں بنانے اور چمکانے کی کوشش کریں۔ شائد آپ دل میں کہیں کہ اخلاق کا یہ مرتبہ تو اولیاء اللہ کو ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں محض اتنا کر دیجیے کہ جو کچھ ہو خلوصِ قلب سے ہو۔ اور اگر خلوصِ قلب بھی میسر نہیں تو کم از کم بچّوں کی نظر میں ایک ظاہری رکھ رکھاؤ ہی سہی۔

دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز

پھر کردار کی تشکیل میں اخلاقی عمل ہی نہیں بلکہ علم کی بھی جگہ ہے۔ آپ کا مدرسہ صوبے کا مشہور و معروف ادارہ ہے۔ اس صوبے میں کئی ایک اچھے پبلک اسکول موجود

ہیں۔ گھوڑا گلی، سینٹ اینتھنی وغیرہ۔ کبھی موقعہ ملے تو ان کی چھوٹی جماعتوں میں جائیے اور معلوم کیجیے کہ ہماری اور ان کی تربیت میں کیا فرق ہے۔ جہاں ہمارے بچے علم کو یاد کرتے ہیں ان کے ہاں کے بچے علم کو آنکھ سے دیکھتے اور دل سے محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے بچے کتاب میں پڑھتے ہیں کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ بارش ۱۵ جون سے شروع ہوتی ہے لیکن ذہنی لحاظ سے وہ سورج کو کبھی نکلتا نہیں دیکھتے اور نہ ہی فضا میں مون سون کے اسباب اور اس کے عنوانات کو پڑھ سکتے ہیں ۔ اس کا کیا سبب ہے۔ اس کی بڑی وجہ ایسا علم ہے جسے عمل سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ایسی معلومات جسے احساسات سے کوئی رشتہ نہیں۔

امام غزالی جب طوس سے تعلیمی سفر پہ چلے تو کندھے پر علمی اشارات کے پلندے لادے ہوئے تھے۔ راستے میں کاروان پر ڈاکہ پڑا اور تمام مال و متاع غارت ہو گیا۔ سوداگروں کو اپنے قیمتی سرمایہ جانے کا افسوس تھا اور امام کو متاعِ علم کی بربادی کا ملال۔ اسی پریشانی میں ہمت کر کے ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور بولے میرے اشاراتِ علم کی ایک گٹھڑی لُوٹ میں آگئی ہے۔ آپ لوگوں کے کس کام کی ہے۔ مجھے لوٹا دیں تو عنایت ہو گی۔ "گٹھڑی؟ سردار نے حیرت سے پوچھا۔ کس چیز کی گٹھڑی؟' بولے علمی ملفوظات کی' سردار نے اپنے لوگوں سے کہا بھئی یہ اچھا عالم ہے جس کا علم کاغذ کے پُرزوں پہ مارا مارا پھرتا ہے۔ اس بھکاری کو اس کے مانگے تانگے کا علم واپس کر دو۔ امام غزالی نے کہنے کو اوراق کی گٹھڑی واپس تو لے لی لیکن سردار کی بات ان کے دل میں گھاؤ کر گئی۔ روانہ ہوئے تو راستے میں ایک ایک کر کے اوراق پھینکتے گئے۔ "علمِ حاضر" کی تعریف امام صاحب کے زمانہ سے ہی شروع ہوئی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر علم حاضر نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

میرا ارادہ تدریس کے ان بدیہی اصولوں کو چھونے کا نہیں۔ یہ اصول آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ میرا تو یہی کہنا ہے کہ ہم بہتر انسان ثقافت اور شرافت کے لحاظ سے بہتر انسان

پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک شکایت بھی کرنا ہے۔ ہمارے بعض اساتذہ کا انداز گفتگو۔ ان کی بات چیت کا طور طریقہ بازاری ہوتا ہے۔ وہ اپنے کردار کا احساس پیدا کرنے سے پہلے بچوں میں رکیک زبان کے ذریعے احساس کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ آیئے ہم آج سے عہد کر لیں کہ ہم بچے کی شخصیت کا احترام کرتے ہوئے اسے ہمیشہ مہذب اور موقر الفاظ میں خطاب کریں گے۔ پھر ہمارے آداب نشست و برخاست، لباس و پوشاک میں صفائی اور چستی ہونا چاہیئے۔ ہماری زندگی، جسمانی اور اخلاقی، نک سک سے درست ہو۔ اس میں توازن ہو۔ حسن ہو۔ اس میں 'مکروہات' کی جگہ نہ ہو اگر ہم 'مکروہات' سے بچیں گے تو بچے بھی ان سے کوسوں دور بھاگیں گے۔ اگر ہم فرض شناس ہوں گے تو بچے ہم سے بڑھ کر احساس فرض کا ثبوت دیں گے۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ ہم بچوں کو سمجھتے ہیں یقین مانئے کہ بچے ہمیں ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ وہ ہماری کمزوریوں کو جانتے ہیں۔ ہماری کوتاہیوں پر بے حد کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور جب موقعہ ملے تو ان کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

انگلستان کے مشہور مفکر اور ماہر تعلیم برٹرنڈ رسل نے اپنی کتاب On Education میں لکھا ہے کہ جب انہوں نے اپنے بچے کو پہلی مرتبہ علیحدہ کمرے میں سونے کے لئے کہا تھا سے بتا دیا گیا کہ نو بجے کے بعد اس کے کمرے میں تاریکی رہے گی۔ پہلی رات بچہ کچھ دیر تو خاموش لیٹا رہا۔ اس کے بعد اس نے یکبارگی چلانا شروع کیا۔ جب پوچھا گیا۔ تو کہنے لگا۔ مجھے اندھیرے میں اژدھے نظر آرہے ہیں۔ اس پر روشنی کی گئی تو دیکھا کہ کمرے کی دیوار سے ایک رسّی بندھی تھی۔ خیال ہوا کہ شاید اس کی وجہ سے بچے کو دھوکا ہوا ہو۔ دوسری رات ان حضرت نے دوبارہ یہی حرکت فرمائی۔ اور پہلے سے زیادہ چیخ پکار کی۔ آخرکار ان کے ابا کو یقین ہو گیا کہ یہ سب مکر و فریب ہے۔ اس پر انہوں نے بچے کو نہایت سنجیدگی سے کہا کہ دیکھو بیٹے! آئندہ اگر جہنم بھر کے اژدھے بھی تمہارے کمرے میں گھس آئے تب بھی

روشنی نہیں کی جائے گی۔ اس پر بچے نے کہا "ابا۔ مان گئے۔ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"
اور اس کے بعد دوبارہ ایسا کبھی نہیں ہوا! بچہ ہمیں شخصیت کی ان حدود تک جانتا ہے۔
دیکھنا یہ ہے کہ ہم بھی اسے کہاں تک پہچانتے ہیں۔

آج مسلمان کے خلاف ایک دنیا برسرِ پیکار ہے۔ کہیں جنگ سر پر آگئی ہے کہیں آنے والی ہے۔ ہمیں نئی پود کو ان طاغوتی طاقتوں کے خلاف جسمانی ہی نہیں ذہنی اور اخلاقی جہاد کے لئے تیار کرنا ہے۔ کیا ہماری تعلیم و تربیت اس قسم کی ہے کہ ہم بچوں کو اس عالمگیر آفاقی کشمکش کے لئے تیار کر سکیں۔

آیئے ہم آج سے عہد کریں کہ اپنی بساط کے مطابق ہم ایسی زندگی کا نمونہ پیش کریں گے۔ ضبط و محنت۔ خلوص و محبت کی آئینہ دار ہو گی۔ اس کے راستے میں جو انتظامی طاقتیں حائل ہوں گی میں انہیں ہیڈ ماسٹر صاحب کے تعاون سے دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہماری تمنا یہی ہونا چاہیئے کہ خواہ ہمارے ہاں کے لڑکے امتحان کی فہرست میں چوٹی پر نہ ہوں لیکن آج سے ۱۵ سال بعد وہ شہریت کے زینہ پر سب سے زیادہ باوقار اور قابلِ اعتبار ہوں۔

ایک کسان اپنی زندگی کے ہر سال میں کئی ایک فصلیں دیکھتا ہے۔ ایک سے تجربہ حاصل کرتا ہے تو دوسری بار ان غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کھاد۔ پانی۔ مٹی سب کے نئے نئے تجربے کرتا رہتا ہے۔ لیکن استاد کی قسمت میں کئی ایک نہیں محض دو ایک ہی فصلیں ہوتی ہیں۔ ہم نت نئے تجربوں کی جرأت نہیں کر سکتے ہمیں تو شروع سے ہی وافر پانی اور زرخیز مٹی تیار کرنا ہے۔

آج میں نے آپ کا بہت سا عزیز وقت لے لیا۔ اس میں کچھ باتیں تھیں۔ کچھ ہدائتیں۔ مجھے اُمید ہے آپ ان میں تنقید کا پہلو تلاش نہیں کریں گے بلکہ اس جذبہ اور اخلاص کی جھلک دیکھنے کی کوشش کریں گے جس نے مجھے آپ لوگوں سے یہ چند باتیں

کھنے کے لئے بے تاب کر دیا۔ میں جبلتاً اور خاصیتاً مدرّس ہوں اور اس جنس کی سبھی کمیاں اور کوتاہیاں مجھ میں موجود ہیں۔ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ذاتیات سے بلند ہو کر یہ سوچنے کی کوشش کریں کہ آخر ہمارے دیس کا بچہ گردن جھکا کر کیوں چلتا ہے۔ اسے تن کر چلنا چاہیئے۔ اس کے چہرے پر معذرت خواہ افسردگی کیوں ہے۔ اس کی جگہ ولولہ اور بانکپن ہونا چاہیئے۔ اگر آج وہ جوتے کے تسمے نہیں باندھتا تو کیا کل دنیا اس کی اس سہل انگاری کو معاف کر دے گی؟ اگر آج وہ بیدار اور جی دار نہیں تو کل کیا دنیا اس کی نیم خوابی اور تنک تابی کو درگذر کر دے گی؟

مجھے احساس ہے کہ اس لحاظ سے نئی پود کی تربیت میں بہت کمی آگئی ہے۔ اس پہلو سے ہمارے بزرگوں کی تعلیم و تربیت زیادہ بااصول اور منظم تھی۔ اس کا راز ان کے کردار کی ہم آہنگی اور اس کا توازن تھا۔ ہماری نسل ایک بے لنگر جہاز ہے۔ جو طوفان کے رحم و کرم پر ہے۔ اس میں نہ کوئی ثقافتی وزن ہے اور نہ کوئی اصولی وقار۔

لیکن نئے حالات نے ہمارے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے ایک نئی منزل کا نشان دے دیا ہے۔ ہم اشتراک عمل کے ایک بے پناہ جذبے کے ساتھ اس پر گامزن ہوں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے بچے اس ادارے سے ایک نئی شجاعت و عظمت، عزم اور استقلال کا سبق لے کر جائیں گے۔ اور ان کے پاس ایک ایسے علم کی دولت ہوگی جو زندگی سے مربوط ہوگا۔

رابرٹ ریکس کا خستہ حال اسکول

سعیدہ بیگم احمد

۱۷۸۰ء کی ایک اندھیری شام کو انگلستان کا ایک امیر و کبیر کاتب اور گلوسیسٹر جرنل کا ایڈیٹر اتفاقاً ایک گلی سے گزرا جس کا نام سوٹی گلی تھا۔ یہ گلی اِس شہر کی بے انتہا گندی گلی مانی جاتی تھی جس میں نہایت غریب طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ یہ گلی دلدل سے بھری ہوئی تھی۔ رابرٹ ریکس کا ملازم اس کے ساتھ لالٹین لئے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا۔ ان گندے بچّوں نے جن کے جسم پر کپڑوں کے چیتھڑے لٹک رہے تھے جب اسے دیکھا تو شور مچانا شروع کیا چند ایک نے تو اس امیر طبقے کے فرد کو گالیاں دینی شروع کیں اور بھی بہت سی نازیبا باتیں کیں بلکہ ایک نے تو یہاں تک بدتمیزی کی کہ گندی مٹی کی ایک مٹھی بھر کر اُس کی کمر میں زور سے دے ماری۔

مجبور ہوکر رابرٹ ریکس نے دروازے کے پیچھے پناہ لی اور پیچھے گھوم کر جو دیکھا تو ایک عورت سامنے نظر آئی جو بچّوں کے شور و غل کی وجہ معلوم کرنے باہر نکل آئی تھی۔ رابرٹ نے

غصّے میں آن کر اس عورت سے کہا کہ اِن بچّوں کے والدین کو اپنے بچّوں کے اس بیہودہ رویّے پر شرم آنی چاہیئے۔

اُس نے جواب دیا "جی ہاں۔ آپ سچ فرماتے ہیں لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ بچّے دن بھر محنت کرتے ہیں۔ رات کے وقت اِن کے پاس کہیں جانے کے لئے جگہ نہیں نہ اِن کے پاس کوئی کھیلنے کی جگہ ہے اور نہ اِن کے پاس کوئی کام کرنے کو ہے۔ کاش کبھی اتوار کے دن جب انہیں چھٹی ہوتی ہے آپ آکر دیکھیں تو معلوم ہو کہ کیا اُس دن ہنگامہ یہ لوگ برپا کرتے ہیں۔

ریکس سوتی گلی کو دیکھنے کے لئے دوسری اتوار گیا جو منظر اُس کی آنکھوں نے دیکھا۔ وہ سخت تعجب خیز اور پریشان کن تھا۔ اُس نے دیکھا کہ بڑے لڑکے ایک دوسرے کو مار رہے تھے اور بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ وہ چھوٹے لڑکوں کو دوسرے لڑکوں کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ تاکہ اُن کی آپس میں خوب اچھی طرح مارپیٹ ہو۔ چھوٹی لڑکیاں اور لڑکے سامنے کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اِن میں سے بعض نہایت لاپرواہی کے ساتھ گندگی سے بھری ہوئی زمین پر پھر رہے تھے۔ ایک آدمی جو برائے نام کپڑے پہنے ہوئے تھا چند لڑکوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا کیونکہ انہوں نے دروازے کی کھڑکی توڑ دی تھی۔

ان بچّوں کو فیکٹریوں میں کام کرنے کے لئے اور کام سیکھنے کے لئے ۶ سال کی عمر سے بھیجا جاتا تھا۔ اِن میں سے اکثر ۱۲ گھنٹے دن میں کام کرتے تھے۔ اِن میں سے دس میں سے ۸ لڑکے اپنی عمر کا اکیسواں سال پورا کرنے سے پہلے بدعادتوں کی وجہ سے جیل خانے بھیجے جاتے تھے۔ اور ہر چار میں سے ایک کو پھانسی ملتی تھی۔

ریکس اُس کمیٹی کا لیڈر تھا جس کا کام اُن لوگوں کی مدد کرنا تھا جو قید خانے میں بھیجے جایا کرتے تھے۔ اُس کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ غریبوں کا "مددگار" کے نام سے مشہور تھا۔ وہ اِن بچّوں کے حالات کا معائنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اِن بچّوں کی اخلاقی حالت

سنوارنے کے لئے صرف روپے کا عطیہ دینا کافی نہیں۔ اُس نے اس بات کی ضرورت کو
ازحد محسوس کیا کہ اصل میں اِن کا وقت اتوار کے دِن کسی مفید کام میں گذرنا چاہیئے۔ کیونکہ
اتوار ہی کا دن ایسا تھا جس کو وہ فضول طریقے سے گذارا کرتے تھے۔

ریکس ایک نہایت پرہیزگار پادری تھا اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے ان بچّوں کو مذہبی
تعلیم دینے کے لئے بُلانا چاہیئے۔ اُس نے اس علاقہ کا دَورہ کیا جہاں پر نہایت مفلس لوگ
رہا کرتے تھے۔ اس دَورے کا مقصد ایک ایسی معتبر عمر رسیدہ عورت کی تلاش تھی جو اِن غریب
بچّوں کو مذہبی تعلیم دے سکے۔ مسز کنگ جو بینٹ کیتھرین اسٹریٹ کی رہنے والی تھیں۔ اُس
کی پہلی مددگار رضا تو بن بنیں۔ اُس نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ چند اور والدین کی
رضامندی حاصل کی۔ ایک اتوار کو اُس نے پیسوں کا لالچ دے کر مسز کنگ کے گھر پر
ایک درجن بچّوں کو پہنچا دیا۔ وہاں اُس نے بائیبل کا تھوڑا سا حِصّہ پڑھ کر سنایا۔ ایک کہانی
بھی کہی اور ایک اچھی سی نصیحت بعد میں کی۔ جو اِن سب کی سمجھ میں آئی۔

اُس نے دیکھا کہ ہر اتوار کو لڑکوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اُس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ
خبر چاروں طرف پھیل گئی تھی کہ صرف خاموشی سے بیٹھ کر سننے کے عوض بچّوں کو پیسے اور
چاکولیٹ ملتے ہیں۔ لڑکیوں نے بھی اِس مجلس میں شرکت کرنے کی درخواست کی۔ ریکس
نے خوشی سے اجازت دی کیونکہ وہ اِس بات کی موافقت میں تھا کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک
جگہ بیٹھ کر تعلیم پائیں۔ اِس لئے لڑکیوں کی درخواست کو اُس نے خوشی سے قبول کیا۔

اُس کے ہم پیشہ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیونکہ ہر اتوار
کی صبح کو یہ قد آور شخص اس کام میں منہمک نظر آتا تھا۔ اِس کا لباس ایک کھلی کوٹ۔ سفید
تسمہ دار جُوتے اور اُونچی ٹوپی تھا۔ وہ اِس لباس کو زیب تن کئے ہوئے اس چھوٹے گروہ
کے سر پر شور و غل مچانے والے بچّوں کو گھیر کر ان سب کو سبت اسکول میں لے جایا کرتا
تھا۔ کسی نے اُس کو اِن بچّوں کو لے جاتے ہوئے دیکھ کر مذاقیہ انداز میں یہ بھی کہا۔ ریکس

کا اسکول تو چیتھڑے لگے ہوئے بچّوں کا اسکول ہے"۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس پھٹے پُرانے کپڑے پہننے والے بچّوں کے اسکول ہی نے جدید ماڈرن "سنڈے اسکول" کی بنیاد رکھی۔ یہی ایک ایسی انسٹی ٹیوشن ہے جو دنیا کے ہر حصّے میں پھیلی ہوئی ہے۔ آج لاکھوں کی تعداد میں نوجوان بچّے مذہبی تعلیم اِسی قسم کے اسکولوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہ تعلیم اُن کو وہ اساتذہ دیتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں اِن کاموں کے لئے وقف کردی ہیں۔ اور وہ بلا تنخواہ کام کرتے ہیں۔ یہ اُستاد مختلف قسم کے گرجوں میں پڑھاتے ہیں اور یہ رُوئے زمین پر غالباً سب سے بڑی درسگاہ چال چلن کو سنوارنے اور بلند اخلاق کی تعلیم دینے کی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کہ اخلاقیات کی تعلیم بچّوں کو اپنے گھر سے باہر یہاں پر ہی ملتی ہے۔

اپنے اس نئے تجربے کے پہلے سال میں ریکیس نے تین اور نئے اُستادوں کا اضافہ کیا وہ ہر اتوار کو اُنہیں ایک ایک شلنگ دیا کرتا تھا۔ اب آہستہ آہستہ اُس نے بچّوں کو پڑھنے اور لکھنے کی تعلیم دینے کی طرف قدم بڑھایا۔ چونکہ غریب طبقے کے بچّے کسی اسکول میں نہ جا سکتے تھے۔ اِس لئے وہ اسکول ہی اِن کے پاس لے کر آ گیا۔ اُس نے چھوٹی چھوٹی کتابیں چھپوائیں۔ جن میں Alphabets اور بائیبل کے کچھ حصّے لکھے ہوئے تھے۔ یہ "سنڈے اسکول" کا پہلا لٹریچر تھا۔

یہ بچّے ہر اتوار کو دس بجے دن صبح کے وقت اسکول جاتے تھے اور دوپہر تک اسکول میں رہتے تھے۔ یہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر جایا کرتے تھے اور پھر دن کے ایک بجے گرجے میں واپس آ جاتے تھے۔ گرجے میں عبادت کرنے کے بعد یہ اپنی کلاسوں میں پڑھنے آ جاتے۔ اور ساڑھے پانچ بجے تک مذہبی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اِن بچّوں کو انعام کے طور پر چھوٹے چھوٹے کیک اور پیسے ملا کرتے تھے۔ پھر ریکیس اِن کو رخصت کر دیتا لیکن اِس نصیحت کے ساتھ کہ "وہ اپنے اپنے گھر خاموشی کے ساتھ بغیر راستہ میں شور مچائے جائیں اور راستہ میں سڑک

سے کنارے بیٹھ کر ہرگز نہ کھیلیں"۔

اس Ragged School کے سرپرست نے یہ قاعدہ بنایا کہ سب بچّے اپنے ہاتھ منہ دھوکر اسکول میں آئیں اور روزانہ بالوں میں کنگھی کریں۔ اکثر بچّوں کے پاس کنگھے اور برش نہیں تھے۔ ریکنس نے اُن کو اپنے پاس سے کنگھے دیئے اور اُن کے استعمال کرنے کا صحیح طریقہ سکھایا۔ وہ اِن بچّوں کے گھروں کو دیکھنے گیا اور ان کے شرابی والدین کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ چنانچہ وہ غلط فہمیاں جو اُن کو ریکنس کے متعلق تھیں اُس کی شرافت اور شفقت کے رویے نے زائل کر دیں۔ اُس نے اِن بچّوں کے والدین کے دل کو دوستانہ تعلقات اور کپڑے اور تحفے تحائف دے کر موہ لیا۔

ریکنس نے اپنے ہم پیشہ دوستوں کو گلوچسٹر اور لندن میں اور بہت سے اسکول کھولنے کی ترغیب دی۔ اُس نے گرجے کے پادریوں سے اپیل کی کہ وہ سبت کے دن کے متعلق بچّوں کو دلچسپ طریقے سے سمجھائیں۔ ایسا کرنے کے بعد اِس پر اُس کے خلاف بڑی سخت مخالفت شروع ہوگئی۔ وزیروں نے اس پر غصّہ کا اظہار کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ یہ پادری کی عزّت اور وقار کے خلاف ہے کہ وہ نچلے طبقے کے بچّوں کو مذہبی تعلیم دے۔ اُنہوں نے اِس بات کی بھی شکایت کی کہ بچّے بے حد گندے اور اُودھم مچانے والے ہیں۔

اِن کی مخالفت نے نیا رنگ اختیار کیا اور اُنہوں نے کہا کہ یہ ہمارا مذہبی عقیدہ ہے کہ سبت کے دن کوئی کام نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک پادری نے ریکنس کو خفا ہو کر خط لکھا اور اُس کو تنبیہ کی کہ بچّوں کو اتوار کے دن پڑھانا مذہبی نقطۂ نظر سے غلط ہے کیونکہ اُنہوں نے کہا کہ "سبت کے دن جسم و ذہن کا استعمال کرنا گناہِ کبیرہ ہے"۔ لیکن وہ اس قسم کی مخالفت پر غالب آگیا۔ کیونکہ اُس نے ایسے مضامین جن میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے مثلاً "حساب" اور "لکھائی" اُس دن کسی بچّے کو نہ کرنے دیئے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند پادری اُس کی موافقت میں ہوگئے۔

گلوچیسٹر کے ایڈیٹر کو کیا معلوم تھا کہ اُس کی یہ تعلیمی تحریک ساری دنیا کی ایک بڑی اعلیٰ پائے کی تحریک کا پیش خیمہ ہوگی۔ اسس کو بہت جلدی اپنی کوششوں کے اچھے نتائج بچوں میں نظر آنے لگے۔ بچے بڑے فخر کے ساتھ اپنے صاف ہاتھ اُس کو دکھاتے تھے کلاسوں میں نہایت تمیز کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ اور شور و غل کا نام نہ تھا۔ ریکیس نے بچوں کی روزمرہ کی گفتگو کے درست کرنے کے لئے بڑی جانفشانی کی اور اُن کو ملنے جلنے کے عادات و اطوار سکھائے۔ جن بچوں میں اُس نے لیڈر بننے کا قدرتی میلان دیکھا اُن کو اُن کی کلاسوں کا مانیٹر بنا دیا۔ یہ عزت اُن کو اس لئے بخشی تاکہ وہ دوسروں کی مدد کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہیں۔ اِن ناتوان اور بساط سے زیادہ کام کرنے والے بچوں کے والدین نے اسس حیرت انگیز تبدیلی کا ذکر ریکیس سے کیا جو اُن کو اپنے بچوں میں نمایاں طور پر نظر آنے لگی۔

ایک مزدور جس کا بچہ ریکیس کے اسکول میں پڑھتا تھا۔ اُس نے ریکیس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا" حضور! جب سے ہمارے بچے نے اسکول میں جانا شروع کیا ہے۔ اُس دن سے ہمیں اُسے مارنے پیٹنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی ہے"۔ اسی طرح ایک فیکٹری کے مینیجر نے بڑا اچھا خط ریکیس کو لکھا جس میں اُس نے ریکیس کی اس اعلیٰ پائے کی تحریک کی تعریف کی۔ اُس کے مددگار و معاون جن میں سے اکثر کی عمر چھ سے بارہ سال تک کی تھی اور جو Ragged School میں پڑھتے تھے بے حد فرمان بردار تھے۔ اور لڑنے جھگڑنے میں بھی بہت کم وقت ضائع کرتے تھے۔

نومبر ۱۷۸۹ء کے بعد جب "Gentleman's Magazine" نے ریکیس کی اس پروجیکٹ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی تو یہ تحریک ساری دنیا میں تیزی کے ساتھ پھیل گئی جون ویسلی جو Methodism کا بانی تھا اُس نے اِس تحریک کی پُرزور حمایت کی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ Sunday School یورپ کی بہترین درسگاہوں میں سے ہیں جو کئی صدیوں کی مسلسل کوششوں کے بعد دیکھنے میں آئے ہیں۔

ویسلی (Wesley) نے سبت اسکول میں موسیقی کی تعلیم جاری کی۔ بچّوں کی عمر کے لحاظ سے کلاسیں شروع کیں۔ بچّوں کی پڑھائی کے گھنٹوں کی تعداد میں کمی کی۔ اور مذہبی تعلیم دینے کے طریقوں کو زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کی۔

رکیس نے کچھ اساتذہ Bradford بھیجے۔ یہ شہر اُونی کارخانوں کے لئے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس شہر کو اس بات پر فخر تھا کہ اُن کے کارخانوں میں بچّوں کی تعداد انگلستان کے ہر شہر سے زیادہ ہے۔ اور اُنہوں نے "سنڈے اسکول" ولایت کے غریب ترین اضلاع میں کھولے تھے۔

لیڈز اور ویلش کے پادریوں نے بھی اِس اعلیٰ مثال کی پیروی کی۔ ۱۷۸۴ء میں Stockport کے مقام پر عیسائی مذہب کے مختلف فرقوں نے اپنے اختلافات ہمیشہ کے لئے دفن کر دینے کے بعد پہلی عمارت "سنڈے اسکول" بچّوں کی تعلیم کے لئے بنائی۔ یہاں ایک ہزار سے زیادہ تعداد میں ہر ہفتہ بچّے جمع ہُوا کرتے تھے۔

۱۷۸۵ء میں رکیس نے ایک رپورٹ پیش کی جس میں اُس نے یہ دکھلایا۔ کہ سارے انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں ۰۰۰،۲۵۰ بچّے "سنڈے اسکول" میں تعلیم پاتے ہیں۔ لندن میں ایسے ۵۰ اسکول تھے اور اڈنبرا میں اِن کی تعداد ۴۴ تھی۔

William Wilberforce جو پارلیمنٹ کا ممبر تھا "سنڈے اسکول" کی تحریک کا مربّی بنا اور یورپ کی مشہور و معروف ہستیوں نے اس کی تعلیمی تحریکوں کی موافقت کی اُس نے کشادہ دلی کے ساتھ بائبل کے چھپوانے اور پھر بچّوں کو بانٹنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔

Wilberforce نے شہزادی چارکوٹ (Charcot) کی توجہ اس کام کی طرف مبذول کرائی۔ وہ دن رکیس کے لئے قابلِ فخر تھا جبکہ وہ بادشاہ جارج اور ملکہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے اُن کے سامنے بھی یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی کہ بچّوں کو اگر اسکول کی تعلیم اور ساتھ ساتھ اخلاقی اور مذہبی تعلیم دی جائے تو وہ بہترین شہری ثابت ہو سکتے ہیں۔

رابرٹ ریکس کے سنڈے اسکولوں نے دو بڑی زبردست تحریکوں کی بنیاد رکھی۔
جن کا اثر سماج پر بہت گہرا ہوا۔ یہ تحریکیں یہ تھیں:۔
ا۔ وہ غریب بچے جو محنت و مزدوری کرتے ہیں اُن کے کام کرنے کے گھنٹے کم کر دینے چاہئیں۔ گلوچیسٹر کے کشادہ دل اور روشن خیال ایڈیٹر نے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔
۲۔ ہر بچے کو تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ دینا چاہیئے خواہ وہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو
اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر ہم بچے کو اسکول کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو اُس کو کام سے کچھ دیر کے لئے چھٹی بھی ملنی چاہیئے۔ اُس نے اِس واہیات خیال کی بڑی سخت مخالفت کی کہ "تعلیم اگر عام کر دی جائے تو اُس کے نتائج خراب ہوتے ہیں" اُس نے کہا "مَیں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں اور قید خانوں میں قیدیوں کی حالت دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے بُری عادتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تعلیم اور بلند اخلاقی کا دامن اور چولی کا ساتھ ہے۔ اور تعلیم یافتہ بچے ہی کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں"۔
کارخانوں کے مینجروں نے بچّوں کے کارخانوں میں کام کرنے کے گھنٹوں میں کمی کرنے کی تحریک کی سخت مخالفت کی۔ اِس لئے ریکس نے مجبور ہو کر اِن بچّوں کی تعلیم کا انتظام رات کے وقت کیا۔ اُس نے اُستادوں کو پڑھانے کے لئے رکھا اور اُن کو معقول تنخواہیں دیں اُس نے اپنے رسالے میں متعدد مضمون لکھے۔ جن میں رات کے اسکولوں میں پڑھانے کی عمر ۱۰ اور ۱۲ سال کر دی۔ اُس نے سوداگروں کے بڑے بڑے لیڈروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے اَن تھک بحثیں کیں۔ اور اس بات کو اُن کے ذہن نشین کرایا کہ ہمارے ملک کی فلاح و بہبودی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کو اپنے ملک کے بچّوں کی تعلیم کا کس حد تک خیال ہے اور یہ کہ ہم اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کو کس قسم کا بنانا چاہتے ہیں۔

رابرٹ ریکس کا ۱۸۱۱ء میں انتقال ہوا۔ جبکہ اُس نے اپنی عمر کے ۷۰ سال پُورے کر لئے تھے۔ اُس نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا۔ کہ بچّوں کے لئے کام کرنے کے گھنٹوں میں تخفیف کر دی گئی۔ تاکہ وہ اسکول میں بھی جا کر پڑھ سکیں ۱۸۰۳ء میں اتوار ی مدارس کی یونین قائم ہوئی۔ اور اُس نے ۱۸۷۰ء کا ایجوکیشن ایکٹ پاس کرایا جس کی بنا پر لوکل ایجوکیشن آتھریٹیز (Local Education Authorities) نے ڈھیر اسکولز سارے یورپ میں کھول دئے۔

برطانیہ کے نرسری اسکول

علی ناصر زیدی

آج ہم بفضلہ تعالیٰ ایک آزاد مملکت میں سانس لے رہے ہیں۔ آزادی کی آمد کے ساتھ ساتھ ہمارے شانوں پر نئی ذمہ داریاں بھی آئی ہیں۔ ہمارے بچے ہی کل کے شہری ہیں۔ اور پوری قوم کا دار و مدار اُن پر ہی ہے۔ اُن کی تربیت اور صحیح تعلیم کا فرض والدین اور حکومت دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ تمام آزاد ممالک میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے علیحدہ سکول قائم ہیں۔ جہاں اُن کو اُن کے والدین سے جدا کر کے تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم آپ تو اپنے بچّوں کو عام طور سے اُس وقت مدرسوں میں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں۔ جب اُن کی عمر چھ سات سال کی ہو جاتی ہے۔ اُس عمر میں بچّوں کو والدین سے جُدا کرنا ہمارے ملک میں نہایت مضحکہ خیز بات سمجھی جاتی ہے۔ لیکن برطانیہ میں جابجا ایسے سکول قائم ہیں۔ جہاں چار پانچ سال اور اس سے کم عمر کے بچّوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ اِن سکولوں کو نرسری سکول کہتے ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم اِن سکولوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ آزاد ممالک اپنے کل کے

شہریوں کو کس طرح تعلیم و تربیت دیتے ہیں ، ہم آزادی کے علمبردار ہیں تو ہمارا فرض ہونا چاہیئے۔ کہ ہم بہت سے بہتر شہری پیدا کریں خواہ ہم کو دیگر ممالک کی نقل ہی کیوں نہ کرنا پڑے اگر ہم فیشن پرستی اور تعیش کوشی میں مغرب کی نقل کرنا فخر سمجھتے ہیں تو اچھی باتوں کی پیروی کرنے میں کیا ہرج ہے ؟

انگلستان اور ویلز کے محکمۂ تعلیم کی زیر نگرانی آج وہاں تین۔ چار سو نرسری اسکول اور دو ہزار نرسری جماعتیں قائم و جاری ہیں۔ یہ اسکول اور جماعتیں دو سال سے پانچ سال کی عمر تک کے ستاسی ہزار بچّوں کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ آیئے دیکھیں یہ بچّے اپنی جماعتوں میں اور اُن سے باہر کس طرح اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ اور یہ کہ اس قسم کے اسکول قوم کے لئے کس طرح مفید ہوتے ہیں ۔

سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِن اسکولوں کی ضرورت و اہمیت کیا ہے ؟ اگرچہ انگلستان میں اس قسم کے اسکولوں کو کُھلے ہوئے تیس سال کا عرصہ گذر گیا تاہم اب بھی وہاں اِن اسکولوں کو بعض اوقات ایک نئی چیز ہی سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ جنہوں نے اِن اسکولوں کو اندر سے نہیں دیکھا عجیب و غریب سوالات کرتے ہیں مثلاً کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ پانچ سال سے کم عمر کے بچّوں کے لئے بہترین جگہ اُن کا اپنا گھر ہی ہے ؟ کیا نرسری اسکولوں کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بچّوں کو والدین سے غیر مانوس اور بے نیاز کر دیا جائے یا والدین کو بچّوں کی سرپرستی سے سبکدوش کر دیا جائے ؟ حکومت کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؟ اِس قسم کے سوالات کرنے والے حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ نرسری اسکول ایسے گھرانوں کے بچّوں کے لئے تو واقعی مفید ہو سکتے ہیں جن کی ماؤں کو چند فرائض کے لئے گھر سے باہر جانا پڑتا ہے اور وہ اپنے بچّوں کی خبر گیری نہیں کر سکتی ہیں لیکن جہاں گھر کا ماحول پُر امن ہے اور ماں کو بھی اتنی فرصت ہے کہ وہ اپنے بچّے کی نگرانی اور دیکھ بھال کر سکے وہاں اِس قسم کے اسکول کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے ؟

دراصل بات یہ ہے کہ ہم اچھے بُرے گھر کے درمیان کوئی حدِ امتیاز قائم نہیں کر پاتے اور اچھے گھر کی صحیح معنوں میں تعریف نہیں کر سکتے۔ اگر عوام سے یہ سوال کیا جائے کہ اچھا گھر کیا ہوتا ہے تو غالباً اُن میں سے بیشتر یہی جواب دیں گے "ایک صاف ستھرا آرام دہ مکان جس میں رہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہ ہو اور جس میں نیک طینت و پُرامن آدمی بستے ہوں جو اپنے بچّوں سے محبت کریں اُن کو اچھی طرح کھلائیں پلائیں اور اُن کی صحیح طور پر نگرانی کریں۔ اُن کو صاف رکھیں۔ اُن کو اچھی عادات اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیں۔ ہر کام صحیح وقت پر کرائیں۔ اور اُن کی تندرستی اور کھیل کود کا خیال رکھیں۔ وغیرہ"۔

ہمارے ہزاروں گھرانے ایسے ہیں جو اِس معیار پر پُورے نہیں اُترتے۔ اور اگر وہ پُورے اُتریں بھی تو کیا اچھے شہری بنانے کے لئے بچّوں کے لئے صرف اِتنی ہی چیزیں کافی ہیں؟ ساتھیوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ بچّے کے جسم کے ساتھ ساتھ اُس کا دماغ بھی بڑھتا ہے اور اُس میں سوچنے سمجھنے کے لئے زیادہ وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دماغ کی صحیح نشوونما میں کونسی چیز مددگار ثابت ہوگی؟ بچّہ کا دل چاہتا ہے کہ اُس کو دوڑنے کے لئے لمبی چوڑی جگہ میسّر ہو۔ وہ نئی نئی چیزیں دیکھنا چاہتا ہے اُس کو معلومات کا شوق ہوتا ہے۔ اُس کو حفاظت و امن کے ساتھ یہ تمام چیزیں کہاں ملیں گی؟ ہماری طرزِ جدید کی زندگی نے خاص طور سے ایسی زندگی نے جو نہایت تنگ اور پُرہجوم شہروں میں بسر کی جا رہی ہے، ہمارے بچّوں کی تربیت کے متعدد نئے مسائل ہمارے سامنے رکھے ہیں بیشمار والدین چھوٹے چھوٹے مکانات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جن میں نہ صحن ہے اور نہ کوئی باغیچہ! ایسے والدین نرسری اسکول کی ضرورت اور اُس کی افادیت کو محسوس کرتے ہیں۔

اِن نرسری اسکولوں میں بچّوں کو وہی مادری محبت ملتی ہے۔ جس سے وہ اپنے گھروں میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بعض چیزیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جو بچّوں پر ہی چھوڑ دینی چاہئیں اور اُن کو بھی سوچنے سمجھنے اور اپنا کام خود انجام دینے کا موقعہ دینا چاہیئے۔ بعض

مائیں جنہوں نے نرسری اسکولوں کو قریب سے دیکھا، بچّوں کی پرورش سے متعلقہ بہت سی اچھی باتیں سیکھ گئیں بعض آدمی یہ کہتے ہیں کہ بچّوں کو نرسری اسکولوں میں چھوڑ کر عورتیں اپنے فرائض کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتی ہیں۔ اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ بچّوں کی ماؤں کے لئے ٹریڈ یونین کے اوقات مقرر کرنا مناسب نہیں ہے۔ بہت سی عورتیں اپنی طاقت سے زیادہ کام کرنے کی وجہ سے قبل از وقت ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ نرسری اسکولوں میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی ہے۔ امیروں نے اپنے گھروں پر ہی اِس قسم کے اسکول قائم کر رکھے ہیں اگرچہ اُن کا اصلی مقصد وہاں فوت ہو جاتا ہے یعنی وہ اپنے بچّوں کے لئے ماما، کھلائی، نرسری گورنیس (Nursery Governess) وغیرہ رکھ لیتے ہیں کیونکہ وہ اُن کی تنخواہ ادا کر سکتے ہیں۔ جب ملکہ معظّمہ نے اپنی بیٹیوں کے لئے نرسیں ملازم رکھیں تو کسی کو اعتراض کی جرأت نہ ہوئی لیکن سب ہی آدمی تو مالی اعتبار سے اِس قدر صاحبِ مقدرت نہیں ہوتے۔ کہ وہ اپنے بچّوں کے لئے نرسوں کا پورا اسٹاف ملازم رکھ سکیں۔ اس لئے اگر کوئی ماں اپنے چھوٹے بچّے کو دن میں چند گھنٹوں کے لئے کسی ایسے سکول میں بھیج دے جہاں اُس کی خبر گیری کے لئے ایک دوسری ماں موجود ہے تو کیا ہرج ہے۔ ماں کو اتنی فرصت مل جائے گی کہ وہ اپنے چند دیگر فرائض سے سبکدوش ہو جائے، پبلک کی کچھ خدمت کر سکے کیونکہ ہر عورت کے ماں ہونے کے علاوہ چند دیگر فرائض بحیثیت ایک شہری کے بھی ہوتے ہیں۔ اُن کو پُورا کرنے کے لئے اُس کو وقت اور جسمانی قوت ملنی چاہیئے۔ ایک خاتون جس کو گھر کا تمام کام کاج کرنا پڑتا ہے، کھانا پکانا پڑتا ہے، کپڑے دھونا پڑتے ہیں، بازار سے سودا سلف بھی لانا پڑتا ہے۔ (کیونکہ انگلستان کی عورتیں ہماری خواتین کی طرح نہیں ہوتی ہیں) اُس سے کس طرح یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے بچّہ کی دیکھ بھال بھی صحیح طور پر کر سکے پس اگر وہ اُس بچّہ کو دن میں چند گھنٹوں کے لئے کسی ایسے سکول میں بھیج دے جہاں استانیوں کا ماہر اسٹاف صرف ایسی خدمت کے لئے مامور ہے۔ تو اُس میں کیا ہرج ہے؟ بچّے کے لئے وہ سکول بہتر

ہے یا بازار کی گردش جب کہ ساتھ ساتھ اُس کی ماں ایک دوکان سے دوسری دوکان کی طرف دوڑ رہی ہو؟

کوئی ماں بھی جس کو گھر کا پورا کام کرنا پڑتا ہے، اپنے بچّہ پر پوری توجہ مبذول نہیں کرسکتی اُس کی قوت اور توجہ دونوں ہی منقسم رہتی ہیں اور وہ کوئی کام بھی پورے انہماک کے ساتھ نہیں کرپاتی ہے۔ نہ بچّہ کی دیکھ بھال ہی اور نہ ہی گھر کا کام کاج۔ شام کو ماں اکثر اپنے بچّہ کو اپنے ساتھ کھیلنے کا موقعہ دیتی ہے لیکن دن بھر کام کاج کرنے کے بعد ایسی ماں میں اتنی سکت کہاں باقی رہتی ہے کہ وہ بچّہ کے ساتھ کھیل بھی سکے بعض اوقات تو اُس کا یہ بھی جی نہیں چاہتا کہ وہ شام کو اپنے خاوند سے ہی گفتگو کرسکے۔ میں ہرگز اس کے خلاف نہیں ہوں کہ عورتوں کو گھر کا کام کاج انجام نہیں دینا چاہیئے لیکن اُن کو اتنی فرصت ضرور ملنی چاہیئے کہ وہ صحت اور خوردونوش کے علاوہ دیگر فرائض کی طرف دیکھ سکیں۔ نرسری اسکول اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ بچّے تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ ہوئے تو عورت کو اتنا موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ گھر کا کام کاج اطمینان اور تیزی سے کر ڈالے۔ شام کو جب شوہر اور بچّے واپس آتے ہیں۔ تو اُس میں اتنی تاب و تواں باقی ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے دیگر مسائل پر کچھ گفتگو اور اظہارِ خیال کرسکے۔

یہ تو رہا نرسری اسکولوں کی ضرورت اور اہمیت کا ذکر اور اُن آسانیوں کی تفصیل جو وہ بچّوں کی ماؤں کے لئے مہیّا کرتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ بچّوں کو کیا فائدہ پہنچاتے ہیں؟

سب والدین اس بات کو جانتے ہیں کہ قبل اس کے کہ بچّہ چھ سات سال کی عمر تک پہنچے اور ضروری تعلیم کے لئے کسی اسکول میں جائے، اُس کو یہ آرزو رہتی ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے ساتھیوں کے ساتھ کھیلے کودے۔ اپنی ماں کی باتوں اور اُس کی تعلیم سے وہ کبھی کبھی اکتا جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی اور شغل میں لگے۔ اس میں تجسّس ہوتا ہے طبیعت میں

"کیوں" اور "کیا" بسا ہوتا ہے۔ وہ ہر نئی بات کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کا تجسس دن میں اور بھی بڑھ جاتا ہے جب کہ اُس کی ماں کام دھندے میں لگی ہوتی ہے اور وہ بیکار رہتا ہے۔ بیکاری کی وجہ سے بچّے بدمزاج ہو جاتے ہیں اور تھکے تھکے معلوم ہوتے ہیں۔ نرسری اسکول میں بچّے کو وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی اُسے ضرورت ہے۔ اُس کو ہم عمر ساتھی ملتے ہیں۔ ایسے ایسے نئے مشاغل ملتے ہیں جو اُس کے جسم اور دماغ کی نشوونما میں مدد ثابت ہوتے ہیں۔ اُس کو وہاں ایسے اساتذہ ملتے ہیں۔ جن کا فرض ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اُس سے گفتگو کریں اور اُس کی امداد کریں۔ نرسری اسکول میں ہر قسم کا کام کرنے کے لئے جگہ بھی کافی ہوتی ہے خواہ بچّہ دوڑے، کھیلے کودے یا کوئی اور کام کرے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ بچّوں کو کھیلنے کودنے کے لئے کافی جگہ مہیا کی جائے۔ چھوٹے بچّوں کو بڑے بچّوں کی بہ نسبت زیادہ جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُن کے دماغ اور جسم کی نشوونما کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اتنے دوڑیں کہ تھک جائیں، کُودیں۔ اُونچے مقامات پر چڑھیں اور جتنا جی چاہے اُتنا چیخیں۔

بڑے ہو جانے پر ہم کو آپ کو اپنے وطن کے (اگر وہ دیہات تھے) وہ کھُلے میدان اور فراخ گھر یاد آتے ہیں جن میں ہم پلے بڑھے، جہاں ہم کودتے پھرتے تھے، دوڑتے تھے طرح طرح کے کھیل کھیلتے تھے۔ وطن کی گلیوں کے ایک ایک ذرّہ سے ایک نہ ایک یاد وابستہ ہوتی ہے۔ بچّوں کی بالکل یہی تمنّا ہوتی ہے کہ وہ بہت سے ایک جگہ ہوں، ایک باغ ہو جس میں دوڑنے کے لئے کافی جگہ موجود ہو، درختوں کے درمیان چھپنے کے لئے کافی جگہ موجود ہو، جھاڑیاں ہوں اور درختوں کا گھنا سایہ ہو، پھول ہوں اور پھل بھی موجود ہوں، ایسے درخت ہوں جن پر آسانی سے چڑھا جا سکے، بڑا سا مکان رہنے کے لئے موجود ہو جس میں اتنی جگہ ہو جہاں وہ اپنی حسبِ پسند اپنے گھروندے بنا سکیں، ایسے گوشے تلاش کر سکیں جہاں وہ اپنا "خزانہ" چھپا سکیں، کھانے کے لئے دل پسند چیزیں موجود ہوں اور شور مچانے کا اتنا موقعہ میسّر ہو کہ بڑے لوگ اُن کو تنبیہ نہ کر سکیں۔ گھر اور باغ کے علاوہ کھُلے میدان بھی ہوں جہاں

گھومنے پھرنے کے لئے کوئی حد مقرر نہ ہو۔ جب بچے ذرا بڑے ہوتے ہیں تو اُن کو شکار کا شوق چرّاتا ہے۔ چڑیوں کے گھونسلوں اور اُن کے انڈوں کی تلاش کی فکر دامن گیر ہوتی ہے بعض بچے اپنے کتّے کے ساتھ غلیل گلے میں ڈالے یا ہاتھ میں ہوائی بندوق لئے گھر سے باہر نکلتے ہیں اور میلوں کھلے میدانوں میں نکل جاتے ہیں۔ شہروں میں رہنے والے آج کتنے خاندان ہیں جو اپنے بچوں کے لئے خوشی کے ایسے لمحات مہیّا کر سکتے ہیں؟ گھر کے صحن کا سوال تو بعد میں آتا ہے اوّل تو گھر ہی نہیں ملتا۔ ہم اِس میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا گھر چھوٹا سا کٹورے کی مانند ہے جس میں بیکار جگہ بالکل نہیں۔ چھوٹے سے مکان میں بچے تھوڑا سا بھی شور کرتے ہیں تو سخت ناگوار گذرتا ہے۔ بچے اور بزرگ اکثر ایک ہی کمرہ میں گھُسے رہتے ہیں۔ بزرگوں کو بچوں کے شور اور اُن کی بے معنی باتوں سے چھٹکارا نہیں ملتا اور بچوں کو ہر وقت بزرگوں کی تنبیہ اور جھاڑ پھٹکار کا خوف لگا رہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں فریق گھبرائے گھبرائے رہتے ہیں اور آخر کار بدمزاج ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی گھر میں کوئی باغیچہ بھی ہو تو بچوں کو وہاں جانے نہیں دیا جاتا۔ مبادا وہ پھولوں اور پھلوں کا ستیاناس کر دیں علاوہ ازیں باغیچہ میں گیند بھی تو نہیں کھیلی جا سکتی۔ دوڑا نہیں جا سکتا، کودا پھاندا نہیں جا سکتا۔ اِن کھیلوں کے لئے بچہ جو جگہ تلاش کرتا ہے وہ سڑک ہے! اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پانچ چار سال کے بچے اگر سڑک پر کھیلیں گے۔ تو کیا انجام ہوگا۔

نرسری اسکول کو گھر اور باغیچہ کا ایک مجموعہ سمجھئے۔ رہنے کے لئے نہیں بلکہ کھیلنے کے لئے جس کو بچہ اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اِن اسکولوں میں بچوں کے لئے وہ تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں جو اِس بُرے زمانے میں بہت کم والدین اپنے گھروں میں مہیّا کر سکتے ہیں۔ ایک بڑا باغ جس میں کھیلنے کے لئے ضرورت سے زیادہ جگہ موجود ہوتی ہے، ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن پر چڑھا جا سکے، جن پر سے کودا جا سکے، جن پر اپنے بدن کو تولا جا سکے اور توازن کا سبق سیکھا جا سکے، جن پر سے پھسلا جا سکے وغیرہ۔ اُن کے اپنے کھیلنے کے لئے بڑا سا کمرہ موجود ہوتا

ہے۔ کھلونوں اور کھیلنے کے سامان کے لئے جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ تمام چیزیں حتّٰی کہ فرنیچر بھی ایسے سائز کا ہوتا ہے جو بچوں کے لئے موزوں ترین ہو۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو بچوں کے چھونے کے لئے ممنوع ہو یا جس کو چھیڑنے سے بزرگوں کی طرف سے سزا کا خطرہ ہو اس طرح بچوں کو روزانہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیلنے کا موقعہ ملتا ہے۔

آیئے نرسری اسکول کے اندر چلیں اور وہاں ایک دن گذاریں۔ وہاں ہر ایک چیز اس مقصد کے لئے رکھی گئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے جسم اور دماغ کی بہترین نشو ونما ہو سکے۔ اِس کے حصول کے لئے وہاں ایسے اساتذہ متعین ہوتے ہیں جن کو بچوں کی اصلی ضروریات سمجھنے کی ٹریننگ دی گئی ہے۔ سکول صبح آٹھ یا نو بجے کھُلتا ہے۔ جیسے ہی بچّے آتے ہیں۔ اسکول کا اسٹاف اُن کو خوش آمدید کہتا ہے اور پینے کے لئے کوئی گرم گرم چیز پیش کرتا ہے۔ بچّے اپنے اپنے کوٹ اُتارتے ہیں کیلیں اتنی نیچے گڑی ہوتی ہیں کہ وہ اپنے آپ آسانی سے اپنے کوٹ اُن پر ٹانگ دیتے ہیں اور کھیلنے کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں اپنے دوستوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ کھیلنے کے کمرہ میں فرنچ کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ جو باغیچہ کی طرف کھُلتی ہیں۔ تاکہ بچّے بلا تکلف اِدھر اُدھر بھاگ سکیں اور کھیلنے کے لئے کمرہ اور باغیچہ دونوں کو استعمال کر سکیں۔ کھیلنے کی چیزوں میں وہ تمام اشیا شامل ہوتی ہیں جن کو چھوٹے بچّے پسند کرتے ہیں مثلاً مٹّی اور ریت کھودنے کے لئے اور گھروندے بنانے کے لئے پانی۔ وہاں ایسی چیزیں بھی موجود ہوتی ہیں جو بچّوں کی قوتِ تخلیق میں اضافہ کریں۔ مثلاً چکنی مٹّی تاکہ بچّے طرح طرح کے نمونے بنائیں اور اُن میں اختراع کی صلاحیت پیدا ہو۔ پینٹ اور رنگ موجود ہوتے ہیں، قینچی اور کاغذ ہوتا ہے، کیلیں ہوتی ہیں، ہلکی ہتوڑیاں ہوتی ہیں اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی موجود ہوتے ہیں۔ گڑیاں ہوتی ہیں۔ گڑیوں کے لئے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں ہوتی ہیں، چائے کے سیٹ ہوتے ہیں، پکانے کے برتن ہوتے ہیں، برش ہوتے ہیں، پلیٹیں ہوتے ہیں اور گرد وغیرہ صاف کرنے کے لئے

کپڑے بھی موجود رہتے ہیں۔ کمرہ سے باہر کھیل کود کا ضروری سامان موجود ہوتا ہے جو بچوں کو بھاگنے دوڑنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ جھولے ہوتے ہیں۔ رسیاں اور گیندیں ہوتی ہیں۔ چڑھنے اور کودنے کے لئے مناسب چیزیں ہوتی ہیں اور کھینچنے کے لئے ہلکی پھلکی گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔

بعض اوقات بچوں کی اُستانیاں اُن کو کہانیاں سُناتی ہیں، گیت سُناتی ہیں۔ اور بچے کھیل کود کی چیزوں کو چھوڑ کر اُن کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات بچوں کو کھیل سے ہٹا کر آس پاس کے دلچسپ مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ کسی کھیت کی سیر ہوتی ہے، کسی نئی عمارت کو دیکھنے کے لئے نکلتے ہیں یا دریا پر کشتیوں کی آمد و رفت کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچے اپنے گرد و پیش کے ماحول میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں اور اُن کے اساتذہ کو مستقل طور سے یہ خیال رہتا ہے کہ اُن کو ایک کمرہ میں بند نہ رکھا جائے۔ بلکہ چاروں طرف کی سیر کرائی جائے۔ اور ادھر اُدھر دیکھنے، سوچنے سمجھنے کا موقعہ دیا جائے۔

جب صبح کے کھیل ختم ہو جاتے ہیں تو بچے اپنے کھیلنے کی چیزوں کو قرینہ سے اُن کی جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ بچے غسل خانوں کی طرف دوڑتے ہیں جہاں نیچی میزوں پر اُن کے لئے ایک ایک برتن موجود ہوتا ہے اور ایک ایک تولیہ الگ ٹنگا رہتا ہے۔ وہ مُنہ ہاتھ دھوتے ہیں، اپنے بال درست کرتے ہیں اور کھانے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔

نرسری اسکول بچوں کو صفائی کی تعلیم دیتے ہیں جو اچھے گھروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہر ایک بچہ کا اپنا ایک تولیہ ہوتا ہے۔ مُنہ کو صاف کرنے کے لئے فلالین کا ایک ٹکڑا علیحدہ ہوتا ہے اور اپنا اپنا کنگھا بھی علیحدہ ہوتا ہے۔ بچے اپنی چیز کو اُن تصویروں سے پہچانتے ہیں جو اُن کے اساتذہ اُن اشیا پر لگا دیتے ہیں۔ ہر بچہ کے لئے جداگانہ قسم کی تصویر۔ تولئے اور رومال وغیرہ نیچی کیلوں پر ٹانگے جاتے ہیں تاکہ بچے اُن کو آسانی سے اُتار سکیں اور پھر واپس ٹانگ دیں

وہاں بچّوں کو اپنی مدد آپ کرنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ حوائجِ ضروریہ سے خود فراغت حاصل کرتے ہیں۔ اپنے بالوں میں خود کنگھی کرتے ہیں۔ جب ضرورت ہوتی ہے خود ہی مُنہ ہاتھ دھو لیتے ہیں۔ اور اپنے غسل خانہ کو صاف رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر بچّوں کو اپنا کام خود کرنے کی آزادی دی جائے تو وہ صفائی کی عادت سیکھ جاتے ہیں حتّٰی کہ چار سال کی عمر تک اُن میں ضروری سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے۔

دوپہر کا کھانا دلچسپی کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ میز پر خوبصورت میز پوش اور اُن پر پھُول سجے ہوتے ہیں۔ بچّوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور کھانے سے اپنے حصّہ کا انتظار کرنے میں اُن کو لطف آتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن بچّوں کو گھر پر اچھی یا کافی غذا نہیں ملتی وہ نرسری اسکول میں اچھی طرح کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد بچّوں کو ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام کے لئے دیا جاتا ہے۔ اِس مقصد کے لئے نیچے آرام دہ بستر موجود ہوتے ہیں تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ پانچ سال سے کم عُمر کے بچّوں کے لئے دوپہر کے وقت آرام کرنا صحت پر بڑا اچھا اثر ڈالتا ہے۔ تندرست بچّہ کھیلتے وقت کافی قوّت صرف کرتا ہے لیکن دوپہر کے آرام کے بعد وہ سہ پہر کی کھیل کُود کے لئے پھر سے تیار ہو جاتا ہے۔ اتنے وقت کا آرام رات کی نیند پر کوئی بُرا اثر نہیں ڈالتا ہے بلکہ تھکن کو دُور کرتا ہے اور معدہ کا نظام درست رکھتا ہے۔

چار بجے نرسری جماعت کے بچّے اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ کچھ اسکول ایسے ہیں جو بچّوں کو سہ پہر کی چائے پلانے کے بعد پانچ بجے اُن کے گھروں کو واپس کرتے ہیں۔

بچّوں کو نرسری اسکول بھیجنے کے سلسلہ میں والدین پر بھی ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسکول بھیجنے سے قبل اُن کو یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ اُس اسکول میں باقاعدہ سند یافتہ اسٹاف موجود ہے یا نہیں؟ وہاں بچّہ کے کھیلنے کے لئے ضروری سامان موجود ہے یا نہیں تاکہ وہ مشغول رہ سکے؟ اُس کو سکول سے باہر بھی کچھ وقت گذارنے کا موقعہ دیا جائے گا یا نہیں؟ نہانے

دھونے اور کھانے پینے کا معقول انتظام ہے یا نہیں؟ اسکول کا محل وقوع کیسا ہے؟
علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ بچّہ اسکول میں زیادہ دیر تک تو نہیں رہے گا؟ بعض اسکول ان شرائط کو پورا نہیں کرتے ہیں اور بلا استثنٰی یہ کہنا کہ نرسری اسکول ہمیشہ گھروں سے بہتر رہتے ہیں، درست نہیں معلوم ہوتا۔ انگلستان میں جنگ کے دوران میں نرسری اسکول دس۔گیارہ بلکہ بارہ گھنٹے تک کھلے رہتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچّے حتّٰی کہ شیر خوار اطفال صبح ہونے سے قبل ہی ماؤں کی آغوش سے علیحدہ کر لئے جاتے ہیں۔ کیونکہ عورتیں کام پر جاتی تھیں۔ ان بچّوں کو دن چھپ جانے کے بعد اُن کے گھروں کو واپس کیا جاتا تھا۔ اس اثنا میں وہ اتنا تھک جاتے تھے کہ راستہ ہی میں سو جاتے تھے۔ نہ ماں کو ہی اتنا وقت ملتا تھا کہ وہ بچّے سے باتیں کر سکے اور نہ بچّہ ہی کو شفقتِ مادری سے بہرہ مند ہونے کا موقعہ ملتا تھا ہفتہ کے اختتام پر ایک دوسرے کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی تھی لیکن اُس وقت ماں کو اور بہت سے ضروری کام کرنا ہوتے تھے مثلاً بازار سے خریداری، کپڑوں کی دیکھ بھال وغیرہ۔ کسی ملک کے لئے اس قسم کا پروگرام دورانِ جنگ میں تو جائز سمجھا جا سکتا ہے لیکن زمانۂ امن میں اس کو کسی طرح بھی قابلِ تسلیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بچّہ کو اپنی ماں کی ہر روز ضرورت ہے صرف اتوار کے دن ہی نہیں! نرسری اسکولوں میں بچّوں کو صرف اتنا وقت گذارنے کا موقعہ دینا چاہیئے۔ کہ اُن کے والدین اپنے ضروری فرائض سے سبکدوش ہو سکیں۔ سونے سے قبل بچّہ کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے والدین کی صورت دیکھ سکے اور اُن کی محبت سے لطف اندوز ہو سکے اس کا مطلب یہ ہوا کہ شام کو پانچ بجے تک بچّہ کو اپنے گھر واپس آجانا چاہیئے۔

اوقات کے علاوہ نرسری اسکول کا نظام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بُرے نرسری اسکول سے یہ کہیں بہتر ہے کہ بچّہ اپنے گھر پر ہی وقت گذارے۔ اگر اچھی باتیں نہ سیکھ سکے گا تو کم از کم بُری باتوں سے تو محفوظ رہے گا۔ اچھے اسکول سے میرا منشاء یہ ہے کہ وہاں اس قسم کی نرسیں اور اُستانیاں موجود ہوں کہ بچّوں کو اپنی ماں سے جُدا ہونا محسوس نہ ہو سکے۔ وہ

بچوں کے لئے ایسے حالات پیدا کریں کہ اُن کی ذہنی و جسمانی نشوونما صحیح طریق پر ہو سکے ماہرین نفسیات آپ کو بتا سکتے ہیں کہ بعض اوقات بے وقت کی امداد ہماری آئندہ زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے بعض آدمی بچوں سے محبت تو بہت کرتے ہیں لیکن اُن کو صحیح طور پر پرکھنا نہیں جانتے، صحیح موقعہ پر اُن کی مدد نہیں کرپاتے۔ نرسری اسکول کا محل وقوع مناسب ہونا چاہیئے، اُس علاقہ کی آب وہوا صحت بخش ہونی چاہیئے، اُس کا ساز و سامان درست اور کافی ہونا چاہیئے اور اُس میں ایسا اسٹاف موجود ہونا چاہیئے جو یہ جان سکے کہ بچوں کی صحیح ضروریات کیا ہیں۔

حکومتِ پاکستان بچوں کی تعلیم میں کافی دلچسپی لے رہی ہے چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں بلوچستان میں پرائمری اسکولوں کی تعداد دوگنی ہوگئی ہے۔ صوبۂ سرحد کی حکومت نے اساتذہ کی حالت کی طرف توجہ مبذول کی ہے، اُن کی تنخواہیں بڑھائی ہیں اور کالجوں کی حالت بہتر بنانے کی فکر کی جارہی ہے لیکن ابھی تک ہمیں اتنی فرصت نہیں ملی کہ ہم پرائمری اسکولوں سے نیچے کی فکر کرسکیں یعنی ایسے بچوں کی تعلیم کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہے جن کی عمر چھ سال سے کم ہوتی ہے۔ لاہور جیسے شہر میں بڑے بچوں ہی کو کھیلنے کے لئے جگہ نہیں ملتی چھوٹے بچوں کو کہاں بھیجا جائے؟ ذرا ماں کی آنکھ بچی اور ننھے گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئے جہاں ٹریفک کے لئے وہ وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ اور ٹریفک اُن کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ لاہور کی سڑکوں پر اور گلیوں میں سائیکل سے بچوں کا ٹکرانا ایک عام بات ہوکر رہ گیا ہے بعض آدمی تو اس کی پرواہ تک نہیں کرتے اور دھول جھاڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہماری حکومت کو چاہیئے کہ تین سے پانچ چھ سال کی عمر تک کے بچوں کے لئے نرسری اسکول قائم کرے۔ ماہرین نفسیات کے نزدیک بچے کے بننے بگڑنے کا یہی زمانہ ہوتا ہے

کہ اس کو تجسس کا موقعہ دیا جائے، سوچنے سمجھنے کے لئے مناسب ماحول پیدا کیا جائے تو اس کی ذہنی نشوونما میں مدد ملتی ہے۔ شروع ہی سے اگر یہ دیکھا جائے کہ اُس کا رجحان کس طرف ہے، پڑھنے لکھنے کی طرف یا صنعت کی طرف۔ اور پھر اُس کو اُس کے رجحانِ طبع کے مطابق تعلیم دی جائے۔ تو وہ آئندہ زندگی میں ایک کامیاب انسان ثابت ہوگا۔ ہمارے ملک میں یہ تو دیکھا ہی نہیں جاتا کہ بچہ کس طرف جا رہا ہے اُس کا دل کس کام میں لگتا ہے؛ بلکہ اُس کو اُس علم کی تعلیم دی جاتی ہے جس کے پیسے بازار میں اچھے اُٹھتے ہیں مثلاً آج کل سائنس پڑھنے کی وبا زوروں پر ہے۔ بعض بچوں کا دماغ ریاضیات، طبیعیات اور کیمیا کو بالکل قبول نہیں کرتا لیکن بیچارے پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ والدین کا تقاضا ایسا ہے، زمانہ کا تقاضا ایسا ہے۔ سارے سال محنت کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ تو طوطے کی طرح رٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹیوشن رکھتے ہیں۔ خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اُن میں پیدا نہیں ہوتی۔ اور جو تھوڑی بہت موجود ہوتی ہے وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ ہزار مصیبتوں کے بعد امتحان میں بیٹھتے ہیں اور بمشکل تمام تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوتے ہیں یا فیل ہو جاتے ہیں۔ اِس طرح سائنس پڑھنے سے کیا فائدہ ہے؟ انجنیئر اور ڈاکٹر بننے کی ہوس میں نہ تو وہ سائنس ہی پڑھ پاتے ہیں اور نہ آرٹ ہی۔ ضروری نہیں کہ ایسے لڑکے جو سائنس میں دلچسپی نہیں رکھتے ہیں آرٹ بھی شوق سے نہ پڑھ سکیں۔ میرے مشاہدہ میں ایسے طلبا آئے ہیں جو کلاس میں سائنس پڑھتے ہیں اور گھر پر دیوانِ غالب۔ بہت سے لڑکوں کو آرٹ سے دلچسپی ہوتی ہے لیکن وہ تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے۔ آرٹ کے لئے بھی میدان موجود ہے بشرطیکہ آپ اُس میں ترقی کریں اسی طرح بعض طلبا سائنس پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُن کا دماغ ریاضیات میں بھی خوب کام کرتا ہے۔ لیکن صحیح ہدایت نہ ہونے کی وجہ سے وہ آرٹ میں پھنس جاتے ہیں۔ اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد صرف ایک کلرک بن پاتے ہیں۔

اِن کے علاوہ ہمارے شہروں، قصبات اور دیہاتوں میں بہت سے بچّے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو قدرت کی طرف سے ذہانت کے اعلیٰ مدارج عطا ہوتے ہیں لیکن مفلسی، ناداری اور نامساعد حالات اُن کو پڑھنے لکھنے سے باز رکھتے ہیں۔ بہت سے دیہاتی صرف اِس وجہ سے ترقّی نہیں کر پاتے ہیں۔ کہ اُن کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ وہ کالجوں کی تعلیم سے استفادہ کر پاتے۔ بہت سے بچّے اِس لئے محنت و مزدوری کرنے پر مجبور کئے جاتے ہیں کہ اُن کے باپ کے پاس اِتنا روپیہ نہیں ہے کہ وہ اُن کو اسکولوں میں داخل کر سکے سے

وہ فردوسی ہیں یہ جن کی زبان کھلنے نہیں پائی
وہ رستم ہیں نہیں سہراب کا خوں جن کی گردن پر

برخلاف اس کے ہمارے اُمراء کے بچّے اکثر کند ذہن ہوتے ہیں اور علم حاصل کرنے کی صلاحیت سے قطعی بے بہرہ، لیکن اُن کے پڑھانے کے لئے اعلیٰ انتظامات کئے جاتے ہیں۔ سب کچھ ہونے پر بھی وہ نہیں پڑھتے۔ دنیا کا یہ زیر و بم آخر کب تک چلے گا؟ بچّوں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ اُن کو اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا پورا حق پہنچتا ہے اور اُن کو اِس کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ چھوٹے چھوٹے بچّوں کے لئے ایسے اسکول قائم کرے جہاں اُن کے رجحانِ طبع کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ اور جس کام میں وہ دلچسپی لیتے ہیں، اُسی کی تعلیم کا انتظام اُن کے لئے مکمل کیا جائے تاکہ وہ آئندہ چل کر اچھے شہری بنیں اور ملک و قوم کے لئے مایۂ ناز افراد!

کھیل کی ضرورت

محمدؐ مظفر الدین

کھیل اور تماشے کا وجود اور اس طرف لوگوں کی عام رغبت ہی اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ ہر انسان کھیل کی کسی نہ کسی شق سے ضرور دلچسپی رکھتا ہے اور یہ بات صرف انسان تک ہی محدود نہیں بلکہ صحیح معنوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ ہر جاندار کی جبلت میں کھیل کے لئے کشش موجود ہے۔ بلی کے بچوں کا گیند یا کسی اور چیز کے پیچھے دوڑنا۔ کتے کے پلوں کا ایک دوسرے سے تعاقب کرنا۔ گائے کے بچھڑے اور گھوڑی کے بچھیرے کا اِدھر اُدھر کلیلیں کرتے پھرنا۔ مرغی کے بچوں کا اُچھلنا۔ کودنا۔ اور ایک دوسرے سے لڑنا۔ انسان کے بچوں کا عالم شیر خوارگی میں ہاتھ پاؤں مارنا اس بات پر دال ہے کہ کھیل سے سب جاندار دلچسپی لیتے ہیں۔ حیوان ناطق (انسان) چونکہ زیورِ علم و عقل سے مزین ہے اِس لئے اس کے کھیل دیگر حیوانات کی نسبت زیادہ سُلجھے ہوئے، باقاعدہ اور با اصول ہوتے ہیں۔

بچے کے لئے کھیلنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہ حقیقت میں اُس کی زندگی ہے اور اس کی تمام کائنات کھیل پہ مشتمل ہے۔ کھیل کے نفسیاتی اور تعلیمی فوائد کی تفصیل حسب ذیل

-۲-

(۱) کھیل کا میلان صانع حقیقی نے انسان اور حیوان کی فطرت میں رکھ دیا ہے۔ اگر کسی وجہ سے کوئی بچّہ اپنے فطری میلان کو پورا نہ کر سکے تو یہ کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً اگر شرارت سے باز رکھنے کے لئے کسی بچّے کو کسی ایسے کمرہ میں بند کر دیں جس میں اسے مشغول رکھنے کی کوئی چیز نہ ہو تو وہ زمین پر ہی پاؤں مارنا، قلابازیاں کھانا یا چیخنا چلّانا شروع کر دیتا ہے۔ بچّے کی کھیلنے کی قدرتی خواہش کا اندازہ اس وقت بخوبی کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ کھیل میں پوری طرح محو ہو۔ اس وقت اس کی محویت گھوڑے، گاڑی، اونٹ، ٹانگے اور موٹر وغیرہ کی آمد سے بھی متاثر نہیں ہوتی۔

(۲) کھیل میں بچّے کی فطری رغبتوں کو پورا ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ اگر انہیں کھیلنے کی مہلت نہ دی جائے تو ان کی قدرتی تحریکات جو ان کے دل میں ہوتی ہیں اپنا رخ شرارت کی جانب کر لیتی ہیں اور وہ بڑے ہو کر جرائم یا دیگر ناپسندیدہ افعال کا ارتکاب کرنے لگ جاتے ہیں۔

(۳) کھیل سے صحت اچھی ہوتی ہے۔ مختلف اعضاء کی ورزش ہوتی ہے۔ جسم اچھا ہونے سے دماغ بھی اچھا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ انگریزی میں مثل مشہور ہے "A sound mind in a sound body."

(۴) کھیل سے تھکان خواہ دماغی ہو یا جسمانی دُور ہو جاتی ہے کیونکہ خیالات ایک طرف سے دوسری طرف منعطف ہو جاتے ہیں۔

(۵) کھیل بچّے کی آئندہ زندگی کے لئے ٹریننگ اور تیاری ہوتی ہے۔ جو بچّہ اپنے بچپن میں نہیں کھیلتا وہ ذہنی اور جسمانی ارتقا کے لحاظ سے ادھورا رہتا ہے۔ جو لوگ بچپن میں جی کھول کر کھیلوں میں حصّہ لیتے ہیں وہ آئندہ زندگی میں نمایاں

کامیابی حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور حالات مساعد و موافق ہوں تو اپنے ہمعصروں پر فوقیت لے جاتے ہیں۔

(۶) مختلف کھیلوں میں حصّہ لینے سے بچّوں کو کھیل ہی کھیل میں تمدّن و معاشرت کے ضروری مسائل کا علم غیر شعوری طور پر ہوتا رہتا ہے۔ نیز ان کی اخلاقی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً باہم مل جُل کر رہنا۔ ایک دوسرے کی معاونت کرنا۔ ٹیم سپرٹ سے کام کرنا۔ دوسروں کی حق تلفی نہ کرنا۔ خود ضبطی۔ خود اعتمادی۔ دیانتداری تحریک عمل۔ شکست کا خندہ پیشانی سے اعتراف اور اس کی برداشت۔ فتح میں مغرور نہ ہونے کی عادت وغیرہ کی قسم کے اعلیٰ خصائل ان میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ انگلستان میں آئندہ حاکموں کو پچاس فی صدی سے زیادہ تعلیم کھیل کے میدانوں میں ہی ملتی ہے چنانچہ جنرل ولنگٹن نے کہا تھا کہ واٹرلو کے مقام پر جو جنگ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہوئی تھی اور جس میں انگریزوں کو فتح اور فرانسیسیوں کے شہنشاہ نپولین کو شکست فاش ہوئی تھی وہ در اصل ایٹن (Eton) کے پبلک اسکول کے کھیل کے میدان میں جیتی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو طالب علم اس زمانہ میں کرکٹ اور فٹ بال وغیرہ کے کھلاڑی تھے۔ وہ اس جنگ میں مختلف فوجی عہدوں پر فائز المرام ہو کر اپنے حریفوں کے مقابلہ میں کامیابی سے لڑے اور جو اوصاف میدانِ جنگ میں کامیابی کے لئے ضروری ہیں ان کی بنیاد اور تربیت ایٹن کے کھیل کے میدان میں ہوئی تھی۔

(۷) کھیل میں بچّے زندگی کے مختلف امور و مدارج سے آگاہ ہوتے ہیں اور اِس ذریعہ سے ان کی خوابیدہ طاقتیں بیدار ہوتی ہیں۔ نیز ان کے رجحانِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً جو لڑکے کھیل میں لیڈر رہیں۔ ان کا آئندہ زندگی میں بھی لیڈر بن جانا عین ممکن ہے۔ ایک مغربی دانا جوزف ——— لی

(Joseph Lee) کہتا ہے کہ اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ بچہ کیسا ہے تو اس کے کھیل کا مطالعہ کرو۔ اگر اس کو کسی خاص طرز کا بنانا چاہو تو اس کے کھیل اس طرز کے کرو۔

(۸) کھیل کے ذریعہ بعض بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک ماہرِ نفسیات مس لوون فیلڈ (Miss Lowen Field) نے جو ولائیت میں بچوں کے نفسیات کے ادارہ کی ناظمِ اعلیٰ ہے۔ اس غرض کے لئے ایک تجربہ گاہ بنائی ہے جس میں مختلف اقسام کے کھیل کا سامان پڑا رہتا ہے۔ بچے اس سامان سے کھیلتے ہیں اور وہ ان کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر کے ان کی بیماریوں کی تشخیص کر لیتی ہے اور ان کا علاج کرتی ہے۔

(۹) کھیل سے طبیعت میں انبساط پیدا ہوتا ہے جو نظامِ زندگی کو بحال رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ بچوں میں پیدائش کے وقت سے جذبات مسرت والم موجود ہوتے ہیں۔ جذبات الم نظامِ حیات میں اختلال پیدا کر دیتے ہیں جو اکثر اوقات بیماری یا موت کا موجب بن جاتا ہے۔ لہذا اس سے احتراز لازمی ہے جو توجہ کو دوسری طرف مبذول کرنے میں ہی ممکن ہے اور بچہ کی توجہ ایک طرف سے دوسری طرف لگانے کا مؤثر ذریعہ کھیل ہی ہے۔ اس سے وہ انقباض دور ہو جائے گا۔ جو جذبات الم کی بدولت طبیعت میں پیدا ہو گیا تھا اور دشمنِ صحت تھا۔

پس انبساط اور تفریح طبع کے لئے بھی کھیل لازمی چیز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی خوشی اس قدر ہوتی ہے کہ دولت بھی اسے خرید نہیں سکتی۔

(۱۰) کھیل کے ذریعہ زندگی کے کاروبار اور تعلیم و تربیت کے ذرائع میں دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور اس سے بچوں کی توجہ کسی کام میں قائم رکھی جا سکتی ہے۔

(۱۱) کھیل سے بدن میں چستی پیدا ہوتی ہے اور سستی دور ہوتی ہے۔

کھیل صرف بچوں کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ نوجوانوں اور بڑے بوڑھوں کے لئے بھی ضروری ہے کیونکہ اس سے ان کی بھی تفریح طبع ہوتی ہے اور ان کے خیالات زندگی کے اُکتا دینے والے اور تھکا دینے والے جھمیلوں سے دوسری طرف منعطف ہوجاتے ہیں۔ اور اس سے کاروبارِ زندگی میں توازن قائم رہتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے ان کے قواء کی درزش ہوتی ہے۔

بڑے آدمیوں کے کھیل اس قسم کے ہونے چاہئیں جو اُن کے غیر استعمال شدہ قوائے فکری و عملی کو حرکت میں لائیں تاکہ اُن کے خیالات بھی دوسری طرف لگیں اور ان کا پریشان دل سکون، اطمینان اور فرحت حاصل کرے۔ لیکن بعض اوقات آدمی ایسے کھیل بھی کھیلتے ہیں جن سے ان کے وہی اعضاء حرکت کرتے ہیں جن کی روزمرّہ کے کام کاج میں عام طور پر ورزش ہوچکی ہوتی ہے۔ مثلاً کسی لوہار یا ترکھان کا والی بال کھیلنا۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے ایسے کھیل چنداں مفید نہیں ہوتے جن میں صرف دماغ ہی لڑانا پڑے بلکہ انہیں اس قسم کے کھیل کھیلنے چاہئیں جن سے ان کی توجہ معمول کے کاروبار سے کسی اور طرف لگے۔ اور جن میں اُن قواء کی تربیت ہو جن کی ورزش روزمرّہ کے کام میں نہیں ہوتی مثلاً والی بال۔ فٹ بال۔ ٹینس۔ بیڈمنٹن۔ ہاکی۔ تیرنا وغیرہ +

بچّہ اور کھلونا

شفیقی

صبح، دوپہر اور شام اپنے اپنے متعلقات سمیت ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ اور حقیقت میں یہ متعلقات کی پیدائش ہی بتاتی ہے۔ کہ اب کون سا وقت ہے۔ اسی طرح بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی کیفیات ہیں۔ ان کے متعلقات بھی پوری دیانت داری سے اپنے اپنے وقت پر آموجود رہتے ہیں قطع نظر اس سے کہ ہم تینوں کے متعلق کچھ لکھیں۔ اس وقت صرف بچپن اور اس کے متعلقات پر بحث کریں گے۔

مثل مشہور ہے۔ کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ ممکن ہے۔ کوئی اس کے لفظی معنوں پر قناعت کرلے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قوائے انسانی کے جِلا یا مکدر کا انحصار ماحول پر ہوا کرتا ہے۔ اور انسان کی پیداوار سے ہمیشہ یہی مراد ہوتی ہے۔ کہ جواہر انسانی کس حالت میں ہیں۔ اگر ماحول نے اجازت دی تو اخلاقِ فاضلہ پیدا ہوگئے۔ اور اگر اس کے خلاف واقع ہوا تو اخلاقِ رذیلہ کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ چونکہ یہ بحث اپنی جگہ پر نہایت اہم ہے اس لئے ہم احباب

کسی دوسرے وقت بحث کریں گے۔

بچہ اپنے بچپن کے متعلقات لئے ہوئے اِس دنیا میں آتا ہے۔ ادھر پیدا ہؤا۔ ادھر ماحول متعلقات سے بھرپور ہوگیا۔ اور ایک گوشت کا لوتھڑا دنیا میں کیا آیا۔ ایک نئی دنیا کی تخلیق ہوگئی۔ اب یہ اپنے بڑوں کا کھلونا ہے۔ اور بڑے بوڑھے اِس کے کھلونے۔

ماں جب بچّے کو اپنی گود میں لے کر یا پنگوڑے میں ڈال کر اس سے باتیں کرتی ہے۔ تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اِس کے سر میں عقل بھی ہے۔ زبان استعمال کرتی ہے تو بالکل بچوّں کی سی۔ توتلی توتلی باتیں کرتی ہے کبھی مُنہ کو کسی طرح بناتی ہے کبھی کسی طرح۔ بچّے کو ہاتھ لگاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان بڑے بڑے ہاتھوں اور موٹی موٹی انگلیوں میں طاقت ہی نہیں۔ بالکل کمزور ہیں۔ یوں سمجھئے کہ بچّے سے بچّہ کھیل رہا ہوتا ہے۔

باپ بننے سے پہلے جب مَیں بچوّں کو کھلونوں سے کھیلتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ تو یہ دیکھ کر کہ بچّہ اس مٹی سے بھرے ہوئے کھلونے کو بار بار مُنہ میں ڈالتا ہے۔ اُس کا روغن تک چاٹ جاتا ہے۔ اس کھلونے پر مکھیاں بھی آکر بیٹھتی ہیں۔ تو خیال کیا کرتا تھا۔ کہ بچّے کے ہاتھ میں کھلونا دینا ایک حماقت ہے۔ اس سے اس کی صحت پر مضر اثرات یقینی ہیں۔ مگر جب باپ بنا۔ اور تجربہ کیا۔ تو معلوم ہؤا۔ کہ کھلونوں کے بغیر چارہ ہی نہیں۔

حقیقت میں فطرت کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر ایک کو بچّہ ہو یا بوڑھا کھلونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے سے کمتر ایک مخلوق کے لئے مجبور ہے۔ یہی فطرت کبھی مزدور و سرمایہ دار کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے کبھی آقا اور غلام کی صورت میں۔ کہیں افسر اور ماتحت کے لباس میں۔ کہیں حاکم و محکوم کی تفریق میں۔ اور یہی اصول بچّہ کو کھلونوں کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اب بچّے کے والدین کا فرض ہے۔ کہ اس کے لئے مناسب اور معقول کھلونے مہیا کریں۔

بچّہ آنکھیں کھولنے کے ساتھ ہی اپنے ماحول کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے اور اس سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ یہ تاثرات زندگی تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ رنگدار چیزیں اور کھلونے

خاص طور پر بچہ کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ جب بھی کبھی کسی کھلونے پر شوخ رنگ دیکھتا ہے تو ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اور کھلونا لے کر اس کا اور استعمال چاہے جانے یا نہ جانے۔ اسے اپنے مُنہ میں ڈال لیتا ہے۔ اگر ماں باپ عقلمند ہوں تو وہ اسی کھلونے کے ذریعے کھیل ہی کھیل میں اسے ضروری دوائیں بھی کھلا سکتے ہیں جس سے اس کی صحت درست رہے۔ پھر چونکہ بچہ ہر نئی چیز کو اچھی طرح دیکھتا ہے۔ اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کھلونوں کے انتخاب میں مستقبل کا خیال رکھا جائے کیونکہ یہی پہلا مدرسہ ہے۔ جس سے اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ چیزوں کے نام پوچھتا ہے۔ ان کے کام سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور پھر خود ان کا تجربہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً ماں نے طوطا خرید کر بچے کے آگے رکھا۔ طوطے کا رنگ خود بخود جاذب ہوتا ہے۔ بچے نے دیکھا۔ بڑی رغبت اور شوق سے لیا۔ کبھی پروں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ کبھی دُم کو دیکھتا ہے۔ کبھی سر پر غور کرتا ہے۔ کبھی چونچ کی مڑی ہوئی نوک سے کھیلتا ہے۔ کبھی ٹانگوں اور پنجوں پر نگاہ کرتا ہے۔ اور جب اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ طوطا پروں سے اُڑتا چونچ سے کُترتا اور ٹانگوں کے بل پنجوں سے چلتا اور ٹہنیوں کو مضبوطی سے پکڑتا ہے۔ تو وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کا یہ طوطا بھی پنجوں سے ٹہنی کو پکڑے۔ چونچ سے کُترے۔ پروں سے اُڑے۔ چنانچہ کبھی تو وہ اُسے کسی چھڑی پر بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کوئی پھل یا روٹی اُس کی چونچ میں دینے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی اسے اُڑانے کی۔ غرض وہ اِس بے جان بُت سے وہی کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ جو اس نے جاندار طوطے کو کرتے دیکھا یا سُنا۔ اور یہی قدرت کی مخلوق کا مطالعہ حقیقی علم ہے۔ جو آئندہ کے لئے بچے کے علم و دانش کی بنیاد بنتا ہے۔ پس اگر اسے یہاں صحیح واقفیت مہیا ہو گئی۔ تو اس کی علمی بنیاد صحیح طور پر رکھی گئی۔ ورنہ اگر خدانخواستہ بنیاد ٹیڑھی اور غلط ہو گئی تو ع " تا ثریا مے رود دیوار کج" کا مضمون خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ اسی لئے ضروری ہے کہ بچے کو جو علم بھی دیا جائے وہ صحیح ہو۔ اور اس کو سکھانے کا ڈھنگ یہ ہے۔ کہ جو کچھ بتایا جائے وہ کہانی کی صورت میں ہو۔

اور اس کہانی کی بنیاد اور توضیح کے لئے کھلونے ہی استعمال کئے جائیں۔ کیونکہ علم النفس کے مطالعہ اور تجربہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ بچے جہاں کھلونوں کے شوقین ہوتے ہیں۔ وہاں کہانیاں بھی نہایت شوق اور رغبت سے سنتے ہیں۔ اور لبا اوقات دیکھا گیا ہے۔ کہ کسی نے کہانی شروع کی۔ بڑے سنتے سنتے سو گئے۔ مگر بچے ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ اور جب داستانگو خاموش ہوتا ہے۔ تو بچے اصرار شروع کر دیتے ہیں۔ کہ کہیئے۔

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم میں "طریقہ حکایت" نہایت کامیاب ہوتا ہے۔ اور استاد بہت جلد اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ حقائق اپنی اصلی صورت میں بچے کے سامنے پیش کئے جائیں۔ انہیں کہانی کے لباس میں پیش کرنا نہایت سود مند ہے۔ اس کا ایک یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ جب تک بچوں کو کہانی سنائی جائے۔ ایک بچہ کی آواز بھی نہیں نکلے گی۔ اور بے مثال ضبط خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ چھوٹے بچوں کے مدارس میں ضبط کا ہر جگہ فقدان ہے۔ ان مدارس میں اساتذہ اس طریقۂ تعلیم پر عمل پیرا ہو کر کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ بچہ مدرسہ میں جا کر کتاب یا قاعدہ کے حروف و الفاظ کو پڑھنا سیکھتا ہے اور اس سے پہلے کھلونوں کی صورت میں دنیا کی کتاب کے حروف و الفاظ پڑھتا ہے۔ دونوں تعلیم گاہوں کے طریقۂ تعلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بچہ گھر پر پیدائش سے لے کر پانچ برس کی عمر تک جو تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اس سے کبھی نہیں اکتاتا۔ اور مدرسہ کی چند گھنٹوں کی تعلیم اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے۔ جہاں وہ چھٹی کی گھنٹی کی آواز سنتا ہے۔ بے اختیار ہو کر خوشی سے چلا اٹھتا ہے۔ اور گھر کی طرف بھاگتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا۔ کہ گھر کے ۱۹ انیس گھنٹوں کے مقابلہ میں مدرسہ کے پانچ گھنٹے زیادہ مشکل ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ گھر پر اس کے ماحول کے متعلقات اس کے لئے چشم براہ ہوتے ہیں۔ اور مدارس میں ایسا ماحول اور اس کے متعلقات کا نام تک نہیں ہوتا۔ گھر کے معلم یعنی ماں باپ

اور دوسرے بہن بھائی بچّے کے لئے اپنے دلوں میں ایک ہمدردی اور محبت رکھتے ہیں۔ مگر مدرسہ کے معلم کے دل میں بچے سے کوئی محبت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو بچے کا اور کچھ نہیں سمجھتا۔ صرف اُستاد سمجھتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماحول اور اس کے متعلقات کے فقدان کے ساتھ ہی ساتھ اُستاد کی بے مہری اور تلخ کلامی بچّے کو مدرسہ سے بیزار کر دیتی ہے۔

جن دنوں میں پرائمری اسکول کا مدرس ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچے میرے پُرخلوص سلوک کے باعث والدین کے روکنے پر بھی چھٹی نہیں لیا کرتے تھے۔ اس کی شکایت کئی دفعہ طلبہ کے سرپرستوں نے مجھ سے کی۔ اس لئے کہ بچّے مدرسہ کو گھر سے بہتر سمجھتے تھے۔ اور میں عام طور پر سرپرستوں کی شکایت کے جواب میں یہ شعر پڑھ دیا کرتا تھا ؎

درسِ ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پائے را

ہمدردی اور محبت کا تذکرہ ماحول کے متعلقات سے متعلق ہے۔ بچّے کی تعلیم، دلچسپی، رغبت اور آسانیٔ تعلیم کے لئے جس قدر کھلونوں سے زیادہ کام لیا جائے گا تعلیم اتنی ہی آسان، مضبوط، پائدار اور دلچسپ ہوگی۔ اس سلسلے میں اگر پختہ کھلونے میسر نہ آسکیں تو اساتذہ کو چاہیئے۔ کہ اسکول میں ایسا وقت بھی مقرر کریں جس میں بچّے گندھی ہوئی مٹّی کے مختلف کھلونے بنائیں۔ کھلونوں کی تعداد۔ جانوروں کی ٹانگوں کا شمار۔ پیروں کی گنتی سے بچّے حساب کی شاہراہ پر آسانی سے گامزن ہو سکیں گے۔ ہاں اساتذہ کو اتنی احتیاط ضرور رکھنی چاہیئے۔ کہ بچّے اس کھیل میں گندہ رہنا نہ سیکھ لیں۔

غرض اس کھلونے کے لئے کھلونے ہی ماحول اور متعلقات کا صحیح تقاضا ہیں۔ لہذا گھروں اور پرائمری مدارس میں زیادہ سے زیادہ کھلونوں سے کام لینا چاہیئے۔ تاکہ بچّے کے قوٰے کی تربیت اور تعلیم صحیح طور پر آسانی سے ہو سکے۔

بچّوں کا اخلاقی ارتقا

شمسؔ بریلوی

جس طرح قدرت نے ماں باپ کو بچّوں کی جسمانی اور دماغی نشوونما کی اہم خدمت سپرد کی ہے، اسی طرح اخلاقی نشوونما کے بھی ذمہ دار ہیں اور اس سے زیادہ ذمہ داری ان اساتذہ اور معلمات کے ذمہ ہے، جن پر کامل اعتماد کر کے ماں باپ اپنے بچّوں کو ان کی تربیت میں سونپ دیتے ہیں۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ بچّہ ایک گیلی لکڑی کی طرح ہے جس طرف اس کو موڑ دو گے مُڑ جائے گی یعنی جس قسم کی ان کو تربیت دی جائے گی ویسے ہی اخلاق ان میں پیدا ہوں گے۔

اگرچہ بچّہ کی تربیت کے بارے میں بھی عام طور پر ہر ایک ماں باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا بچّہ بہترین اخلاق یا اخلاقِ فاضلہ کا مالک بن جائے لیکن —— ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ !! علی العموم یہی دیکھا جاتا ہے، غفلت کرنے والے والدین کے بچّے اپنے گھر اور مدرسہ کے ماحول سے جب نکلتے ہیں تو انسانیت کا بدترین نمونہ

بن کر نکلتے ہیں؛ اس کا باعث عام طور پر ماں کی بےجا محبت ہوتی ہے۔ ماں دیکھتی ہے کہ بچہ ایک غیر مناسب کام کر رہا ہے اور ایسے عمل میں مصروف ہے جس سے بداخلاقی کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ یا وہ کوئی ایسی شرارت کر رہا ہے جو بداخلاقی کی اصل بنا ہے۔ مگر وہ جذبہ محبت سے اس قدر مغلوب ہو جاتی ہے کہ وہ بچہ کو اس کام سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتی' وہ نہیں چاہتی کہ اس کے منع کرنے سے دل کو صدمہ پہنچائے' ایسے مواقع پر اگر کسی دوسرے شخص کی طرف سے تحریک ہو یا وہ توجہ دلائے کہ بچے کو ایسے کام سے باز رکھا جائے تو اس کا جواب صرف یہ ہوتا ہے کہ "بچہ ہے ابھی اس میں نیک و بد کی سمجھ نہیں ہے؛ جب سمجھدار ہوگا تو خود ٹھیک ہو جائے گا۔" حقیقتاً یہی وہ غلطی ہے جو والدین اور سرپرستوں کو بچہ کی بداخلاقی پر آئندہ رات دن رلاتی ہے۔ لیکن اس وقت افسوس اور ندامت بےکار ہے۔

اس وقت جب کہ بچہ کی اخلاقی تعمیر پر ہم کو ہر طرح کا اختیار ہوتا ہے اور اس کی اس وقت کی ہر نقل و حرکت اس کے اخلاق کا سنگِ بنیاد ہوتی ہے اور اس نقل و حرکت پر آئندہ اس کے کردار کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ ہم ان کی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اس وقت تو اشارہ ہی اشارہ میں ان کی اصلاح ہو سکتی ہے لیکن جب بھی شرارتیں' بداعمالیاں ان کی طبیعت ثانیہ بن جائیں گی تو ان کی اصلاح کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ خواہ اس کے لئے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔

ماں باپ بچوں کی کم سنی کی شرارتوں اور بیہودگیوں کو کسی نہ کسی جذبہ سے مغلوب ہو کر نظر انداز کر جاتے ہیں مگر آئندہ اس لاپرواہی کا رونا تمام عمر روتے ہیں اور خود بچہ کی زندگی کو بھی تباہ کر ڈالتے ہیں اور ان کی اس تباہی کا اثر انفرادی نہیں ہوتا۔ بلکہ نسلِ انسانی' سماج اور ہماری معاشرت کو بھی رفتہ رفتہ تباہی کے غار تک پہنچا دیتا ہے۔

آئے دن ہم اپنے بچوں کی ایسی باتوں کو معمولی سی بات سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں' دوسروں کے بچوں کے مقابلہ میں جا و بے جا اپنے بچوں کی حمایت کرنا' بچوں کے بہلانے کو خواہ مخواہ جھوٹ بولنا' اسی قسم کی اور بہت سی باتیں ہیں' ہم کو ایسی باتوں میں بڑا لطف آتا ہے مگر ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہماری تو تفریح ہو رہی ہے اور بچے میں بداخلاقیاں جڑ پکڑتی جا رہی ہیں۔

بچہ ماں باپ اور اس کے بعد اُستاد کی حرکات کا سچا مقلد ہوتا ہے۔ وہ ہمارے ہر ایک کام کی تقلید بڑے شوق سے کرتا ہے' ہماری بداخلاقیاں اور خوش اخلاقیاں رفتہ رفتہ اس میں اثر و نفوذ کر کے اس کے کردار اور سیرت کی تشکیل و تکمیل کرتی ہیں۔ لہٰذا بچہ کی اصلاح سے قبل خود ہم کو اپنی اصلاح کی ضرورت ہے۔ بچوں کی اخلاقی تربیت سے پہلے خود ماں باپ یا مربی کو اپنی اخلاقی حالت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ بڑے ستم کی بات ہے کہ ماں باپ تو بداخلاقی کا مجسمہ بنے ہوئے ہیں لیکن جب بچہ تقلیداً وہی حرکت کرتا ہے تو اگر ہم اس کی اصلاح کے درپے ہیں تو یہ کہتے ہوئے کہ "بچہ کا ناس ہوا جاتا ہے" ایک ظالم کی طرح بچہ کو زد و کوب کر کے اس فعل سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں یا اگر ہم کو بچہ کی اخلاقی تربیت کا احساس ہو گیا تو اپنی قوت کے بل پر طمانچوں اور بیدوں کی ضربات سے بچے کے دماغ میں ان نصائح کو ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس سے کبھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ بجز اس کے کہ بچہ ظلم و ستم سہنے کا عادی ہو جائے اور عزت نفس کا مفہوم اس طفلی اور کمسنی ہی میں اس کی نگاہوں میں کچھ نہ رہے۔

والدین اور مربی کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس طرح کی جبریہ اخلاقی تعلیم کبھی کارگر نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ سزا کے خوف سے بادل ناخواستہ ماں باپ یا مربی کے سامنے اس کو نباہتا ہے لیکن جونہی وہ اس ظلم کے پنجہ سے رہائی پاتا ہے اس کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اس جبریہ اخلاقی تعلیم کے مقابلہ میں کھلم کھلا بغاوت شروع کر دیتا ہے اس لئے

[redacted]

کہ وہ فضائل اخلاق یا اخلاقی تعلیم نہ تو اس کی طبیعت ثانیہ ہیں اور نہ خود بطیب خاطر ان کی طرف راغب تھا اور نہ ان کو اس نے بتدریج تقلیداً غیر شعوری طور پر ماں باپ سے حاصل کیا ہے، ہاں یہی اچھی عادتیں ماں باپ اپنے عمل سے نمونہ پیش کرکے اس کی طبیعت میں راسخ کردیتے تو وہ پائدار اور مستحکم ہو جائیں اور پھر کبھی ان کے نقوش نہ مٹتے۔

عادات وخیالات کی تعمیر:

ہم ابھی اس چیز کو بیان کر چکے ہیں کہ کمسنی کا زمانہ ہی بچّہ کی شخصیت اور اس کے عادات واطوار کی تعمیر کا زمانہ ہے۔ گھر کا ماحول ہو یا مدرسہ دونوں جگہ اس تعمیری کام کے لئے ہوشیار معمار کی ضرورت ہے جو اس کی تعمیر صحیح طریقے پر کر سکے اور "خشتِ اوّل" کج نہ رکھے اس لئے کہ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج ٭ تا ثریا می رود دیوار کج

خیالات وعادات بہت قریبی رشتہ رکھتے ہیں، عمل کی پیہم تکرار عادت ہے۔ یا بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر قسم کی جسمانی ونفسانی حرکات اور تمام انسانی کردار عادت ہی کے تحت میں داخل ہیں۔ عادت جبلت نہیں ہوتی کیونکہ یہ طبعی وفطری چیز نہیں ہے۔ بلکہ اکتسابی ہے اور جبلت اکتسابی نہیں ہوتی ہے۔ عادت کی اگر صحیح تربیت ہو جائے تو اس سے بہت سے فوائد میسر ہو سکتے ہیں۔

عادات بہت آسانی سے پختہ ہو جاتی ہیں اور بچپن کی قائم شدہ عادات آسانی سے نہیں چھوٹ سکتی ہیں۔ اس لئے جو بچے بچپن میں بری عادتوں کے خوگر ہو جاتے ہیں وہ تمام زندگی اس کی بندشوں سے نجات نہیں پا سکتے۔

تعلیم وتربیت میں عادات کی اہمیت:

یہ مسلم امر ہے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جا سکتی جب تک انہیں عمدہ اور پسندیدہ عادات کا خوگر نہ بنا دیا جائے۔ چونکہ بچپن میں دماغ پر نقوش

مرتسم ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ دیرپا اور پائیدار ہوتے ہیں۔ اِسی لئے مدرسہ میں عادات کی ترکیب اوران کے قیام پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ بچّہ جوں جوں نشو و نما پاتا ہے اس کی عادات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور پندرہ سال کی عمر میں بہت سی عادتیں اس میں پختہ ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس عمر سے پہلے پہلے گھر میں، مدرسہ میں تمام ضروری اور مفید عادتیں، مثلاً سچّائی، باقاعدگی، راست بازی، پابندی اوقات، اطاعت وغیرہ کی تربیت ان میں پختہ طور پر ہو جائے۔

بچّے عموماً عملی کاموں میں حصّہ لینے کے بجائے زیادہ تر خواب و خیال میں منہمک رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں تکمیل کار کی عادت اور پسندیدہ کاموں کو سرانجام دینے کی عادت کا خوگر بنانا چاہئے تاکہ آئندہ وہ خود اپنی ذات اپنے خاندان اور ملک و قوم کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکیں۔

تشکیل عادت کے قواعد:

بچّہ اسکول میں داخل ہونے سے پہلے ہی جبکہ اس کی عمر ۵، ۶ سال کی ہوتی ہے۔ اپنے ماحول کے تحت بہت سی عادتوں کا خوگر ہو چکتا ہے۔ جن میں سے بعض ناپسندیدہ بھی ہوتی ہیں۔ اگر وہ مدرسہ میں داخل ہو چکا ہے تو یہ فریضہ مدرس کا ہے کہ وہ خراب و ناپسندیدہ عادات کو ترک کرائے اور ان کے بجائے نیک و پسندیدہ عادات کا عادی بنائے اور اگر وہ مدرسہ میں داخل نہیں ہؤا ہے تو ماں باپ کے ذمہ یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ اس کی اصلاح کریں اور ترکیب عادات میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔

(۱) ترکیب عادات کے سلسلہ میں سب سے اوّل یہ ضروری ہے کہ جدید عادتوں کے قائم کرنے اور قدیم عادات کے ترک کرانے کے لئے مناسب محرکات بہم پہنچائیں یعنی بچّہ کے بخوبی ذہن نشین کرائیں کہ تبدیلی کس وجہ سے اختیار کی جارہی ہے اور قدیم عادات میں کون بُرائیاں تھیں اور ان جدید عادات میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔

(۲) دوئم یہ کہ جدید عادات کے لئے صلہ یا جزا اور قدیم کے لئے سزا (جسمانی نہیں) تجویز کی جائے مثلاً مٹی کھانے والے بچوں کو مٹی کی گولیاں مرچ یا کونین ملا کر دینے سے وہ اس عادت کو ترک کر دیں گے۔ مدرسہ میں بُری عادت کے ترک کرنے کے لئے دھمکی، بے قدری، ناخوشنودی، درجہ کی تنزلی وغیرہ ہونا چاہیئے اور نیک عادت کے لئے خوشنودی، قدر افزائی، تعریف، تحسین اور درجہ کی ترقی وغیرہ کا استعمال کرنا چاہیئے۔

(۳) جس بچہ سے کوئی عادت ترک کرانی مقصود ہے اسے اس بات کا پورا یقین دلانا چاہیئے کہ وہ اسے کامیابی کے ساتھ ترک کر سکتا ہے۔ اسے اپنی قوتِ ارادی پر پُورا پُورا بھروسہ ہونا چاہیئے۔

(۴) جدید عادت کے اختیار کرنے میں قدیم ترک شدہ عادت کو ایک بار بھی عود نہ کرنے دیا جائے بلکہ جہانتک ممکن ہو جدید عادت کی مشق کرائی جائے کیونکہ جدید قائم شدہ یا اختیار کردہ عادت کو ایک بار بھی توڑنے سے دوبارہ ان نقوش کا قائم ہونا جو پہلے قائم ہو چکے تھے زیادہ دشوار ہے۔ غرضکہ بچے کی اخلاقی تربیت کا مرحلہ سخت دشوار گذار ہے مربی یا سرپرست کی تھوڑی سی غفلت یا بے پرواہی سے بچہ کی آئندہ زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم کو بڑی ہوشیاری سے اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ بچوں کی اخلاقی تربیت کے وقت معلم یا والدین سے عموماً یہ زبردست غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ "وہ ابھی بچے ہیں" اور ان کے دماغی قویٰ ابھی ناکمل ہیں۔ اور ان کی قوتِ فکر ناقص ہے وہ ابھی نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اس لئے ناپسندیدہ عادتوں کے ترک کرانے کے سلسلہ میں وہی طریقے زیادہ سُودمند ہیں جو جبلتوں کی اصلاح و تربیت کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں یعنی عدم استعمال۔ انسداد اور ارتفاع۔

ہم سے اکثر و بیشتر حضرات کا یہ عمل ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ہمارے سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتا تو پھر ہم زبردستی اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد قوت اور بید کی نوک سے اخلاق کی تعلیم و تربیت ان کے لئے شروع کی جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر روزانہ کی زندگی میں ماں باپ کی طرف سے کچھ اس قسم کی تاکیدیں بچہ کو ہوتی رہتی ہیں کہ جس سے بچہ میں نہ تو خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور نہ جرأت! اگر ماں باپ بچہ کو کسی ایسے کام میں مشغول پاتے ہیں جس سے اس کی قوت ارادی میں ترقی ہوتی ہے یا دلیری و جرأت کی عادت راسخ ہوتی ہے تو جذبۂ محبت کے تحت یا اپنے مال کے نقصان کے خوف سے اس طرح اس کام کے لغو و لایعنی خطرناک نتائج سے ڈرایا جاتا ہے کہ بیچارہ خوفزدہ ہو کر اس کام سے باز رہتا ہے۔ کیا اس قسم کے احکام روزمرہ ہماری زبان سے صادر نہیں ہوتے "دیکھو گھڑی مت چھوؤ"۔ "اندھیرے میں مت جاؤ کیڑا کاٹ لے گا"۔ "راستہ میں ہؤ بیٹھا ہے مار ڈالے گا"۔ "چوٹ لگ جائے گی چھت پر مت چڑھو"۔ "وہاں سے گر و گے تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی"۔ غرضکہ ایسے احکام کا نتیجہ آئندہ یہ نکلتا ہے کہ ان خطرناک نتائج کی آگاہی سے بچہ میں بزدلی، کم ہمتی پیدا ہو جاتی ہے؛ خوف، دہشت دل میں گھر کر لیتے ہیں اور وہ سچی جرأت، بہادری اور مردانگی جو دنیاوی زندگی کے لئے ضروری ہے اس سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اس لئے عادتوں کی تربیت کے وقت ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے ♦

اِصطلاحی غور و فکر

(۲)

اِصطلاحات

161. Welfare

فلاح ، خیریت ، بہبود ، بہبودی ،

تینوں لفظ مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے اچھے ہیں۔ لیکن عام اصطلاحی لحاظ سے آخری دو میں سے کسی لفظ کا اختیار کرنا مناسب ہوگا۔ مثلاً Child welfare کے لئے بہبودیٔ اطفال ہی مناسب ہے۔

162. Intelligentsia

عاقل گروہ ، فہمیدہ جماعت ، ہوشمند جمعیت ، دانشمند فریق ، عقلمند فرقہ ، ذکی جماعت ، ذہین گروہ ، زیرک فریق ، روشن خیال جماعت ،

گروہ ، جماعت ، جمعیت ، فریق ، فرقہ وغیرہ کے مقابلہ میں طبقہ زیادہ مناسب لفظ ہے۔ اور Intelligentsia کے لئے فہمیدہ طبقہ یا روشن خیال طبقہ کہنا موزوں

معلوم ہوتا ہے۔اور یہی ترجمے عام مستعمل بھی ہیں۔

163. Survey.

پیمائش، معائنہ، جائزہ، مشاہدہ، سروے،

مندرجہ بالا تمام الفاظ میں سے "جائزہ" زیادہ موزوں اور Survey کے تمام مفہوموں پر حاوی معلوم ہوتا ہے۔

164. Precedent

نظیر، نمونہ، سند، مثال، سابقہ، رواج ۔

اصطلاحی لحاظ سے "سابقہ" زیادہ اچھا ہے۔نظیر بھی موزوں ہے ۔

165. Abnormal

غیر معمولی، خلاف معمول، شاذ، مستثنیٰ، عجیب الخلقت، عجیب وغریب، بے اصول، مختلف النوع، غیر طبعی، بے قاعدہ، غیر معیاری، غیر عیاری، غیر معتدل۔

مختلف مقامات پر استعمال کے لحاظ سے تقریباً تمام مندرجہ بالا الفاظ صحیح ہوں گے۔لیکن عموم اور جامعیت کے لحاظ سے "غیر طبعی" کو انتخاب کر لینا موزوں ہوگا ہاں البتہ عمرانیاتی اصطلاح کے لحاظ سے غیر عیاری قابل ترجیح ہے۔

166. Extra-mural activities.

فالتو مشغلے، زائد مشاغل، غیر نصابی مشاغل۔

ان میں سے "غیر نصابی مشاغل" قابل ترجیح ہے۔

167. Designation.

تقرر، لقب، وصف، خطاب ۔

ان الفاظ کے مقابلے میں ہمیں "منصب" زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

168. Propaganda

تدبیر، نشرواشاعت، تحریک، تبلیغ، پراپےگینڈا، اشتہار، شہرت، رواج، توسیع۔

اِس کیلئے "تحریک" اور "تبلیغ" دونوں اچھے ہیں۔لیکن "تحریک" کے مقابلے میں تبلیغ زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔

169. Popularity.

شہرت، عام مقبولیت، ناموری، ہر دلعزیزی۔

ہم اِن سب میں سے "ناموری" کو Popularity کے لئے قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں۔

170. Editor.

اخبارنویس، منشی، مدیر، ایڈیٹر۔

"مدیر" اچھاہے۔ اور عام مستعمل ہے +

(ب)

اِصطلاحات زیرِ غور

171. Hall.

172. Drawing Master.

173. Science Room.

174. Library.

175. News Board.

176. Notice Board.

177. Money Order.

178. Letter Box.

179. Tag.

180. Primary School.

181. Middle School.	182. High School.
183. College.	184. University.
185. At-par.	186. Above par.
187. Below par.	188. Agent.
189. Amount.	190. Assessment.
191. Audit	192. Balance
193. Debit & Credit	194. Balance Sheet
195. Charter	196. After date
197. Bond	198. Budget Estimate
199. Capital	200. Fixed Capital

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ـــــ شعبہ اسکول

تاریخ شمار احکام	نام	منصب	تقرر یا تبدیلی کہاں ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
ستمبر سنہ ۴۹ء ۱۲۸۴۹-	م۔ فضل احمد ایچ پی او ٹی (۵۰ — ۱۰۰)	قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ بجائے قاضی ظفرالحق کی رخصت میں کام کر رہے ہیں اور جنکے معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو کی حیثیت سے تبادلے کے احکام صادر ہو چکے ہیں۔	قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول بھنیرہ بمشاہرہ ۵۰ روپے ماہوار میزان مشاہرہ (۵۰-۳-۸۰/۴-۱۰۰)	تاریخ حاضری سے	محمد یوسف کی جگہ جن کا اینگلو ورنیکلر سیکشن میں تبادلہ ہو چکا ہے۔
ستمبر سنہ ۴۹ء ۱۲۹۴۷-	م۔ عبدالمالک ایس وی نمبر ۳۴۴: ۵۰ — ۱۰۰	معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ	معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو۔ بمشاہرہ سابقہ۔	"	م۔ فلک شیر کی جگہ جن کا خوشاب کی طرف تبادلہ ہو چکا ہے۔
۲۰ ستمبر سنہ ۴۹ء ۱۳۹۷۵-	م۔ غلام محمد ایس وی نمبر ۱۳/۴: (۵۰—۱۰۰)	معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ	معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال بمشاہرہ سابقہ	"	ق۔ نور حسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۲۰ ستمبر سنہ ۴۹ء ۱۴۱۱۲-	م۔ محمد اکرم بی اے ایس اے وی نمبر ۲۴۳: (۹۰—۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مری۔ بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ کرم داد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

صیغہ نسواں

تاریخ شمار احکام	نام	منصب	تقرر یا تبدیلی کہاں ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۸ ستمبر سنہ ۴۹ء E/۲/۸۰۴	استانی فیض الہی ایس وی نمبر ۲: ۴۰-۵-۴۰	معلم اردو گورنمنٹ زنانہ مڈل اسکول چیچہ وطنی	معلم اردو گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول ملتان بمشاہرہ سابقہ	"	استانی زبیدہ بیگم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	استانی زبیدہ بیگم ایس وی۔ ایکا پی یو نمبر ۲: ۱۴۰-۲۲۰	معلم اردو گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول ملتان (رخصتی)	معلم اردو گورنمنٹ زنانہ مڈل اسکول چیچہ وطنی۔ بمشاہرہ سابقہ	"	استانی فیض الہی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

صیغہ دفاتر

تاریخ شمار احکام	نام	منصب	تقرر یا تبدیلی کہاں ہوئی	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۹ ستمبر سنہ ۴۹ء ۱۲۲۴۴-	م۔ محمد اشرف حمید	ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ		۲۱ اگست سنہ ۴۹ء سے	اپنے عہدہ پر بمشاہرہ مستقل قرار دئے گئے ہیں

رموز

نومبر ۱۹۴۹ء

مدیر

بشیر ہاشمی

معاونین

سلیم فارانی　　عبدالغفور چودھری

پبلشر: ادارہ پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور سے چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا
[redacted]

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

مدیر "آموزش" کی تسلیم کے ساتھ

ناشر

کتاب منزل

لاہور

نومبر ۱۹۴۹ء

جلد:— ۲

شمارہ:— ۸

سالانہ چندہ:—

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیرممالک کیلئے ۸ روپے

قیمت فی جلد دس آنے

رموز

فرنگی دور میں مغربی تہذیب و تمدّن کے اثر سے ہمارے دل و دماغ کچھ ایسے مسحور ہو چکے تھے، کہ کہیں ایجادات کے تذکرے میں مسلمانوں کا نام لینے کی کوئی جرأت بھی کرتا تو حقارت آمیز ہنسی سے اس کا خیر مقدم ہوتا، گویا یہ بات ہمارے اکثر و بیشتر "روشن خیال" دماغوں میں یقین کی حد تک سمائی ہوئی تھی، کہ مسلم قوم کچھ ایسی پس ماندہ اقوام میں سے ہے کہ "ایجاد" نہ کبھی اس کے بس کا روگ تھا، نہ ہے، نہ ہوگا۔ وہ سحر ابھی ٹوٹا نہیں۔ آزاد ہو جانے کے بعد بھی ہماری نگاہیں ابھی عقیدتمندانہ روش سے مغرب ہی کو دیکھ رہی ہیں، جیسے ہماری زندگی کے تمام شعبے مغربیوں کے مرہونِ منت ہیں لیکن کیا یہ حقیقت ہے ؟....... اِس کے متعلق فکر و غور ہم نے تو شاید کبھی ضروری نہیں سمجھا، اور ابھی تک پورے جذبے کے ساتھ اس امر کی تحقیق کی طرف مائل ہوتے بھی نظر نہیں آتے، حالانکہ قومی تعمیر و عروج کی خاطر اس قسم کی تحقیق کی ہمیں اب زیادہ ضرورت ہے۔ کیا ہمارے دل و دماغ فاخرانہ حیثیت سے چونک نہ اُٹھیں گے اگر تحقیق پر مغربی بہت سی چیزوں میں ہماری ایجادات کے مرہونِ منت نظر آئیں ؟ کسی مسلمان کی زبان سے ایسی بات نکلے تو ہمارے مغرب پسندی

اب بھی اسے بے بنیاد خوش فہمی سے تعبیر کرے۔ لیکن کوئی مغربی کہہ دے تو شاید آمنّا وصدّقنا
کہہ اٹھے گی۔

مسٹر فرانک سی سیکرن نے جو واشنگٹن کے ایک نامور ادیب اور لیکچرار ہیں، اپنے ایک مضمون میں جو "سیرین آرک" میں چھپا ہے۔ امریکی تمدن کا جائزہ لیتے ہوئے عربوں کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

" اینٹ پتھر کے جن مکانوں میں آج امریکن رہتے ہیں وہ چھ ہزار سال پہلے کے عربوں کے خاکے ہیں۔ شیشہ کا انکشاف دو ہزار سال قبل اہلِ شام نے کیا تھا جن کی بدولت آج شیشہ کی کھڑکیوں اور برقی روشنی کی ترقیاں ممکن ہو سکی ہیں۔ صابن عربوں کی ایجاد ہے۔ جس کو آج ایک عام امریکن اپنی روزمرہ زندگی میں استعمال کرتا ہے۔ استرا بھی عربوں کا کارنامہ ہے۔ آج کا امریکن لباس بھی ایک حد تک عربوں کا مرہونِ منّت ہے کیونکہ پارچہ بافی عربوں کا ایک فن رہا ہے.... یہی نہیں بلکہ جو "کافی" آج امریکن پیتے ہیں وہ بھی عربوں ہی کی ایجاد ہے۔ اس کا نام بھی عربی لفظ سے مشتق ہے۔ کافی جس بیج سے تیار کی جاتی ہے۔ اس کی دریافت عربوں ہی نے کی۔ اور اس بیج سے ایک مشروب تیار کیا جس کو آج ہم کافی کہتے ہیں۔ چینی بھی عربی ایجاد ہے اور توس بھی جسے آج ہر امریکن ناشتہ میں استعمال کرتا ہے۔ حمل ونقل کا اہم ذریعہ، پہیہ کی حد تک بھی امریکہ عربوں کا شکر گزار ہے۔ کیونکہ اس ایجاد کا سہرا عربوں کے سر رہا ہے۔ شامیوں نے لفظ کی ایجاد کی اور آواز کے معنی پہنائے۔ الفاظ اور اعداد کے علاوہ عربوں نے کاغذ بنایا۔ تعلیمی دنیا میں اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بھی عربوں ہی کی ایجاد ہیں۔ اور آج دنیا کی سب سے پرانی جامعہ قاہرہ کی جامعہ الازہر ہے۔ عرب مقنن بھی تھے۔ سب سے پہلا قانون ان ہی کا تیار کردہ ہے۔ سب سے پہلے عربوں نے عدالت اور انتظامیہ کی علیحدگی پر زور دیا اور اپیل کرنے کا طریقہ عربوں نے ہی بتلایا....... علاوہ ازیں جوہری توانائی کی ابتدائی کوششیں عربوں اور یونانیوں نے کیں اور دنیا کو گھٹیا دھات سے سونا بنانا سکھایا...... غرض عربوں نے دنیا کے ہر شعبہ حیات میں

اپنا رنگ چھوڑا ہے۔ طب ہو کہ فن تعمیر، جغرافیہ ہو کہ تاریخ، ادب ہو یا تعلیم، زندگی کے تمام شعبے آج تک عربوں کے مرہونِ منّت ہیں۔"

حقائق پر جو پردے پڑے ہیں، انہیں مسلمان محقق اٹھائیں، تو حیرت انگیز انکشافات ہوں اور قوم کے لئے فاخرانہ ماضی کی بنا پر شاہانہ مستقبل کی امیدیں پختہ ہوں۔ اس تحقیقی ذمہ داری کے بار کو کوئی اور نہیں اٹھا سکے گا۔ قرعۂ فال اربابِ علم و تعلیم ہی کے نام پڑے گا۔ اور پڑنا چاہیئے۔ اربابِ علم و تعلیم کو اس کی طرف جلد توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ قوم کے بچّوں کے ہاتھوں میں قوم کے شاندار ماضی کی ایسی تاریخ آئے جس سے وہ رہبرِ اقوام بننے کی تمنائیں اپنے دلوں میں پیدا کر کے حیرت انگیز مستقبل بنانے کی فکر میں مصروفِ عمل ہوں۔ مختلف علوم و فنون میں مسلمانوں کے کارنامے بچوں کو معلوم ہوں، تو نا معلوم تعلیم کے دوران میں ان کے دل و دماغ میں کیا کیا عزائم پیدا ہوں ؟

ذہنی ارتقا اور توارث و ماحول

شمس بریلوی

ذہنی ارتقا کی بحث چھیڑنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں وضاحت کے ساتھ مسئلہ ارتقا کو بیان کریں۔ مسئلہ ارتقا پر عام طور سے دو نظریئے ہم کو ملتے ہیں۔ جن میں ڈارون کو تقدم حاصل ہے : اس کے بعد ڈارون کے مسائل کی تشریحی صورت: لامارک کا نظریہ ارتقا ہے!

ڈارون کے نظریہ ارتقا "Evolution" کے تمام مباحث کو اگر سمیٹ کے بیان کیا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہوگا کہ

"جانوروں کی مختلف قسمیں ایک ہی باپ دادا کی اولاد ہیں اور بڑے جانوروں کا ارتقا چھوٹے جانوروں سے آہستہ آہستہ ایک نظام کے تحت میں ہوا ہے"

لامارک، کا نظریہ جو ڈارون کے نظریہ کی ایک تشریحی صورت ہے ہم کو بتاتا ہے کہ "جانور اپنے ماحول کے مطابق ضرورتوں کو محسوس کرکے اپنی قدرتی عادتوں کو تبدیل کر دیتا ہے۔ اور ایسا کرنے کے لئے اس کے جسمانی اعضا میں بھی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں" یہ

تبدیلیاں اور خاص طور سے بدن کے کسی حصّہ کو استعمال کرنے یا نہ کرنے کے نتائج اس جانور کی اولاد میں آجاتے ہیں اور اولاد بھی ان ہی تبدیلیوں میں تھوڑا بہت اضافہ کر لیتی ہے اور اس طرح پرانی قسموں سے نئی قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں"۔

برگسان مشہور جرمن فیلسوف نے بھی اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے چنانچہ اس نے اس موضوع پر تخلیقی ارتقا کے نام سے ایک مستقل تصنیف پیش کی ہے جس نے ڈارون، اسپنسر، اور ہیگل کے نظریاتِ ارتقا میں بہت کچھ ترمیم کی ہے لیکن اگر اس موقع پر ہم ان مباحث کو چھیڑ دیں تو ہمارا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ ہم نے صرف توارث و ماحول کے اثر و نفوذ کو ثابت کرنے کے لئے اس بحث کو بطور تمہید پیش کیا ہے۔

ڈارون نے اجناس کی تبدیلیوں میں دو قسم کی تبدیلیوں کو تسلیم کیا ہے ایک تو وہ چھوٹی تبدیلیاں جو اوسط قسم کے جانوروں میں پائی جاتی ہیں۔ اور دوسری وہ بڑی تبدیلیاں جو ان سے بالکل مختلف ہیں، اس کا دعویٰ ہے کہ یہ دونوں قسم کی تبدیلیاں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

اس مسلمہ اصول کے پیشِ نظر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو باتیں انسان خود سیکھ سکتا ہے یعنی تربیت و اعمال اکتسابی، کیا وہ بھی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہو سکتے ہیں یا نہیں، اس سلسلہ میں وسیمین اور میکڈوگل نے بہت کچھ تجربات کئے، انہوں نے چوہوں کو اپنے تجربات کے لئے انتخاب کیا جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ والدین کی عادتیں بغیر تربیت کے وراثتاً اولاد میں نہیں پہنچتی ہیں۔ ہاں ان کے قبول کرنے کی صلاحیت تمام افرادِ عالم سے زیادہ ایسے والدین کی اولاد میں ہوتی ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ کوئی دو فرد آپس میں بالکل ایک دوسرے سے مماثل نہیں ہوتے حتیٰ کہ توام بچے بھی! کہ ان میں اختلاف کا امکان بہت کم ہے! حسنِ اتفاق سے اگر ان میں مشابہت قریبہ پیدا بھی ہو جائے تو بھی وہ ذہنی، اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے بڑی حد تک ایک دوسرے

سے مختلف ہوتے ہیں۔

اس لقینی اور لامحدود اختلاف کی اصل دو چیزیں ہیں یعنی دو ایسے عنصر فرد کی نشوو نما میں کارفرما ہوتے ہیں جو آپس میں مختلف ہیں ایک توارث (فطرت، طبیعت) اور دوسرا ماحول (تربیت) پچھلے زمانہ میں ان ہی متذکرہ بالا دو عناصر یعنی توارث و ماحول کے اثرات کے متعلق صرف دو نظریئے رائج تھے، ایک گروہ کا خیال تھا کہ بچہ بڑا ہو کر جو کچھ بنتا ہے محض موروثی اثرات کے تحت بنتا ہے۔ گویا اس گروہ کا خیال تھا کہ آبا و اجداد کے اخلاق و عادات اس کو ورثہ میں ملے ہیں، اس کے لئے تربیت یا ماحول کا اثر بیکار ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ قدرت نے ازل ہی سے ہر ایک میں ایک مقررہ و معینہ مقدار ذہانت کی رکھی ہے جس کی تکمیل و تزئین تعلیم و تربیت (یا ماحول) کے ذریعہ سے ہوتی ہے لیکن عصر حاضر کے فلاسفر اس پر متفق ہیں کہ ذہنی و جسمانی نشوونما کے لئے دونوں عناصر کا اشتراک ضروری ہے یعنی استعداد طبعی جو بڑی حد تک توارث سے حاصل ہوتی ہے اور تعلیم و تربیت بھی۔ اگر ایک بچہ میں استعداد طبعی نہیں تو اس کی تربیت ذہنی پر خواہ کتنا ہی کیوں نہ خرچ کر دیا جائے اس کو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اکثر ذی استعداد بچے اپنے ماحول کے افلاس یا غفلت کی بھینٹ چڑھ کر تمام عمر گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اسی مقصد کے پیش نظر "نفسیات" میں توارث و ماحول کے مباحث کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم اس بحث کو ہر پہلو سے واضح ترین صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

توارث کا مفہوم:

مسئلہ ارتقا کی رو سے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں طبعی توارث سے یہ مراد ہے کہ ایک بچہ پر اس کی پیدائش کے وقت اس کے ذہنی و جسمانی قوٰی میں ماضی کا طویل سلسلہ نسب اپنی تمام خصوصیات سے برابر اس پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے یعنی ہماری تمام طبعی قوتیں ہم کو ہمارے بعیدی یا قریبی بزرگوں سے ورثتاً ملی ہیں، مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ حامد کی تمام پشتوں یعنی اسلاف

میں شہسواری کا طریقہ رائج تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہر پشت کا بانی بہترین دل ودماغ رکھتا تھا قوائے جسمانی کے اعتبار سے ہر فرد اس خاندان کا بہت طاقتور اور توانا گذرا ہے، اب حامد کا بچہ اس عمل توارث کے اعتبار سے نہایت توانا، طاقتور، طباع اور اسپ سواری کا شائق ہونا چاہیئے۔

ایمرسن کا قول اس موقع پر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہم ان تمام کا جن سے ہمارا کچھ نسبی تعلق رہاہے ایک جزو ہیں"۔ یہ مقولہ بالکل صحیح ہے ہماری ہر ایک نسل نے خواہ وہ قریبی ہو یا بعیدی ہماری جسمانی ترکیب وساخت میں اپنا کچھ نہ کچھ حصہ چھوڑا ہے۔ تجرباتی طور پر ہم کو بہت سے ایسے رجحانات نسلِ انسانی میں مشترک ملتے ہیں جو ان کی ابتدائی نسلوں میں موجود تھے۔

بھوری مونچھوں اور نیلی آنکھوں والے خاندان کے بچے اسی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں یعنی ہر بچہ کی آنکھ نیلی ہوگی۔ اور بال سنہرے ہوں گے یہ قریبی توارث ہے اور تقلید مذہب وغیرہ یہ بعیدی توارث کا نتیجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توارث کا عمل ناگزیر ہے مگر اس کی حدیں معین نہیں کی جاسکتی ہیں۔

توارث کا اثر مخلوقات کی تمام اصناف میں معین قدروں کے ساتھ نہیں پایا جاتا بلکہ ایسے جانداروں کا نظام عصبی اور نظام جسمانی زیادہ سادہ ہوتا ہے اور ان کے وظائف زندگی مخصوص اور معین ہیں، ان میں توارث کا عمل زیادہ پایا جاتا ہے اور تربیت کی ضرورت کم ہوتی ہے اس صورت میں ہم جانداروں کو دو قسموں پر تقسیم کرتے ہیں ایک قسم تو وہ ہے جس کو نفسِ ناطقہ سے کوئی حصہ نہیں ملا ہے یعنی حیوانات، دوسری نوع وہ ہے جو نفسِ ناطقہ سے بہرہ مند ہے یعنی انسان، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ حیوانات مطلق کی نسل میں چونکہ وظائفِ زندگی محدود ومتعین ہیں اس لئے ان کو ماحول کی تربیت کی ضرورت نہیں، مرغ کا بچہ پیدا ہونے کے کچھ دیر بعد ہی حصولِ خوراک کے وظیفہ کو دوہرانے لگتا ہے، چوہوں، گلہریوں کے بچوں کو دیکھئے توارث کے خصوصیات کس قدر ملے ہوئے ہیں، اسی طرح درندوں میں توارث کے اثرات بہت زیادہ پائے جاتے ہیں، ان کا مخصوص ماحول ہوتا ہے، اگر ان کے سادہ اور معین ماحول میں تبدیلی کردی جائے تو

چونکہ ان میں ردِّ عمل کی صلاحیتیں موجود نہیں ہوتی ہیں اس لئے ان کا تلف ہو جانا یقینی ہے، اس کے برخلاف چونکہ حیوان ناطق (انسان) کا نظام عصبی زیادہ پیچیدہ ہے اس لئے توارث کا اثر ان پر اس قدر نہیں ہوتا جتنا کہ حیوانات (مطلق) پر اور نہ اس کا کوئی سادہ اور مخصوص ماحول ہے اسی لئے اس کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس نکتہ کو ہم زیادہ واضح کر کے اس صورت میں پیش کر سکتے ہیں کہ انسان کا بچہ ایک طرف تو متعدد و بے شمار معینہ تعلقات لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے جنہیں وہ اپنے غیر ارادی اور جبلی افعال کے ذریعہ سے پورا کر کے اپنی حفاظت کی مہم انجام دیتا ہے اور دوسری جانب وہ اثر پذیری سے زندگی کی آزمائشوں سے بتدریج عہدہ برآ ہونا سیکھتا ہے، اس مخلوط اور پیچیدہ عصباتی نظام کے اعتبار سے بچہ کے زمانہ شیر خوارگی سے لے کر اس کے بلوغ کے زمانہ تک تمام زمانہ ساری مخلوقات سے زیادہ اہم ہے۔

جسمانی اور نفسانی توارث کا ثبوت انسان میں :

انسان اپنے قریبی اور بعیدی بزرگوں سے ایسا نظام عصبی جو اثر پذیر ہے اور مخصوص رجحانات ہی میراث میں نہیں پاتا بلکہ جسمانی اور نفسانی نشوونما میں بھی مخصوص اثرات اسے میراث میں ملتے ہیں ہم پہلے اس امر کی طرف کچھ اشارہ کر آئے ہیں کہ گوری رنگت اور بلند قد والدین کے بچے عموماً گوری رنگت کے اور بلند بالا ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ ماحول اور اغذیہ کے اختلاف کی وجہ سے کچھ تغیرات بعد کو ان میں پیدا ہو جائیں، پیدائشی بہرے والدین کے بچے عموماً بہرے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی جسمانی اور نظام عصبی کے توارث کے عین مطابق ذہنی خصوصیات بھی ایک ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ یعنی جس طرح جسمانی توارث کے عمل میں بچے کے عضلاتی ریشے (جن سے جسم کی ترکیب ہوتی ہے) ارثی میلانات کے تحت میں بنتے ہیں اسی طرح دماغی عصباتیے یا عضلات اصول توارث سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگرچہ والدین اپنا نفس بچہ کو ورثہ میں نہیں دے دیتے مگر وہ مشین یعنی دماغ

جس کے ذریعہ سے نفس کام کرتا ہے والدین کی خصوصیات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

امریکہ اور یورپ کے اکثر ماہرین نفسیات نے اس قسم کے تجربات کئے ہیں چنانچہ پیرسن نے ۱۹۰۴ء میں چار ہزار بچوں کا جن میں دس سال سے چودہ سال تک کے بھائی بہن شریک تھے ایک چارٹ مرتب کر کے ان کی ذہنی اور جسمانی مطابقت کا اندازہ لگا کر اس امر کو ثابت کیا ہے کہ ان بھائی بہنوں کے جسمانی خصوصیات میں پچاس فی صدی اور ذہنی خصوصیات میں ۴۵ فی صدی مطابقت اور یکسانیت ہے۔ یہ مطابقت توام بچوں میں معمولی بہن بھائیوں کے مقابلہ میں زیادہ پائی جاتی ہے۔

توارث کا اثر اخلاقی اور معاشرتی خصوصیات پر:

اکثر ماہرین نفسیات نے توارث کے اثرات کے سلسلہ میں بعض خاندانوں کے افراد کا اخلاقی جائزہ لیا ہے۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ توارث کے اثرات یقیناً اسلاف سے اخلاف میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر ڈیل نے ۱۸۷۷ء میں نیویارک کے ایک خاندان جیوکس نامی کے ڈیڑھ سو سالہ مدت کے اندرونی افراد کا مطالعہ کر کے ان کے اخلاقی حالات کو اس طرح قلمبند کیا ہے کہ!!

"جیوکس بانی خاندان ۱۷۲۰ء میں پیدا ہوا جو ایک ناکارہ اور نالائق شخص تھا، اس نے الکل اپنے جیسی نالائق اور ناکارہ عورت سے شادی کی ۱۸۷۷ء تک اس نالائق جوڑے کی پانچ شتوں میں بارہ سو افراد کا پتہ چل سکا، ان بارہ سو افراد میں ۱۴۰ بھکاری، ۷ قاتل، ۶۰ عادی چور، ۰ بدکاریوں میں مبتلا اور ۱۴۰ مختلف افراد دیگر جرموں میں سزا یافتہ اور ۴۴۰ اوباشی اور عیاشی سے اپاہج ہو چکے تھے، صرف ۲۰ افراد نے کاروباری تربیت پائی تھی۔" اسی طرح ڈاکٹر ونشپ نے یکہ کے ایک مشہور اعلیٰ خاندان ایڈورس کے افراد کے حالات اس طرح لکھے ہیں کہ:

۱۹۰۰ء میں اس خاندان کے افراد کی تعداد ۱۳۹۴ افراد پر مشتمل تھی ان میں سے ۲۹۵ کالج کے گریجویٹ، ۱۳ کالج کے پرنسپل، ۶۰ مشہور اطباء، ۱۰۰ سے زیادہ مذہبی مبلغین، مشہور مصنفین، ۱۰۰ قانون دان، ۳۰ جج، ۸۰ اعلیٰ عہدہ دار جن میں ایک امریکہ کا نائب صدر جمہوریہ،

کچھ مجلس واضع قانون کے ممبر اور امریکہ کے سفراء وغیرہ ہیں اور اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس خاندان میں کوئی مجرم بھی ہوا ہے یا نہیں" (بحوالہ تعلیماتی نفسیات)

دوسرے ملکوں کی طرح خود پاکستان و ہند میں ایسے متعدد خاندان ہیں کہ بانی خاندان سے لے کر اس وقت تک ہزاروں افراد کی تعداد ہے لیکن اس خاندان کا ہر فرد خاندانی روایات کا حامل ہے جیسے یو۔پی کا لال خانی اور خیر وانی خاندان، سرحد کے محسودی، وزیری وغیرہ قبائل کشمیر کے پنڈت، اسی طرح ہندوستان و پاکستان کی بعض نبرد آزما قومیں، جن کی جنگجویانہ خصوصیات بانی خاندان سے لے کر اس وقت تک قائم ہیں۔

اکتسابی خصائل کا انتقال :

اس سلسلہ میں ماہرین نفسیات کی رائیں مختلف ہیں۔ مگر دو گروہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ایک اس بات کا حامی ہے کہ اکتسابی خصوصیات بھی توارث کے ذریعہ بعد کی نسلوں یعنی اخلاف میں منتقل ہوتی ہیں" جرائم پیشہ اولاد کا جرائم پیشہ ہونا ضروری ہے" دوسرا گروہ اس کے بالکل مخالف ہے یہ گروہ اکتسابی خصوصیات کے انتقال کا منکر ہے۔

اس گروہ کا دعویٰ ہے کہ ایک ہندوستانی یا پاکستانی ماں باپ کا بچہ جس کے والدین انگریزی زبان میں زبردست قابلیت رکھتے ہیں اور بے تکان اس کو بولتے ہیں محض توارث کے زیر اثر انگریزی (بغیر تربیت) نہیں بول سکتا، ہمارے یہاں ختنہ کی رسم (سنت) قدیم الایام سے چلی آتی ہے جس کو بلا فصل ساڑھے تیرہ سو برس گذر گئے لیکن محض توارث کے زیر اثر بچے مختون پیدا نہیں ہوتے اور ظاہر ہے کہ ختنہ اکتسابی خصوصیت ہے۔ اسی طرح چینیوں کی کئی نسلیں اس خصوصیت کی حامل گذر چکی ہیں کہ لوہے کے تنگ جوتے بچوں کو پہنا کر ان کے پیر چھوٹے کر دئے جاتے ہیں توارث کے زیر اثر، زرد رنگ، چپٹی ناک اور چھوٹی آنکھوں کی طرح ان کے بچوں کی پیدائش پر پیر بھی چھوٹے ہونا چاہئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے اکتسابی خصوصیات جو عصباتی نظام سے وابستہ نہیں ہیں عمل توارث سے نسل میں منتقل نہیں ہوتے اگر ایسا ہوتا تو تعلیم و تربیت

کی تمام کوششیں بیکار اور رائیگاں جاتیں۔

ذہنی توارث کی اہمیت بچہ کی نشوونما میں:

عمل توارث کے تحت ہر فرد (بچہ) ایک معینہ حالت میں طبعی استعداد اور ذہانت لیکر آتا ہے اور اس حالت کا تعین اسی وقت ہوجاتا ہے جبکہ وہ جنین (بچہ شکم مادر میں جب روح حیوانی سے بہرہ ور ہوتا ہے) ہوتا ہے یہ مقدار یا کیفیت کسی بچے میں کم اور کسی میں بیش ہوتی ہے یکساں نہیں ہوتی، چنانچہ اگر متعدد بچوں کو بالکل ایک سے ماحول میں رکھ کر ایک ہی قسم کی تعلیم و تربیت دی جائے تو بعد تکمیل تربیت وقابلیت محصلہ قابلیت اور لیاقت میں بیحد اختلاف ہوگا۔ معلم اخلاق شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست ✦ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

یہاں اسی فطری استعداد کا اختلاف ظاہر کیا گیا ہے۔ باغ میں ایک ہی قسم کے بیج بوئے جاتے ہیں ان کو پانی، ہوا اور روشنی بھی یکساں ہی پہنچتی ہے مگر پودوں میں پھر بھی یکسانیت نہیں ہوتی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود بیجوں کی طبعی استعداد اور اندرونی خاصیت میں اختلاف تھا ورنہ یہ صورت نہ ہوتی۔

ہم کسی ایسے بچے کو جو طبعاً ریاضی داں ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اپنی تمام قوتوں کو بھی اگر کام میں لے آئیں تو ایک اچھا ریاضی داں نہیں بنا سکتے۔ ایک بچہ جو قبول علم کی صلاحیت نہیں رکھتا، استادوں کی پوری توجہ کے باوجود بھی تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

زمیں شور سنبل بر نیارد
درآں تخم عمل ضائع مگرداں

غرضکہ بچہ کی تعلیم کے وقت اس کی فطری استعداد کو ملحوظ رکھ کر اس کی رہنمائی کرنا چاہیئے ورنہ وہ تعلیم بالکل بیکار ہوجائے گی۔

بچہ کی نشوونما میں ماحول کا حصہ:

یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ محض موروثی اثرات ہی سے شخصیت نہیں بنتی ہے۔ بلکہ ذاتی کوششوں، گرد و پیش کے اثرات جس کو ماحول سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تعلیم و تربیت کو بھی اس میں کافی دخل ہے۔ بچّہ کی نشوونما میں توارث اور ماحول کی نسبت سے شریک ہیں اور ان میں کون شریک غالب ہے اس کا فیصلہ نہ حکمائے قدیم کر سکے اور نہ عصر حاضر کے ماہرین نفسیات۔ مشرقی مصلحین میں شیخ سعدیؔ معلم اخلاق سمجھے جاتے ہیں مگر اس خصوص میں ان کی رائے بھی تذبذب سے خالی نہیں۔ کبھی وہ ؎

پسر نوح بابداں بنشست ÷ خاندانِ نبوتش گم شد

کہہ کر ماحول ہی کو سیرت سازی میں کارگر تسلیم کرتے ہیں اور کبھی ؎

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود ÷ گرچہ با آدمی بزرگ شود

کی تمثیل پیش کر کے توارث کا اقرار اور ماحول کے اثرات کا انکار کرتے ہیں۔ یہ تذبذب رائے اور اختلاف کچھ حکمائے مشرق ہی تک محدود نہیں بلکہ حکمائے مغرب اور عصرِ حاضر کے ماہرین نفسیات کا بھی یہی حال ہے۔ توارث کے سب سے بڑے حامی سر فرانس گالٹن ہیں اور انہوں نے اس کی اہمیت کو اتنا بڑھا دیا ہے جس کے سامنے ماحول کے اثرات تمام تر نظر انداز ہو گئے ہیں۔ ان کے مقابل میں ڈاکٹر ہیورڈ ہیں وہ کہتے ہیں کہ نفسیاتی توارث *Psychological Heredity* ایک خیالی بھوت ہے جو زندگی کے حقیقی واقعات کی روشنی میں آتے ہی فرار ہو جاتا ہے۔

اگرچہ وہ موروثی رجحانات کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان کی رائے میں ان کا عدم و وجود برابر ہے اور انہوں نے صاف طور سے کہہ دیا ہے کہ "انسان کی سیرت تعلیم و ماحول کا نتیجہ ہے نہ کہ توارث کا"۔ بہرحال اکثریت کا اتفاق اسی پر ہے کہ ماحول بچّہ کی ذہنی نشوونما میں شریک غالب ہے جس قسم کے ماحول میں اس کی نشوونما ہو گی۔ وہ انہیں خصوصیات سے آراستہ ہو گا۔ بچّہ کے لئے سب سے پہلا ماحول جب وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے "آغوشِ مادر ہے"، اس کے بعد گھر، پھر جب

اس کی صلاحیتوں میں اثر پذیری کی لچک پیدا ہونے لگتی ہے تو اس کے لئے تین ماحول بن جاتے ہیں۔ گھر، مدرسہ اور سماج۔ اس کی نشو و نما انہیں تینوں کے زیر اثر ہو گی۔ بچوں کی پرورش اور تربیت ان مختلف ماحولوں میں کس طرح کی جائے؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر ہم ان شاء اللہ آیندہ کبھی لکھیں گے۔

سکاٹ لینڈ کا نظامِ تعلیم

خواجہ غلام نبی بٹ

برطانیہ کلاں کے شمالی تیسرے حصّہ کو سکاٹ لینڈ کہتے ہیں۔ یہ قطعۂ زمین سطح کے لحاظ سے تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بالائی حصّہ پہاڑی ہے لیکن سب سے اُونچے پہاڑ کی بلندی صرف ۴۴۰۰ فٹ ہے۔ وسطی حصّہ زرخیز میدان ہے اور زیرین حصّہ ایک سطح مرتفع ہے۔ جگہ جگہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ جن کا پانی ندی نالوں کی صورت اختیار کر کے وسطی علاقہ کی جھیلوں میں جا گرتا ہے۔ ان جھیلوں کو ایک ۶۲ میل لمبی مصنوعی نہر کے ذریعے سمندر سے ملا دیا گیا ہے۔ تاکہ جہاز رانی کے لئے مفید ہو سکے۔ ندی۔ نالے۔ جھیلیں۔ سبز پوش پہاڑ اور ہرے بھرے میدان اس خطہ کی قدرتی خوبصورتی کو دوبالا کرتے ہیں۔ سکاٹ لینڈ کا کُل رقبہ تیس ہزار مربع میل کے قریب ہے اور آبادی کوئی ساٹھ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ لوگ نہایت خوبصورت۔ سرو قامت۔ تنومند۔ محنتی۔ جفاکش اور کفایت شعار واقع ہوئے ہیں۔ اور ان کے متعلق یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ وہ گزشتہ ساٹھ ستر سالوں سے جزائر برطانیہ کی سیاسی، تعلیمی، صنعتی اور تجارتی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ امریکہ۔ آسٹریلیا۔ کینیڈا۔ جنوبی افریقہ اور دوسری برطانوی نوآبادیوں میں

کثیر تعداد میں جا بسے ہیں۔ اوران ممالک کے دوسرے نوآبادکاروں سے اپنی فنی اور دماغی قابلیت کالوہا منوا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے بہترین عیسائی مشنری بھی سکاٹ لوگ ہی ہیں۔ اس ساری مادی اور روحانی ترقی کا رازان کے ملک کے نظام تعلیم میں مضمر ہے۔ جو گذشتہ چار صدیوں سے جبکہ جان ناکس (John Knox) نے ۱۵۶۰ء میں اپنی مشہور کتاب (First book of discipline) کو ترتیب دیا تھا۔ روائیتی طور پر جمہوری اور قومی چلا آرہا ہے۔ ان لوگوں کو اس بات پر بجا طور پر ناز ہے کہ ان کے ہاں انگلستان کی طرح امرا اور غربا کے بچوں کے لئے علیحدہ علیحدہ اسکول نہیں ہیں۔ بلکہ سب بچے ایک ہی قسم کے سرکاری اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ انگلستان میں پبلک اسکول ان اسکولوں کو کہتے ہیں۔ جہاں صرف امرا کے بچے بھاری فیس ادا کرکے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ لیکن سکاٹ لینڈ میں پبلک اسکول ان اسکولوں کو کہتے ہیں۔ جہاں قوم کا ہر بچہ خواہ وہ غریب ترین گھرانے سے ہی تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ داخل ہو سکتا ہے۔ یہاں کے پبلک اسکولوں میں ایک امیر ترین سوداگر۔ کارخانہ دار اور ایک غریب مزدور یا دکاندار کا لڑکا ایک ہی جگہ بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں کسی امیر لڑکے کے دل میں اپنے غریب ہم جماعت کے متعلق کبھی نفرت وحقارت کا خیال تک بھی نہیں آسکتا۔ ملک میں چار یونیورسٹیاں ہیں۔ ایڈنبرا۔ گلاسگو۔ سینٹ اینڈریوز اور ایبرڈین اوران کا طریق بھی خالص جمہوری ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ لوگوں میں تعلیم کا شوق بہت عام ہے اور ہر بچہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ کہ وہ ملک کی اعلیٰ تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھائے۔ کوئی بچہ اپنے والدین کی ناداری اور غربت کی وجہ سے زیور تعلیم سے محروم نہیں رہتا۔ کیونکہ گورنمنٹ کی طرف سے بے شمار وظائف اور دیگر امدادی رقوم کا انتظام موجود ہے۔ ہر بچہ کو اس کی عمر۔ دماغی قابلیت اور طبعی رجحان کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرد زندگی کی دوڑ میں اپنی اپنی جگہ کامیاب نظر آتا ہے۔ آئیے اس ملک کے دلچسپ تعلیمی نظام کو اس کی خشت اول سے دیکھنے کی کوشش کریں۔

(۱) نرسری اسکول:

یہ سکول ۲ سال سے ۵ سال کی عمر کے بچوں کے لئے ہیں۔ ان اسکولوں کے اجرا کے لئے پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر ۱۹۱۸ء کے ایجوکیشن (سکاٹ لینڈ) ایکٹ میں اہتمام کیا گیا تھا اور پھر سنہ ۱۹۳۰ء میں سکاٹش ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ نے اس مہم کو تیز تر کرنے کے لئے ایک میمورینڈم بھی نکالا تھا لیکن اس سلسلہ میں چند مالی وجوہات کی بنا پر کوئی زیادہ ترقی نہ کی جا سکی۔ یہاں تک کہ ۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء کو سارے سکاٹ لینڈ میں صرف ۱۹ نرسری اسکول تھے ۔ جن میں ۸۷۵ بچے درج رجسٹر تھے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں جبکہ بیشتر مائیں فیکٹریوں میں کام کرنے کے لئے چلی جایا کرتی تھیں۔ تو انہی نرسری اسکولوں نے چھوٹے بچوں کی غور و پرداخت کے سلسلہ میں بہت مفید کام کیا۔ مزید برآں موجودہ صدی کے ڈاکٹروں تعلیمی ماہروں اور نفسیات کے عالموں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دو سال سے پانچ سال تک کی عمر کا عرصہ انسانی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اسی عمر میں اکثر بچے کم سمجھ والدین کی غفلت کی وجہ سے متعدد بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یا اگر بچ بھی نکلیں۔ تو ان کی جسمانی اور دماغی حالت بہت کمزور رہ جاتی ہے۔ چنانچہ انہی خطرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ۱۹۴۵ء کے ایجوکیشن (سکاٹ لینڈ) ایکٹ کی رو سے ہر مقامی تعلیمی محکمے کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے۔ کہ وہ نرسری اسکولوں کے اجرا کے لئے مناسب انتظام کرے۔ اب اس قسم کے اسکول قابل اور سند یافتہ استانیوں کی زیرِ نگرانی بیش از بیش تعداد میں کھل رہے ہیں۔ اور وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔ ایسے اسکولوں کی خاص طور پہ بڑے بڑے صنعتی علاقوں میں ضرورت ہے۔ چنانچہ گلاسگو کے شہر میں اس وقت ۳۶ نرسری اسکول موجود ہیں۔ اگرچہ ان اسکولوں میں بچوں کا بھیجنا لازمی نہیں ہے لیکن زیادہ سے زیادہ والدین ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور اس قسم کے مزید اسکول کھولے جانے کے لئے درخواستیں دے رہے ہیں۔ ایک نرسری اسکول عام طور پر ۴۰ سے ۵۰ بچوں کے لئے ہوتا ہے۔ اسٹاف ایک تربیت یافتہ

استانی - ایک معاون استانی، دو نوجوان معاون لڑکیوں اور ایک باورچن پر مشتمل ہوتا ہے
بچوں کو ان کی مائیں صبح ۹ ½ بجے اسکول چھوڑ جاتی ہیں اور شام کو ۴ ½ بجے واپس لے جاتی ہیں -
بچے اِن آٹھ گھنٹوں کے لئے اسکول کی چار دیواری میں ایک طے شدہ ٹائم ٹیبل کے مطابق کھیل کود
میں معروف رہتے ہیں - اسکول میں ہر بچہ کے لئے اپنا اپنا تولیہ - صابن - دانت صاف کرنے کا
برش اور کنگھی موجود رہتی ہے - اسکول آتے ہی ہر بچہ اپنی استانی کی زیرِ نگرانی منہ ہاتھ دھوتا ہے
دانت صاف کرتا ہے - بالوں میں کنگھی کرتا ہے اور پھر اپنے استعمال کی چیزیں اپنی ایک خاص
مقررہ جگہ پر سنبھال کر رکھ دیتا ہے - جب سب بچے تیار ہو جاتے ہیں تو وہ چھوٹے بچوں کے گیت
(Nursery Rhymes) سیکھتے ہیں اور مل کر گاتے ہیں - ٹھیک دس بجے ہر بچے کو دودھ کی
ایک ایک بوتل (بغیر کھانڈ ڈالے) پینے کے لئے مل جاتی ہے - پھر سب بچے چھوٹی چھوٹی بچہ گاڑیاں
ٹرائسکلوں - پنگوڑوں اور مختلف قسم کے تعلیمی کھلونوں سے کھیلنا شروع کر دیتے ہیں - اس سے انکی
کافی ورزش ہو جاتی ہے - اور اعضائے جسمانی کے مضبوط ہونے میں مدد ملتی ہے ۱۲ ½ بجے دوپہر
کا کھانا پورے آدابِ مجلس کے ساتھ کھایا جاتا ہے - اور ایک بجے سب بچے اپنے ننھے منھے اور
صاف بستروں میں سو جاتے ہیں تین بجے سو کر اُٹھتے ہیں - تو ہاتھ مُنہ دھو کر چائے کی ایک ایک
پیالی ایک بسکٹ کے ساتھ پی لیتے ہیں - پھر مل کر گیت گانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے - مہربان
استانی ہر ایک بچے سے صاف اور سلیس زبان میں گفتگو کرتی ہے اور ان کی جھجک اور ہچکچاہٹ
کو دُور کرنے کی کوشش کرتی ہے - حتیٰ کہ اسکول بند ہونے کا وقت ہو جاتا ہے - یہ اسکول بھی
بڑے بچوں کے اسکولوں کی طرح ہفتہ میں صرف ۵ دن کھلتے ہیں - ہفتہ اور اتوار کے روز بچے اپنے
والدین کے پاس رہتے ہیں - یاد رہے کہ ان اسکولوں کا مقصد بچوں کو مناسب ورزش اور آرام کے
ذریعہ صحت مند بنانا - ان کی عادتیں سنوارنا اور ان کی روزمرہ کی زندگی کو باقاعدہ بنانا ہے - نرسری
گیتوں کے علاوہ کسی قسم کی لکھائی پڑھائی کا کام ان اسکولوں میں نہیں کیا جاتا - نرسری اسکولوں
میں کوئی فیس نہیں لی جاتی - لیکن ہر بچے کو فی ہفتہ دو شلنگ ۱۱ پنس کی رقم دوپہر کے کھانے اور

جائے کی قیمت کے طور پر دینا پڑتی ہے۔ صبح کا دودھ سرکار کی طرف سے مفت ملتا ہے۔

(۲) پرائمری اسکول:

یہ اسکول ۵ سال سے ۱۲ سال کی عمر کے بچوں کے لئے ہیں۔ اگرچہ نرسری اسکولوں میں بچوں کو بھیجنا والدین کی اپنی مرضی پر منحصر ہے لیکن ۵ سال کی عمر کے بعد ہر بچے کو کسی پرائمری اسکول میں بھیجنا لازمی ہے۔ پہلے دو سالوں میں کنڈر گارٹن کی طرز پر تعلیم دی جاتی ہے اور پھر باقاعدہ لکھائی پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سلیبس میں دستکاری۔ حساب۔ انگریزی لکھائی پڑھائی۔ مطالعہ قدرت۔ جغرافیہ۔ تاریخ اور موسیقی کے مضامین شامل ہیں۔ ورزش جسمانی اور مذہبی تعلیم کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر روز پہلا پیریڈ مذہبی تعلیم کے لئے وقف ہوتا ہے۔ پرائمری اسکولوں میں بچوں کی تعلیم اکثر و بیشتر استانیوں کے سپرد ہے۔ صرف ہیڈ ٹیچر مدرسہ کے بہتر انتظام کے لئے عموماً تجربہ کار مرد ٹیچر ہوتے ہیں۔ ۱۲ سال کی عمر تک سب بچے ایک ہی قسم کے مضامین میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جوں جوں بچہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ اس کے امتحانوں کے نتائج۔ اس کی دماغی قابلیت اور طبعی رجحان کے متعلق مختلف اساتذہ کی آراء اس کی پروگریس رپورٹ میں درج ہوتی رہتی ہے۔ پرائمری کا کورس ختم کرنے کے بعد ہر بچہ اپنی پروگریس رپورٹ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اسی رپورٹ کے مندرجات اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی رائے کی روشنی میں بچے کے آئندہ اسکول کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

(۳) سیکنڈری اسکول:

پرائمری اسکول کے امتحانات ختم کرنے کے بعد انگلستان میں بچوں کو تین مختلف گروہوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ اعلیٰ دماغی قابلیت کے لڑکے گرامر اسکولوں میں۔ درمیانی درجہ کے بچے سیکنڈری موڈرن اسکولوں میں اور سب سے کم دماغی قابلیت کے بچے ٹیکنیکل اسکولوں میں چلے جاتے ہیں لیکن سکاٹ لینڈ میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں سب بچے ایک ہی اسکول میں جسے (Omnibus Secondary School) کہتے ہیں۔ داخل ہو جاتے ہیں۔ قابلیت

کے اعتبار سے بچوں کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کرلیا جاتا ہے۔ اعلیٰ قابلیت کے بچوں کے لئے مختلف نصاب ہیں۔ جن میں زیادہ تر پڑھائی کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ کم دماغی قابلیت کے بچوں کے نصاب میں دستی کام کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے تاکہ پندرہ سال کی عمر میں جب وہ اس اسکول کو چھوڑیں تو وہ کسی اعلیٰ ٹیکنیکل اسکول میں جاکر اپنے مرغوب فن کی تکمیل کرکے ماہر کاریگر بن سکیں۔ اعلیٰ دماغی قابلیت کے بچے ۱۶ سال کی عمر تک اپنی تعلیم اسی اسکول میں جاری رکھتے ہیں۔ پھر ان میں سے چند ایک کاروباری اسکولوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور نہایت ہی اعلیٰ دماغی قابلیت کے بچے مزید دو سال تک اسی اسکول میں یونیورسٹی میں داخلہ کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ۱۸ سال کی عمر میں سکاٹش ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کا (Higher School Certificate) کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کرکے اپنے آپ کو یونیورسٹی میں داخل ہونے کا مستحق بنا لیتے ہیں۔ یہ امتحان ہماری یونیورسٹیوں کے درجہ انٹرمیڈیٹ کے برابر ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سیکنڈری اسکولوں کے پاس کرنے والوں کا صرف پانچ فیصدی حصّہ یونیورسٹی میں جاتا ہے اور باقی ۹۵ فیصدی ملک کے دوسرے صنعتی اور کاروباری اداروں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں داخل ہونے والے طلبا واقعی اس قابل ہوتے ہیں۔ کہ وہ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیمی سہولتوں سے استفادہ کرسکیں۔ اور ملک کے مایہ ناز سپوت بن سکیں۔ اس طرح قوم کا ہر فرد اپنی اپنی استعداد کے مطابق قومی شان کو دوبالا کرنے میں مستعد نظر آتا ہے۔ اور اس سے وہی کام لیا جاتا ہے جس کے وہ قابل نظر آتے ہے۔

(۴) دماغی اور جسمانی طور پر کمزور بچوں کے اسکول:

کچھ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کی دماغی اور جسمانی حالت بہت ہی پست درجہ کی ہوتی ہے۔ اگر ان بچوں کو عام اسکولوں میں رکھا جائے۔ تو وہ اپنی مسلسل ناکامیوں سے جی چھوڑ بیٹھیں اور کسی کام کے نہ رہیں۔ ایسے بچوں کے لئے علیحدہ اسکولوں کا انتظام ہے۔ جہاں وہ ۱۶ سال کی عمر تک ٹھہرتے ہیں۔ اور اس عمر کو پہنچنے تک ان میں اتنی قابلیت ضرور آجاتی ہے۔ جو علم

بچوں میں گیارہ بارہ سال کی عمر تک ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کوئی مفید کام بھی سیکھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کمزور دل۔ کمزور نظر۔ گونگے۔ بہرے اور اندھے طلباء کے لئے کھلی ہوا میں رہائیشی اسکول موجود ہیں۔ جہاں ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی صحت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ غرض قوم کے اس کمزور بازو کو اس خاص قسم کی "مالش" سے اس قابل بنا دیا جاتا ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں اپنی روزی کمانے کے قابل ہو سکیں۔ اور قوم پر ان کا وجود ایک بار بن کے نہ رہ جائے۔

بچوں کی جسمانی صحت اور خوراک کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر بچے کو صبح پہلے پیریڈ کے بعد ایک بوتل دودھ پینے کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مفت ملتا ہے۔ قریباً ۹۰ فی صدی بچے دوپہر کا کھانا نہایت سستے داموں یعنی صرف ۵ پنس فی کھانے کے حساب سے اسکول کے ڈائننگ ہال میں ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ اسکولوں میں ڈاکٹری معائنہ کا انتظام نہایت ہی اعلیٰ ہے۔ مناسب علاج اور حفظ ماتقدم کی تدابیر کے ذریعہ بچوں کو آئندہ آنے والے خطرات سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اور ان کو اس قابل بنا دیا جاتا ہے کہ وہ بے فکری سے اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دے سکیں۔ کچھ انہی فوائد کا ذکر کرتے ہوئے سیکرٹری آف سٹیٹ فار سکاٹ لینڈ نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں کہا تھا۔ کہ پندرہ سال کی عمر تک تعلیم کو لازمی قرار دے کر اور اس کے ساتھ تین ایمز (Ms) یعنی Midday Meals اور Milk و Medical Inspection کا مناسب انتظام کر کے ہم نے سکاٹ لینڈ کی تعلیمی کشتی کو جہالت کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ اور اب ہمارا تعلیمی نظام دنیا کے کسی دیگر ترقی یافتہ ملک سے دوسرے درجہ پر نہیں ہے۔

اِنشاءپردازی اور ہمارے مدارس

قاضی عبدالقدیر

کسی قوم کا بہترین اور لازوال سرمایہ اُس کا ادب ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی استدلال کی محتاج نظر نہیں آتی۔ پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لئے تو اس کی اہمیت دوسرے ممالک کی نسبت اور بھی زیادہ ہے۔ اِس میں کوئی کلام نہیں کہ اُردو زبان کی موجودہ وسعت اور اُس کا ہمہ گیر دامن جملہ علوم وفنون کے اظہار پر کافی حد تک قادر ہیں تاہم ہمیں یہ چیز ابھی شدّت سے محسوس ہو رہی ہے کہ فی الحال ہماری زبان کو کئی ایک اور ارتقائی مراحل ومنازل درپیش ہیں۔ اِن میں سے کچھ نئے ماحولی اقتضا سے بھی لازم آئے ہیں۔

انشاء ادب کی اساس ہے۔ یہی ادبِ عالیہ کی گُلکاریوں کی ابجد ہے۔ ہمیں ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے ادیب پیدا ہوں جو ہماری زبان کو ہر لحاظ سے غیر ملکی زبانوں کے دوش بدوش لا کھڑا کریں۔ اور اس کے دامن کو مختلف علوم متداولہ سے مالا مال کرتے چلے جائیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ایسی انشا پردازی کی بنیاد مدارس کی ابتدائی

جماعتوں میں ہی رکھی جانی ضروری ہے۔ تاکہ بچے کی تدریجی نشوونما کے پہلو بہ پہلو اس کی زبان بھی سنورتی چلی جائے حتیٰ کہ مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہونے تک طالب علم ادب کی اکثر اور ضروری لطافتوں سے اچھی طرح روشناس ہو چکا ہو۔ لیکن جس قدر غفلت اِس باب میں آجتک روا رکھی گئی ہے اس کی تلافی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ البتہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ جہاں پہلے حالات میں ترقی کے ذرائع اگر مسدود نہ تھے تو بے حد محدود ضرور تھے۔ مگر اب وہاں میدان وسیع ہے اور ترقی کے وسائل کافی حد تک تسلی بخش۔ اِن وسائل سے پورے طور پر متمتع ہونے کے لئے تین امور پر یہاں روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اوّل انشاء پردازی کی حقیقت۔ دوسرے اساتذہ اور تلامذہ کے فرائض۔ اور تیسرے محکمہ کی توجہّ۔

درسی انشاء پردازی کی اصلیت اور اس کی تفہیم کے لئے یہاں ایک نہایت ہی سادہ تمثیل لائی جاتی ہے۔ انشاء پردازی کا عمل تعمیری عمل ہے۔ اور عماراتی تعمیر کے متوازی حرکت کرتا ہے۔ چنانچہ اوائل سے اواخر تک دونوں میں مختلف مدارج عمودی اور افقی طور پر کامل ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ عنوان کی حیثیت میدانِ تعمیر یا سفیدہ کی ہے۔ دونوں کے انتخاب کی دقتوں اور احتیاطوں سے کون آشنا نہیں؟ خاکہ کی تیاری اور اُس کی اہمیت ہر دو میں خوب روشن ہے۔ اس کے بغیر دونوں کے عمل کا نتیجہ فنیّ نظر میں سعی لاحاصل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ الفاظ و معانی کا مہیا کرنا عماراتی مسالہ کی فراہمی سے مماثلت تامہ رکھتا ہے۔ جن کا جمع کرنا ہر حالت میں مجوزہ عنوان و مکان کی رعایت سے لازم آتا ہے۔ عنوان کی حیثیت کے مطابق الفاظ و معانی کا ارتباط اور اُن کا ہم آہنگ ہونا ویسے ہی ضروری ہے جیسے ایک خاص حیثیت کی عمارت کے لئے خاص قسم کے مسالوں کی ترکیب۔ ہم یہاں سے یہ کہے بغیر نہیں گذر سکتے کہ ہمارے اکثر اساتذہ کا اپنا ذخیرہ بسا اوقات ایک دیوالیئے کی بے بسی کی حسرتناک تصویر پیش کرتا ہے اُن کے پاس گنتی کے چند الفاظ، چند نپے تُلے کتابی فقرے اور کچھ فرسودہ و پامال خیالات کے سوا کوئی قابلِ لحاظ علمی ادبی سرمایہ نہیں ہوتا۔ بھلا بھوکا بھوکے کو کیا دے گا۔ ایک

زندہ شمع سینکڑوں مردہ شمعوں کو منور کر سکتی ہے۔ مگر سینکڑوں مردہ شمعیں باہم مل کر بھی ایک مُردہ شمع کو روشن نہیں کر سکتیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جو اساتذہ تربیت حاصل کرتے ہیں وہ تعلیمی حیثیت سے بہت پست معیار رکھتے ہیں اور یہ خامی صاف طور پر دُور رس نقصانات کی حامل نظر آرہی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر کل کے اُستاد کی ذاتی قابلیت کے معیار کو بلند کرنے کی سعی نہ کی گئی تو یقین جانئے کہ انشاء اور ادب تو کہیں رہے قوم و ملک ارتقائی فضا سے اِدھر ہی پڑاؤ کرنے پر مجبور نظر آئیں گے۔

الفاظ و معانی کی فراہمی کے بعد اُن کی تربیت نہایت ہی اہم چیز ہے۔ ظاہر ہے کہ معمار بھی مسالے کا آمیزہ ایک خاص ترکیب اور تناسب سے تیار کرتا ہے۔ اور پھر اینٹ پتھر کی ترتیب کو پورے طور پر ملحوظ رکھتا ہے۔ اِس سے آگے چل کر ایک اور ضروری منزل ہے جس سے بیشتر اساتذہ آنکھیں بند کئے رہتے ہیں یعنی ترقی کی حرکات میں ایک خاص ڈگر کا پیش نظر رکھنا۔ اِصلاحِ مضامین سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے۔

طلباء کو آزادانہ اظہارِ خیال کا موقع دینا اشد ضروری ہے۔ استاد عموماً خود مضامین املا کرا دیتے ہیں۔ یہ ذاتی اُپج کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔ اور مدرسے کی فضا میں اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اُستاد کا یہ رویّہ بڑے سے بڑے ملکی گناہ کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ قصور معافی کے قابل نہیں۔ یہی روش خود اعتمادی، قوتِ استدلال، غور و فکر اور سب سے بڑھ کر آئندہ پیدا ہونے والے اسالیب کا بیدردی سے قلع قمع کر دیتی ہے طلباء کی شخصیتیں گویا غنچۂ مرگ ہو جاتی ہیں۔

آخری منزل بھی بالکم و کاست دونوں میں قریبی مشابہت رکھتی ہے۔ جس طرح عمارت کی تکمیلی تصدیق اُس کی حیثیت کے مطابق آخری ٹیپ ٹاپ کے فقدان کے باعث ثبت نہیں کی جا سکتی اُسی طرح اِنشاپرداز اگر اپنے مضمون کے خاتمے پر اس لطافت کے پیدا کرنے سے قاصر رہتا نظر آئے جو منتہائے حسن ہوتی ہے تو مضمون ضرور پھیکا اور بے مزہ ہوگا۔ اِس کے علاوہ اختتامی حسن کی

خلقت کے لئے اُس کے قلم کی چند ہلکی ہلکی اور اشاراتی حرکتیں اگر بروئے کار نہ آئی ہوں تو مضمون انشاء پرداز کا ایسا ادھورا نقش ہوگا جس طرح ایک رفیع الشان عمارت باوصف تکمیل صرف پلستر اور سفیدی وغیرہ سے محروم رکھی جائے۔

دوسرے درجہ پر اُستاد اور شاگرد کے فرائض کا ذکر ضروری ہے۔ اُستاد پر بڑے اہم فرائض عاید ہوتے ہیں۔ سب سے مقدم اس کے مطالعہ کا تسلسل ہے۔ ہمارے اساتذہ فکرِ معاش سے آزاد نہیں ہوتے۔ اُن کے مشاہرے قلیل اور ذمہ داریاں کثیر۔ چادر سر کی طرف کھینچتے ہیں۔ تو پاؤں ننگے اگر پاؤں ڈھکتے ہیں تو سر برہنہ، چنانچہ مجبوراً اُنہیں گلخن میں کئی ایک سلاخیں گرم رکھنی پڑتی ہیں۔ جس سے اُن کے لمحاتِ فکریہ جن میں وہ ذخائر علمیہ سے متعارف ہو سکتے ہیں معاش کی کشاکش کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جب اُستاد کے جمود کی حالت یہ ہو تو طلباء کی ذوقی اشتہاء اور اُس کی شدت معلوم۔ وہ تو خدا سے پتھر کا صمٌ بکمٌ اُستاد چاہتے ہیں جو اُنہیں ہر کاہش و کاوش سے بچا کر صرف ایسی رموزت سے آشنا کر دے جو سالانہ ترقی کی ضمانت ہو سکتی ہوں اور بس! مدرسے کے اُستادِ اعلیٰ کا اوّلین فرض یہ ہے کہ اساتذہ سے ہر ماہ کے خاتمے پر تازہ مطالعہ کے کوائف طلب کرے۔ بلکہ اُن کی ڈائری میں ہر اُس کتاب کی تلخیص کا مطالبہ کرے جو اُن کے مطالعہ سے گذری ہو۔ اُس کا دوسرا فرض لائبریری میں ماہ بماہ تازہ ترین ادبیات کا اضافہ ہے۔ معاون اساتذہ کے لئے تیسری احتیاط آئندہ لکھائے جانے والے مضامین کی تدریجی ترتیب ہے۔ ایسی فہرست سال کے شروع ہی میں مرتب ہو جانی چاہیئے۔ یہ فہرست ہر قسم کے مضامین پر منحصر ہونی چاہیئے۔ مثلاً ماحولی موجودات، ذاتی پسند کی چیزیں، موسموں کے بیان، پیشہ وروں اور فنکاروں کے حال، ملکی اور غیر ملکی تاریخی و جغرافیائی مضامین، ہولناک حادثات اور خوفناک مناظر کی کیفیت، اختراعات و ایجادات حاضرہ کے موضوع، سوانح نگاری وغیرہ۔ دوسرے اِس فہرست میں استعمال کئے جانے والے الفاظ و خیالات کی گوناگونی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ موضوع کی ارتقا کے ساتھ ذخیرۂ الفاظ و خیالات بھی اُسی رفتار سے قوتِ بیانیہ کے معاون ہوتے

چلے جائیں۔

طلباء سے ہر اصلاح کے بعد مطالبہ کیا جائے کہ وہ تصحیحات کی مشق کرکے پھر سے اُستاد کے دستخط ثبت کرائیں۔ ورنہ اِصلاح بیکار ہوگی۔ اور اغلاط کا اعادہ ضرور ہوتا رہے گا۔ اُستاد مطمئن رہے گا۔ کہ فلاں فلاں قسم کی غلطیوں کی اصلاح ہو چکی ہے اور اب اعادہ کا امکان نہیں۔ یہ مفروضہ محض خوش فہمی ہے۔ عام غلطیوں اور اُن کی تصحیح کے نقشے ہر جماعت کے معیار کے مطابق اُس کے کمرے میں آویزاں رکھنا بھی سُود مند ہے بشرطیکہ طلبا کی توجہ وقتاً فوقتاً نئے اضافوں کے سلسلے میں اُس کی طرف دلچسپی کے ساتھ منعطف کرائی جائے۔

اِسی طرح ہر جماعت میں جماعتی لائبریری کا موجود رکھنا اور اُس سے طلبا کا مستفید ہوتے رہنا بھی بے حد ضروری ہے۔ طلباء میں زائد مطالعہ کی ترغیب و تحریص بھی اُستاد کے اپنے ذوق کی افراط یا تفریط پر منحصر ہے۔ ہر جماعت کے ذمہ دار اُستاد پر اس بات کا جائزہ لینا کہ طلبا نے مستعار لی ہوئی کتب سے استفادہ کیا ہے یا نہیں ایک ضروری فرض ہے۔ اِس ضمن میں آخری چیز خوشخطی کے معقول معیار کا قائم کرنا اور قائم رکھنا ہے۔

مقالے کے خاتمے سے پہلے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انشاء پردازی حکومت کی بالعموم اور محکمے کی بالخصوص سرپرستی کی بڑی حد تک محتاج ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ قومی فلاح و بہبود کے پیش نظر تمام معیاری جرائد اور ادبی رسائل کے لئے ہر اسکول کو کافی گرانٹ دے۔ جس کی موجودہ شرح اعلےٰ لٹریچر کی فراہمی کے لئے قطعاً مکتفی نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ یا تو لائبریری اور ریڈنگ روم کے چندوں کی شرح میں مناسب اضافے کی اجازت دے۔ یا لائبریری گرانٹ میں مستقل اور موزوں اضافہ کرے۔ دوسرے ہر سال اعلےٰ درجہ کے ایسے ادبی مواد کی سرکاری طور پر فہرست شائع کرکے اسکولوں میں تقسیم کرائے اور اُنکے خریدنے کیلئے گرانٹ دے جو ہر اسکول کے تمام مختلف درجات کیلئے موزوں ہو طلبا اور اساتذہ کے جذبۂ تقابل کو حوصلہ افزائی سے ہوا دیا جائے یعنی عمدہ مضمون نویسی کے انعامی مقابلے کرائے جائیں۔ اس تحریص و ترغیب کا لازمی نتیجہ اعلیٰ مضامین اور ارفع مقالوں کی موفور پیداوار ہوگی۔

رُوسی کسان اور کان کن

انور قریشی

تعارف :

(رقبہ) روس وسعت کے لحاظ سے شمالی ایشیا کے تیسرے حصّے اور مشرقی یورپ کے نصف حصّے پر مشتمل ہے۔ اس کا کل رقبہ ۲۲۰ لاکھ مربع میل ہے۔ اور اس لحاظ سے روس تمام مملکتِ برطانیہ سے بڑا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ دنیا کی ہر ایک مملکت سے بڑا ہے۔ اور آبادی کے لحاظ سے دنیا میں روس کا درجہ تیسرا ہے۔ کیونکہ مملکتِ برطانیہ اور چین کی آبادی روس کی آبادی سے بہت زیادہ ہے۔ اگر ہندوستان کو ہم مملکتِ برطانیہ میں شامل نہ کریں۔ تو آبادی کے لحاظ سے روس کا دنیا میں چوتھا درجہ ہے۔ روس کی اس وقت آبادی ساڑھے بیس کروڑ کے لگ بھگ ہے اس ملک میں کوئی ۱۲۰ قومیں آباد ہیں۔ یہاں متحدہ ہندوستان کا سا تعصب مفقود ہے۔ تمام انسانوں کو یورپ کے دیگر ممالک کی طرح پورے شہری حقوق حاصل ہیں۔ بلکہ نسلی اور قومی تفوق خلافِ قانون ہے۔ ساٹھ بڑی بڑی قومیتوں کے علیحدہ علیحدہ علاقے ہیں۔

سطح :

روس کا علاقہ اِس قدر وسیع ہے کہ مختلف حصّوں میں مختلف جغرافیائی حالات پائے جاتے ہیں۔ ملک کا مغربی اور زیادہ آباد حصّہ میدانی ہے جس کے وسط میں اورل نام کے پہاڑ ہیں۔ انتہائی جنوب میں یہی پہاڑ سلسلۂ قفقاز میں جا شامل ہوتے ہیں۔ اگرچہ ملک کا بیشتر حصّہ پہاڑی ہے۔ تاہم یہ پہاڑ کم بلند ہونے کے باعث عام نقل و حرکت میں اس قدر مزاحم نہیں ہیں۔

آب و ہوا :

یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ کی مجموعی آب و ہوا مغربی یورپ کی آب و ہوا کی نسبت زیادہ شدت کی ہے۔ اور اس میں نمی کم ہے۔ جوں جوں ملک کے اندرونی حصّوں میں چلتے جائیں۔ آب و ہوائی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے موسم گرما نسبتاً خشک اور گرم ہوتا ہے۔ اِسی طرح موسم سرما میں سخت سردی پڑتی ہے۔ درجۂ حرارت ۲۰ درجے سنٹی گریڈ تک چلا جاتا ہے۔ تمام ملک کا کم و بیش سردیوں میں یہی حال ہوتا ہے۔ جنوب میں پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ البتہ سردی کم ہوتی ہے۔

نباتات :

شمال میں بے گیاہ ٹنڈرا کی دلدلیں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جنوب میں گھنے جنگلات ہیں جن سے تقریباً نصف ملک ڈھنپا ہوا ہے۔ اِس جنگل کے جنوب میں سٹیپ کا میدان شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں کہ سیاہ مٹی کے علاقے واقع ہیں۔ اس کے بھی جنوب میں بحیرۂ کیسپین کے مشرق کی طرف صحرائی خطّے واقع ہیں۔ جہاں خوب گرمی پڑتی ہے اور فضا میں رطوبت کا نام تک نہیں۔ ان خطّوں میں مویشی پالے جاتے ہیں۔ مگر دریاؤں کے کناروں پر نخلستانوں میں کپاس کی کاشت کی جاتی ہے۔

نئی زندگی کی ابتدا :

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے باعث روس کے اجتماعی وسائل پیدائش میں بے حد تبدیلی آئی۔ زار کا روس زرعی ملک تھا مگر اشتراکی روس صنعتی ملک ہے صنعتی انقلاب یہاں تک کامیاب ہے کہ روس کی پیداوار ۵۰ گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ روس کی صنعتی ترقی ایک علیحدہ باب ہے۔ ہرچند کہ صنعتی پیداوار زرعی پیداوار سے بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ تاہم روسیوں کی اکثریت زراعت ہی کو ذریعۂ معاش بنائے ہوئے ہے۔ یہ حقیقت روس کی شہری اور دیہی آبادی کے تناسب سے بھی ظاہر ہے۔ مثلاً تمام ملک کی آبادی کا ۳۰ فی صدی حصّہ شہروں میں آباد ہے اور ۷۰ فی صدی دیہات میں زندگی گذار رہا ہے۔

کسانوں کی اکثریت "اجتماعی کاشت" کے طریقوں میں شامل ہے۔ ان میں مزدوری اوزاروں اور ذرائع پیداوار کی ملکیت اجتماعی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طریق کی زراعت کے باعث روس دنیا میں سب سے بڑے میکانکی نظامِ کاشت کا موجد ہے۔ ۱۹۴۰ء میں اس ایک ملک میں ۵۲۴۰۰۰ ٹریکٹر اور ۱۸۲۰۰۰ فصل کاٹنے کے آلات مستعمل تھے۔ اس وقت روس دنیا میں گندم، رئی، جئی، گنّا، سن اور کپاس کی پیداوار کے لئے کسی دوسرے ملک سے پیچھے نہیں ہے۔ ان زرعی اشیاء کے علاوہ روس میں مویشیوں کی چند ایک بہترین نسلیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اجتماعی اندازِ کاشت اور زیرِ کاشت خطّوں کی توسیع اور کاشت کے لئے بہترین آلات کے استعمال سے روس میں ایک زبردست زرعی انقلاب آچکا ہے۔

عمومی معاشی ترقی کے باعث عوام کی معاشرتی حالت بتدریج بہتر ہوگئی ہے۔ وہ مفلسی سے رفتہ رفتہ نجات پاگئے ہیں حتیٰ کہ ۱۹۳۱ء کے بعد ملک میں بیکاری قطعاً دُور ہوگئی۔ مالی بہبودی کے ساتھ ساتھ تمدنی سطح بھی بلند ہوتی گئی۔ چنانچہ تعلیمی ترقی کا یہ عالم ہے کہ یہاں ۱۸۹۷ء میں ۲۴ فیصدی آبادی خواندہ تھی۔ ۱۹۳۹ء میں سَو میں سے ۸۱٫۲ روسی تعلیم یافتہ تھے اور اب روس میں ۹۰ فیصدی سے زائد آبادی خواندہ ہے۔ ۱۹۳۹ء میں اعلیٰ روسی درسگاہوں میں ۶۰۰,۰۰۰ طلبا زیرِ تعلیم تھے۔

تماعی کاشتکار کی مثال:

آج سے چند سال پیشتر تولا خطے کے ایک یاکو ولوو وگاؤں میں ایک انگریز سیاح ہیرو ینیسن نامی کسان کے گھر ٹھہرا۔ اس کے آنکھوں دیکھے حالات اِتنے دلچسپ ہیں کہ ہم نہیں ل کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ لکھتا ہے کہ وینسن ایک اجتماعی فارم کا مالک ہے اور اسی فارم ں اپنے تین لڑکوں، ایک لڑکی اور بیوی کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایک لڑکا ٹریکٹر چلاتا ے۔ دوسرا کھیت کے مزدوروں کا انچارج ہے۔ اور تیسرا مقامی ریلے ریڈیو اسٹیشن کا آفیسر ہے۔ کی دیہاتی اسکول میں اُستانی ہے۔ زن وشوہر بظاہر کسان ہیں مگر بوتے وقت اور فصل ٹتے وقت شوہر لوہار کا کام بھی کرتا ہے۔

سان کا گھر:

تین سونے کے کمروں ایک بیٹھک اور ایک کچن پر مشتمل ہے۔ مکان کے ساتھ ہی ایک یشی خانہ ہے جس میں ایک گائے ایک بچھیا ایک سوٗر چھ بھیڑیں اور تقریباً ۱۵ مُرغیئیں ر ہنس ہیں۔ ساتھ ہی سبزی کی کیاریاں اور باغیچہ ہے۔ جس میں کم ازکم بیس سیب اور ناشپاتی ے درخت ہیں۔ اور ان کے علاوہ چند دیگر پھلوں کے پودے بھی ہیں۔ یہ سب وینسن کی ذاتی لیت ہے۔ بلکہ فارم کے تمام ممبران کے گھر اور ان کا سازوسامان کم وبیش اسی قسم کا ہے۔ س کے علاوہ فارم سے ہر کارکن کو اناج اور اس کے مویشیوں کے لئے چارہ بھی ملتا ہے۔ گذشتہ سال وینسن کو ۵۶ من گندم ملی تھی۔ یعنی ہر کنبے کے ہر ممبر کو تقریباً ۷۵۰ پاؤنڈ۔ جو اُن کی ذراوقات کے لئے ضرورت سے زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ انہیں سال بھر سبزی، دُودھ، کھن اور دہی اور ۱۰ ہزار روبل نقد بھی ملے۔

وینسن کے کنبے کے لئے یہ نقد روپیہ اور اناج وغیرہ امیرانہ ٹھاٹ مہیا کر دیتے ہیں ہر سال وہ کوئی نہ کوئی نئی چیز بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں ان لوگوں نے حکومت سے پانچ سال کے لئے روپیہ قرض لے کر گھر کی مرمت کروالی۔ اس مرمت میں فارم کے دیگر ممبران

نے بھی ہر طرح امداد دی۔ ۱۹۳۷ء میں نکولائی نے جو کنبے کا بڑا فرزند ہے اور بہترین ٹریکٹر چلانے والا ہے اور موٹر سائیکل خریدلی۔ اور دوسرے لڑکے یعنی سیمیان نے سائیکل خریدلی ۱۹۴۰ء میں چھوٹے لڑکے نے دس دیلو (Valve) کا ریڈیو خریدلیا۔ اور توتیا (لڑکی) کا کمرہ گراموفون سے مزین ہوگیا۔ دیہات میں وہ بہترین گانے والی ہے۔

ونسن اپنے لباس میں بھی اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ در اصل دیہی لباس شہری لباس سے مختلف ہوتا ہے۔ دیہات میں ویسے ہیٹ۔ سوٹ۔ ریشم اور اُون کا لباس پہنا جاتا ہے۔ لوگ بڑے بڑے بُوٹ تو پہنتے ہی ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ شہری قسم کے نرم و نازک مردانہ اور زنانہ جُوتوں کا رواج بھی ترقی پا رہا ہے۔

مندرجہ ذیل اعداد سے ثابت ہو جائے گا کہ دیہات میں صنعتی مال کی کھپت کس قدر زوروں پر ہے۔ مثلاً ۱۹۳۸ء میں ۱۹۳۳ء کی نسبت دیہاتیوں نے ۱۸۰ فیصدی کپاس اور اُون کے زیادہ کپڑے خریدے۔ ۱۵۰ فیصدی زیادہ بُوٹ اور جُوتے۔ ۱۴۰ فیصدی زیادہ ربڑ اور فیلٹ کے بڑے بُوٹ، ۳۷۰ فیصد زیادہ کپڑے دھونے کا صابن اور ۵۹۰ فیصدی زیادہ مُنہ دھونے کا صابن استعمال کیا۔ ۱۹۳۸ء میں فارم کے کاشتکاروں نے ۲۸۰۰۰۰ گراموفون خریدے۔ ۳۰۰۰۰۰ سے زائد بائیسکل، ۳۷۰۰۰۰ وائرلیس سیٹ اور ۴۰۵۰۰۰ سے زائد گھڑیاں خریدیں۔ ۱۹۳۲ء میں صرف ۴۰۰۰۰ گراموفون فروخت ہوئے تھے۔

زار کے زمانے میں دیہاتی لوگ ان اشیاء سے روشناس نہ تھے۔ مثلاً ونسن کا گھروندہ ۱۹۱۷ء سے پہلے گھاس پھوس سے بنا ہوا تھا۔ جس کے ساتھ تھوڑی سی زمین تھی کھیتی کے لئے ایک ہل اور دُودھ کے لئے ایک گائے تھی۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ایک گھوڑا بھی ہوا کرتا تھا۔ اور چھوٹا سا سبزی کا کھیت بھی۔ ان کی فصل سال کے آخری مہینوں میں ختم ہوجاتی تھی۔ اور باقی دن وہ بڑی مشکل سے گذارتے تھے۔ گھر میں صرف ونسن کے پاس چمڑے کے بُوٹ تھے۔ بچے گرمیوں میں تو ننگے پاؤں پھرتے مگر خزاں میں درختوں کے

چمڑے کے جوتے پہنتے تھے۔ سردیوں میں تمام کنبے کے لئے بوٹ کا ایک ہی جوڑا ہوتا تھا۔ جسے باری باری پہن لیا جاتا تھا۔ ان کی موجودہ زندگی کی ابتدا ۱۹۱۷ء سے ہوئی ہے۔

زراعت کے اجتماعی فارموں نے روسی کسان کی خارجی زندگی ہی کو نہیں بدلا۔ بلکہ کسان کو بھی بدل کے رکھ دیا ہے۔ زار کے زمانہ میں کسان چھوٹے چھوٹے قطعہ ہائے اراضی کے مالک ہوتے تھے۔ ان کے پاس چند بیل ہوتے اور قدیم قسم کے دو ایک اوزار۔ مگر اب وہی کسان تقریباً ۹۰ کروڑ ایکڑ زمین کے مشترک مالک ہیں۔ زمین کے علاوہ کروڑوں مویشی اور لاتعداد مشینیں ان کے قبضے میں ہیں جن میں ۵۲۴۰۰۰ ٹریکٹر بھی شامل ہیں زار کے عہد میں کسان اپنے افرادِ کنبہ کے ساتھ تنہا کام کرتا تھا۔ مگر اب اجتماعی فارموں کے باعث محنت کشوں میں ایک سائنٹیفک زندگی عود کر آئی ہے۔ کاشت کے مختلف شعبوں کے ماہر بن یکجا ہو گئے ہیں۔

پہلے عہد میں وینسن ہر فن مولا تھا۔ مگر اب وہ ماہر لوہار ہونے کے علاوہ سبزی اگانے میں یدِطولیٰ رکھتا ہے۔ اس کا بڑا لڑکا طبعاً میکانک ہونے کے باعث ٹریکٹر ڈرائیور ہو گیا ہے۔ دوسرا لڑکا جس میں تنظیم کی بہت صلاحیت ہے اجتماعی فارم کے کارندوں کا انچارج ہے۔ اور لڑکی جو معمولی کسان گھرانے کی دختر ہے۔ اساتذہ کے ٹریننگ کالج میں داخل ہو کر بی اے کر کے اپنے ہی گاؤں میں استانی ہو گئی ہے۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب سے ۵۰ سال پیشتر عرصے میں اس گاؤں نے تین ڈاک خانے کے کلرک، تین تار بابو، ایک کمپونڈر اور ایک ریلوے کا آفیسر پیدا کیا۔ مگر انقلاب روس کے بعد بیس سالہ عرصے میں اسی گاؤں نے ۳۰۰ ماہرین پیدا کئے ہیں جن میں ۲۲ اساتذہ، ۱۱ انجنیئر، ۲ دیہی معاشیات کے ماہرین، ۵۰ ٹریکٹر ڈرائیور ۵۰ بجلی کے کاریگر اور ۵۰ سے زیادہ سُرخ فوج کے افسران بھی شامل ہیں۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ روس میں صرف پیداوار ہی کے لحاظ سے ترقی ہوئی

ہے۔ بلکہ دیہات میں نئے مدارس ہسپتال، کلب، ریڈنگ روم اور بے تار برقی کے باعث زندگی میں بہت فرق پیدا ہوگیا ہے۔ وینسن کے پہلے بچوں کی پیدائش میں ایک نامعقول قسم کی جاہل دایہ بلائی جاتی تھی۔ ان میں ایک بچہ بھی اس وقت زندہ نہیں ہے۔ مگر اس کے موجودہ بچے ایک بہترین زچہ خانے میں تولد ہوئے۔ جو گاؤں سے چند سَو گز کے فاصلے پر ہے وینسن کے بچوں نے ابتدائی تعلیم دیہات میں حاصل کی۔ اور اعلےٰ تعلیم کے لئے انہیں شہر میں جانا پڑا۔ وینسن بذاتِ خود اَن پڑھ تھا۔ لہٰذا اس نے تعلیم بالغان کے مقامی مدرسہ میں خواندگی کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ بعد ازاں اس نے اپنے بچوں سمیت دیہاتی ریڈنگ روم میں دیہی معاشیات پر مزید سائنٹیفک معلومات حاصل کیں۔

کسانوں کے فرصت کے لمحات بھی تعلیمی کاموں میں صرف ہوتے ہیں۔ وینسن اور اس کی بیوی دیہات کے ریڈنگ روم میں اکثر تقاریر سُننے کے لئے جاتے ہیں۔ کبھی فن کاروں کے شعبدے دیکھتے ہیں اور ہفتے میں دو دفعہ دیہات میں فلمیں دیکھتے ہیں۔ دیہاتی نوجوانوں نے ابھی تک پُرانے اشغال نہیں چھوڑے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں فصل کاٹتے وقت شام کو ضرور جمع ہوتی ہیں۔ نوجوان اپنی ہونے والی بیویوں کو پارٹیاں دیتے ہیں اور لڑکیاں اسی طرح نوجوان لڑکوں کو مدعو کرتی ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں حلقہ باندھ کر اکثر ناچتے ہیں۔ ناچ کے ساتھ ساتھ دیہاتی ارغن بھی بجتے ہیں۔ کبھی ناچ کے وقت گراموفون ریکارڈ بھی چلتے ہیں۔ نوجوان دیہاتی تھیٹر میں کئی کھیل کھیلتے ہیں۔ وینسن کی لڑکی اور بڑا لڑکا اس لحاظ سے کافی شہرت بھی رکھتے ہیں۔ موسمِ گرما میں والی بال کھیلا جاتا ہے۔ اور سرما میں نوجوان برف پر کھیل کھیلتے ہیں۔ وینسن کا چھوٹا لڑکا سائیکل دوڑ کے مقابلوں میں شریک ہوتا ہے۔ تعلیمی اور پراپیگنڈہ فلموں کا روسی دیہات میں بہت رواج ہے۔

روسی کسان سال بھر میں کئی تعطیلات بھی مناتا ہے اور نوجوان ایسے ایام میں بالخصوص مزے اُڑاتے ہیں۔ قومی تعطیلات میں سبھی شامل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ نئے مکان کی تعمیر پر

نئے اوزار یا نئے کپڑوں کی خرید پر بھی خوشی منائی جاتی ہے۔ بلکہ ذاتی خوشی کے موقعوں کو تہواروں تک ملتوی رکھا جاتا ہے۔ اور قومی تہواروں پر اجتماعی خوشی اور ذاتی لطف کو یکجا کرلیا جاتا ہے۔ ۷ نومبر، اکتوبر کا انقلاب، یکم مئی بین الاقوامی مزدور تہوار، ۵ دسمبر یعنی یوم منشور اور اسی قسم کے اور ایام میں خوب پُرلطف پروگرام رہتے ہیں۔

وینسن اور اس کے کنبے کی زندگی تمام روسی کسانوں کی زندگی کا نمونہ ہے۔

اب اسی سیاح سے روسی کان کن کی زندگی کے حالات سنئے۔ وہ لکھتا ہے کہ لیواڈمیا کی آرام گاہ میں یعنی کریمیا کے جزیرہ نما میں ہماری شنٹشا سے ملاقات ہوئی۔ وہ ڈونٹس کے ضلع کا رہنے والا ہے۔ اور اس مقام پر اسے ہر سال ٹریڈ یونین کی طرف سے بھیجا جاتا ہے۔ تاکہ وہ ایک ماہ کے آرام سے اپنی صحت درست کرلے۔ ایک لمبے وارڈ میں وہ پانچ مریضوں کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ ہسپتال کیا ہے جنت کا ایک ٹکڑا ہے۔ ہر طرف باغات اور انگور کی بیلیں اور تین طرف سمندر کا پانی۔ اس کی ٹھوڑی اور رخسار کے نیلے داغوں سے ظاہر ہے کہ وہ کان کن ہے۔ اس کا لباس سادہ ہے۔ مگر غریبانہ نہیں۔ اور جسم بے حد گٹھا ہوا ہے۔

آرام گاہ کے لوگ اسے دوستداری کے طریق پر ملتے ہیں۔ کیونکہ وہ وہاں گذشتہ دس سال سے آرہا ہے۔ وہ ایک بہترین کاریگر ہے۔ لہٰذا اسے یہ قومی حق حاصل ہے کہ آرام کے دن کریمیا ایسی بہترین جگہ پر گذارے۔

کپیشل نایا کی کان شمالی علاقے میں سب سے بڑی کان ہے۔ یہاں ہمارا کان کن کام کرتا ہے۔ اس کان کا چیف انجینئر کاذلوف ہے۔ اس کی عمر کوئی چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اور وہ کان کنی کے بہترین طریقوں میں مہارت رکھتا ہے۔ انجینئر کئی دفعہ اپنے سرکاری کام کے سلسلے میں بلجیم، انگلینڈ اور امریکہ جا چکا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے وہ اسی کان میں بطور مزدور کام کرتا تھا۔ آیئے ہم آپ کو کان میں لے چلیں۔ تین منزلی لفٹ آپ کو ایک دم ۵۰۰

میٹر نیچے لے جاتی ہے۔ لفٹ کے سوراخ کی دیواریں نیچے تک بیحد پختہ بنی ہوئی ہیں۔ لفٹ سے اُترتے ہی ہم مرکزی گیلری میں پہنچ جاتے ہیں۔ تمام دیواریں کنکریٹ کی بنی ہوئی ہیں۔ اندر بے شمار لیمپ لگے ہوئے ہیں۔ بجلی اور ٹیلیفون کے تار دیوار کے ساتھ ساتھ قدِ آدم تک اُونچے لگے ہوئے ہیں۔ اندر کی ہوا نہایت صاف ہے اور تنفس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کان میں چھوٹی ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی ہیں۔ جن میں درجنوں کوئلے سے لدی ہوئی کاریں آ تی جاتی ہیں۔ ایک کار میں ۲ ٹن کوئلہ لادا جاسکتا ہے۔ اور لفٹوں سے باہر نکالا جاتا ہے۔

انجنیئر بڑے دعوے سے کہے گا کہ یہاں جدید ترین ایجادات مستعمل ہیں۔ گفتگو کرتے وقت اس کی نگاہوں میں ایک چمک سی آجاتی ہے۔ جیسے اس نے بیابان میں جنت تعمیر کردی ہو۔ یہ بات ہے بھی درست۔ کیونکہ آج سے پچاس برس پہلے یہاں حالات بہت ہی ابتر تھے۔ اس وقت کوئلہ ہاتھ سے توڑا جاتا تھا اور ٹوکروں میں ڈال کر بمشکل باہر نکالا جاتا تھا۔ کان کے سوراخ کو لکڑی سے مضبوط کیا جاتا تھا۔ لکڑی گیلی ہوکر نہ صرف کان کنوں کے لئے مضرِ صحت تھی بلکہ کان کے لئے بھی باعثِ خطرہ تھی۔ مزدور بارہ گھنٹے محنت کرتے تھے۔ صحت ان کی تباہ ہوتی تھی۔ اور ہر وقت جان کو خطرہ لاحق رہتا تھا۔ کان کے باہر بھی زندگی خوب تر نہ تھی۔ گندے ہوئے مکانوں کی رہائش اور نہایت ذلیل قسم کی خوراک ان کے لئے مل سکتی تھی۔

"صبح سے سہ پہر تک ہم کان کا ایک تہائی حصّہ دیکھ سکے۔ اسی سے اس کی وسعت کا اندازہ کیجئے۔ وہاں کئی درجن مشینیں کام کرتی ہیں۔ کوئلے کو ہزار ہا گوشوں سے کھینچ کر کاروں میں لادنے کے لئے لایا جاتا ہے۔ سارا عمل میکانکی ہے۔ کان کے ایک گوشے میں شنٹسا سے بھی ہماری ملاقات ہوئی۔ جو نیم عریاں لباس میں اپنے کام میں منہمک تھا۔ اس کی کدالی میں کچھ ایسی جان ہے کہ وہ کان کا ایک جزو معلوم دیتا ہے۔ اس کی حرکات مشین کی مثل ہیں۔"

"ہفتے کا دن تھا اور اگست کی ۱۵ تاریخ۔ شنٹسا تنخواہ لے کر گھر روانہ ہوا۔ تنخواہ

۱۵ روز کے بعد ملتی ہے یعنی ایک ہزار روبل۔ مگر کنبے کے لئے ۴۰۰ روبل ہی کافی ہوتے ہیں چھوٹے سے گاؤں پر اگست کی شام طاری ہے۔ فراخ راستوں کے دونوں طرف کیکر اور لیموں کے درخت اپنے سائے سمیٹے ہوئے کھڑے ہیں۔ دو رویہ پیدل راستہ سبز نظر آرہا ہے مرکز میں ایک مربع پارک واقع ہے۔ جس کے وسط میں ایک فوارہ ایستادہ ہے۔ بہت بچے کھیل رہے ہیں۔ اور بستانِ اطفال کی نرسیں ان کی نگرانی کر رہی ہیں۔ بچوں کے اوپر بوڑھے آدمی بالخصوص پنشنر کان کن استراحت فرما ہیں۔"

"چلتے چلتے شنٹسیا راستے میں ایک محکمانہ دکان پر ٹھہرتا ہے۔ اس کی جیب میں پیسے ہیں۔ لہٰذا وہ ایک تو ووڈکا کی بوتل خریدتا ہے۔ خوراک کے کئی ڈبے، ایک کینڈی کا ڈبہ ایک لکڑی کا گھوڑا اور ایک ربڑ کی گڑیا جس کی آنکھیں شیشے کی ہیں۔ لڑکے کے لئے ٹائی اور بیوی کے لئے سلیپر لے لیتا ہے۔"

"دوکان پر بڑا ہجوم ہے جتنی اشیاء کی کثرت ہے اتنی ہی گاہکوں کی۔"

شنٹسیا کا گھر:

گھر پہنچنے تک کچھ دھندلکا ہو جاتا ہے۔ اس کے مکان میں تین کمرے ہیں تین طرف کھڑکیاں اور ایک طرف برآمدہ ہے۔ سامنے باغیچہ ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہیں اور پشت پر سبزی لگی ہے۔ اس کی بیوی نے چولہے پر جام رکھا ہوا ہے۔ اس کے دو پوتے کھیل میں غرق ہیں۔ دادا کو دیکھتے ہی لفافوں کی طرف لپکتے ہیں۔ دادا، دادی اور پوتے کھانا کھاتے ہیں۔ کھانا پتلی سبزی، گوشت، دودھ، کیک اور ووڈکا پر مشتمل ہے۔ کھانے کے بعد بوڑھا درخت کے نیچے (باغ میں) بیٹھ کر بآوازِ بلند اخبار پڑھتا ہے۔ بیوی برتن مانجتی اور اخبار سنتی ہے اور بعد ازاں خبروں پر بحث کرتی ہے۔

استنے میں بڑی بہو نینا بھی آجاتی ہے۔ وہ کان میں بجلی کا کام کرتی ہے۔ وہ بچوں کو سُلا کر اپنے خسر اور ساس کے پاس آ بیٹھتی ہے۔ اور گھڑی کو بے تابی سے دیکھتی ہے۔ یا آج تو

اس کا شوہر آجاتا ہے۔ نکولائی کان کنی کی درسگاہ میں طالب علم ہے۔ وہ دونوں کھانا کھاتے اور چائے پیتے ہیں۔ حتٰے کہ رات کافی گذر جاتی ہے۔

نکولائی بی ایس سی کے بعد ایک ساتھ کی کان میں ملازمت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ جہاں کوئلے میں سے کچھ ایسی گیس نکلتی ہے۔ کہ کوئلہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے تعلیمات سے فارغ ہونے تک نینا بھی کان کنی کی تعلیم حاصل کرلے گی۔ کیونکہ وہ ملازمت سے فارغ ہو کر ہر روز مدرسہ میں جاتی ہے۔

صبح کے وقت بوڑھا دریا پر مچھلی کے شکار کے لئے چلا جاتا ہے۔ اور ناشتے کے لئے نفیس قسم کی مچھلی لے آتا ہے۔ ناشتہ بہت طویل ہوتا ہے۔ اس میں خشک مچھلی، اُبلے ہوئے آلو، کریم، تازہ کیک اور چائے شامل ہوتی ہے۔ ناشتے کے بعد نینا، نکولائی اور بچے جنگل میں چلے جاتے ہیں۔ بوڑھا کلب میں فلم دیکھتا ہے۔ بلیرڈ کھیلتا ہے۔ بیر ایک جام پیتا ہے۔ اور دوستوں سے ہنسی مذاق کرتا ہے۔ بوڑھی گھر میں رہ کر دوپہر کا کھانا تیار کرتی ہے۔ یہ ہے روسی کان کنوں کی زندگی کا خاکہ۔

روسی ذرائع میں تنوع :

روس میں جس قدر مختلف قومیں بستی ہیں اسی قدر وسیع قدرتی ذرائع بھی موجود ہیں روس کے معدنی ذخیرے بالخصوص بہت ہی اہم ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۳ء میں تمام ملک میں ۸۹۴ کروڑ ٹن تیل اور ۲۷۰ کروڑ ٹن لوہا نکالا گیا۔ اسی طرح مینگنیز، اسبیسٹس، پوٹاشیم اور کروم کا حساب ہے۔ ان کے علاوہ روس میں سونے کے ذخائر بھی ہیں۔

چنانچہ ان ذرائع کی بدولت روس کی صنعت ۱۹۴۷ء میں پیش انقلاب عہد سے ۱۲ گنا بڑھ گئی تھی۔ اور ملک معاشی لحاظ سے یورپ میں چوتھے درجے کی بجائے پہلے درجے پر شمار ہونے لگا۔

بیسویں صدی عیسوی میں

تعلیمی طریقوں کے سلسلے میں جدت طرازیاں

(سلیم فارانی)

انیسویں صدی کی ابتدا میں جب کہ ابتدائی تعلیم کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ تھی، اور رضاکارانہ طور پر ابتدائی مدارس چل رہے تھے۔ بچّوں کی بڑی تعداد کو سستے داموں تعلیم دینے کے لئے جماعتی مدارس کی ابتدا ہوئی۔ بہت سے بچّے ایک ہی بارعب اُستاد سے تعلیم پانے لگے۔ جوزف لنکاسٹر اس سلسلے میں پیشرو تھا۔ رفتہ رفتہ جب بچّوں کی تعداد ایسی بڑھی کہ ایک اُستاد سے کام چلنا مشکل نظر آیا۔ تو معاون اُستادوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن جماعت بندی بدستور رہی، بعد میں سرکاری سرپرستی مدارس کو حاصل ہوئی۔ تو بھی نظم و نسق مدارس کی یہی صورت رہی۔ ان جماعتی مدارس میں چند قباحتیں تھیں جنہیں مدرسین اور نفسیات تعلیم کے ماہرین بہت محسوس کر رہے تھے۔

مختلف طبائع کے بچّوں سے ایک ہی قسم کا سلوک ہوتا تھا، ان کے انفرادی

میلان و استعداد کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی، سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا تھا، جماعت کے تمام بچوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ ہر ایک مضمون میں ایک ہی رفتار سے چلیں، سب کے لئے ایک ہی قسم کا نصاب اور ایک ہی قسم کا طریقِ تعلیم تھا، طریقِ تعلیم یہی تھا کہ اُستاد بیان کرتا جاتا اور بچے غور سے خاموش بیٹھے سُنتے چلے جاتے۔ اُستاد کو ہر قسم کی اہمیت حاصل تھی۔ اس کے حکم کی اطاعت بچوں کے لئے ناگزیر تھی، اُستاد کا کام یہ تھا۔ کہ خواہ بچے کام کرنا چاہیں یا نہ۔ انہیں دلچسپی ہو یا نہ۔ مقررہ نصاب پران کا عبور ہو جائے، اس کا فرض تھا کہ ساری جماعت میں ایک ہی منظم اور پُرامن رفتار رکھے۔ رفتارِ تعلیم میں کسی بچے کی طرف سے افراط و تفریط برداشت نہیں کی جاتی تھی۔ کوئی آگے بڑھنا چاہتا تو اُسے روک دیا جاتا کہ اس سے جماعت کی منظم اور یکساں رفتارِ تعلیم میں خلل پڑتا ہے۔ کامیاب اُستاد کی نشانی یہ تھی کہ مختلف طبائع کے بچوں کی ایک بڑی جماعت کو اس طور طریق سے پڑھائے کہ سب ایک ہی معیار و رفتار سے آگے بڑھتے جائیں اور ایک ہی مقررہ نصاب کو مقررہ وقت کے اندر اختتام تک پہنچائیں۔ اِس لئے اُستاد کے لئے "بارعب شخصیت" ہونا ضروری تھا، اس وقت کی اساتذہ کی تربیت گاہیں بھی اِسی قسم کی بارعب شخصیتیں پیدا کرنے میں کوشاں تھیں۔

ان تعلیمی قباحتوں کی اصلاح کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ اور وہ یہ کہ کسی طرح بچے کی انفرادی اہمیت کی طرف توجہ ہو۔ اس سے پہلے اٹھارھویں صدی کے نصفِ ثانی میں بھی مفکرین تعلیم اس مسئلے کی طرف توجہ دلا رہے تھے۔ روسو گھگھیائی آواز سے بزور کہہ رہا تھا، کہ تعلیم کو صحیح معنوں میں مؤثر اور مفید بنانا مقصود ہے تو اسے بچہ کے انفرادی رجحانات و احتیاجات کے مطابق ڈھالو۔ نصاب اور طریق تعلیم کے مقابلے میں بچے کی فطرت زیادہ اہم ہے۔ اُستاد کا اہم فرض یہ ہے کہ مناسب حالات پیدا کرے اور بچے کی نفسیاتی نشوونما کی کڑی نگرانی کرے انیسویں صدی کے اختتام تک یہ بات عام طور پر تمام مفکرین وارباب تعلیم نے تسلیم کر لی کہ تعلیمی طور میں بچہ خاص توجہ کا حقدار ہے۔ اسی مسلمامر نے جدید تعلیمی نظریئے کی بنیاد ڈالی۔

اس نظریئے کے مطابق "جماعت" کی بجائے بچہ انفرادی حیثیت سے تعلیم کا اہم حصہ بنا۔ اب جماعت ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں بچے کی انفرادی ضرورتوں کے مطابق عمل کرنے پر زور دیا جانے لگا۔ اور اُستاد کی طرف سے نظریں ہٹ کر بچے کی طرف منعطف ہوئیں۔ اس نظریئے نے اُنیسویں صدی کے آخر میں جنم لیا۔ اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی تعلیم میں "انفرادیت" کے عَلم بلند ہونے لگے۔ نفسیات اور بچے کے مطالعے کے زیر اثر مفکرین تعلیم زیادہ سے زیادہ احساس کرنے لگے۔ کہ بچوں کی طبائع انفرادی لحاظ سے بہت مختلف ہیں۔ اور یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ کہ مختلف طبائع کے بچوں کی ایک جماعت کو ایک ہی قسم کے نصاب کی یکساں رفتار سے تعلیم دی جائے۔ اور پھر ہر مضمون کو برابر وقت دیا جائے۔ یہ قباحت ایسی ہے۔ جیسے مختلف بیجوں سے یکساں زراعتی تدبیر کے ماتحت یہ توقع کی جائے کہ ان سے بالکل ایک ہی قسم کے پودے تیار ہوں گے۔ چنانچہ ہر طرف شور اُٹھا کہ انفرادی توجہ اور انفرادی طریق تعلیم سے کام لیا جائے۔ اور اس ضرورت کے ماتحت مندرجہ ذیل طریقے معرض وجود میں آئے (۱) مانٹے سوری میتھڈ۔ (۲) وینٹیکا پلان (۳) ڈالٹن پلان (۴) پراجیکٹ میتھڈ۔

(۱) مانٹے سوری میتھڈ:

اجتماعی تعلیم سے انفرادیت کی طرف عملی تغیر پہلے پہل معصوموں کی تربیت کے سلسلے میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ بڑے بچوں کے مقابلے میں ان بچوں کے لئے جماعتی صورت بڑھتی جا رہی تھی۔ اور جماعتی قباحتیں یہاں زیادہ نمایاں تھیں۔ اور جہاں قباحت زیادہ ہو وہیں بغاوت یا اصلاح کا عَلم بلند ہوتا ہے۔ چنانچہ اٹلی کی تعلیمی مفکرہ ڈاکٹر میریا مانٹے سوری اس سلسلے میں پہلی اہم باغی یا مصلح شخصیت تھی۔

ڈاکٹر مانٹے سوری موصوفہ طبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ مدت ماؤف و ناقص بچوں کی دماغی تربیت پر مامور رہی۔ اس کام میں اسے اِٹارڈ اور ایڈورڈ سیگوئن کے طریقوں کا مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ جنہوں نے ماؤف بچوں کے انفرادی طور پر دماغی کاموں کا مطالعہ کرنے کی کوشش

کی تھی۔ اور بڑی محنت و کاوش سے ایسے دماغوں کی نشوونما کے طریق ایجاد کئے تھے۔ ان دونوں مفکروں کے کاموں سے متاثر ہو کر اور بہت حد تک اپنی اختراعی جبلت سے مجبور ہو کر مادام مانٹے سوری نے ایسے سامان کا ایک سلسلہ تیار کرنے کی کوشش کی کہ جو بچوں کے لئے ایسا جاذب توجہ ہو۔ کہ وہ خود بخود اس کام میں لگ جائیں جو اُس سامان سے متعلق ہے۔ اور پھر اپنے آپ ہی عمل کر کے اپنے اندر بعض قویٰ کو تربیت دیں۔ یہ سلسلہ فقط بچے کی دماغی قویٰ کی عام تربیت تک محدود نہ تھا، بلکہ بہت سا سامان خاص طور پر ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد ایسا تھا جس سے بچے عام مدرسی نصاب کی ضرورت کے مطابق مقررہ علم و ہنر سیکھ سکتے تھے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر مانٹے سوری کا کام مرغوب عام ہوا۔ اس مادام کی تربیت سے معیوب و ماؤف بچے اس قابل ہو گئے تھے کہ تندرست بچوں کے ابتدائی مدرسے کے مقررہ امتحانات پاس کر سکیں۔ اس تجربے سے ڈاکٹر مانٹے سوری کی ہمت بڑھی اور اس نے تندرست بچوں کے سلسلے میں بھی اپنے طریق کا استعمال شروع کر دیا۔ ۱۹۰۷ء میں روم کے ضلع سان لورینزو میں بچوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ جس کا نام "بچوں کا گھر" رکھا۔ اس سلسلے میں بھی اسے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کا وہ سامان جو "تعلیمی سامان" کے نام سے مشہور ہوا۔ ایک چھوٹی سی الماری میں رکھا رہتا، جہاں سے بچے آسانی سے اُٹھا سکتے۔ بچوں کے لئے عام مدرسوں کی طرح قائم ڈیسکیں نہیں تھیں۔ بلکہ ان ڈیسکوں کی بجائے میزیں اور کرسیاں مہیا کی گئی تھیں۔ بچے حسب ضرورت و خواہش فرش کو بھی استعمال میں لا سکتے تھے۔ بچوں کو کسی قسم کا حکم نہیں ملتا تھا۔ بلکہ اُستاد صرف مشورہ یا تجویز کی صورت میں کوئی چیز پیش کرتا۔ بچے الماری کے پاس چلے جاتے اور جس قسم کا سامان چاہتے نکال لیتے اور اس کے مطابق کام میں مشغول ہو جاتے۔ اس قسم کی تدریس کی بنا آزادی اور خود مختاری کے اصولوں پر تھی۔ بچوں پر سوائے اس کے اور کوئی پابندی نہیں تھی۔ کہ ہر بچہ دوسرے کے کام میں دخل دینے سے احتراز کرے۔ کہیں بچہ کوئی شور مچاتا یا مدرسہ کی کرسی یا میز اُلٹ دیتا تو اس سے دوسروں کو جو کوفت ہوتی۔ وہی اُس کے لئے کافی ہوتی۔ اور وہ آئندہ

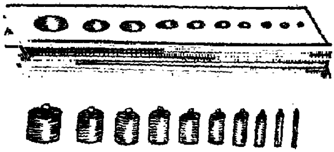
سنبھل جاتا۔

مانٹے سوری کا یہ طریق تعلیم اب اکثر مدارس میں اختیار کیا جا چکا ہے۔ اِس طریق تعلیم میں سزا اور جزا کا کوئی رواج نہیں۔ مانٹے سوری کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ سزا اور جزا سے رُوح مقید سی ہو جاتی ہے۔ ان سے آزاد عمل نہیں ہوتا۔ بلکہ جو بھی عمل ہوتا ہے۔ مجبوری سے ہوتا ہے۔ انعام حاصل کرنے کی خاطر یا سزا سے بچنے کے لئے۔ اِس طرح بچے کی آزاد نشو ونما نہیں ہو سکتی۔

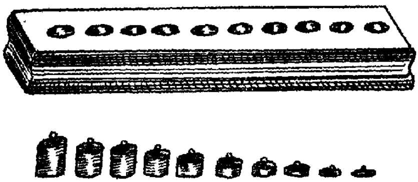
مانٹے سوری کا اہم اصولِ تعلیم یہ ہے کہ ابتدائی منازل میں تعلیم کی بنیاد حواس کی تربیت پر قائم ہونی چاہیئے۔ اور حواس کی یہ تربیت کچھ اِس طرح کی جائے کہ ہر بچہ آزادانہ طور پر خود بخود اپنی نشو ونما کے لئے کام کرے۔ چنانچہ ابتدائی تعلیمی سامان ایسا بنایا گیا ہے۔ کہ بچوں کو اس قسم کی خود عملی کی طرف ترغیب ہو جس سے اُن کے امتیازِ حِسّی کی قوتیں پُورے طور پر نشو ونما پا سکیں۔

مثلاً حجم کی واقفیت دلانے کی خاطر حِسّ بصری کی تربیت کے لئے لکڑی کے تین مختلف سیٹ تیار کئے گئے ہیں۔ جن میں مختلف سائز کے دس گول خانے ہیں۔ اور ان خانوں کو بھرنے کیلئے لکڑی کے دس مختلف حجم کے گول بیلن یا اسطوانے بنائے گئے ہیں۔ جو ان خانوں میں ٹھیک ٹھیک پیوست ہو جاتے ہیں۔ ہر بیلن کے اوپر ایک چھوٹا سا دستہ ہے۔ جس کے ذریعے اسے آسانی سے اُٹھا کر خانے سے باہر نکالا اور خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔ پہلے سیٹ میں یہ بیلن اُونچائی میں برابر لیکن قطر میں مختلف ہیں۔ دوسرے سیٹ میں تمام بیلن قطر میں برابر لیکن اُونچائی میں مختلف ہیں۔ تیسرے سیٹ میں یہ بیلن اُونچائی اور قطر دونوں لحاظ سے مختلف ہیں۔ بچہ جب کبھی ان کو دیکھتا ہے۔ جبلّی طور پر اس طرف مائل ہو جاتا ہے۔ کہ کسی طرح اِن بیلنوں کو سُوراخوں سے باہر نکالے۔ اور جب یہ سب میز پر نکال کر بے ترتیب رکھ دیتا ہے تو پھر اسے شوق پیدا ہوتا ہے۔ کہ انہیں واپس سُوراخوں میں ڈال دے۔ اور ان سُوراخوں میں انہیں واپس ڈالنے کی دِقّت کو حل کرنے میں اسے حجم کا نظری ادراک صحیح طور پر ہو جاتا ہے۔

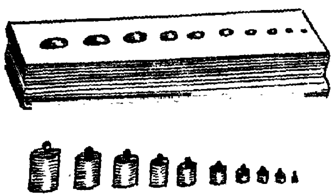
ذیل کی تصاویر تینوں قسم کے سیٹ ظاہر کرتی ہیں:۔



(۱)

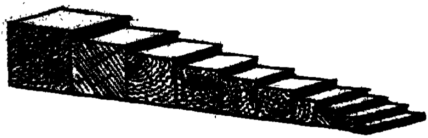


(۲)

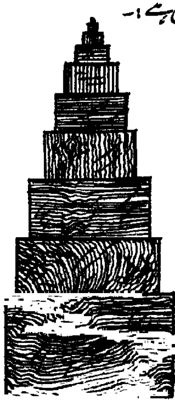


(۳)

ضخامت کا ادراک کرانے کے لئے دس مختلف بلندی کے چوکور یا چہ پہلو منشور استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ انہیں بے ترتیبی سے ملا دیا جاتا ہے۔ اور بچہ اٹھا کر انہیں ترتیب دار اس طرح جوڑ کر رکھتا ہے۔ کہ ان سے ایک سیڑھی سی بن جاتی ہے۔ اس طرح بچہ مختلف قسم کی ضخامتوں کے ادراک کے متعلق اپنی حس مشترک کی تربیت کرتا ہے۔ شکل مندرجہ ذیل سے یہ سلسلہ واضح ہے :-



اُونچائی کا ادراک کرانے کے لئے ایک مینار بنایا گیا ہے۔ جس کے مختلف حصّے دری پر بکھیر دیئے جاتے ہیں۔ اور پھر انہی ٹکڑوں سے بچّہ مینار بناتا ہے۔ اس عمل میں بچّے کو مختلف قسم کی مشقیں میسر آتی ہیں۔ مثلاً جھکنا، اُٹھنا اور اسی طرز کی دوسری حرکات تاکہ مینار بنانے کا مقصد پورا ہو جائے اس مینار کی تصویر ذیل میں دی گئی ہے :-



لمبائی کا اندازہ و تعارف کرانے کے متعلق مشق بھی اسی طرح کھلونوں سے کرائی جاتی ہے۔ مثلاً دس مختلف لمبائی کی سلاخوں کا ایک سیٹ ہے۔ سب سے بڑی کی لمبائی ایک میٹر اور سب سے چھوٹی کی ایک ڈیسی میٹر ہے۔ ہر سلاخ پر ڈیسی میٹر کو بتدریج سُرخ یا نیلا کر دیا گیا ہے۔ اس میں ہدایت یہ ہے کہ جب سب سلاخیں اکٹھی رکھی جائیں تو اُن رنگوں کو ایک قطار میں ہونا چاہیئے۔ یہ سلاخیں بکھیر دی جاتی ہیں۔ اور بچّہ انہیں ساتھ ساتھ رکھ کر لمبائی کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ ان سلاخوں سے متعلق عمل کرنے کے ذریعے بچّہ حساب کے ابتدائی عناصر

بھی سیکھ جاتا ہے۔ ایک سے دس تک گنتی آجاتی ہے۔ اور نظامِ اعشاریہ کا تعارف بھی ہوجاتا ہے۔ دوسرے حواس کی تربیت کے لئے بھی بہت سی چیزیں تیار کی گئی ہیں۔ مثلاً مختلف رنگوں میں امتیاز اور ہر رنگ کی مختلف جھلکیوں میں فرق کرنے کے لئے مشقیں ہیں۔ جن میں مختلف ریشمی ریلوں کو ترتیب دیا جاتا ہے۔ ان ریلوں کی کافی تعداد مہیا کی جاتی ہے۔

وزن کے امتیاز کے لئے ایک ہی حجم کی لیکن مختلف وزن کی لکڑی کی گولیاں بچوں کو دی جاتی ہیں۔ اور ان کے ذریعے ادراک وزن کی مشق کرائی جاتی ہے۔

حسِ لمس کی مشق کے لئے انتہائی نرم پالش کی ہوئی سطح اور ریتلی سطح کا کاغذ بچوں کو دیا جاتا ہے۔ حسِ سمع کے لئے مختلف آوازوں کے گول جھنجھنوں کے ذریعے جن کے اندر مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔ بچوں کو مشق کرائی جاتی ہے۔ حواس کی تربیت میں جس طرح اقدام کیا جاتا ہے۔ اس کی چار نمایاں منزلیں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے تیاری کی مشقیں۔ پھر چیز کا نام بتانا۔ پھر نام سے چیز معلوم کرنا۔ پھر چیز سے نام معلوم کرنا۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال مفید ہوگی۔

مثلاً رنگوں میں امتیاز سکھانا مقصود ہے۔ تو مانٹے سوری طریق سے اس کے لئے اقدام کی صورت حسب ذیل ہوگی۔ پہلے بچوں کو مختلف رنگوں کے کارڈ دئے جائیں گے۔ جن کو بچے مختلف طریق سے خود بخود علیحدہ علیحدہ رنگوں کے لحاظ سے ترتیب دیں گے۔ اس کے بعد دوسرا قدم اٹھایا جائے گا یعنی اُستاد رنگوں کے نام بتائے گا۔ سُرخ کو اُٹھا کر دکھائے گا۔ اور کہے گا "سُرخ" بچے کہیں گے "سُرخ"۔ اسی طرح "نیلا" "زرد" اور "سبز" وغیرہ۔

اس کے بعد تیسری منزلِ سبق آئے گی۔ یہاں اُستاد رنگ کا نام لے گا۔ اور بچے اس رنگ کا کارڈ اُٹھا کر اُستاد کو دیں گے۔ گویا نام سے چیز کی پہچان سکھائی جائے گی۔

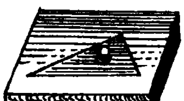
چوتھی منزل میں اُستاد سُرخ رنگ کا کارڈ اُٹھا کر پوچھے گا' یہ کیا رنگ ہے؟ بچے کہیں گے "سُرخ" وغیرہ وغیرہ۔ گویا اب چیز سے نام کی پہچان ہوگی۔

اسی طرح مانٹے سوری طریق سے کھلونوں کے ذریعے بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ مختلف شکلوں

سے زندگی کے روزمرہ کاموں میں تربیت حاصل کریں۔ فریموں میں کپڑوں کے ٹکڑے لگے ہوئے بچوں کو دئے جاتے ہیں۔ جن میں سے کسی میں تسمے باندھنے ہوتے ہیں کسی میں بٹن لگانے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان پر بٹن بند کرنے اور کھولنے، تسمے باندھنے اور کھولنے کی مشقیں کرنے کا اثر یہ پڑتا ہے کہ بچّے آسانی سے اور جلدی سے اپنا لباس پہننا اور اُتارنا سیکھ جاتے ہیں۔

مانٹے سوری کے طریقِ تعلیم میں بچّے اپنے آپ کو خود پڑھائی لکھائی اور حساب کے لئے تیار کر لیتے ہیں۔ اور یہ تینوں چیزیں رفتہ رفتہ مشقوں کے ذریعے سیکھ جاتے ہیں۔

ابتدائی نصاب میں بچّہ پہلے بہت سی ایسی مشقیں کرتا ہے۔ جن سے اسے جومیٹری کی شکلوں کی پہچان ہو جائے۔ یہ پہچان سکھانے کے لئے لکڑی کی بنی ہوئی شکلیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ان شکلوں کے اوپر دستے لگے ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعے یہ شکلیں تختیوں کے اندر کھُدے ہوئے رخنوں میں آسانی سے رکھی یا ان سے نکالی جا سکتی ہیں۔ یہ رخنے بالکل ان شکلوں کے مطابق ہوتے ہیں۔



بچّہ ان شکلوں کو فقط تختیوں کے رخنوں سے باہر نکالتا اور ان میں پھر پیوست ہی نہیں کرتا بلکہ ان کے گرد اُنگلی بھی چلاتا ہے۔ اور اس طرح بذریعہ لمس بھی ان کی پہچان سیکھتا ہے۔ اور جب اس کی آنکھیں بند کر دی جاتی ہیں۔ تو ہاتھوں اور اُنگلیوں سے ٹٹول کر وہ اس شکل کو پہچان لیتا ہے۔ بعد میں وہ اسی قسم کے دھات کے بنے ہوئے سیٹ استعمال کرتا ہے۔ اور ایسی شکلوں کو نکال کر کاغذ پر رکھتا ہے اور ان کے گرد پنسل چلاتا ہے۔ اور اس طرح ان کی شکلیں کاغذ پر کھینچ کر اپنی مرضی کے مطابق رنگدار پنسلوں سے اُن میں رنگ بھرتا ہے۔ اس طریقِ عمل سے وہ صرف شکلیں پہچاننا ہی نہیں سیکھتا بلکہ ایسی حرکات میں بھی مہارت

حاصل کر لیتا ہے۔ جو عملِ تحریر میں ضروری ہوتی ہیں۔

مانٹے سوری نظامِ تعلیم میں لکھنا پہلے شروع ہوتا ہے پڑھنا بعد میں، کیونکہ لکھنے کے لئے تو عضلاتی حِس کی نشوونما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ بچپن میں جلد فروغ پاتی ہے۔ لیکن پڑھنے کے لئے اعلیٰ دماغی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں علامات کی ترجمانی کرنی پڑتی ہے آواز اور لہجہ کا مدوجزر سیکھنا پڑتا ہے۔ جس کے بغیر الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔ لکھنے کے سلسلے میں مانٹے سوری نفسیاتی اصول پر عمل کرتی ہے وہ اس قسم کے اقدام کی وضاحت کے لئے تجویز کرتی ہے کہ ایک لکھتے ہوئے بچے پر غور کیجے اور اس کی حرکات اور عملِ تحریر کا جائزہ لیجے اور اس کی تحلیل کیجے تاکہ لکھنا سکھانے کا صحیح طریق معلوم ہو۔

لکھنا سکھانے کا طریق مانٹے سوری کو ایک تجربے کے دوران میں سوجھا، ایک کمزور لڑکی کو سینا سکھانا تھا۔ مانٹے سوری نے دیکھا کہ کنڈر گارٹن کی چٹائیاں بنتے بنتے اس لڑکی نے ہاتھ کی حرکات پر اس قسم کا قابو پالیا کہ وہ آسانی سے سینے کا کام کرنے لگی۔ حالانکہ چٹائیاں بننے سے پیشتر وہ سینے کی اہل نہ تھی، بلکہ اس کے لئے سینا بہت دشوار تھا، اس سے مانٹے سوری نے یہ اصول اخذ کیا کہ کسی کام کے لئے تیاری کرنے میں بعض مشقوں کے ذریعے ان حرکات پر قابو پایا جا سکتا ہے جو اصل عمل میں صادر ہوتی ہیں۔ اور ان حرکات کو مشینی حرکات کی طرح رواں کیا جا سکتا ہے۔ ان حرکات پر قابو پانے کے بعد اصل کام آسانی سے شروع ہو سکتا ہے۔

لکھنے سے مراد بے معنی نقالی نہیں جس میں صرف سُرخیاں یا بے ربط عنوانات ہی نقل کئے جاتے رہیں۔ بلکہ اس سے مراد بامعنی لکھائی ہے۔ ایسے الفاظ کی لکھائی جن میں معانی بھرے ہوں۔ مانٹے سوری نظام میں بچہ بے ربط عنوانات لکھنے کے قابل نہیں بنتا۔ بلکہ بامعنی لکھائی کے لئے تیار ہوتا ہے۔

لکھنے کے عمل میں دو قسم کی حرکتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ حرکت جس سے حروف کی

شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ اور دوسری وہ جس سے آلۂ تحریر (یعنی قلم) استعمال کیا جاتا یا چلایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ املا کی خاطر الفاظ کے تلفظ کی تحلیل و ترکیب کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے
ان حرکات میں مہارت حاصل کرنے کے لئے لکھائی شروع کرنے سے پہلے مشقیں کرانا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ اس کے لئے بھی کھلونوں کی طرز کا سامان ایجاد کیا گیا ہے۔ ریگ مال میں کٹے ہوئے حروف گتوں پر چسپاں کر دئے جاتے ہیں۔ اور ان پر بچے انگلیاں چلاتے ہیں۔ ریگ مال کی کھُردری سطح انگلیوں کے صحیح طور پر چلنے میں مدد دیتی ہے۔ بچے اس مشق کے بعد آنکھیں بند کر کے صحیح طور پر انگلیاں چلانے لگ جاتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ بچے دیکھ کر حروف کو پہچان نہیں سکتے۔ لیکن چھونے سے پہچان جاتے ہیں۔ اس طرح حروف کی شکلیں بصر و لمس و حرکت کے ذریعے دل و دماغ پر نقش ہو جاتی ہیں۔ آوازیں بھی اسی طریق سے سکھائی جاتی ہیں۔ حروف سے آشنا ہو کر بچے کٹے ہوئے حروف سے الفاظ بناتے اور الفاظ کو حروف میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور اس طرح پڑھنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

جومیٹری کی شکلیں بنانے میں قلم چلانے کی مشق پہلے ہی سے ہو رہی ہوتی ہے۔ اس لئے حروف یا الفاظ کی شکلیں بناتے وقت قلم استعمال کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی۔

جب بچہ قلم چلانے، حروف کی شکل بنانے اور مختلف حروف سے الفاظ بنانے میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ لکھنے کے لئے مکمل طور پر تیار ہوتا ہے۔ اور اچانک خود بخود لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

مانٹے سوری نے لکھائی کی طرف طلبہ کے خود بخود میلان کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ کہتی ہے: "دسمبر کے ایک خوبصورت دن میں جب کہ سورج نکلا ہوا تھا اور فضا بہار جیسی تھی بچوں کو لے کر چھت پر گئی۔ بعض آزادانہ اِدھر اُدھر کھیل میں مشغول رہے۔ بعض میرے

گرد تھے۔ میں آتشدان کے قریب بیٹھی تھی، میرے پاس ایک پانچ سالہ بچہ بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے ایک چاک کا ٹکڑا دے کر کہا "میرے لئے اس آتشدان کی تصویر بناؤ" اس نے اطاعت کی، اور چھت کے فرش کی ٹائیلوں پر چمنی کی ایک تصویر کھینچی۔ میں نے حسب معمول اسکی ہمت افزائی کی۔ اور اس کے کام کو سراہا۔ بچے نے میری طرف دیکھا، مسکرایا اور لمحہ بھر اس حالت میں رہا کہ گویا ابھی خوشی سے اُچھل پڑے گا۔ پھر اچانک چلایا: "میں لکھ سکتا ہوں" "میں لکھ سکتا ہوں" اور جھک کر اُس نے لکھا: "ہاتھ" پھر جوش میں آکر "چمنی" "چھت" کے الفاظ بھی لکھے۔ لکھتا بھی گیا اور خوشی سے چلاتا بھی گیا، کہ "مجھے لکھنا آگیا ہے" "میں لکھ سکتا ہوں"۔ اس کے خوشی کے نعرے سُنکر اور بچے بھی آگئے اور اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اور تحیر سے اس کے کام کو دیکھنے لگے۔ دو تین نے جوش سے لرزتے ہُوئے مجھ سے کہا "ہمیں بھی چاک کا ٹکڑا دو، ہم بھی لکھ سکتے ہیں" اور انہوں نے حقیقتاً مختلف الفاظ لکھنے شروع کر دئے مثلاً ماں، ہاتھ، جان، آتشدان، وغیرہ۔

پہلا لفظ لکھ لینے کے بعد بچے "دیوانہ وار ہر جگہ لکھتے پھرے ...... ان ابتدائی دنوں میں جہاں کہیں سے گذرنے کا اتفاق ہوتا۔ دریوں پر بھی لکھنے کے نشانات ہوتے، گھروں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور بعض ماؤں نے دیواروں وغیرہ کو اُن کی بے پناہ لکھائی سے محفوظ رکھنے کی خاطر بچوں کو کاغذ اور پنسل دے دی۔ تاکہ وہ کاغذ پر لکھتے رہیں۔ اور دیواروں اور گھر کی دوسری چیزوں کو اپنے اس شوق کی آماجگہ نہ بنائیں۔ ایک دن ایک بچہ ایک چھوٹی سی کاپی لایا جو ساری لکھائی سے پُر تھی۔ اس کی ماں کہتی تھی کہ یہ بچہ صبح سے لے کر شام تک لکھتا ہی رہا ہے یہاں تک کہ رات کو جب سویا تو پنسل اور کاغذ اس کے ہاتھ میں تھا۔"

لکھائی کے لئے تیاری کی مشقوں اور اصل لکھائی (یعنی پہلا لفظ لکھنے) کے درمیان کوئی بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرتا۔ مانٹے سوری کہتی ہے کہ چار سال کے بچوں کے لئے یہ کوئی ایک مہینے سے ڈیڑھ مہینے تک کا عرصہ ہوتا ہے۔ پانچ سال کے بچوں کے لئے اس سے کم تین

مہینوں کے بعد بچے عام طور پر لکھائی میں ماہر ہو جاتے ہیں۔

پڑھائی میں مفہوم سمجھ کر پڑھنے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، اور اس کے لئے کاغذ کے ٹکڑے یا کارڈ جن پر جلی قلم سے مفرد اور مرکب الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ استعمال کئے جاتے ہیں اسباق کی ابتدا چیزوں کے ناموں سے ہوتی ہے۔ یہ چیزیں یا تو موجود ہوتی ہیں یا بچوں کو پہلے ہی سے معلوم ہوتی ہیں۔ اقدام حسب ذیل طریق سے ہوتا ہے:۔

بچے کو ایک کارڈ دیا جاتا ہے جس پر کسی چیز کا نام مروج رسم الخط میں لکھا ہوتا ہے، بچہ پہلے اسے آواز میں بدلتا ہے۔ اگر ابسا قدم درست ہو تو نگران خاتون اسے جلد جلد پڑھنے کا حکم دیتی ہے اور بچہ ذرا تیز پڑھنے لگتا ہے۔ لیکن بغیر سمجھے معلمہ کہتی جاتی ہے" اور تیز" "اور تیز" بچہ تیز پڑھنے لگتا ہے۔ جب کوئی بچہ ایک لفظ کا تلفظ کر لیتا ہے تو وہ کارڈ کو اس چیز کے نیچے رکھ دیتا ہے۔ جو وہی نام رکھتی ہے۔ اور بس مشق ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سبق جلد جلد چلتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسے بچوں کو دیا جا رہا ہوتا ہے جو پہلے ہی سے لکھائی کے ذریعے اس کے لئے آمادہ و تیار ہوتے ہیں۔ فقرے جن میں مختلف احکام یا اعمال کا مذکور ہوتا ہے۔ کاغذ کے پرزوں پر لکھ دئے جاتے ہیں۔ بچے ان کا انتخاب کرتے ہیں اور ان میں لکھی ہوئی بات کو پورا کرکے دکھاتے ہیں۔ ایک بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ بچہ فقروں کو باآواز نہیں پڑھتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مانٹے سوری نظام میں پڑھنے کا مقصد بچوں کو علامات و حروف سے خیالات و معانی معلوم کرنا سکھاتا ہے۔ اس لئے مطالعہ خاموش ہونا چاہیئے باآواز نہیں۔

پڑھنا سکھانے کے سلسلے میں بھی مانٹے سوری سے ایک واقعہ سنیئے:۔

"ایک چار سالہ بچے نے، جس نے نجی طور پر گھر میں تعلیم پائی تھی، ہمیں متعجب کر دیا۔ اس کا باپ ڈپٹی تھا۔ جسے بہت خطوط آتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ دو ماہ سے اس کے بچے کو ایسی مشقوں کے ذریعے تعلیم دی جاتی رہی ہے۔ جن سے لکھنا اور پڑھنا سیکھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ لیکن اس نے اس کی طرف کم توجہ کی تھی۔ اور حقیقت میں اس طریق پر

اُسے اعتماد بھی نہ تھا۔ ایک دن وہ بیٹھا پڑھ رہا تھا اور وہ لڑکا پاس ہی کھیل رہا تھا۔ کہ ایک نوکر داخل ہوا اور میز پر اُس نے بے شمار خط رکھ دئے۔ جو ابھی ابھی آئے تھے۔ اس بچے کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔ اور ہر خط کو اُٹھا کر پتہ با آواز پڑھنے لگا۔ اس کے باپ کو یہ معجزہ ہی معلوم ہوا۔"

پڑھنا سیکھنے کی اوسط مدت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ لکھنا شروع کرنے اور پڑھنے کی قابلیت ظاہر ہونے کے درمیان کا عرصہ تقریباً نصف ماہ ہے۔ پڑھنے میں مہارت لکھنے میں مہارت کے مقابلے میں زیادہ آہستہ حاصل ہوتی ہے۔ تندرست بچے جن کی مانٹے سوری طریق کے مطابق تربیت ہوتی ہے۔ چار سال کی عمر میں لکھنا اور پانچ سال کی عمر میں پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔

گرامر پڑھانے کے لئے بھی اسی طرح کھیلیں اور تعلیمی سامان تیار کیا گیا ہے۔ گرامر کے سلسلے میں طریق ترکیبی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے مناسب کھلونے ہیں مثلاً ایک بکس میں دو خانے ہوتے ہیں۔ ایک میں مختلف صفات اور دوسرے میں اسم یعنی چیزوں کے نام (مذکر، مؤنث، واحد، جمع) چھوٹے چھوٹے کارڈوں پر چھپے ہوئے کافی تعداد میں ملے جلے رکھے ہوتے ہیں۔ بچہ ان الفاظ کو نکال کر ساتھ ساتھ رکھ کر مرکبات توصیفی بناتا ہے مثلاً:۔ | سُرخ | رنگ |

جب یہ مرکب بنا لیتا ہے۔ تو سُرخ کا کارڈ بھی اس ثبوت کے لئے نکال کر ساتھ رکھ دیتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو۔ کہ اس کا مرکب درست ہے۔ اسی طرح وہ مرکبات بنانا سیکھتا ہے۔ اور صفات کا مفہوم و استعمال بھی سمجھ لیتا ہے۔ اسی قسم کی اور مشقوں سے گرامر کی تمام ضروری چیزیں سکھائی جاتی ہیں۔

حساب، جغرافیہ، تاریخ اور اکثر دیگر مدرسی مضامین کی ابتدائی تعلیم اسی طور طریق سے دی جاتی ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابتدائی تعلیم کے تمام مضامین پر یہ طریق حاوی

ہو جائے گا۔

مانٹے سوری کے طریق تعلیم میں وقت نامے کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہاں بچوں پر اوقات کی پابندی نہیں۔ بچہ جب تک دلچسپی لیتا رہتا ہے۔ اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔ اور جب اُکتا جاتا ہے۔ تو ایک کام چھوڑ کر دوسرا اختیار کر لیتا ہے۔ مانٹے سوری اسکول میں بچے اپنی مرضی سے کئی کئی دن کام کرتے رہتے ہیں۔

مانٹے سوری طریق تعلیم پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے۔ تو اس میں چند امتیازی خصوصیات نظر آتی ہیں۔

(۱) حِسّی تربیت کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔

(۲) جاذبِ توجہ کھلونوں سے تربیت دینے کے باعث بچوں کا کام میں بخوشی انہماک رہتا ہے۔

(۳) ہر ایک بچہ اپنے آپ کو بہت حد تک خود ہی تعلیم دیتا ہے۔

(۴) بچے پر کسی قسم کی مجبوری نہیں۔ وہ ہر طرح آزاد ہے۔ وہ کسی قسم کی پابندی اختیار بھی کرتے ہیں تو اپنے ہی اختیار سے۔

(۵) جزا و سزا کی رسم نہیں۔ بچے کا کمال حاصل کر لینا ہی اس کے لئے بڑی خوشی کی چیز ہے۔ بچہ جو کچھ کرتا ہے کسی کے ڈر سے نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے۔

(۶) بچے کی انفرادیت جماعت کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھتی، بلکہ وہ اپنے رجحانات، جبلتوں اور رغبتوں کے موافق نشو و نما پاتا ہے۔

(۷) اُستاد کی حکومت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ایک ہمدرد دوست اور معاون و رہبر کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۸) بچوں کی اپنی اُمنگیں دبی دبی سی نہیں رہتیں۔

(۹) بچے کی رفتارِ تعلیم پر کسی قسم کی قیود نہیں۔

(۱۰) بچہ جو کچھ سیکھتا ہے خود کام کر کے سیکھتا ہے۔ [illegible]

پڑھائی میں طلبہ کی رہنمائی

آر - بی - مل

بیسویں صدی کی ابتدا میں اور خاص کر پہلی جنگِ عظیم کے آخیر میں ماہرینِ تعلیم نے طالب علم کی زندگی میں نمایاں دلچسپی لینی شروع کی۔ اس سے پہلے اُن کا رجحان صرف مضمونِ تعلیم ہی کی طرف ہُوا کرتا تھا۔ اس رُخ کے بدلنے سے ایک خاص نظریہ ترقی پا گیا۔ جو اب تک قائم ہے کہ بچہ صرف اپنی جبلتوں اور قوتوں کی وجہ سے نشوونما پاتا ہے نہ کہ دوسروں کی تلقین یا ڈانٹ ڈپٹ سے۔

ترقی پسند اساتذہ اب اس نظریے کے قائل ہیں کہ ان کا کام مروجہ تعلیمی طریقوں سے علم ٹھونسنا نہیں بلکہ بچے کی علمی زندگی میں قوت پیدا کرنا اور اس کی اس طرح رہنمائی کرنا ہے کہ وہ خود اپنی کوششوں سے مقاصدِ مطلوبہ حاصل کرے۔

پڑھائی میں طلبہ کی صحیح رہنمائی نہیں ہو سکتی جب تک وہ تمام رکاوٹیں دُور نہ ہوں۔ جو اس سلسلے میں حائل ہیں۔ بلکہ رہنمائی کا پہلا قدم ہی یہی ہے کہ ان رکاوٹوں کو راستے سے

ہٹا دیا جائے۔

یہ رکاوٹیں دو قسم کی ہیں۔ بعض اساتذہ سے متعلق ہیں اور بعض طلبہ سے۔ پہلی قسم کی رکاوٹیں کم و بیش یہ ہیں: اساتذہ نفسیات اطفال سے یا تو واقف نہیں اور یا اس کے علم سے فائدہ ہی نہیں اُٹھاتے۔ عمل تدریس میں خود کم دلچسپی لیتے ہیں۔ تنگدستی کے شاکی ہیں خود مطالعہ کم وسیع رکھنے کی بنا پر دوسروں کو صحیح ہدایت نہیں کر سکتے۔ پڑھانے کے صحیح طور طریق سے آشنا نہیں یا قائل نہیں۔ اور بچوں سے مناسب سلوک کرنے کے طریق سے بھی ناواقف ہیں۔ زیادہ تر انہیں طلبہ کی کافی تعداد کے امتحان میں پاس ہو جانے کی فکر ہوتی ہے۔ بچوں کے دل و دماغ پر خواہ مخواہ بہت دباؤ ڈالتے ہیں۔ پڑھانے کے لئے خود کوئی خاص تیاری اور سوچ بچار نہیں کرتے۔ سخت گیری سے کام لیتے ہیں۔ اور سبق کے اندر کوئی جاذبیت پیدا نہیں کرتے۔ اکثر مضمون تدریس پر خود حاوی نہیں ہوتے۔

دوسری قسم کی رکاوٹیں دو نوعیتوں کی ہوتی ہیں۔ مدرسی اور خانگی۔ مدرسے میں تعلیمی طور اچھا نہیں ہوتا۔ وہاں آزاد پڑھائی کے مواقع کم ملتے ہیں۔ پابندی سے بچے کی طبیعت دبی دبی سی رہتی ہے۔ اُستاد کے ڈر سے اس کی فہم و ادراک کی قوت سہمی سی رہتی ہے مدرسے سے باہر بھی اس کے دل و دماغ پر اُستاد کا ہوا سا رہتا ہے۔ اسے گھر کا کام اتنا ملتا ہے کہ کسی اور کام کی فرصت تو کیا خود اس کام کی تکمیل بھی ناممکن ہوتی ہے۔ گھریلو کام میں بچے کے لئے کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔ گھریلو کام کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی اس کی عادات خراب کر دیتی ہے۔ کام ہر بچے کی ذہنی قابلیت و صلاحیت کے مطابق نہیں ہوتا۔ گھر کے حالات بچے کی پڑھائی کے منافی ہوتے ہیں۔ مثلاً گھر کے افراد کا شور، روشنی اور ہوا کا خراب انتظام، مالی مشکلات، ریاضت اور ورزش کا کم موقعہ ملنا، اَن پڑھ اور بے پرواہ والدین وغیرہ۔ اسی طرح مدرسی منافی حالات مثلاً کمروں میں شور، روشنی، نشست و برخاست وغیرہ کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونا، کتب کا ذخیرہ بہت کم ہونا، نقشوں کی کمی،

[illegible] ذہنی اختلاف، اس کے علاوہ طلبہ کو معلوم نہیں ہوتا کہ صحیح طور پر پڑھنے کے عمل کیسے کیا جائے۔ پہلے کیا کرنا چاہیئے۔ بعد میں کیا۔ استعداد یا سیکھنے کی قابلیت پڑھنے کی قوت، صحت، وقت اور سوسائٹی کا بھی کافی دخل ہوتا ہے۔

اِن رکاوٹوں کو دُور کرنے کی تدابیر یہی ہوسکتی ہیں کہ :۔

اساتذہ نفسیاتِ اطفال کا علم حاصل کریں اور اس کا استعمال کریں۔ عملِ تدریس میں حصہ لیں۔ ان کی تنخواہیں اُن کی ضرورتوں کی پوری کفیل ہوں۔ تاکہ تنگدستی ان کے عملِ تدریس میں کھٹائی نہ ڈالے۔ انہیں سست یا بے حوصلہ نہ کردے۔ وہ خود اپنا مطالعہ وسیع کرتے رہیں۔ تاکہ ہر نقطہ پر بچوں کو مناسب ہدایات دے سکیں۔ انہیں پڑھائی کے صحیح طور طریق سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ تاکہ وہ بچوں سے مناسب سلوک کرسکیں اور انہیں صحیح تعلیم دے سکیں۔ امتحانوں کے رویئے کو بدلا جائے۔ اور انہیں اساتذہ کی قابلیت جانچنے کا معیار نہ بنایا جائے۔ تاکہ اُستاد کے دل و دماغ سے پاس کرانے کی فکر دُور رہے۔ اور اپنے شوق و ذوق سے صحیح تعلیم دے سکے۔ بچّوں کے دماغوں پر خواہ مخواہ بوجھ نہ ڈالے بلکہ جہاں تک ان میں دلچسپی قائم ہو سبق کو جاری رکھے۔ وہ اُکتانے لگیں تو سبق ختم ہوجائے۔ اساتذہ جو کچھ پڑھائیں۔ خاص تیاری سے پڑھائیں۔ تاکہ وہ سبق میں دلچسپی پیدا کرنے کے سامان بروقت کرسکیں۔ مضمون تدریس پر خود ہر طرح حاوی ہوں۔ اور کوئی نکتہ ایسا نہ ہو جس پر انہیں قابو نہ ہو۔ طلبہ کے استفسار پر وہ لڑکھڑائیں نہیں۔ سخت گیری سے کام نہ لیں۔ بلکہ پیار و محبت سے مختلف نکات واضح کرسکیں۔

مدرسے کا تعلیمی طور بھی سُدھارا جائے۔ بچّوں کے لئے آزاد پڑھائی کے مواقع میسر آنے چاہیئیں۔ خارجی پابندیاں عائد کرکے ایسی فضا پیدا نہ کی جائے۔ کہ اس کی طبیعت دبی دبی سی رہے۔ اُستاد کا ڈر نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کی شفقت و محبت کے باعث بچّے کی قوت فہم و ادراک آزادانہ طور پر خوشی خوشی مختلف نکتے پڑھے اور سمجھے۔ [illegible]

طبیعت ہمت اور وسعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اسے ایسا دلچسپ بنا دیا جائے۔ کہ بچے اسے خوشی خوشی کیا کریں۔ اور اس میں باقاعدگی ہونی چاہیئے۔ تاکہ بچوں میں اچھی عادات پیدا ہوں۔ گھر کے حالات کی درستی کے لئے حتی الامکان کوشش کی جائے۔ مدرسے کی فضا کو بھی بچے کی نشو و نما کے لئے مناسب بنایا جائے۔ ان کی استعداد، صحت اور سوسائٹی پر بھی کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

تمام رکاوٹیں دُور ہو جائیں تو پھر اساتذہ کو مستقل اسباق دینے کے علاوہ مندرجہ ذیل طریق پر پڑھائی کے سلسلے میں طلبہ کی رہنمائی کرنی چاہیئے:۔

(۱) سوالات: پیراگراف کا عنوان لکھنا، سبق کا خلاصہ بیان کرنا، تشریح کرنا، موافق و مخالف رائے دینا، حسابی مسائل کا حل کرنا۔

(۲) تفویضات (Assignments) منظم طریق سے ہدایات و حوالے دے کر سوالات کے جوابات طلب کرنا۔

(۳) اشارات لینا، سکھانا کہ کس طرح مختلف موضوعات کے متعلقہ کوائف کو مختصر طور پر بطور یادداشت لکھ دیا جائے۔

(۴) حوالے کی کتابیں دیکھنے کا شوق پیدا کرنا۔

(۵) جدید معلومات کا شوق دلا کر لائبریری کی کتابیں پڑھنے کی تلقین کرنا۔

اصطلاحی غور و فکر

(۱)

اصطلاحات

171 Hall.

بڑا کمرہ، تالار، ہال، جلسہ گاہ، مقامِ اجتماع

تالار فارسی لفظ ہے۔ عام مستعمل نہیں۔ اس لئے اسے اختیار کرنے میں تامل ہے۔ شاید گراں گذرے۔ جلسہ گاہ اور مقامِ اجتماع بہت حد تک ہال مفہوم ادا کرتے ہیں۔ لیکن محدود ہیں۔ ہال کے لئے بہتر ہوگا، کہ اسی انگریزی لفظ کو ہی اپنا لیا جائے۔

172. Drawing Master.

معلم ڈرائینگ، معلم نقشہ کشی، تصویر آموز، خاکہ ماسٹر

اس کے لئے معلم نقشہ کشی بہتر ہے۔ لیکن اگر "ڈرائینگ ماسٹر" ہی کو اختیار کرلیا جائے تو غیر موزوں نہیں ہوگا۔

173. Science Room.

اطاقِ طبیعیاتی ، سائنس کا کمرہ ، سائنسی کمرہ ، اطاقِ سائنس

اطاق کچھ ثقیل لفظ ہے۔ یہ ثقالت طبع نازک پر اور بھی گراں گذرے گی۔ سائنس کا ترجمہ طبیعیات بھی درست نہیں، طبیعیات سائنس کا ایک جزو ہے۔ جو سائنس کے لفظ کی طرح حاوی نہیں۔ اس لئے لفظ سائنس کو اسی طرح ہی استعمال کیا جائے۔ تو بہتر ہے۔ "سائنس کا کمرہ" اس کے لئے موزوں رہے گا۔ سائنسی کمرہ اور اطاقِ سائنس قابلِ قبول ترکیبیں نہیں ہوں گی۔

174. Library.

کُتب کا خزانہ ، کتاب گھر ، کتب خانہ ، مکتبہ ، خزانہ کُتب

تقریباً تمام الفاظ ایسی دکانوں کا مفہوم بھی ادا کرتے ہیں۔ جو کتابیں بیچتی ہوں۔ لائبریری سے اس طرح کا مفہوم نہیں لیا جاتا۔ لائبریری کے لئے مکتبہ کا لفظ استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ اور یہی زیادہ موزوں ہے۔

175 News Board.

تختۂ اطلاعات ، اطلاعی بورڈ ، تختۂ اخبار

ان سب میں سے "تختۂ اطلاعات" اچھا ہے۔

176. Notice-Board.

تختۂ اطلاعات ، نوٹس بورڈ ، تختۂ اعلانات

اِن میں سے موزوں "تختۂ اعلانات" ہے۔

177. Money Order

اِس کے لئے موزوں یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ منی آرڈر کا لفظ ہی اُردو میں استعمال کیا جائے۔ کیونکہ یہ بہت عام ہے اور ہر ایک کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔

1 8. Letter Box.

صندوقِ خطوط، صندوقِ مکتوبات، ڈاک خانہ، چٹھی بکس، مراسلہ گھر

ڈاک خانہ اور مراسلہ گھر تو پوسٹ آفس کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ صندوقِ خطوط اور صندوقِ مکتوبات بھی ثقیل سے ہیں۔ "چٹھی بکس" زیادہ اچھا رہے گا۔

Tag.

بند، تسمہ، تاگا

دونوں طرح درست ہے۔ لیکن تسمہ بُوٹ وغیرہ کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ تکمہ کُرتہ یا کوٹ وغیرہ کے لئے مخصوص ہے۔ اگر "تیگ" استعمال کیا جائے۔ تو موزوں ہوگا۔

180. School.

پہلا مدرسہ، ابتدائی مدرسہ، پرائمری اسکول، ابتدائی اسکول

ان میں سے "ابتدائی مدرسہ" اچھا ہے اور مستعمل بھی ہے۔

(ب)

اصطلاحات زیرِ غور

181. Middle School
182. High School
183. College
184. University
183. At Par
186. Above Par
187. Below Par
188. Agent
189. Amount
190. Assessment
191. Audit
192. Balance
193. Debit & Credit
194. Balance Sheet
195. Charter
196. After date
197. Bond
198. Budget Estimate
199. Capital
200. Fixed Capital

سرکاری جریدہ کا اعلان

شعبہ دفاتر

تاریخ وشمارہ احکام	نام	کہاں کس عہدے پر تقرر ہُوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۷۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء ۱۷-۸۶-G دفتر گورنمنٹ کالج منٹگمری	ش عبدالحی منصور احمد ایک اُمیدوار	ادنیٰ محرر گورنمنٹ کالج منٹگمری بمشاہرہ ۵۰ روپے ماہوار درجہ مشاہرہ ۵۰-۳-۸۰/۴-۱۰۰	۲۶ اکتوبر ۱۹۴۹ء سے	میاں محمد شریف کی جگہ جن کی ملازمت ختم کردی گئی ہے۔ اور چودھری عبدالرحمٰن کے حق عود میں جن کی اب ترقی ہو گئی ہے۔

اطلاعات

۱۔ پہلے صفحہ پر آپ سے متعلق کوئی اطلاع تو نہیں؟ شائد آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہو!

۲۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ اس سے آپ کو جواب جلد مل سکے گا۔ بصورت دیگر تاخیر کے لئے دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔

۳۔ "آموزش" ہر ماہ باقاعدہ شائع ہوتا ہے۔ اور پہلے ہفتہ میں سپرد ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک پرچہ نہ ملے۔ تو اپنے ڈاک خانہ کو مطلع فرمائیں۔ اور دفتر "آموزش" کو بھی آگاہ کریں۔

۴۔ "آموزش" کے انتظامات یا دلچسپی میں کوئی کمی محسوس ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر کوئی نئی تجویز آپ کے ذہن میں آئے۔ تو ہمیں آگاہ کریں۔ شائد کوئی عملی صورت پیدا ہو جائے۔

مینیجر "آموزش"
کشمیری بازار۔ لاہور۔

آموزش

دسمبر ۱۹۴۹ء

مدیر

بشیر ہاشمی

معاونین

سلیم فارانی   عبدالغفور چودھری

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

ناشر

کتاب منزل

لاہور

قیمت فی جلد [illegible] آنے

دسمبر ۱۹۴۹ء

جلد: ۲

شمارہ: ۹

سالانہ چندہ:-

پاکستان کیلئے [illegible] روپے

غیر ممالک کیلئے [illegible] روپے

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر دہلی
رموز

مذہب و آزادی کے انتہائی جوش میں ہم نے مدرسوں اور کالجوں میں "اسلامیات" کو ایک تدریسی مضمون کی حیثیت سے شامل تو کرلیا ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ہم "اسلامیات" کی تعیین نہیں کر سکے۔

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے ۲۰-۱۹۱۹ء میں تجویز کیا تھا کہ مسلمانانِ بنگالہ کے سیاسی ہیجان و ملال کی تعدیل کے لئے ڈھاکہ میں ایک جدید یونیورسٹی قائم کی جائے اور اس یونیورسٹی کو باقاعدہ اسلامی تعلیمی ادارہ ظاہر کرنے کی خاطر عام یونیورسٹیوں کے مروج نصاب میں ایک مضمون "اسلامک سٹڈیز" کے نام سے بڑھا دیا گیا۔ اور ایک باقاعدہ محکمہ اسلامک سٹڈیز کی بنیاد بھی رکھ دی گئی۔ ایک پروفیسر، ایک ریڈر اور دو لیکچرار مقرر کر دئے گئے۔

"اسلامک سٹڈیز" کے اس محکمہ نے ایک نصاب تیار کر لیا اور اس پر شوق سے عمل پیرا رہا۔ اس محکمہ کے نتائج سے ہم باخبر نہیں ہو سکے۔

چند سال بعد علیگڑھ یونیورسٹی وجود میں آئی، اور یہاں بھی "اسلامیات" کا محکمہ قائم ہوا۔ چھ سال تک اس محکمہ کے صدر علامہ اس کے نصاب کی تعیین پر غور و خوض کرتے رہے۔ اور آخر کار دو نئے ڈگری کے کورس جاری ہوئے۔ بیچلر ان تھی آلوجی اور ماسٹر ان تھی آلوجی۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے بیچلر ان تھیالوجی کو اختیار کرنے کے لئے طلبہ کو راغب کرنے کا طریق بہت کامیاب نہ ہوا۔ صرف چند طلبہ نے جو یونیورسٹی میں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے ذرائع مسدود تھے۔ یہ نصاب اختیار کیا۔ جو زیادہ تر عربی زبان کے مبادیات، قرآن کریم، احادیثِ نبوی اور قدرے فقہ و اسلامی تاریخ پر مشتمل تھا۔ اس نصاب کے عرصۂ حیات میں گریجوایٹوں کی تعداد واقعتہً دو درجن سے زیادہ نہ تھی۔ دوسرے انسانی مشاغل کی طرح یونیورسٹی کے کورس بھی زندگی میں افادے کے مطابق جاذب توجہ ہوتے ہیں۔ اسلام دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ اصلیت پسند ہے۔ اس نے کبھی دنیوی زندگی کو مذہب سے خارج نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلام میں انسانی زندگی ایک غیر منقسم کل ہے۔

ہمیں ڈھاکہ یونیورسٹی یا علیگڑھ کے نصابِ اسلامیات کے اثر و مفاد کی بحث میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ یہ اس کا موقعہ نہیں۔ ہماری گذارش صرف یہ ہے کہ اسلامیات کی تعلیم شروع کرنے سے پیشتر ہمیں اسلامیات کے موقف و حدود کی تعیین کے لئے دیانتدارانہ کوششیں کرنی چاہئیں۔

حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی ۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے ۱۱۱۳ء میں وفات پائی۔ آپ کا وطن طوس تھا۔ نیشاپور میں تعلیمی استفادہ کیا۔ بغداد میں تدریسی فرائض

سرانجام دیئے۔ شام اور دیار مصر میں تصوفانہ دورے کئے۔ اور آخر کار اپنے وطن طوس میں عزلت گزین ہوئے اور وہیں رحلت فرمائی۔

دنیائے اسلام میں، بحیثیت مفکر و مصنف غزالی کا مرتبہ نہایت درجہ بلند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جریدہ عالم پر ان کا دوام ثبت ہے۔ غزالی کے نتائج افکار کو مغرب کے اعلیٰ مفکرین نے حیرت و اعتبار کی نگاہ سے دیکھا۔ اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ یورپ کے بعض علمی حلقوں میں تو دے کارت (Descartes) کے متعلق یہ شبہ رہا کہ اس نے غزالی کی احیاء العلوم سے خوشہ چینی کر کے اپنا فلسفہ اخلاق مرتب کیا۔ انقلاب فرانس کے زندہ جاوید محرک فلسفی روسو کی مشہور تصنیف 'اے مل' کو ملاحظہ فرمایئے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام کتاب غزالی کے افکار و نتائج سے اخذ کی گئی ہے۔ اور 'اے مل' ایک ایسا چمن ہے جس کی بندش و آرائش سات سو سال پہلے لگائے ہوئے باغ کے پھول پتوں سے کی گئی ہے۔

اس گذارش کا مقصد سرقہ علمی کا الزام لگانا نہیں۔ علم انسانی کی تجدید اسی نوع ہوتی رہی ہے۔ مقصود اس امر کا اعلان کرنا ہے۔ کہ غزالی کی بلند اور دور رس نگاہ ان حقائق کو دیکھنے میں کامیاب ہوئی جو متمدن ترین اقوام کے افراد کو سات آٹھ سو سال بعد نظر آئے کیتنی عظیم الشان شخصیت تھی جس کا سایہ آج بھی موجودہ دور کے مشاہیر کی صف میں بدرجہ اعزاز نظر آ رہا ہے۔

غزالی کا ایک مشہور کتابچہ "ایہا الولد" ہے۔ میری گذارش پر میرے رفیق کار سلیم فارانی صاحب نے اس کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اس مہینے کے آموزشش میں یہ ترجمہ پیش خدمت ہے۔

یہ کتابچہ دراصل ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔ جو غزالی نے اپنے

ایک شاگرد کے جملہ استفسارات کے جواب میں تحریر کیا تھا۔ بہ ظاہر ایک مختصر سی چیز ہے۔ لیکن جواہر پارہ کے لئے جسیم ہونا ضروری نہیں ؛

پندنامہ غزالی

حجۃ الاسلام امام غزالی طوسی کے مشہور رسالہ

"ایہا الولد"

کا اردو ترجمہ

جس میں انہوں نے علم و عمل اور صفائے باطن کے متعلق گرانقدر نکات بیان کئے ہیں

از

سلیم فارانی

ایک طالب علم نے زین الدین حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی قدس سرہ کی خدمت میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ اور کئی ایک دقیق علوم جمع کرنے کے علاوہ فضائل نفس کی تکمیل کی۔ بعد میں ایک دن اس نے اپنے حال پر غور کیا اور کہا: میں نے مختلف قسم کے علوم پڑھے اور اپنی عمر کا بہترین حصہ ان کے سیکھنے اور جمع کرنے میں صرف کیا۔ اب مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ان علوم میں سے کون سا علم میرے لئے کل (فردائے قیامت) کو

مفید اور عالم برزخ میں میرا مونس و غمگسار ثابت ہوگا۔ اور کون سا علم میرے لئے نفع بخش نہیں ہوگا۔ تاکہ اسے ترک کر دوں۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی دعا فرمائی ہے :

اللھم انی اعوذ بك من علم لا ینفع (اے خدا میں غیر مفید علم سے پناہ مانگتا ہوں)

چنانچہ یہ فکر اسے شدت سے لاحق ہوا۔ اور اس نے حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں استصواب رائے کی خاطر عریضہ لکھا جس میں متعدد مسائل دریافت کئے۔ اور نصیحت و دعا کی استدعا کی۔ اسی طالب علم کا کہنا ہے کہ اگرچہ شیخ کی تصنیفات مثلاً احیاء وغیرہ میں میرے مسائل کا جواب موجود تھا۔ تاہم میری مراد اور خواہش یہ تھی کہ امام بزرگ کسی طرح چند اوراق میں میری ضرورت کی چیزیں تحریر فرمادیں تاکہ میں ان اوراق کو تادم حیات اپنے ساتھ رکھوں۔ اور عمر بھر مشیت ایزدی کے مطابق ان پر عمل کرتا رہوں۔ امام غزالی نے اس طالب علم کے استفسارات کے جواب میں یہ رسالہ لکھ کر بھیجا :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے محبوب و عزیز فرزند! خداوند کریم اپنی اطاعت میں تمہاری زندگی دراز کرے۔ اور اپنے محبوب بندوں کی راہ پر چلنے کی تمہیں توفیق عطا فرمائے! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ نصیحت نامہ کا ماخذ معدن رسالت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر ان کی طرف سے تمہیں نصیحت پہنچ چکی ہے تو پھر میری نصیحت کی تمہیں ضرورت نہیں۔ اور اگر کوئی نصیحت ان کی طرف سے تمہیں نہیں پہنچی تو مجھے بتاؤ کہ تم نے اتنے گذشتہ سالوں میں کیا حاصل کیا ؟

اے بیٹے! رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو جو نصائح ارشاد فرمائے ہیں ان میں سے ایک ارشاد یہ ہے :

علامۃ اعراض اللہ عن العبد اشتغاله بما لا یعنیه وان امرأ ذهبت ساعة من عمره فی غیر ما خلق له

خدا کی اپنے بندے سے روگردانی کی علامت یہ ہے کہ وہ بندہ بے تعلق و بے سود چیزوں میں مشغول رہتا ہے بیشک وہ آدمی جس کی عمر کی کوئی گھڑی ایسے کام

لجد بران تطول علیہ حسرتہ۔ | میں گزرتی ہے جس کے لئے اس کی تخلیق نہیں ہوئی، اس بات کا حقدار ہے کہ اس کی حسرت لمبی ہو

ومن جاوز الاربعین ولم یغلب خیرہ شرہ فلیتجھز الی النار۔ | اور جو چالیس سے گزرا لیکن اس کی نیکی اس کی برائی پر غالب نہ آئی اسے دوزخ کے لئے تیاری کرنی چاہیئے۔

یہ نصیحت اہلِ علم کے لئے کافی ہے ۔

اے بیٹے ! نصیحت کرنا آسان ہے لیکن اس کا قبولنا مشکل ہے کیونکہ یہ خواہشات کے بندوں کے لئے کڑوی ہوتی ہے۔ اس قسم کے اشخاص کو ممنوعات پسند ہوتی ہیں، خصوصاً ایسے شخص کو جو رسمی طالب علم ہو اور دنیوی خوبیاں اور ذاتی فضیلتیں حاصل کرنے میں مصروف ہو کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ تنہا علم میں ہی اس کی نجات و رستگاری ہے اور وہ عمل کا محتاج نہیں۔ جیسا کہ فلاسفہ کا اعتقاد ہے۔ سبحان اللہ ! وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ علم حاصل کرنے کے بعد اگر وہ اس پر عمل نہ کرے گا تو یہ اس کے برخلاف ایک زبردست حجت ہوگی۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

اشد الناس عذابا یوم القیامۃ عالم لا ینفعہ اللہ بعلمہ ۔ | قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس عالم کو ہوگا جسے خدا علم سے فائدہ اٹھانے کی توفیق نہ بخشے

روایت ہے کہ جنید قدس سرہٗ کو وفات کے بعد خواب میں دیکھا گیا اور ان سے پوچھا گیا۔ کہ اے ابوالقاسم ! کوئی اُس عالم کی خبر دیجئے۔ آپ نے کہا : "وہ عبارتیں اور تاویلیں مٹ گئیں، وہ اشارات و نکات فنا ہو گئے۔ اور ہمیں سوائے ان رکعتوں کے جو ہم نے آدھی رات کو ادا کیں کسی چیز نے فائدہ نہ پہنچایا"۔

اے بیٹے ! اعمال کے مفلس و نادار نہ ہو اور احوالِ قلب سے مبرا و معرا نہ رہو اور یقین کر لو کہ تنہا علم کچھ مدد نہیں کرتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے کسی جنگل میں ایک بہادر اور جنگجو آدمی ہو جس کے پاس دس ہندی تلواریں اور کچھ دوسرے ہتھیار ہوں۔ کوئی عظیم و ہیبت ناک شیر حملہ کر دے۔ تو تمہارا کیا خیال ہے ؟ وہ ہتھیار اور تلواریں ضرب و استعمال کے بغیر

اس شیر کے شر کو اس بہادر کے سر سے دُور کر سکیں گی؟ ظاہر ہے کہ حرکت و ضرب کے بغیر ایسا ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی ایک لاکھ علمی مسئلے پڑھ لے اور سیکھ لے لیکن ان پر عمل نہ کرے تو اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی اور مثال یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی تپ اور صفراوی مرض میں مبتلا ہو جس کا علاج سکنجبین اور طبلیہ جات ہوں تو وہ ان چیزوں کا استعمال کئے بغیر شفا نہیں پاسکے گا ؎

گر مے دو ہزار رطل ہمی پیمائی ❊ تا مے نخوری نباشدت شیدائی

اگر تم سو سال علم پڑھتے رہو اور ہزار کتابیں جمع کرلو تو بھی عمل کے بغیر خدا کی رحمت کے قابل نہیں ہو سکتے۔

وان لیس للانسان الا ما سعٰی ۔	انسان اپنی "کوشش و عمل" سے ہی سب کچھ حاصل کرتا ہے ۔
فمن کان یرجو لقاء ربه فلیعمل عملا صالحا۔	جسے خدا کا دیدار مطلوب ہے اسے چاہیئے کہ نیک "عمل" کرے
جزاء بما کانوا یکسبون۔	یہ ان کے "اعمال" ہی کی جزا ہے۔
ان الذین امنوا وعملوا الصالحات کانت لهم جنات الفردوس نزلا خالدین فیها لا یبغون عنها حولا۔	بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک "عمل" کئے انکی ضیافت کیلئے جنات فردوس ہیں جنہیں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہیں گے
الا من تاب و امن وعمل عملا صالحا ۔	مگر وہ شخص جس نے صحیح طور پر رجوع کیا، یقین کیا اور نیک "عمل" کئے ۔

اور اس حدیث کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے:

بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله واقام الصلاة وایتاء الزکاة	اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور نماز کا قائم کرنا زکوٰۃ

وصوم رمضان وحج البیت — ادا کرنا، ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور

من استطاع الیہ سبیلا۔ — حسب استطاعت خانۂ خدا کا حج کرنا۔

اور ایمان "زبانی اقرار" دلی تصدیق اور ارکان پر "عمل" کرنے کا نام ہے۔

اعمال کے حق میں تو اَن گنت دلیلیں ہیں۔ اگرچہ بندہ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے جنت تک پہنچتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کی اطاعت و عبادت سے صلاحیت و قابلیت حاصل کرنے کے بعد ہی وہاں تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ

ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین — بیشک خدا کی رحمت نیک عمل کرنیوالوں ہی کیساتھ ہے

اگر کہا جائے کہ مجرد ایمان کے ساتھ بھی تو جنت میں پہنچتا ہے تو ہم بھی کہیں گے ہاں! لیکن سوال یہ ہے کہ کب پہنچتا ہے؟ اور کتنی کٹھن اور دشوار گذار گھاٹیاں اور چڑھائیاں عبور کرکے پہنچتا ہے؟ ان گھاٹیوں میں سے پہلی گھاٹی ایمان کی ہے۔ تو اب دیکھو کہ آخر تک اس کا ایمان محفوظ و سلامت رہ سکتا ہے یا نہیں؟ وہ جب پہنچے گا تو مایوس و نادار ہوگا۔ حسن بصریؒ کا قول ہے: "اللہ تعالےٰ قیامت کے دن اپنے بندوں سے کہے گا کہ اے میرے بندو! میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ اور اسے اپنے اعمال کے مطابق بانٹ لو۔

اے بیٹے! جب تک تم عمل نہیں کروگے اجر نہیں پاؤگے۔ حکایت ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک آدمی نے ستر سال خدا کی عبادت کی، خدا نے چاہا کہ اپنے فرشتوں پر اس کے کمال کو ظاہر کرے چنانچہ اس کے پاس ایک فرشتہ بھیجا کہ جاکر اسے بتلائے کہ وہ اس عبادت کے باوجود جنت میں داخل ہونے کے لائق نہیں۔ جب یہ بات اس عابد تک پہنچی کہنے لگا: ہم تو عبادت ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اُس کی عبادت کرتے جائیں، فرشتہ خدا کی طرف لوٹا اور بولا "الٰہی! جو کچھ اس عابد نے کہا تجھے بخوبی معلوم ہے"۔ اس پر خدا تعالےٰ نے فرمایا: اگر وہ ہماری عبادت سے پھرنے کا نہیں تو ہم بھی اپنے کرم کے سلسلے میں اس سے روگردانی نہیں کریں گے۔ اے میرے فرشتو! گواہ رہو، میں نے اس کے تمام گناہ معاف کر دئے۔

رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

حاسبوا قبل ان تحاسبوا وزنوا	محاسبہ سے پہلے اپنے حسابات کا جائزہ لے لو
اعمالکم قبل ان توزنوا -	اور جانچ پڑتال سے پہلے اپنے اعمال کو تول لو۔

حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں : "جسے اعتماد ہے کہ وہ بغیر جد و جہد اور کوشش کے منزلِ مقصود کو پہنچ گا بس وہ اسی تمنا ہی میں رہ جائے گا ؛ اور جسے یقین ہُوا کہ وہ کوشش و محنت سے منزل پر پہنچے گا۔ وہ بے نیاز اور کامیاب ہو گا۔"

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ عمل کے بغیر جنت کی طلب گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔

رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

الکیّس من دان نفسہ وعمل لما	دانا وہ ہے جس نے نفس کو ترک کیا اور حیاتِ بعد از
بعد الموت والاحمق من اتبع ھواہ	مرگ کی خاطر عمل کیا اور احمق وہ ہے جو اپنی خواہشات
وتمنی علی اللہ تعالی الاماني ۔	پر چلا اور خدا سے مختلف قسم کی تمنائیں باندھ بیٹھا۔

اے بیٹے ! تم نے کتنی راتیں علمی تکرار اور مطالعۂ کتب کی خاطر جاگ جاگ کر گذاریں - اور اپنے آپ پر نیند کو حرام کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کا باعث کیا تھا ؛ اگر اس سے مقصود دنیوی عزت حاصل کرنا، دولت کمانا، عہدے لینا اور اپنے ساتھیوں اور ہم عمروں کے مقابلے میں فخر کرنا تھا - تو تم پر بار بار افسوس ہے، لیکن اگر تمہارا مقصد اس سے شریعتِ نبوی کا احیا، تہذیبِ اخلاق اور نفسِ امارہ کی تسخیر تھا تو تم پر بار بار آفرین - کسی نے کیا ہی سچ کہا ہے ؎

سہر العیون لغیر وجہك ضائع   وبكاؤهن لغير فقدك باطل

(تیرے دیدار کے بغیر آنکھوں کی بے خوابی رائیگاں اور تیرے ہجر کے بغیر ان کا رونا باطل ہے -)

اے بیٹے ! جتنا چاہو عیش کر لو کیونکہ تم آخر کو موت کا شکار ہو گے - اور جس سے چاہو - محبت کرو - کیونکہ آخر کار تمہیں اس سے فراق نصیب ہوگا - اور جتنا چاہو عمل کر لو کیونکہ اسی کے موافق تمہیں جزا ملے گی -

اے بیٹے! مذہب کے متعلق عقلی بحثوں، مناظروں، طبی مشغلوں، شعروشاعری کے تذکروں، نجومی گلچھروں، عروضی اور صرفی و نحوی مذاکروں سے سوائے خدائے ذوالجلال کی منشا کے خلاف عمر ضائع کرنے کے تجھے اور کیا ملے گا۔ میں نے عیسٰی علیہ السلام کی انجیل میں یہ قول دیکھا ہے کہ میت کو جنازہ میں رکھنے کی گھڑی سے لے کر لب گور رکھنے کے لمحے تک خدائے عظیم اس سے چالیس سوال کرتا ہے۔ پہلا سوال یہ ہوتا ہے۔ کہ اے میرے بندے! تو نے لوگوں کی خاطر کئی سال اپنے آپ کو سنوارا۔ لیکن کیا میری خاطر بھی اپنے آپ کو کسی لمحہ سنوارا؟ خدا ہر روز تمہارے دل میں نظر ڈال کر کہتا ہے کہ میرے سوا دوسروں کی خاطر تم کیا کچھ کرتے ہو؛ حالانکہ تم میری مہربانیوں سے گھرے ہوئے ہو۔ کہیں تم بہرے تو نہیں کہ سنتے نہیں؟ اے بیٹے! عمل کے بغیر علم دیوانگی ہے اور علم کے بغیر عمل ممکن نہیں۔

اور تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ آج اس دنیا میں تنہا علم تمہیں گناہوں اور لغزشوں سے محفوظ رکھ کر خدا کی فرمانبرداری میں نہیں لگائے گا اور کل (فردائے قیامت) کو تمہیں دوزخ کی آگ سے نہیں بچائے گا۔ اگر تم آج مصروف عمل نہیں ہوگے اور گذرے ہوئے دنوں کا تدارک نہیں کروگے تو کل قیامت کے دن کہوگے فارجعنا نعمل صالحا (مہربانی فرما کر ہمیں دنیا کی طرف واپس بھیج دو اب ہم ضرور نیک عمل کریں گے) لیکن تم سے کہا جائے گا "نادانو! تم وہیں سے تو آرہے ہو"

اے بیٹے! روح کے سلسلے میں ہمت، نفس کے سلسلے میں شکست اور بدن کے سلسلے میں موت ٹھان لو۔ کیونکہ تمہارا آخری مسکن قبر ہے۔ اور قبروں والے ہر لحظہ تمہارے انتظار میں ہیں کہ کب پہنچتے ہو؟ دیکھنا کہیں سازوسامان کے بغیر ان سے نہ جا ملنا۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰے عنہ فرماتے ہیں: کہ یہ جسم پرندوں کے قفس اور ڈھوروں کے اصطبل ہیں۔ اس لئے تم اپنے متعلق سوچ لو کہ کس قطار میں ہو۔ اگر تم طائر لاہوتی ہو تو جونہی نقارۂ آسمانی کی آواز سنو اپنے پروردگار کی طرف رجوع کر کے بلند پرواز ہوتے چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ

عقل کے بلند ترین برجوں پر جا بیٹھو۔ جیسا کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔
اهتز عرش الرحمن من موت سعد بن معاذ   سعد بن معاذ کی موت سے عرش رحمٰن ہل گیا۔
اور معاذ اللہ اگر تم ڈھوروں میں سے ہو جیسا کہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے :۔
اولئك كالانعام بل هم اضل   وہ تو ڈھوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ
تو پھر کنج خانہ سے قعرِ جہنم میں تمہارا جا پہنچنا ناگزیر ہے۔ روایت ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ کو پینے کے لئے آب خنک دیا گیا۔ آپ نے پیالا لے لیا مگر دفعۃً رقت طاری ہوئی اور بیہوش ہو گئے۔ اور ان کے ہاتھ سے پیالہ گر گیا۔ جب آپ ہوش میں آئے تو ان سے کہا گیا " اے ابوسعید! کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ مجھے دوزخ والوں کی وہ التجا یاد آگئی تھی۔ جب وہ جنّت والوں سے کہیں گے :۔
افیضوا علینا من الماء ومما رزقکم اللہ۔   از رہِ کرم ہمیں پانی اور خدا کی طرف سے دوسری عطا کی ہوئی چیزوں میں سے کچھ عنایت کرو۔
اے بیٹے! اگر تنہا علم تمہارے لئے کافی ہوتا اور تمہیں اس کے علاوہ عمل کی ضرورت نہ ہوتی۔ تو پھر هل من سائل؟ (کیا کوئی سائل ہے؟)، هل من مستغفر؟ (کیا کوئی مغفرت کا طلب گار ہے؟)، هل من تائب؟ (کیا کوئی توبہ کرنے والا ہے؟) کی ندا بے فائدہ تھی۔

روایت ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت نے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس عبداللہ بن عمر کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اچھا آدمی ہے اگر رات کو نماز پڑھا کرے۔ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے ارشاد فرمایا کہ اے فلاں! رات کو زیادہ نہ سویا کرو۔ کیونکہ رات کو زیادہ سونا، سونے والے کو قیامت کے دن کے لئے فقیر و بیکس بنا کر چھوڑتا ہے۔

اے بیٹے! آیت ومن اللیل فتہجد بہ (رات کو عبادت کر) میں حکمِ عبادت اور وبالاسحار هم یستغفرون (صبح کو وہ مغفرت مانگتے ہیں) میں شکرِ خدا اور

المستغفرین بالاسحار (صبح کو استغفار کہنے والے) میں ذکرِ خدا کی تلقین ہے۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آوازیں خداوند تعالےٰ کو پسند ہیں، مُرغ کی آواز، قرآن پڑھنے والی آواز، اور صبح سویرے استغفار کرنے والوں کی آواز۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ خداوند تبارک تعالےٰ نے ایک ہوائی ذریعہ پیدا کیا ہے جو صبح سویرے اذکار و استغفار کو بندوں سے آقا تک پہنچاتا رہتا ہے۔ انہی کا قول ہے کہ جب رات کا پہلا حصّہ شروع ہوتا ہے۔ تو عرش کے نیچے سے منادی کرنے والا منادی کرتا ہے کہ ہاں اب عبادت گزار کھڑے ہو جائیں۔ چنانچہ وہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور مشیت ایزدی کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں پھر آدھی رات کو منادی کرنے والا کہتا ہے کہ ہاں اب مستقل مزاج فرمانبردار اُٹھ کھڑے ہوں! چنانچہ وہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور سحر تک عبادت کرتے ہیں اور جب سحر ہونے کو آتی ہے تو منادی کرنے والا منادی کرتا ہے کہ ہاں اب استغفار کرنے والے کھڑے ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور مغفرت کی دُعائیں مانگتے ہیں۔ پھر جب سورج نکل آتا ہے تو منادی کرنے والا منادی کرتا ہے کہ ہاں! اب غافل اُٹھ جائیں۔ چنانچہ وہ اپنے بستروں سے اِس طرح اُٹھتے ہیں جیسے کہ مُردے اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں۔

اے بیٹے! لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کیں اُن کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے کہا۔ اے بیٹے! دیکھنا مُرغ تم سے زیادہ دانا ثابت نہ ہو۔ کہ وہ تو صبح سویرے چلّا رہا ہو اور تم محوِ خواب رہو، کسی نے کیا ہی اچھے شعر کہے ہیں ؎

لقد هتفت فی جنح لیل حمامة ... علی فنن وهنا وانی لنائم

کذبت وبیت الله لو کنت عاشقا ... لما سبقتنی بالبکاء الحمائم

وازعم انی هائم ذو صبابة ... لربی فلا ابکی وتبکی البهائم

(آدھی رات کے تاریک پردے میں کبوتری شاخوں پر گنگنا رہی ہے اور میں سو رہا ہوں، میں جھوٹا دعویدار ہوں، خانۂ خدا کی قسم اگر میں عاشق ہوتا تو کبوتریاں رونے میں مجھ سے سبقت نہ لے جاتیں۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے رب کا عاشق و متوالا ہوں حالانکہ میں روتا نہیں اور ڈھور روتے ہیں۔)

اے بیٹے! علم کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ طاعت و عبادت کیا چیز ہے؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ طاعت و عبادت سے مراد گفتار و کردار میں شارع علیہ السلام کے اوامر و نواہی کی پیروی ہے۔ یعنی جو کچھ تم کہتے اور کرتے ہو۔ سب کچھ شرع کی اطاعت میں ہونا چاہیئے مثلاً اگر تم نے یوم عید یا ایام تشریق میں روزہ رکھا تو تم نافرمان قرار دئے جاؤگے یا تم نے ناپاک کپڑے میں نماز پڑھی۔ اگرچہ وہ عبادت ہی ہے تاہم تم نے گناہ کیا۔

اے بیٹے! تمہاری گفتار اور تمہارا کردار شرع کے مطابق ہونا چاہیئے، کیونکہ شرع کی اقتدا کے بغیر علم و عمل گمراہی ہے۔ تمہیں صوفیوں کی لاف و گزاف سے بھی دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ کیونکہ تصوف کی راہ لاف و گزاف سے طے نہیں ہوتی بلکہ مجاہدہ سے اور نفسانی خواہشات کو شمشیر ریاضت کے ساتھ قتل کرنے سے طے ہوتی ہے۔ اور تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بیلگام زبان، غفلت بھرا دل اور خواہش نفسانی بدبختی کی علامات ہیں۔ جب تک تم صدق مجاہدہ سے نفس کو نہیں مارو گے، تمہارا دل معرفت کے انوار سے زندہ نہیں ہوگا۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارے بعض استفسارات کا جواب لکھ کر نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تو اس حالت کو پہنچے گا۔ تو تمہیں اُن چیزوں کا خود بخود عرفان نصیب ہو جائیگا کسی اور صورت سے اُن چیزوں کا علم ناممکن ہے۔ کیونکہ اُن کا تعلق ذوق سے ہے۔ ذوقی کیفیات الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ مثلاً میٹھی چیز کی مٹھاس اور کڑوی چیز کی کڑواہٹ چکھنے کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک مردیت سے عاری شخص نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا اور التجا کی کہ مباشری لذت کی کیفیت سے مجھے آشنا کرو۔ اس نے جواب میں صرف یہی لکھ کر بھیج دیا کہ اے فلاں! مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم مرد ہی نہیں۔

تمہارے استفسارات سے مجھے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم اس شخص کی طرح نادان ہو، یہ تو ذوقی لذت ہے تم اٹھاؤ تو پہچانو، تقریر و تحریر میں تو یہ آ نہیں سکتی۔

اے بیٹے! تمہارے بعض استفسارات تو مندرجہ بالا قسم کے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں۔ کہ جن کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ احیاء العلوم وغیرہ میں ہم نے ان مسائل کا تذکرہ پہلے سے ہی کر دیا ہے۔ یہاں اس کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے اس کا کچھ حصہ بیان کئے دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک سالک پر چار چیزیں واجب ہیں۔ پہلی چیز صحیح اعتقاد ہے جس میں بدعت کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ دوسری مخلص وغیر متزلزل توبہ (توبتہ نصوح) جس کے بعد لغزش کی طرف رجوع ہی نہ ہو۔ تیسری چیز اہل مخاصمت کی رضا طلبی تاکہ تم پر کسی کا حق نہ رہ جائے۔ اور چوتھی چیز علم شریعت کی اس حد تک تحصیل کہ خدا تعالےٰ کے احکام کی صحیح طور پر تعمیل ہو سکے۔ اور علوم آخرت سے اس درجہ واقفیت کہ نجات کا سامان ہو سکے۔

حکایت ہے کہ شبلی رحمہ اللہ نے چار سو اُستادوں کی خدمت کی۔ اور ان کا کہنا ہے کہ میں نے چار ہزار حدیثیں پڑھیں۔ بعد ازاں ان چار ہزار حدیثوں میں سے ایک حدیث چُن لی اور اُس پر عمل کیا۔ باقی تمام چھوڑ دیں۔ کیونکہ اس ایک حدیث پر غور کرنے سے اسی میں مجھے اپنی نجات اور رہائی نظر آئی۔ متقدمین و متاخرین کا علم سارا اسی میں سمایا ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی کو کافی سمجھا اور وہ حدیث یہ ہے:۔

رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض اصحاب سے فرمایا:

اعمل لدنیاک بقدر مقامک فیھا واعمل	اپنی دنیا کیلئے اتنا عمل کر جسقدر اسمیں تمہارے ٹھہرنے کا
لاخرتک بقدر بقائک فیھا واعمل للّٰہ	امکان ہے اور آخرت کیلئے اتنا کام کر جتنا وہاں باقی رہنا ہوگا
بقدر حاجتک الیہ واعمل للنار	اور اپنے خدا کیلئے اتنا عمل کر جتنی تمہیں اسکی حاجت ہے
بقدر صبرک علیھا۔	اور دوزخ کے لئے اس قدر عمل کر جس قدر تو
	اسے برداشت کر سکتا ہے۔

اے بیٹے! اس حدیث سے ظاہر ہے۔ کہ وفورِ علم کی ضرورت نہیں۔ ایک اور حکایت پر بھی غور کرو۔ حاتم اصمؒ شقیق بلخی رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے تھے۔ ایک دن شقیق بلخی نے اُن سے پوچھا۔ آپ تیس سال میری صحبت میں رہے۔ بتلایئے تو کیا کچھ حاصل کیا؟ انہوں نے کہا: میں نے علم سے آٹھ فوائد حاصل کئے اور وہ میرے لئے کافی ہیں۔ کیونکہ میں انہی کے ذریعے اپنی نجات و خلاصی کی اُمید رکھتا ہوں۔ شقیق نے کہا:

رہ گیا ہیں؟ حاتم اصم نے کہا :

پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ میں نے لوگوں پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی چیز پیاری ہے ۔ جس سے اسے محبت و عشق ہے ۔ ان پیاری چیزوں میں سے بعض تو اس کا مرضِ موت تک ساتھ دیتی ہیں بعض لبِ گور تک ۔ اس کے بعد سب لوٹ آتی ہیں۔ اور اسے اکیلا اور تنہا چھوڑ دیتی ہیں قبر میں اس کے ساتھ ان چیزوں میں سے کوئی بھی داخل نہیں ہوتی ۔ اس صورت حال پر میں نے غور کیا اور کہا : انسان کے لئے بہترین محبوب چیز وہی ہو سکتی ہے ۔ جو عالمِ برزخ میں بھی اسکے ساتھ ہی رہے اور اس بھیانک خلوت میں اس کی مونس و غمگسار ہو ۔ چنانچہ مجھے اعمالِ صالحہ کے سوا اور کوئی چیز ایسی نظر نہ آئی، لہذا میں نے اعمال صالحہ کو ہی اپنا محبوب بنا لیا، تاکہ وہ عالم برزخ کی تاریکی میں میرے لئے چراغ بنیں اور اس کی بھیانک فضا میں میری دلجوئی کریں اور مجھے وہاں تنہا نہ چھوڑ دیں ۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا، لوگ اپنی مرادوں کی پیروی کرتے ہیں ۔ اور نفسانی خواہشات کے سلسلے میں ہمہ تن تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں ۔ اس کے متعلق میں نے فرمانِ ایزدی پر غور کیا :

واما من خاف مقام ربه	جس نے اپنے مالک و پروردگار کے سامنے حاضری
ونهى النفس عن الهوى	کی ہیبت محسوس کی اور اپنے نفس کو اس حاضری کے
فان الجنة هي المأوى	خوف سے خواہشات کی تقلید میں ملوث ہونے سے روکا
	تو یقیناً جنت ہی اس کی قرارگاہ ہوگی ۔

مجھے یقین تھا کہ قرآن مجید حقیقت و صداقت کا آئینہ دار ہے اس لئے جلدی سے میں اپنے نفس کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا ۔ اور ریاضتِ نفسانی پر کمر کس لی ۔ اور خواہشات سے نفس کو نفع اندوز نہ ہونے دیا یہاں تک کہ وہ بلند و پاک خدا کی اطاعت پر راضی ہو گیا ۔ اور اس سلسلے میں اس نے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا ۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ ہر ایک آدمی دنیاوی دولت جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اور پھر ممسک و بخیل ہو کر اسے خرچ کرنے سے ہاتھ روک لیتا ہے ۔

اِس سلسلے میں میں نے فرمانِ ایزدی پر غور کیا:

ما عندکم ینفد وما عند اللہ باق۔ — جو چیز تمہارے پاس ہے اس کا ختم ہونا ضروری ہے اور جو چیز خدا کے پاس ہے اسے بقا حاصل ہے۔

چنانچہ مجھے دُنیا سے جو کچھ میسر آیا تھا اُسے میں نے راہِ خدا میں خرچ کردیا اور مسکینوں میں بانٹ دیا تاکہ میرے لئے خدا کے ہاں ذخیرہ جمع ہو۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ خاندانوں اور قبیلوں کی زیادتی میں شرافت و عزت ہے۔ چنانچہ وہ اسی میں مگن ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ دولت کی فراوانی اور کثرتِ اولاد میں بزرگی و احترام ہے اور وہ اسی چیز پر فخر کرتے ہیں، اور بعض کا گمان ہے کہ شرف و عزت لوگوں کا مال چھیننے، ان پر ظلم کرنے اور خون بہانے میں ہے۔ ایک گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ عزت و شرافت مال و دولت کے اتلافِ بیجا، فضول خرچی اور صرفِ بے پناہ میں ہے۔ اس کے متعلق بھی میں نے خداوند کریم کے ارشاد پر غور کیا:۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم — تم میں سے خدا کے نزدیک وہی سب سے زیادہ باعزت و بزرگ ہے جو سب سے زیادہ محتاط ہے

چنانچہ میں نے تقویٰ اختیار کرلیا، اور میرا یقین مستحکم ہوگیا کہ قرآن حقیقت و صداقت کا آئینہ دار ہے۔ اور اُن لوگوں کے عقائد و زعائم تمام باطل و زائل ہیں۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو ایک دوسرے کی مذمت و غیبت کرتے دیکھا اور تحقیق پر مجھے معلوم ہُوا کہ اس کا سبب مال و دولت، عزت و مرتبت اور علم و وقار کا حسد ہے۔ میں نے خدا تعالٰے کے ارشاد پر توجہ دی:۔

نحن قسمنا بینہم معیشتہم فی الحیوۃ الدنیا۔ — ہم ہی نے دنیوی زندگی میں ان کی معیشت اور روزینے کی ان کے درمیان تقسیم کی ہے۔

تو مجھے معلوم ہُوا کہ نصیبے کی تعیین خدا کی طرف سے ازل سے ہی ہوچکی ہے اس لئے میں نے کسی کو حسد کی

نگاہ سے نہ دیکھا، بلکہ خدائے کریم کی تقسیم ازلی پر رضامند رہا۔

چھٹا فائدہ یہ ہے۔ کہ میں نے دیکھا کہ لوگ کسی غرض و سبب کی بنا پر ایک دوسرے سے عداوت کرتے ہیں۔ اس معاملے میں میں نے ارشاد خدا کو غور سے دیکھا:۔

ان الشیطان لکم عدو — بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تمہیں اگر کسی
فاتخذوہ عدوا۔ — سے عداوت کرنا ہے تو اسی سے ہی کرو۔

میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ شیطان کے سوا کسی سے عداوت جائز نہیں۔

ساتواں فائدہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ ہر ایک آدمی قوت و معاش کی طلب میں اس حد تک جد وجہد کرتا ہے۔ کہ وہ اس سے مختلف شبہات و ناجائز اقدامات کا شکار رہتا ہے۔ اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔ اور اپنی قدر و منزلت گراتا ہے۔ اس ضمن میں بھی حکم خداوندی پر میں نے غور و خوض کیا :۔

ومامن دابۃ فی الارض الاعلی اللہ — روئے زمین کے ہر جاندار کے لئے قوت مہیا
رزقھا۔ — کرنا خدا ہی کے ذمہ ہے۔

اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا رزق تو خدا کے ذمے ہے اور اسی نے اس کی ضمانت دی ہے۔ اس لئے میں بے فکر ہو کر اس کی عبادت میں مشغول ہو گیا اور اس کے سوا کسی اور سے ہر قسم کی اُمید و ہوس منقطع کر لی۔

آٹھواں فائدہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ ہر ایک آدمی کا کسی نہ کسی چیز پر سہارا ہے۔ کسی کا روپے پیسے پر، کسی کا دولت و سلطنت پر، کسی کا صنعت و حرفت پر، اور کسی کا اسی طرح اور چیزوں پر۔ میں نے اس کے متعلق فرمانِ ایزد دیکھا :۔

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ — جس نے خدا پر بھروسہ کیا وہ اسکے لئے کافی ہے
ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ — بیشک خدا اپنے ارادے کی تکمیل کرتا ہے۔ اور
لکل شیئ قدرا۔ — خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

چنانچہ میں نے خدائے بزرگ پر توکل کرلیا وہی میرے لئے ہر طرح کافی ہے۔ اور میرا بہترین نگاہبان ہے۔ شقیقؒ نے یہ سب سُن کر کہا : خدا تجھے توفیق بخشے۔

میں نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید میں نظر دوڑائی ہے۔ مجھے تو ان چاروں کتابوں کا محور یہی آٹھ چیزیں نظر آئی ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ جس نے ان فوائد پر عمل کیا۔ اس نے گویا چاروں کتابوں پر عمل کیا۔

اے بیٹے! تم نے ان دو حکایتوں سے یہ معلوم کرلیا کہ کثرتِ علم کی ضرورت نہیں۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ راہِ حق پر چلنے والے کے لئے کیا کچھ واجب ہے؟

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ سالک کیلئے ایک ایسے رہبر و مربی کا ہونا ازبس ناگزیر ہے جو اپنی تربیت سے اس کے بُرے اخلاق زائل کرکے ان کی جگہ اچھے اخلاق پیدا کرے۔ تربیت معنی کے لحاظ سے کسان کے کام کی طرح ہے۔ جو کانٹے اکھیڑتا اور اجنبی خود رو پودوں کو باہر نکال پھینکتا ہے تاکہ سبزی اور فصل اچھی اور بخوبی تیار ہو۔ سالک کے لئے ایک ایسے شیخ کے بغیر چارہ نہیں، جو اسے ادب سکھائے اور راہِ خدا پر چلائے۔ خدا نے بندوں کی طرف رسول بھیجے تاکہ اس کے راستے کی طرف ہدایت دیں۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ جب رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو انہوں نے اپنے نائب چھوڑے مقصود یہ تھا کہ خدا تعالےٰ کی طرف رہنمائی کرتے رہیں۔ ان نائبوں کی ضرورت ناقابلِ انکار ہے۔ شیخ کے لئے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا صحیح طور پر نائب بننے کی لازمی شرط یہ ہے کہ عالم ہو لیکن ہر عالم خلافت ونیابت کا سزاوار نہیں ہوتا۔ میں تمہاری خاطر مختصر طور پر صحیح رہبر کے بعض علامات بیان کرتا ہوں۔ تاکہ ہر ایک آدمی مرشد و رہبر ہونے کا دعوٰی تمہارے سامنے نہ کرسکے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ جو شخص دنیا کی محبت اور منصب کی چاہ سے محترز ہو، جس نے کسی صاحبِ بصیرت شخص کی تابعداری کی ہو۔ اور اس تابعداری کا سلسلہ سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو۔ اور جس نے تھوڑا کھانے تھوڑا بولنے اور تھوڑا سونے اور بہت سی نمازیں پڑھنے، صدقے دینے اور روزے رکھنے سے اپنے

نفس کی اچھی طرح ریاضت کی ہو۔ اور شیخِ بصیر کی اطاعت میں اپنے اندر محاسن اخلاق پیدا کئے ہوں، اور نماز، شکر، توکل، یقین، قناعت، طمانینتِ نفس، حلم، تواضع، علم، صدق، حیا، وفا، وقار، سکون، حوصلہ اور اس طرح کی اور خوبیوں سے اس کی سیرت کی تعمیر ہوئی ہو ایسا شخص نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے انوار میں سے ایک نور ہوگا۔ اور اس قابل ہوگا کہ اس کی پیروی کی جائے۔ لیکن ایسے شخص کا وجود نادر ہے بلکہ کبریت احمر (سُرخ گندھک) سے بھی زیادہ نایاب ہے۔ جس نیک بخت کو اس قسم کا شیخ و مرشد مل جائے اور اسے وہ شیخ بھی قبول کرلے تو اُسے چاہئے کہ اس کا ظاہری اور باطنی طور پر احترام کرے۔ ظاہری احترام یہ ہے کہ وہ شیخ سے جھگڑے نہیں۔ اور ہر مسئلہ میں خواہ اس کی غلطی کا علم بھی ہو شیخ کے ساتھ حُجّت بازی میں مشغول نہ ہو۔ اور نماز ادا کرنے کے اوقات کے سوا اس کے سامنے اپنا سجادہ و مصلّٰے نہ پھیلائے جب نماز سے فارغ ہو جائے تو مصلاّ اُٹھا دے اور شیخ کی موجودگی میں زیادہ نوافل نہ پڑھے اور اپنی وسعت وطاقت کے موافق شیخ کے احکام کی تعمیل کرے۔ احترامِ باطنی یہ ہے کہ جو کچھ شیخ سے ظاہری طور پر سُنے یا قبول کرے باطنی طور پر قول و فعل کے لحاظ سے اس کا انکار نہ کرے تاکہ منافقت نہ ہو۔ اور اگر ایسا نہ کرسکے۔ تو بہتر یہی ہے کہ شیخ کی صحبت اس وقت تک ترک کردے جب تک کہ اس کا ظاہر و باطن موافقت اختیار نہ کرلے۔ بُرے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے پرہیز کرے تاکہ اس کے صحنِ قلب سے شیاطین جن و انس کی سطوت کا اثر زائل ہو اور وہ شیطنت کی گندگی سے پاک ہو جائے۔ اور ہر حال میں فقر کو غنا پر ترجیح دے۔

پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ تصوف کی دو خصلتیں ہیں۔ استقامت اور لوگوں کی طرف سے اطمینان وسکون۔ جس شخص نے استقامت اختیار کی۔ اور لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک اور صبر و حوصلہ سے برتاؤ کیا تو وہ صوفی ہے۔ استقامت سے مراد یہ ہے کہ اپنی خواہشات نفسانی کو قربان کرتا چلا جائے۔ اور لوگوں سے اچھا سلوک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں پر اپنی خواہشات کا بوجھ نہ ڈالا جائے بلکہ جب تک لوگ شرع کے مخالف عمل نہ کریں۔ اُن کی

منشا کا بوجھ اپنے ہی نفس پر ڈالا جائے ۔

تم نے عبودیت کے متعلق سوال کیا ہے۔ وہ تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ پہلی امر شرعی کی حفاظت، دوسری قضا وقدر اور قسمت پر رضامندی، تیسری اپنے نفس کی رضا کو رضائے خدا کی طلب گاری میں ترک کرنا۔

تم نے توکل کے متعلق بھی پوچھا ہے وہ یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے وعدوں پر پختہ یقین و اعتقاد رکھو یعنی اس بات کا یقین رکھو کہ جو کچھ تمہارے لئے اس نے مقدر میں لکھا ہے وہ لامحالہ تمہیں مل کر رہے گا۔ خواہ ساری دنیا اسے تم سے ہٹانے کی کوشش کرے اور جو کچھ تمہارے مقدر میں نہیں لکھا۔ وہ تمہیں نہیں پہنچے گا۔ خواہ سارا جہان تمہاری امداد کرے۔

تم نے اخلاص کے متعلق پوچھا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے سارے اعمال خدا ہی کے لئے ہوں۔ اور تمہاری دلی خواہش یہ نہ ہو کہ لوگ تمہاری تعریف کریں اور اگر وہ تمہاری مذمت کریں تو تمہیں اس سے چڑھ نہ ہو۔

اور تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔ کہ ریا لوگوں کی تعظیم سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ تم لوگوں کو قدرت کے تابع سمجھو اور انہیں جمادات قرار دو جنہیں کسی کو راحت یا تکلیف پہنچانے کی قوت حاصل نہیں۔ تاکہ تم ان دکھلاوں سے نجات پاؤ۔ جب تک تم لوگوں کو صاحب قدرت و ارادہ سمجھتے رہو گے ریا تم سے ہرگز دور نہیں ہوگا۔ اے بیٹے! تمہارے باقی مسائل میں سے بعض تو میری دیگر تصنیفات میں درج ہیں۔ انہیں وہاں سے دیکھ لو۔ اور بعض کے متعلق کچھ تحریر کرنا ناجائز ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ جو کچھ تمہیں معلوم ہے اس پر عمل کرتے جاؤ ۔ تاکہ دوران عمل تم پر ان چیزوں کا خود بخود انکشاف ہو جائے جو تمہیں معلوم نہیں۔

اے بیٹے! آج کے بعد مجھ سے اپنی مشکلات کے متعلق سوال نہ کرنا۔ ہاں البتہ واقعی زبان سے دریافت کرنے میں ہرج نہیں۔ فرمان ایزدی ہے:

ولو انہم صبروا حتی تخرج الیھم   اگر وہ تمہارے آنے تک صبر سے کام لیتے

لصحان خیر لهم ۔ تو یہ ان کے لئے بہتر ہوگا ۔

اس سلسلے میں خضر علیہ السلام کے اس فرمان سے نصیحت قبول کرو :۔

فلا تسألنی عن شیئ حتی احدث لك منه ذکرا ۔ تم مجھ سے کسی بات کے متعلق نہ پوچھو جب تک کہ میں خود اس کا ذکر نہ کروں ۔

ولا تستعجل حتی تبلغ ۔ وہاں پہنچنے سے پہلے جلدی نہ کر ۔

انہ یکشف لك و ستراہ ۔ اس کا تم پر کشف ہوگا اور تم دیکھو گے ۔

سارِیکم آیاتی فلا تستعجلون ۔ میں عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا اس لئے تم جلدی نہ کرو ۔

لہٰذا تم قبل از وقت مجھ سے نہ پوچھو، اور اس بات پر یقین کرو۔ کہ تم مشاہداتی گردش کے بغیر وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ خدا تعالے فرماتا ہے :۔

اولم یسیروا فی الارض فینظروا ۔ کیا وہ زمین میں اِدھر اُدھر پھر کر مشاہدات نہیں کرتے تاکہ انہیں معلوم ہو ۔

اے بیٹے! خدا کی قسم اگر تم سیر کرو تو ہر منزل میں تمہیں عجائبات نظر آئیں گے، تمہیں چاہیئے کہ اپنی روحانی قوتوں کو اسمیں لگا دو۔ کیونکہ اس کام میں سب سے بڑی چیز روحانی قویٰ کا استعمال ہے جیسا کہ ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے اپنے ایک شاگرد سے کہا: اگر تم روح صرف کر سکتے ہو تو آ ؤ ورنہ صوفیت کی ڈینگیں نہ مارو۔

اے بیٹے! میں تمہیں آٹھ چیزوں کی نصیحت کرتا ہوں اسکے مطابق عمل کرو۔ تاکہ تمہارا علم قیامت کے دن تمہارے لئے مضر اور غیر مفید نہ ہو۔ ان آٹھ چیزوں میں سے چار قابلِ عمل ہیں۔ اور چار قابلِ ترک۔ جن چار چیزوں کو چھوڑنا مقصود ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ جہاں تک تمہارے لئے ممکن ہو تم کسی سے کسی مسئلہ پر مناظرہ نہ کرو۔ کیونکہ اس میں بہت سی آفتیں ہیں۔ اور اس میں نفع کے مقابلے میں نقصان زیادہ ہے۔ تمام بُرے اخلاق مثلاً نمود و نمائش، ریا، حسد، تکبر

کینہ، عداوت، بڑائی وغیرہ اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی مسئلہ تمہارے اور کسی شخص یا قوم کے درمیان چھڑ جائے اور تمہارا ارادہ یہ ہو کہ حق ظاہر ہو، پردۂ اخفا میں نہ رہے تو بحث جائز ہے لیکن اس ارادے کی دو علامتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تم اپنی زبان سے اور دوسرے کی زبان سے انکشافِ حق میں امتیاز نہ کرو۔ دوسری یہ کہ بھری بزم کی نسبت خلوت میں بحث کرنا تمہیں زیادہ مرغوب ہو۔ اور سنو! میں تمہارے لئے ایک مفید چیز بیان کرتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مشکلات کے متعلق سوال کرنا مرضِ قلب کو طبیب کے پیش کرنے کے مترادف ہے۔ اور اس کا جواب مرض کی اصلاح کے لئے کوشش کرنا ہے۔ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ جہلا دلیل کے مریض ہیں۔ اور علماء طبیب ہیں۔ ایک ناقص عالم اچھا علاج نہیں کر سکتا! اور ماہر و کامل عالم ہر ایک مریض کا علاج نہیں کیا کرتا بلکہ اس شخص کا علاج کرتا ہے جس کے متعلق اسے امید ہو کہ وہ معالجہ و اصلاح قبول کرے گا۔ اور اگر بیماری مزمن یا عقیم ہو جو علاج قبول نہیں کیا کرتی تو پھر طبیب کی صداقت اسی میں ہے کہ صاف کہہ دے یہ مرض علاج قبول کرنے کا نہیں۔ اس لئے اس کے مداوا میں مشغول ہونا بے سود ہے۔

پھر تمہیں یہ بھی خبر ہونی چاہئے کہ جہل کے مریضوں کی چار قسمیں ہیں جن میں سے ایک قسم علاج قبول کرتی ہے باقی تین نہیں۔ اور جو علاج قبول نہیں کرتیں۔ اُن میں سے ایک وہ ہے کہ جس کا سوال و اعتراض حسد و بغض کی بنا پر ہو۔ اور تم جتنا ہی اچھا، فصیح اور واضح جواب دو۔ مریض کا بغض و عداوت اور حسد بڑھتا ہی جائے۔ اس لئے مناسب اور صحیح طریق یہ ہے کہ اس کا جواب ہی نہ دیا جائے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کل العداوۃ قد ترجی ازالتھا الا عداوۃ من عاداک عن حسد

(ہر عداوت جس کا تم ازالہ چاہتے ہو۔ حسد ہی کی بنا پر ہے)

بہتر ہے کہ تم اس سے کنارہ کرو اور اسے اپنے مرض میں مبتلا چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فاعرض عمن تولی عن ذکرنا — ایسے شخص سے روگردانی کرو جو ہمارے ذکر سے
ولم یرد الا الحیوۃ الدنیا — انحراف کرتا ہے اور دنیوی زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔

حسود تو اپنی باتوں سے اور اپنی کارستانیوں سے اپنے علم کی کھیتی میں آپ ہی آگ لگا دیتا ہے۔

الحسد یاکل الحسنات کما — حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے۔
تاکل النار الحطب۔ — جس طرح ایندھن کو آگ۔

دوسرا مرض: وہ ہے جس کا سبب حماقت ہو۔ یہ بھی علاج قبول نہیں کرتا۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "میں مُردوں کو زندہ کرنے سے تنگ نہیں آیا" لیکن بیوقوف اور احمق کے علاج کرنے سے تنگ آ گیا ہوں"۔ صاحب حماقت وہ ہے جو طلبِ علم میں کچھ مدت مشغول رہتا ہے اور کسی قدر عقلی و شرعی علوم سیکھتا ہے۔ اور پھر اپنی حماقت کی بنا پر ایسے بڑے عالم پر سوالات و اعتراضات کرتا ہے جس کی عمر عقلی و شرعی علوم میں گذری ہے اور یہ احمق اپنی لاعلمی میں یہ سمجھتا ہے کہ جو چیز اس کی اپنی نظروں میں مشکل ہے وہ بڑے عالم کے لئے بھی مشکل ہی ہوگی۔ جب اسے بڑے عالم کی حیثیت اور علمی بلندی ہی معلوم نہیں اور اس کے متعلق اس کا یہ نظریہ ہے تو اس کے سوالات و اعتراضات کی حقیقت بھی واضح ہے۔ وہ سراسر حماقت ہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ ان کا جواب نہ دیا جائے۔

تیسرا وہ کہ ہدایت کا طالب تو ہے اور بڑوں کی جو باتیں اُسے سمجھ نہیں آتیں — انہیں اپنی کم سمجھی پر ہی محمول کرتا ہے اور استفادہ کی خاطر ہی سوال کرتا ہے لیکن کند ذہن ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ایسے شخص کے سوالوں کا جواب دینا مناسب نہیں جیساکہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

نحن معاشر الانبیاء امرنا ان — ہم انبیاء کا گروہ ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم لوگوں
نکلم الناس علی قدر عقولہم — سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کریں۔

اب رہا وہ مریض جو علاج قبول کرتا ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے۔ جو طالبِ ہدایت ہے عاقل ہے سمجھدار ہے۔ حسد، غصہ، خواہشات اور جاہ و مال کی محبت کا مغلوب نہیں۔ سیدھے راستے کا طلب گار ہے، اس کا سوال و اعتراض حسد اور امتحان کی بنا پر نہیں ہوتا، ایسا شخص علاج قبول کرتا ہے۔ اس کے سوال و اعتراض کا جواب دینا جائز بلکہ واجب ہے۔

دوسری چیز جو قابلِ ترک ہے یہ ہے کہ تم ناصح و واعظ بننے اور پیشۂ وعظ و تذکیر اختیار کرنے سے احتراز کرو۔ کیونکہ اس میں بہت سی آفتیں ہیں۔ ہاں البتہ اس حال میں کہ پہلے اپنے قول پر خود عمل کرو پھر اس کے متعلق لوگوں کو تلقین کرو۔ کوئی خطر نہیں۔ اس ضمن میں اُس بات پر غور کرو۔ جو عیسٰی علیہ السلام سے کہی گئی کہ " اے ابن مریم! پہلے اپنے آپ کو نصیحت کرو، اگر تم خود نصیحت پر عمل پیرا ہو تو پھر تمہارا لوگوں کو نصیحت کرنا بھی درست ہے ورنہ اپنے رب سے حیا کرو۔"

اگر کہیں تمہیں وعظ و نصیحت کا کام سرانجام دینا بھی پڑے تو پھر دو چیزوں سے پرہیز کرو:۔

اوّل یہ کہ اپنے کلام میں عبارات، اشارات، اشعار اور لاف و گزاف وغیرہ کے ذریعے تکلف پیدا نہ کرو۔ کیونکہ خدا وندِ کریم تکلف و تصنع سے کام لینے والوں پر ناراض ہوتا ہے۔ متکلف آدمی اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے اور یہ خرابیٔ باطن و غفلتِ قلبی کی نشانی ہے۔

اور تذکیر سے مراد یہ ہے کہ بندہ دوزخ کی آگ کو یاد کرے اور خالق کے احکام کی تعمیل کے متعلق اپنی کوتاہیاں پیشِ نظر رکھے۔ اور اپنی گذشتہ عمر کے سلسلے میں یہ سوچ بچار کرے کہ اسے کن غیر مفید کاموں میں فنا کر دیا۔ اس کے علاوہ اپنے سفرِ حیات میں آئندہ پیش آنے والی گھاٹیوں کے متعلق اس بات کی فکر کرے کہ موت کی وہ گھڑی کیسے کٹے گی جب کہ ایمان کی سلامتی معرضِ فنا میں پڑ جایا کرتی ہے؟ اس وقت اس کی کیا کیفیتِ حال ہوگی۔ جب ملک الموت اس کی روح قبض کرے گا؟ کیا وہ منکر نکیر کا جواب دے سکے گا؟ نیز قیامت اس کے مختلف آزمائشی مواقف و مقامات میں اپنی صورتِ حال کے متعلق اہتمام کرے اور یہ

کہ کیا وہ پُل صراط کو بخیر و خوبی عبور کر جائے گا؟ یا جہنم میں جا گرے گا؟ ان چیزوں کی یاد اپنے دل میں مستقل طور پر رکھے، یہاں تک کہ اس کا دل قرار سے منحرف ہو جائے۔ اس قسم کی تپش کا جوش اور ان مصیبتوں کا نوحہ تذکیر کہلاتا ہے۔ ان چیزوں کے متعلق لوگوں کو اطلاع دینا اور بتانا انہیں اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں سے آگاہ کرنا، انہیں اپنے عیوب کا جائزہ لینے پر آمادہ کرنا اور ان مصائب پر انہیں مضطرب کرنا تاکہ اپنی گذشتہ عمر کا حتی الامکان تدارک کریں۔ اور خدا کی نافرمانی میں گذرے ہوئے دنوں پر حسرت کا اظہار کریں۔ یہ سب کچھ وعظ کہلاتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو اگر کسی آدمی کے گھر کی طرف تمہیں کوئی سیلاب بڑھتا ہوا نظر آئے اور تمہیں یہ بھی خبر ہو کہ اس گھر کے اندر اس آدمی کے گھرانے کے تمام افراد موجود ہیں۔ تو تم کیا کرو گے؟ یہی کہ چلا چلا کر کہو گے: "بچو! بچو! سیلاب سے بھاگو" کیا ایسے آڑے وقت میں تمہارا جی چاہے گا کہ تم مالک مکان کو مکلف عبارات، نکات و اشارات کے ساتھ اس خطرے کی اطلاع دو۔ یقیناً تم ایسا نہیں کرو گے۔ یہی حال واعظ کا ہے۔ اسے چاہیئے کہ ان زبانی تکلفات سے پرہیز کرے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ وعظ میں تمہاری آرزو یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ لوگ تمہاری مجلس کی طرف بھاگ بھاگ کر آئیں۔ وجد کا مظاہرہ کریں۔ اور کپڑے پھاڑیں اور نتیجۃً غل برپا ہو کہ واہ واہ کیا رقت افروز مجلس ہے! کیونکہ ان تمام چیزوں کی طرف میلان دنیا ہی کی خاطر ہے اور اس کا باعث غفلت، ناعاقبت اندیشی ہے مناسب یہ ہے کہ تمہارا عزم اور تمہاری آرزو یہ ہو کہ لوگوں کو دنیا سے آخرت کی طرف، معصیت سے طاعت کی جانب، حرص سے زہد، بخل سے سخاوت اور غرور سے تقویٰ کی طرف دعوت دو۔ ان کے اندر آخرت سے لگاؤ اور دُنیا سے بُغض پیدا کرو۔ اور انہیں علم، عبادت و زہد کی تعلیم دو۔ کیونکہ وہ طبعی طور پر شرع سے منحرف ہوتے ہیں۔ اور ایسی چیزوں کے لئے مصروف اجتہاد ہوتے ہیں جن سے خدا راضی نہیں ہوتا۔ ان کا رجحان عموماً بُرے اخلاق و عادات کی طرف ہوتا ہے۔ اس لئے تمہیں چاہیئے کہ ان کے دلوں میں خوف پیدا کرو، اور خوفناک چیزوں کے بیان سے انہیں ڈراؤ اور غلط اقدامات سے روکو، ممکن ہے کہ ان کی باطنی صفات تغیر پذیر ہوں اور ان کے ظاہری حالات بھی بدل جائیں اور وہ خدا

کی اطاعت اور گناہ سے پرہیز کرنے میں حزن و رغبت کا اظہار کریں۔ یہی وعظ و نصیحت کا طریق ہے اور تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو وعظ اس قسم کا نہیں ہوتا وہ واعظ و سامع دونوں کے لئے وبال ہے بلکہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس صحیح طریق وعظ سے انحراف کرنے والا غول و شیطان ہے جو لوگوں کو راہِ راست سے بھٹکاتا اور تباہ و بربادی کے گھاٹ اتارتا ہے۔ اس لئے لوگوں کو چاہیئے کہ ایسے غول و شیطان سے بھاگیں اور احتراز کریں کیونکہ دینی لحاظ سے جس قسم کا نقصان بھٹکا ہوا واعظ پہنچا سکتا ہے ابلیس لعین کی استطاعت سے بھی باہر ہے۔ جو لوگ قدرت و سطوت رکھتے ہیں۔ انہیں چاہیئے۔ کہ ؛سے منبروں سے اتار دیں۔ اور لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا میل جول رکھنے سے روکیں۔ اور ایسا اقدام امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی قبیل سے ہے۔

تیسری چیز جو قابلِ ترک ہے۔ یہ ہے کہ تمہیں حکام و سلاطین کے ساتھ اختلاط نہیں بڑھانا چاہیئے۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ تم انہیں دیکھو بھی نہیں۔ کیونکہ ان کا دیکھنا، ان سے مل بیٹھنا اور ان سے اختلاط بڑھانا ایک بلائے عظیم ہے۔ اور اگر کہیں تم اس بلائے عظیم میں مبتلا ہو بھی جاؤ۔ تو پھر ان کی مدح و ثنا سے احتراز کرو کیونکہ کسی فاسق و ظالم کی مدح کرنے پر خدا تعالےٰ ناراض ہوتا ہے۔ اور غضب میں آتا ہے۔ ان کی درازئ حیات کے لئے جو شخص دُعا کرتا ہے۔ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ خدا کی زمین و سلطنت میں خدا کی نافرمانی کرے۔

اور چوتھی چیز جس کا ترک کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ تم امرا کے تحفے تحائف قبول نہ کرو۔ خواہ تمہیں یہ بھی معلوم ہو کہ وہ حلال چیزوں کے تحفے ہیں۔ کیونکہ ان کا طمع پیدا ہو جانے سے دین کا فساد لازمی ہے۔ ان عطیوں کے قبول کرنے سے ایک شخص مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ ان امرا و حکام کے ساتھ بنا کر رکھے، ان کی طرفداری کرے اور ظلم میں ان کے خلاف نہ ہو۔ اور یہ سب چیزیں دینی معاملے میں خرابی ہی پیدا کرتی ہیں۔ سب سے مختصر نقصان یہ ہے کہ اگر تم ان کے تحفے قبول کرو اور ان کی دنیا سے استفادہ کرو تو پھر انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا اور اُن سے لگاؤ رکھنا معمولی چیز ہے۔ اس پسندیدگی اور لگاؤ کی بنا پر اُن کی بقا و درازئ عمر کی تمنا تو ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور کسی ظالم کی

بقا کی تمنا ہیں بندگانِ خدا پر ظلم اور تخریب عالم کے ارادے مضمر ہیں۔ لہٰذا تم خود سوچ لو۔ کہ دین و عاقبت کے لئے اس سے زیادہ مضر چیز کون سی ہوسکتی ہے؟ خبردار! کہیں شیطانوں کے جھانسے میں نہ آجانا۔ اور بعض لوگوں کی اس بات سے بھی دھوکہ نہ کھاجانا کہ بہتر یہی ہے کہ ان امراء و حکام سے دینار و درہم وصول کرکے فقراء و مساکین میں تقسیم کردئے جائیں۔ کیونکہ وہ ارباب اقتدار تو فسق و معصیت کے کاموں میں اپنے روپے پیسے کو خرچ کردیں گے۔ ان کے اس مصرف سے تمہارا مفلس و کمزور لوگوں پر خرچ کرنا بہتر ہے۔ شیطان لعین نے اس وسوسے کے ذریعے کئی لوگوں کی گردنیں کاٹ کر رکھ دی ہیں۔ ہم نے اس کا ذکر احیاء العلوم میں بھی کیا ہے۔ وہاں بھی دیکھ لو۔

اب وہ چار چیزیں جن پر تمہارا عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ بیان کی جاتی ہیں:

پہلی چیز یہ ہے کہ تمہارا معاملہ خدا کے ساتھ ایسا ہونا چاہیئے کہ اگر ویسا معاملہ تمہارا غلام تمہارے ساتھ رکھے۔ تو تم اس سے خوش رہو۔ تمہارا دل اس سے تنگ نہ ہو۔ اور نہ ہی تمہیں غصّہ آئے۔ جو باتیں اس غلامِ مجازی کی طرف سے تمہیں پسند نہ ہوں۔ اس قسم کی باتوں سے اپنے خدا کے سلسلے میں احتراز کرو کیونکہ وہ تو تمہارا حقیقی آقا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھو جو تم اُن سے اپنے ساتھ چاہتے ہو کیونکہ انسان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ تمام لوگوں کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جب تم علم پڑھ لو یا علمی حقائق سے آشنا ہو جاؤ تو ضروری ہے کہ اس علم کے ذریعے تمہارے قلب کی اصلاح اور تمہارے نفس کا تزکیہ ہو۔ تم خود ہی بتاؤ کہ اگر تمہیں پتہ چل جائے کہ تمہاری عمر اب ایک ہفتہ سے زائد باقی نہیں۔ تو پھر تم کیا کروگے؟ کیا علم فقہ، علم اخلاق، علم اصول، علم کلام، وغیرہ کی تحصیل و اعادہ میں مصروف ہو جاؤ گے؟ نہیں ہرگز نہیں کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ ان علوم کی تحصیل میں مصروفیت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بلکہ تم تو ایسے مشاغل اختیار کروگے جن سے دل پر کڑی نگاہ ہو، نفس کی خوبیوں سے شناسائی ہو، دُنیا کے دھندوں سے دُور ہٹ

اور تمہارا نفس بُری عادات سے پاک ہوجائے۔ تم تو اللہ تعالےٰ کی محبت وعبادت میں لگ جاؤ گے۔ اور کوشش کرو گے کہ کسی طرح جلد اپنے اندر اچھے اوصاف پیدا کر لو۔ اور تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ بندے پر کوئی دن اور رات نہیں گذرتی جس میں اس کی موت واقع ہونے کا امکان نہ ہو۔

اے بیٹے! تم مجھ سے آخری الفاظ سُن لو۔ اور ان پر غور کرو۔ تاکہ تمہیں نجاتِ ابدی نصیب ہو۔

اگر تمہیں اطلاع ملے کہ ایک ہفتے کے بعد بادشاہ تمہیں اپنا وزیر بنانے والا ہے تو ظاہر ہے کہ تم اس قلیل عرصے میں انہی چیزوں کی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو جاؤ گے۔ جن پر تمہیں بادشاہ کی نظر پڑنے کا الیقین ہوگا۔ مثلاً کپڑے، جسم، گھر، سامانِ خواب وراحت، وغیرہ۔

اب ذرا اس چیز کے متعلق غور کرو۔ جس کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ تم سمجھدار اور دانا ہو۔ اور دانا کے لئے اشارہ کافی ہے۔

کیا رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا؟ :

ان اللہ لا ینظر الی صورکم ولا	بیشک خدا تمہارے صور و اعمال کو نہیں دیکھتا۔
الیٰ اعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم	بلکہ تمہارے دلوں اور باطنی عزائم پر نگاہِ
ونیاتکم۔	تحقیق ڈالتا ہے۔

اگر تمہیں احوالِ قلب کے متعلق معلومات چاہئیں تو میری تصنیفات احیاء وغیرہ میں دیکھو۔ اور تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ احوالِ قلب کا علم فرضِ عین ہے۔ اس کے سوا باقی تمام علوم فرضِ کفایہ ہیں۔ اس حد تک کہ ان سے خدا کے فرائض ادا ہو جائیں۔ اور خدا ہی ان کی تحصیل کی تمہیں توفیق بخشتا ہے۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ تم دنیا وی جنس و مال سے اپنے نان و نفقہ کا سامان اتنا کیا کرو۔ کہ ایک سال تک کافی ہو۔ جیسے کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم اپنے بعض اہلِ بیت کے لئے کیا کرتے تھے۔ آپ دعا فرمایا کرتے تھے کہ :-

اللھم اجعل قوت آل محمد	الٰہی! آلِ محمدؐ کی روزی کو بہ حد عطا فرما۔ کہ بس
کفافا۔	کفایت کرے۔

آپ روزی کا اس قدر اہتمام تمام بیویوں کے سلسلے میں نہیں فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ اہتمام صرف اُنہی کے لئے ہوتا تھا۔ جن کے متعلق معلوم تھا۔ کہ وہ کمزور دل رکھتی ہیں۔ جو حرم محترم الیقینِ محکم کی مالکہ ہوتیں ان کے لئے تو ایک ڈیڑھ دن کی روزی سے زائد انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔

اے بیٹے! میں نے اس مکتوب میں تمہارے استفسارات کا جواب دے دیا ہے۔ اب تمہیں چاہیئے کہ ان پر عمل کرو۔ اور ان کے متعلق اپنی نیک دُعاؤں میں مجھے بھی یاد کرتے رہو۔ اور جو دُعا تم نے مجھ سے طلب کی ہے۔ اسے صحاح کی دُعاؤں سے طلب کرو۔ یہ دُعا جو میں نیچے لکھے دیتا ہوں۔ اپنے مختلف اوقات میں خاص کر نمازوں کے بعد پڑھا کرو:۔

اللھم انی اسالک من النعمۃ تمامھا ومن	اے خدا میں تجھ سے مکمل نعمت، ہمیشہ
العصمۃ دوامھا ومن الرحمۃ شمولھا ومن	رہنے والی پاکیزگی، وسیع رحمت، مستقل
العافیۃ حصولھا ومن العیش ارغدہ	صحت و عافیت، فارغ البال زندگی، بہترین
ومن العمر اسعدہ ومن الاحسان اتمہ	عمر، مکمل احسان، ہمہ گیر انعام، شیریں فضل وکرم
ومن الانعام اعمہ ومن الفضل اعذبہ	قریبی اور زود رس مہربانیاں طلب کرتا
ومن اللطف اقربہ۔	ہوں۔
اللھم کن لنا ولا تکن علینا	اے خدا میری استدعا یہ ہے کہ تو ہمارے حق
	میں رہے۔ ہمارے برخلاف نہ ہو۔
اللھم اختم بالسعادۃ آجالنا وحقق	الٰہی! نیک بختی پر ہماری زندگی کا خاتمہ کر، ہماری
بالزیادۃ آمالنا واقرن بالعافیۃ غدونا	آرزوؤں کو زیادتی سے نواز، ہماری صبح وشام کو
وآصالنا واجعل الی رحمتک مصیرنا	عافیت کا قرین بنا، ہماری چال اور ہمارے انجام
ومآلنا واصبب سجال عفوک علی	کا رُخ اپنی رحمت کی طرف کر دے، اپنی معافی کے

ذنوبنا ومن علينا باصلاح عيوبنا واجعل
التقوى زادنا وفي دينك اجتهادنا
وعليك توكلنا واعتمادنا۔

اللهم ثبتنا على نهج الاستقامة
واعذنا في الدنيا من موجبات
الندامة يوم القيامة وخفف
عنا ثقل الاوزار وارزقنا
عيشة الابرار واكفنا واصرف عنا
شر الاشرار واعتق رقابنا
ورقاب آبائنا وامهاتنا واخواتنا
من النار برحمتك يا عزيز يا غفار
يا كريم يا ستار يا عليم يا
جبار يا الله يا الله يا الله
برحمتك يا ارحم الراحمين
ويا اول الاولين ويا اخر الاخرين
ويا ذا القوة المتين ويا راحم
المساكين ويا ارحم الراحمين۔
لا اله الا انت سبحانك اني كنت
من الظالمين وصلى الله على سيدنا
محمد وآله وصحبه اجمعين
والحمد لله رب العالمين ۰

ڈور کر ہمارے گناہوں پر اے اللہ! ہمارے عیوب کی
اصلاح کرکے ہم پر احسان کر۔ تقویٰ کو ہمارے لئے
زادِ راہ بنا اور اپنے دین کی خاطر ہمیں مصروفِ عمل ہونے
اور اپنی ذات پاک پر توکل و اعتماد کرنیکی توفیق عطا فرما۔
الٰہی! ہمیں استقامت کے راستے پر ثابت قدم رکھ اور
ہمیں دنیا میں ان چیزوں سے بچا جو قیامت کے دن ہمارے لئے
باعثِ ندامت ہوں۔ ہم پر سے گناہوں کا بوجھ ہلکا کر اور ہمیں
نیکوں کی زندگی عطا فرما اور ہمارے لئے خود کافی ہو اور
شریروں کے شر کو ہم سے دور رکھ اور اپنی رحمت سے
ہماری اپنی اور ہمارے آباؤ اجداد، ہماری ماؤں اور ہماری
بہنوں کی گردنوں کو جہنم سے آزاد کر۔
اے عزت و غلبہ والے! اے گناہوں کے بخشنے والے! اے
کرم کرنیوالے! اے عیب پوشی کرنیوالے! اے ہر چیز کی خبر رکھنے
والے! اے زبردستی کے مالک! اے معبودِ حقیقی! اے اللہ!
اے اللہ! اے اللہ! اپنی رحمت کے صدقے اے سب سے زیادہ رحم کرنیوالے
اے سب سے پہلے اور سب سے آخری! اے زبردست قوت والے! اے مسکینوں
پر رحم کھانے والے! اے سب سے زیادہ مہربانی کرنیوالے! تیرے سوا کوئی
معبود نہیں، تیری ذات پاک ہے اور میں بیشک تعدی کرنیوالوں میں سے ایک ہوں۔
خدا کی رحمتیں ہمارے سردار آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور انکے
آل و اصحاب سب پر نازل ہوں۔ تمام قسم کی تعریفیں
جہانوں کے پروردگار اللہ ہی کو سزاوار ہیں۔

علمِ طبیعیات کی ترقی میں مسلمانوں کا حصّہ

شبیر احمد قاری

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی چالیس کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ شمالی افریقہ، عرب، روم، ایران، ترکستان، افغانستان اور پاکستان میں تقریباً سو فیصدی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ مشرقی افریقہ، چین، ہندوستان، جزائر شرق الہند، مشرقی یورپ اور روس میں مسلمان کافی تعداد میں آباد ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم ہر جگہ سیاسی پستی کی حالت میں ہیں۔ یا تو کسی کے ماتحت ہیں یا اگر خود مختار ہیں تو کسی اول درجہ کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ علمی قابلیت میں ہم یورپ کے اکثر ممالک اور امریکہ سے پیچھے ہیں۔ سائنس میں ہماری حالت نہ ہونے کے برابر ہے۔

آج کل کسی ملک کی فوجی قوت کا دارومدار اس کے سپاہیوں کی تعداد اور سپاہیانہ خصلتوں ہی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو سائنس کی ترقی پر ہے جس میں سب سے بڑا درجہ علمِ طبیعات یا فزکس کا ہے۔ اسلامی ممالک میں طبیعیات صرف اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ کوئی اعلیٰ قسم کا دارالعمل یعنی لیباریٹری موجود نہیں ہے جہاں تحقیق یا ریسرچ

کا کام کیا جا رہا ہو۔ تجربہ گاہوں کا فقدان، ریسرچ کا کام کرنے والوں کی کمی۔ علم طبیعات اور دوسرے سائنس کے حصول کے لئے یورپ اور امریکہ کی محتاجی۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے ہمارے دماغوں میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ غیر مسلموں کو تو کیا خود مسلمانوں کو اس بات کا علم نہیں کہ علم اور سائنس کی دُنیا میں مسلمانوں کا ماضی کس قدر شاندار رہا ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ ممالک جو ہر سائنس میں ہمارے اُستاد بنے ہوئے ہیں۔ ان کو یہ درجہ ہمارے اجداد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے ہی کی بدولت ملا ہے۔ کوئی علم اور کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں ہم نے ترقی نہ کی ہو۔ اور جو ہماری ہی بدولت یورپ کو حاصل نہ ہؤا ہو۔ علم طب کے سوا باقی سب علوم کی درس و تدریس کا مرکز مسجدیں ہوتی تھیں۔ صرف قسطنطنیہ میں اسّی مسجدیں ایسی تھیں جن میں قلمی نسخوں اور مسودوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچی تھی تھی۔ قاہرہ، دمشق، موصل بغداد، ایران، ہندوستان ہر جگہ کتب خانے اور لائبریریاں بکثرت موجود تھیں ان سب نسخوں اور مسودوں کا ترجمہ تو درکنار ابھی تک ان کی فہرست بھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ہسپانیہ کی Escorial Library. میں جو کتابیں اور مسودے مسلمانوں کے وقت کے موجود ہیں۔ اس کی ابھی Catalogue یا فہرست تک نہیں بن سکی۔ ان کتابوں میں اگر ان لائبریریوں کی کتابیں بھی شامل کر لی جائیں۔ جو عیسائیوں اور تاتاریوں نے تباہ اور برباد کر دی تھیں۔ تو ان کی فہرست بنانا ہی ایک عظیم الشان کارنامہ سمجھا جائے گا۔ گذشتہ سالوں میں جو کچھ ریسرچ ان کتابوں کے متعلق ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اسلاف علمی تحقیق اور سائنس کی ریسرچ میں کیا کارہائے نمایاں کر گئے ہیں۔

اسلامی علوم و فنون اور سائنس چار مدارج سے گذرے ہیں۔

اوّل دور بعثتِ رسولِ کریمؐ سے لے کر ۷۵۰ء تک جس کو ہم ابتدائی دور کہہ سکتے ہیں دوسرا دور ۷۵۰ء سے ۹۰۰ء تک جس کو ہم دورِ ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔ تیسرا دور ۹۰۰ء سے ۱۱۰۰ء تک جس کو ہم عہد زریں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور چوتھا دور ۱۱۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ہمارا دورِ انحطاط ہے۔

دورِ اوّل:

مسلمانوں کے عروج سے پہلے متفرق علوم وفنون اور سائنس میں جو ترقی ہوئی تھی۔ وہ زیادہ تر یونانیوں نے کی تھی۔ مسلمانوں کے روم اور ایران فتح کرنے سے صدیوں پیشتر یونانی علوم قریباً مردہ ہو چکے تھے۔ معدودے چند عالم ایسے رہ گئے تھے جنہوں نے ارسطو۔ بقراط۔ جالینوس طالیموس۔ بطلیموس۔ ارشمیدس اور دیگر یونانی حکماء کے علم کو ترقی دی ہو۔ مصر میں ان علوم کی ترقی کے امکانات موجود تھے۔ مگر وہاں کے لوگ کٹر قسم کے عیسائی تھے جو سائنس پڑھانا یا کوئی علم حاصل کرنا کفر سمجھتے تھے۔ اس لئے اہلِ مصر بھی یونانی علوم کو بدقسمتی سے عربوں کی فتح مصر کے وقت عربوں کو نہ پہنچا سکے۔ اس بنا پر یہ کہنا حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونانیوں کے علم کو بھی مسلمانوں ہی نے دوبارہ زندہ کیا۔

جب عربوں نے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ فتح کیا تو انہوں نے ایرانی اور بازنطینی علوم وفنون کو برباد نہیں ہونے دیا۔ اہلِ یورپ نے جب اسپین کو مسلمانوں سے لیا تو قتل و غارتگری کے علاوہ ان کے کتب خانوں کو بھی پھونک دیا۔ صلیبی جنگوں میں بیسیوں کتب خانے تباہ کئے گئے۔ اور تاتاریوں نے جب بغداد کو لوٹا تو سارے کتب خانوں میں آگ لگا دی۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ ممالک میں ہر جگہ لائبریریوں کی حفاظت کی۔ ایران میں خسرو نوشیروان کی بنوائی ہوئی ایک درسگاہ علوم جندیشاپور میں تھی۔ اس کو مسلمانوں نے اپنا لیا۔ اور وہ سائنس کا مرکز بن گئی۔ بنو امیہ کے زمانے میں جبکہ دمشق ان کا دارالخلافہ تھا یعنی سنہ ۶۶۱ء سے ۷۴۹ء تک اس درسگاہ نے بڑے بڑے حکماء پیدا کئے۔ جن کی دمشق میں بڑی قدر کی جاتی تھی۔ لیکن اس دور میں کسی مورخ نے اس بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ کہ وہ سائنس کی ترقی کا ذکر کرتا۔

دوسرا دور:

دوسرا دور دراصل ترجمے کا دور تھا۔ یونانی سائنس کو عربی میں ترجمہ کرنے کے متعلق ہماری

معلومات بہت ہی محدود ہیں۔ ہاں البتہ طب کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے۔ اس زمانے کا مشہور سائنسدان جابر ابن حیّان ہے جس نے علم کیمیا کو بہت ترقی دی سنہ ۸۷۳ء میں الکندی ایک بہت بڑا ماہر طبیعیات گذرا ہے جس نے دو سو پینسٹھ مسودے چھوڑے تھے۔ ان میں سے پندرہ میکانیکیات Metorology. پر ہیں۔ کئی ایک وزن مخصوص پر ہیں۔ کچھ سمندری لہروں پر کچھ روشنی پر اور آٹھ علم موسیقی پر۔ الکندی کا لکھا ہوا "علم نور" لاطینی میں ترجمہ ہوا اور وہ مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہے مشہور فرنگی سائنسدان روگر بیکن اور دوسرے فرنگی سائنسدانوں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس دور میں میکانکی مسائل کو ریاضی سے حل کرنے کا عام دستور تھا۔ جو کہ آج کل Properties of matter. (خواص مادہ) کی صورت میں F. Sc. اور M. Sc. کی صورت میں Mechanics اور B. Sc. کے سلیبس میں اور B. Sc. کے سلیبس میں شامل ہے۔ پن چکیوں کے متعلق علم مختلف اقسام کے ترازو۔ پانی سے چلنے والی گھڑیاں اور اسی قسم کی بیسیوں چیزوں پر کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں ترجمہ کم اور نئی معلومات زیادہ تھیں۔ دھاتوں کے علم پر ارسطو کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا اور اس میں پتھروں کے متعلق معلومات کا اضافہ کیا گیا خصوصاً قیمتی پتھروں کے متعلق جو نئی دریافت کی گئی۔ وہ بعد میں ترجمہ کر کے یورپینوں نے اپنا لیا۔ اور اب تک وہ معلومات مفید ثابت ہو رہی ہیں۔

تیسرا دور:

یہ دور سنہ ۹۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۱۰۰ء تک قائم رہا۔ یہ مسلمانوں کا عہدِ زریں تھا۔ اس دوران میں وہ کتابیں لکھی گئیں جن کو آج کل انسائیکلوپیڈیا کہتے ہیں سنہ ۸۶۵ء میں رازی جن کو مغرب Rhazes کے نام سے جانتی ہے پیدا ہوئے۔ یہ صاحب اسلامی دنیا کے عظیم ترین حکیم اور فلسفی ہیں اور ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک کے عظیم ترین حکماء اور فلسفیوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے علم طب پر اور علم طبیعیات پر کتابیں لکھیں طبیعیات کی کتابوں میں انہوں نے مادے۔ خلاء۔ وقت۔ حرکت۔ علم نور۔ موسموں کے تغیرات وغیرہ پر مختصر معلومات

دسج کی ہیں۔ یہ صاحب ۹۲۵ء میں انتقال کر گئے۔

ابوعلی الحسین ابن سینا جن کو اہل مغرب .Avisenna کے نام سے جانتے ہیں ۔ ۹۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۳۷ء میں انتقال کر گئے۔ بوعلی سینا طب میں اس قدر مشہور ہیں کہ اہل یورپ کا طب سب کچھ وہی ہے۔ جو اُن کی مشہور کتاب "القانون فی الطب" سے حاصل کیا گیا ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ .Cannon of Medicine ہے۔ لفظ Canon صاف ظاہر ہے کہ قانون کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مسلمان ان کو بوعلی سینا کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کے وقت کی اُن کتابوں سے جو اب منظرِ عام پر آئی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبیب سے زیادہ ماہر طبیعیات تھے۔ لیکن اس سلسلے میں ابھی ہماری معلومات زیادہ نہیں ہیں۔

ابوریحان محمد البیرونی کو جو ۹۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۴۸ء میں وفات پا گئے۔ اہلِ یورپ 'ماسٹر' کہتے ہیں۔ یہ حکیم تھے۔ منجم تھے۔ ریاضی دان تھے۔ ماہر علم طبیعیات تھے۔ جغرافیہ دان تھے اور مورخ تھے۔ علم طبیعیات میں ان کی وجہ سے جو خاص اضافہ ہوا وہ یہ تھا کہ انہوں نے تجربے کر کے اٹھارہ قیمتی پتھروں اور دھاتوں کا صحیح صحیح وزنِ مخصوص معلوم کیا۔ جن میں کوئی دوسرا سائنسدان اس وقت تک اضافہ نہیں کر سکا ہے۔ ان کی لکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب جو نادر اعجوبات میں سے ہے۔ اسپین کی Escorial Library میں موجود ہے

المسعودی جنہوں نے ۹۵۷ء میں قاہرہ میں وفات پائی بہت زبردست ماہر طبیعیات تھے۔ انہوں نے زلزلوں پر بڑی ریسرچ کی۔ بحیرۂ مردار کے پانی پر مختلف قسم کے تجربے کئے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تجربے اسی قسم کے ہوں۔ جو آج سے چند سال قبل ایک مشہور انگریز ماہر طبیعیات پروفیسر کامپٹن نے کشمیر کے چشموں کے پانی پر کئے تھے یعنی Radio activity پر۔ بیسیوں نہیں سینکڑوں مسودے ایسے ہیں۔ جن کی ابھی تک فہرست بھی نہیں بنی ہے۔ ترجمہ ہونا تو دور کنار۔ پون چکی پہلے پہل غالباً المسعودی ہی نے بنائی تھی۔ اور لطف کی بات یہ ہے۔ کہ یہ پہلے سائنسدان تھے۔ جنہوں نے مسئلۂ ارتقا پر ایک نظریہ قائم کیا۔ گو یورپ کے

اکثر متعصب شخص ڈاروِن کو یہ درجہ دیتے ہیں۔

ایک مسلمان ترک الفارابی نے جنہوں نے ۹۵۱ء میں انتقال کیا علم موسیقی اور اس کے نظریے پر بہت عمدہ کام کیا ہے ۹۷۶ء میں محمد الخوارزمی نے ایک کتاب "سائنس کی کنجی" کے نام سے لکھی۔ اور ابن الندوم نے ۹۸۸ء میں ایک مشہور "فہرست العلوم" لکھی الخازنی نے جو مرو میں ۱۱۲۰ء میں گذرے ہیں ایک ضخیم کتاب "میزان العقل" تالیف کی۔ جس کے ابھی صرف چند حصے شائع ہوئے ہیں۔ اس میں اس نے رومن ترازو یعنی کانٹا جو سٹیشنوں پر تولنے کے کام آتا ہے۔ بنانے کا ذکر کیا ہے۔ وزن مخصوص پر بحث کی ہے۔ اور پانی کے دباؤ کا اس کی گہرائی سے تعلق دکھایا گیا ہے۔ یہ سب کچھ روگر بیکن نے اسی کتاب سے سیکھا ہے ۱۲۰۶ء میں الجزری نے عراق میں ایک کتاب میکانک پر لکھی ۱۲۰۳ء میں رضوان ایرانی نے ایک کتاب لکھی جس میں پانی سے چلنے والی گھڑی کا خاص طور سے ذکر ہے۔ یہ گھڑی اس کے باپ نے دمشق کے ایک دروازے پر لگائی تھی۔ اہل مغرب اس کتاب سے سولہویں صدی تک فائدہ اُٹھاتے رہے۔ ایک اور ایرانی کمال الدین نے جن کا انتقال ۱۳۲۰ء میں ہوا۔ الحسن کے کیمرے کو بہتر بنایا۔ اس نے تجربوں سے ثابت کرکے قوسِ قزح کے متعلق معلومات لکھیں جو آج تک ایف ایس سی اور بی ایس سی میں Primary and Secondary Rainbow کی شکل میں پڑھائی جا رہی ہیں۔

یہ چند نام مشہور سائنسدانوں کے ہیں۔ لیکن جو کام ابو علی الحسن ابن الہیثم نے کیا وہ ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اہلِ مغرب اس کو Alhazen. کے نام سے جانتے ہیں طبیعات پر الحسن نے اختراعات اور معلومات کا اتنا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ کہ صرف یہ بتانے کے لئے کہ انہوں نے کس کس موضوع پر تحقیق کی ہے۔ پندرہ منٹ صرف ہوں گے۔ ان کے متعلق اس وقت صرف اتنا کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کے قائم کئے ہوئے نظریے آج تک ساتویں جماعت سے لے کر ایم ایس سی کے فزکس کے سلیبس میں داخل ہیں۔ جو کچھ انہوں نے

سنہ ۹۶۵ء میں دریافت کر لیا تھا۔ وہ یورپی سائنسدانوں نے ان سے چھ صدیوں کے بعد دریافت کیا سب سے پہلا کیمرا انہوں نے ہی بنایا تھا۔

یہ چند مسلمان سائنسدانوں کے کارناموں کا ایک سرسری جائزہ ہے۔ اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ حکومتِ وقت کو یا پبلک کو سائنس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہیں! ہر خلیفہ، ہر شہزادہ۔ ہر بڑا رئیس عالموں اور سائنسدانوں کا قدردان تھا۔ انہوں نے اپنی اپنی لائبریری قائم کر رکھی تھی۔ عیسائی۔ ہندو۔ یہودی سب ان لائبریریوں سے اور مسلمان عالموں سے مستفید ہوتے تھے۔ خلیفہ المامون نے سنہ ۸۳۰ء میں ایک زبردست "عقل گھر" قائم کیا۔ پھر خلیفہ المتوکل نے اور اس کے علاوہ بہت سے امراء نے بھی اس قسم کی تجربہ گاہ اور لیبارٹریاں بنائیں۔ فاطمی خلیفہ الحاکم نے سنہ ۹۹۵ء میں قاہرہ میں ایک زبردست سائنس گاہ قائم کیا۔ جس کے متعلق ہماری معلومات اس قدر مکمل ہیں کہ اس کا بجٹ تک بھی معلوم ہے۔ مسلمان پبلک کا یہ حال تھا کہ عراق میں ایک سوسائٹی "اخوان الصفا" کے نام سے قائم تھی جس نے دسویں صدی میں ایک انسائیکلوپیڈیا لکھا جس کی باون جلدیں تھیں۔ ان میں سے سترہ جلدیں علم طبیعیات اور علم کیمیا پر تھیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کی کُل ۲۴ جلدیں ہیں۔ جسے انگریزوں کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

چوتھا دَور:

جس کو دَورِ انحطاط کہا جاتا ہے سنہ ۱۱۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء اس دَور کا آخری دن تھا یعنی جب دن کا آفتاب مسلمانوں کی آزادی لے کر طلوع ہوا۔ اور مملکتِ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس دن سے پھر دلِ مسلم میں زندہ تمنائیں دھڑکتی سنائی دے رہی ہیں۔ سائنس کی اہمیت کا احساس بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ لڑکوں کے ایک مقامی کالج میں جہاں سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے فرسٹ ایر میں تیس پینتیس مسلمان طلبا سائنس میں داخل ہوتے تھے اب ایک سَو اسّی مسلمان طلباء کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ لڑکیوں کے ایک مقامی کالج

میں جہاں پاکستان بننے سے پیشتر سائنس کے فرسٹ ایر میں صرف سات آٹھ مسلمان طالبات داخل ہوتی تھیں اب ایک سو میں طالبات سائنس کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ محکمہ تعلیم مغربی پنجاب کا یہ اقدام قابلِ تعریف ہے کہ اس نے ایک کالج راولپنڈی میں اور ایک چکوال میں سائنس کی تعلیم کے لئے کھول دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اعلیٰ لیباریٹری کے قیام کی تجویز پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ شمالی سرحد پر ایک نئی یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے۔ یہ یونیورسٹی اس علاقے میں کھولی گئی ہے۔ جہاں کے مسلمان سینہ بہ سینہ علم کی بدولت بندوق سازی میں ماہر ہیں۔ تھل کے بے آب و گیاہ ریگستان کو آبپاشی کرنے کی سکیم پر عمل شروع ہو چکا ہے۔ چکوال کے قریب مٹّی کے تیل کا ایک نیا ذخیرہ دریافت کر لیا گیا ہے۔ اب وہ دن دُور نہیں کہ پاکستان سائنس اور دوسرے علوم و فنون میں وہ درجہ حاصل کر لے گا۔ جو قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کو حاصل تھا۔

(نوٹ:۔ یہ مضمون ریڈیو اسٹیشن لاہور پاکستان سے "ہم نے اسے زندہ کیا" کے سلسلے میں ۱۱ ستمبر ۱۹۴۹ء کو نشر کیا گیا تھا۔ اس مضمون کو رسالے میں چھاپنے کی اجازت بھی حاصل کر لی گئی ہے)

•

امتحانات

شیخ برکت اللہ

امسال یونیورسٹی کے ہر امتحان پر طلباء نے کسی نہ کسی پرچہ کے خلاف شور و غل اُٹھایا ہے۔ اور جائز و ناجائز طریقہ سے رعایت کا مطالبہ کیا ہے۔ کئی اخبارات میں بھی طلباء کی حمایت میں مضامین شائع ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرچہ جات میں ضرور کچھ سقم تھا۔ آؤ ہم معلوم کریں کہ اس کی اصلی وجہ کیا ہے؟ آیا ہمارے نوجوانوں کی تعلیمی لیاقت کم ہو گئی ہے۔ یا واقعی ممتحن صاحبان نے ایسے پرچہ جات مرتب کئے جن سے طلباء گھبرا اُٹھے۔

ماہرینِ تعلیم کا خیال ہے کہ امتحانات کا موجودہ طریقہ بہت ناقص ہے۔ اس طریقے سے طلباء کی قابلیت کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے۔ کہ جو بچے سال بھر باقاعدہ محنت سے تعلیم حاصل کرتے رہے اور جماعت میں اچھے لڑکوں میں شمار ہوتے تھے۔ کمرۂ امتحان میں پہنچ کر اتنے گھبرا گئے کہ جن سوالات کے جوابات انہیں بخوبی یاد تھے وہ بھی غلط لکھ آئے۔ ویسے بھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ بہت سے طلباء ایسے ہوتے ہیں جو اسکول کی زندگی میں

ہمیشہ نالائق ہوتے ہیں ۔ اور امتحانات میں بھی انہیں ہمیشہ زک اُٹھانی پڑتی ہے ۔ لیکن جُو نہی اسکول چھوڑ کر دُنیاوی زندگی میں شامل ہوتے ہیں تو وہ ذہین طلباء کی نسبت کامیاب زندگی بسر کرنے لگتے ہیں ۔ اگر وہ کسی نہ کسی طریقہ سے میٹرک کا امتحان پاس کرکے کالج میں پہنچ جاتے ہیں تو وہاں ان کے دماغ کی سوتیں کھل جاتی ہیں ۔ اور وہ بڑے اچھے سکالروں میں شمار ہونے لگتے ہیں ۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تعلیم اور خاص کر ہمارے امتحانات میں ضرور کچھ نقائص ہیں ۔ اس لئے موجودہ طرز کی اصلاح کرکے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ جس سے بچوّں کی لیاقت کا صحیح اندازہ ہو سکے ۔ اسائنمنٹ سسٹم یعنی تفویضی طریقہ تعلیم میں بچےّ کا سال بھر کا کام دیکھ کر اگلی جماعت میں چڑھا دیا جاتا ہے ۔ اور دیگر ممالک میں پرچہ جات کے علاوہ دیگر مشاغل کا بھی خیال رکھا جاتا ہے لیکن ہمارے یہاں صرف یہی ایک معیار ہے کہ پرچہ جات کے جوابات اچھے لکھے گئے تو پاس ورنہ فیل ۔ خواہ کتنا ہی ذہین اور محنتی لڑکا کیوں نہ ہو ۔ اگر امتحانات کے دنوں میں بیمار ہو گیا تو تمام قابلیت دھری کی دھری رہ گئی ۔ سردست موجودہ طرز امتحانات کو اگر بدلا نہیں جا سکتا تو اس کی اصلاح ضرور ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ ذیل کی سطور میں امتحانات کے موجودہ طریقے کو بہتر بنانے کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں ۔

امتحانات چار قسم کے ہیں :

۱ ۔ ہر اچھا مدرس روزانہ سبق پڑھا چکنے کے بعد چند ایک سوالات کرکے دیکھ لیتا ہے کہ جو کچھ پڑھایا گیا ہے ۔ وہ بچوّں کی سمجھ میں آیا ہے یا نہیں ۔ ٹریننگ اسکولوں کی اصطلاح میں اس کو اعادہ کہتے ہیں ۔ سبق کی کامیابی کا اندازہ انہیں سوالات سے کیا جاتا ہے ۔ علاوہ ازیں اس کی یہ بھی غرض ہوتی ہے کہ سبق کی موٹی موٹی باتیں دُہرا دی جائیں ۔ تاکہ طلباء ضروری باتوں کو یاد رکھیں ۔ یہ امتحانات عموماً تقریری ہوتے ہیں ۔

۲ ۔ افسرانِ تعلیم کا معائنہ : پرائمری اور مڈل اسکولوں کے طلباء و مدرسین اسی کو امتحان سمجھتے ہیں لیکن دراصل افسران مدرسین کے کام کی پڑتال اور اصلاح کی غرض سے آتے ہیں طلباءٔ کی تعلیمی حالت دیکھنے کے علاوہ مدرسین کی ڈائری اور اُن کا طریقۂ تعلیم اور دیگر مشاغل کا ملاحظہ

فرماتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اصلاح بھی کرتے جاتے ہیں۔ دراصل اِن کا کام مدرسین کی اصلاح ہے۔ تاکہ مدرسین اچھا کام کریں۔ اور طلباء کی تعلیمی لیاقت بڑھے۔

۳۔ اندرونی امتحانات: سال کے دَوران میں مدرسین صاحبان اپنی اپنی جماعت کے امتحان لیتے ہیں۔ جن کو سہ ماہی اور ششماہی امتحانات کہتے ہیں۔ اِن امتحانات میں تین ہفتے ضائع ہو جاتے ہیں۔ ایک ہفتہ میں امتحان کی تیاری دوسرے ہفتے میں امتحان اور تیسرے ہفتے میں پرچہ جات کے نمبر لگا کر دئے جاتے ہیں۔ اِسی وجہ سے محکمۂ تعلیم نے حکم دے رکھا ہے۔ کہ سال کے دَوران میں سالانہ امتحان کے علاوہ صرف دو امتحان لئے جائیں بعض اسکولوں میں ہر ہفتہ میں ایک مضمون کا امتحان لیا جاتا ہے۔ تاکہ تین چار ہفتے ضائع نہ ہوں۔

اِن امتحانات کی غرض یہ ہوتی ہے کہ بچّوں نے جو کچھ پڑھا ہے وہ اُنہیں یاد ہے یا نہیں۔ اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو وہ پُوری ہو جائے۔ علاوہ ازیں اِن امتحانات کی یہ بھی غرض ہوتی ہے کہ بچّوں کو سوالات کے سمجھنے اور اُن کے مناسب جوابات لکھنے کی مشق ہو جائے۔ اور اگر جوابات لکھنے میں طلباء سے کوئی سقم رہ گیا ہو تو اُن پرچہ جات کو مدرّس پھر کمرۂ جماعت میں حل کروائے اور پرچہ جات لکھنے کا درست ڈھنگ بتائے۔ چونکہ مدرسین اِس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دسویں جماعت کے طلباء بھی پرچہ حل کرنے میں بعض ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جو اُنہیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اُنہوں نے دسویں جماعت تک کم از کم بیس(۲۰) دفعہ امتحان دیا ہوتا ہے۔ جو کام بیس(۲۰) دفعہ کر لیا جائے۔ کیا اُس کی مشق نہیں ہو جاتی؟ لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ طلباء اتنی مشق کے باوجود بھی سوالات کے سمجھنے اور اُن کے مناسب جوابات لکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بعض بچّوں میں حد درجہ لاپرواہی ہوتی ہے۔ وہ امتحان کے روز بھی قلم دوات درست نہیں رکھتے۔ سوالات اور اُن کے اجزاء کے نمبر نہیں دیتے۔ اور نہ ہی پرچہ صاف اور خوشخط لکھتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ سوال کا جواب صحیح (To the point) نہیں ہوتا۔ بلکہ سوال کے بارے میں جو کچھ اُنہیں یاد ہوتا ہے سب اُگل دیتے ہیں۔ مثلاً سوال ہے۔ شیر شاہ سوری کا انتظامِ سلطنت بتاؤ؟ لیکن بچّے

اُس کی زندگی کے تمام حالات بچپن سے لے کر وفات تک کے درج کر دیں گے۔ کیونکہ اُنہوں نے ایسا ہی یاد کیا ہے اور اُنہوں نے شیر شاہ سوری کا نام دیکھتے ہی حال لکھنا شروع کر دیا۔ یہ سوچنا اور سمجھنا گوارا ہی نہیں کیا۔ کہ سوال کیا پوچھا گیا ہے۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچوّں میں سوالات کے سمجھنے اور صحیح (To the point) جواب دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ باتیں گھر یلو امتحانات میں ضرور سکھا دینی چاہئیں ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ ادیب فاضل کے آخری پرچہ میں سوال تھا کہ ذیل کے عنوانات میں سے کسی ایک پر مضمون لکھو۔ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے سوال کے دو اجزا الف اور ب بنا کر ا جزُ کے تحت تین چار سیاسی مضامین اور ب جزُ کے تحت تین چار ادبی مضامین کے عنوانات درج تھے لیکن اِن تمام عنوانات میں سے صرف ایک عنوان پر مضمون لکھنا تھا۔ ایک طالب علم نے ب جُز کے تحت جتنے عنوانات درج تھے اُن سب پر تین تین چار چار صفحے کے مضامین لکھ ڈالے۔ اور کمرۂ امتحان سے نکل کر بڑے فخریہ لہجے میں کہنے لگا کہ میں نے تو آج تین چار کاپیاں لکھ ڈالی ہیں جب پوچھا گیا کہ کون سا مضمون لکھا تو جھٹ کہنے لگا کہ میں نے ب جُز کے تمام عنوانات پر مضامین لکھے ہیں۔ جب دیگر طلباء نے اُس کی ہنسی اُڑائی تو اُسے معلوم ہوا کہ میں نے سوال غلط سمجھا۔ اِسی قسم کی اور کئی غلطیاں کی جاتی ہیں۔ اگر ایک ممتحن ایک سال کے پرچوں کی تمام غلطیاں درج کرتا جائے۔ تو لطائف کی ایک اچھی خاصی کتاب بن جاتی ہے۔

امتحان سے پیغمبروں نے بھی پناہ مانگی ہے اور دُعا کی ہے کہ خدا کسی کو امتحان میں نہ ڈالے۔ کیونکہ امتحان میں پُورا اُترنا بہت کٹھن ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض کمزور بچوّں کے دِلوں پر امتحان کے ڈر کا بہت بُرا اثر ہوتا ہے۔ اور جو باتیں اُنہیں یاد ہوتی ہیں وہ بھی بھول جاتی ہیں۔ اِمسال ہمارے اسکول کا ایک چھوٹا سا لڑکا دسویں کا امتحان دیتے ہوئے پہلے روز کمرۂ امتحان سے باہر آکر رونے لگ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ڈر کی وجہ سے کمرۂ امتحان میں پرچے کو نہ تو غور سے پڑھ سکا۔ اور نہ ہی اُس کو اچھی طرح حل کر سکا۔ چونکہ یہ

پہلے دن کا واقعہ تھا۔ لہذا اس کی ڈھارس بندھائی گئی اور وہ دوسرے دن پرچہ حل کرنے کے قابل ہؤا ورنہ وہ تو بالکل شکستہ دِل ہو چکا تھا۔ گو وہ اسکول میں اچھے لڑکوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن وہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہؤا۔

اِن باتوں سے آپ پر واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ یونیورسٹی کے امتحانات کے لئے خاص تیاری اور مشق کی ضرورت ہے۔ اِس لئے مدرسہ کے اندرونی امتحانات ایسے طریقے سے لئے جائیں جن کا مقصد یونیورسٹی کے امتحانات کی تیاری ہو۔ اور اندرونی امتحانات کی نگرانی زیادہ سختی سے کی جائے تاکہ بچوں میں نقل کرنے یا کسی قسم کی اور بددیانتی کرنے کا مادہ پیدا نہ ہو۔ اگر امتحانات کے ذریعے اُن میں ایسی بددیانتی کا بیج بویا گیا۔ تو آئندہ زندگی میں بھی بددیانتی سے کام لیں گے اور کاروبار میں ہمیشہ کام چور رہیں گے۔ لہذا ہیڈ ماسٹروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے اسکول میں نقل کو ناممکن بنا دیں۔

۴۔ سالانہ اور یونیورسٹی کے امتحانات: اسکول کے سالانہ امتحانات کی غرض یہ ہوتی ہے۔ کہ بچے نے جو کچھ سال بھر میں پڑھا ہے۔ وہ اُسے یاد ہے یا نہیں۔ اور کیا وہ اگلی جماعت میں چلنے کے قابل ہؤا ہے یا نہیں۔ بعینہٖ اِسی قسم کا مقصد یونیورسٹی کے امتحانات کا ہوتا ہے اور جو معیار یونیورسٹی نے کسی امتحان کے لئے مقرر کر رکھا ہے کیا طلباء اُس معیار پر پُورا اُترتے ہیں یا نہیں۔ اِس لئے اِن امتحانات کے پرچہ جات بنانے میں ذیل کی باتوں کو مدِنظر رکھنا نہایت ضروری ہے:۔

۱۔ پرچہ تمام کورس پر حاوی ہو۔
۲۔ سوالات کی عبارت عام فہم اور سلیس ہو۔ جس کو طلباء آسانی سے سمجھ سکیں۔
۳۔ سوالات کی عبارت مختصر ہو۔ بہت لمبے لمبے سوالات موزوں نہیں ہوتے۔
۴۔ پرچہ کے تین حصّے کئے جائیں۔ اِن میں سے ایک حصّہ ایسا ہو جو کمزور طلباء بھی حل کر سکیں۔ ایک حصّہ اوسط لڑکوں کے لئے اور ایک حصّہ اُن لڑکوں کے لئے ہو۔ جو

فرسٹ ڈویژن حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

۵۔ سوالات کا صرف وہی جواب ہو جو ممتحن چاہتا ہو۔ اِس سال میٹرک کے ہسٹری کے پرچہ میں سوال تھا۔ کہ کسی ایک مشہور بادشاہ کا حال لکھو۔ ممتحن کی غرض اکبر اور اورنگ زیب سے تھی۔ لیکن طلباء نے شیر شاہ سوری کو ان سب سے بہتر سمجھا اور اُسی کے حالات لکھے۔ غور سے دیکھا جائے تو انتظامی لحاظ سے یہی بہترین بادشاہ تھا اس نے تمام زمین کی پیمائش کروا کر بند و بست کا طریقہ رائج کیا۔ سڑکیں بنوائیں اور اُن پر سرائیں تعمیر کروائیں۔ سایہ دار درخت لگوائے۔ ڈاک کا انتظام کیا۔ غرضکہ اکبر کا پیشرو یہی تھا۔ لیکن جن طلباء نے شیر شاہ سوری لکھا تھا اُن کو نمبر نہیں دئے گئے ہونگے اس کے علاوہ ایک سوال تھا۔ کہ محمد غوری کی ابتدائی زندگی اور اُس کی پرتھوی راج کے ساتھ لڑائیوں کا حال لکھو۔ میٹرک کے امتحان کے لئے جتنی تاریخی کتب اسکولوں میں رائج ہیں۔ اُن میں سے کسی میں بھی محمد غوری کی ابتدائی زندگی کے حالات درج نہیں۔ طلباء سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ سوال کے اِس حصّے کا بھی جواب لکھیں گے۔ لہذا اِس حصّے کے چھ نمبر یونہی ضائع ہو گئے۔

۶۔ پرچہ وقت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اِمسال میٹرک کے امتحان کا جیومیٹری کا پرچہ اِتنا لمبا تھا۔ کہ ذہین سے ذہین طالب علم بھی مقررہ وقت میں تمام سوالات حل نہیں کر سکتا تھا۔ سوالات اِتنے ہونے چاہئیں جن کو اوسط درجے کا طالب علم مقررہ وقت میں سوچ سمجھ کر نہ صرف حل کر سکے بلکہ اُس کو دوبارہ دُہرا بھی سکے۔

۷۔ سوال بنانے کے بعد وہی سوال اپنے آپ پر کر کے دیکھ لینا چاہیئے کہ میں اِس کا کیا جواب دوں گا۔ اگر (To the point) جواب آتا ہو تو سوال درست ہے ورنہ اُس کو بدل دو۔ اور ایسا سوال لکھو جیسا آپ جواب چاہتے ہیں بعض اوقات حساب کے سوالات ایسے درج ہو جاتے ہیں۔ جن کی ضربیں اور تقسیمیں کہیں ختم

ہونے میں نہیں آتیں۔ لہٰذا حساب کے سوالات حل کر کے دیکھ لینا ضروری ہیں۔

۸۔ بعض ممتحن ایسی باتیں پوچھتے ہیں جو طلباء کو نہ آتی ہوں۔ اِس سے اُن کی غرض اپنی لیاقت کا اظہار اور بچّوں کی لیاقت کا انکار کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ میٹرک اور ایف اے کے انگریزی کے پرچوں میں اِسی قسم کا اظہار کیا گیا تھا۔

۹۔ ممتحن وہ مقرر کئے جائیں جنہوں نے کچھ عرصہ اُس جماعت کو خود بھی پڑھایا ہو۔ تا کہ وہ بچّوں کی قابلیت سے پورے طور پر واقف ہوں۔

۱۰۔ صرف خاص خاص اور مشہور باتیں نہ پوچھی جائیں۔ کیونکہ بعض مدرسین نے وہی رٹوائی ہوتی ہیں۔ بعض بچّے مضامین پر پورے طور پر حاوی نہیں ہوتے صرف خاص خاص باتیں یاد کر لیتے ہیں۔ اور پاس ہو جاتے ہیں۔

غرضکہ پرچہ ایسا مرتب کیا جائے جس سے بچّوں کی قابلیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

بہت سے اشخاص کا خیال ہے کہ مشرقی زبانوں کے سوالات مخصوص ہیں۔ اور ہیر پھیر کر کے ہر سال وہی آجاتے ہیں۔ اِس لئے طلباء گذشتہ سالوں کے حل شدہ پرچے یاد کر کے امتحان دے آتے ہیں۔ اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ مقررہ کورسوں کے متعلق اُنہیں کوئی واقفیت نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی قابلیت ہوتی ہے۔

اگر میں پرچہ جات پر نمبر لگانے یعنی مارکنگ (Marking) کرنے کے متعلق کچھ نہ لکھوں تو یہ مضمون ادھورا رہے گا۔ لہٰذا اِس بارہ میں عرض ہے کہ شاید یونیورسٹی کے ذمہ داران نمبر لگانے والوں کی فہرست تیار کرتے وقت کسی کے تجربہ اور قابلیت کا لحاظ نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کی شخصیت کو دیکھتے ہیں۔ صرف بی۔ اے۔ بی۔ ٹی یا او۔ ٹی وغیرہ کا ٹائیٹل دیکھ کر اُس کا نام فہرست میں درج کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض اشخاص ایسے غیر ذمہ دار ہوتے ہیں جو ہر ایک کو بتلاتے پھرتے ہیں کہ میں یونیورسٹی کے پرچہ جات دیکھتا ہوں۔ بلکہ یہاں تک کہ اپنے دوستوں اور طلباء سے اِس کام میں مدد لیتے ہیں۔ باوجود اِس بات کے کہ یہ بڑا رازداری کا ہوتا

ہے۔ اس لئے پرچہ جات دیکھنے کے لئے ایسے اشخاص مقرر کئے جائیں جو اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے والے اور منصف مزاج ہوں۔ بہرصورت پرچہ جات دیکھنے والوں کو ذیل کی باتیں مدِنظر رکھنی چاہئیں :-

۱۔ پرچہ جات ایسے وقت پر دیکھے جائیں۔ جب اپنے آپ میں گھریلو معاملہ کی وجہ سے کسی قسم کا رنج اور غصہ نہ ہو۔ ورنہ وہ غصہ پرچہ جات پر اُترتا ہے۔ پرچہ جات کے دیکھنے کے کام کو ہنسی خوشی اور شغل سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ اور جب طبیعت اُکتا جائے تو چھوڑ دینا چاہیئے۔

۲۔ پرچہ جات کے دیکھنے میں ہمیشہ انصاف برتنا چاہیئے۔ بچے کی بدخطی اور لاپرواہی سے بہت زیادہ برانگیختہ بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ ہرایک پرچے کو ایک جیسے معیار سے دیکھا جائے۔ ایک دفعہ پرچہ جات دیکھتے ہوئے دو تین سَو پرچوں میں ایک پرچہ پر شک ہؤا۔ کہ ایسا ہی پرچہ پہلے بھی نظروں سے گذر چکا ہے۔ لیکن اُس پر نمبر لگانے کے بعد پہلے پرچے کی تلاش کی گئی۔ دونوں پرچوں کو ملایا گیا۔ دونوں ایک جیسے تھے۔ لیکن نمبر جو لگائے گئے تھے وہ بھی سوال بہ سوال ایک جیسے تھے۔ گو دونوں کا کیس پیش کردیا گیا۔ لیکن یہ معلوم ہوگیا کہ نمبر لگانے کا معیار ایک جیسا ہے۔ ضروری ہے کہ ہرایک پرچہ دیکھنے کا معیار ہمیشہ ایک سا ہو۔

۳۔ نمبر لگانے سے پہلے سوال کے اجزا کے نمبر مقرر کر لینے ضروری ہیں۔ اگر بچے نے سوال کے ایک جزو کا جواب درست لکھا ہو۔ اُسے اُس کے نمبر ضرور ملنے چاہئیں۔ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے۔ کہ جغرافیہ کے پرچہ میں سوال تھا کہ دریائے ستلج کا حال لکھو؟ جس کے پانچ نمبر مقرر تھے۔ ان پانچ نمبروں کی تقسیم اِس طرح کی گئی تھی کہ دریا کا منبع دہانہ۔ گذرگاہ اور ۲ یا ۳ باشی وغیرہ کا ایک ایک نمبر مقرر کیا گیا۔ ایک لڑکے نے یوں لکھا تھا کہ دریائے ستلج کوہ ہمالہ سے نکلتا ہے۔ جنوب مغرب کو بہتا ہے۔ دریائے گانگو تک اس کا ایک

جہاز رانی ہوسکتی ہے۔ اس قسم کی کئی دیگر خرافات تھیں۔ ممتحن نے اس کا کوئی نمبر نہیں دیا۔ لیکن جب وہ پرچہ ہیڈ ممتحن کے پاس پہنچا تو اُس نے لکھا کہ اِس لڑکے نے یہ بات تو درست لکھی ہے کہ دریائے ستلج جنوب مغرب کو بہتا ہے۔ لہٰذا اس کو ایک نمبر ملنا چاہیئے میرے اِس کہانی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو بات طالب علم نے درست لکھی ہو اُس کا نمبر ضرور ملنا چاہیئے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بچّہ کمرۂ امتحان میں حواس باختہ ہوگیا ہو۔

۴۔ حساب کے سوالات میں جبکہ عمل اور جواب دونوں درست ہوں تو پُورے پُورے نمبر دئے جاتے ہیں۔ لیکن دیگر مضامین میں خواہ جواب بالکل درست کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ نمبر ضرور کاٹ لئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بعض ممتحن ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ کہ خواہ بچے نے بالکل درست جواب کیوں نہ لکھا ہو۔ وہ دس میں سے صرف پانچ یا چھ نمبر لگاتے ہیں۔ اور بڑے فخریہ لہجے میں بتاتے ہیں کہ میں نے بڑی سختی سے نمبر لگائے ہیں۔ اگر اُن کو اُسی سوال کا جواب خود لکھنے کو کہیں تو وہ ویسا اچھا اور درست جواب نہیں لکھ سکتے۔ مثلاً انگریزی کے پرچہ میں کوئی کہانی **(Story)** لکھنی آگئی۔ بچے نے وہ زبانی یاد کر رکھی تھی۔ اور ہر لحاظ سے بالکل درست لکھ دی کیوں نہ اس کے پُورے نمبر دئے جائیں۔ اسی طرح پر انگریزی کے پرچہ میں دس فقرات ترجمہ کرنے کے لئے دئے گئے ہوں۔ اگر کسی لڑکے نے بالکل درست ترجمہ کر دئے تو وہ پُورے نمبروں کا حقدار ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فقرے میں **(Tense)** کی غلطی کر دی۔ دوسرے میں **(A or an)** کی تیسرے میں **(Shall or will)** کی۔ علےٰ ہذا القیاس ہر ایک فقرہ میں الگ الگ غلطی ہے میرا خیال ہے کہ **(Tense)** کی غلطی والے فقرے کا کوئی نمبر نہ دیا جائے کیونکہ ترجمے میں صرف **Tense** دیکھا جاتا ہے۔ دیگر فقرات کا آدھ آدھ نمبر کاٹ لیا جائے۔

۵۔ حساب میں آدھے نمبر عمل کے اور باقی آدھے جواب کے رکھے جائیں۔ بعض اوقات

ایسا ہوتا ہے کہ بچّے نے عمل تو ٹھیک کیا ہے لیکن ضرب تقسیم کی غلطی سے جواب غلط ہوگیا۔ اگر معمولی غلطی ہو تو وہ نصف سے بھی زیادہ نمبروں کا مستحق ہے۔ لیکن زیادہ غلطی ہو تو پھر بھی وہ اپنے ابتدائی عمل کے لئے کچھ نہ کچھ نمبروں کا مستحق ہے۔ تاکہ بچّوں کا حوصلہ بڑھے۔ اور وہ پورا سوال حل کرنے کی جرأت پیدا کریں۔ اِسی طرح جیومیٹری میں نصف نمبر شکل کے اور نصف عمل کے ہوتے ہیں۔ طلباء کا جو حصّہ درست ہو۔ اُسے اُس حِصّے کے نمبر ضرور ملنے چاہئیں ؛

ابتدائی جماعتوں میں حساب کی تعلیم

خواجہ غلام نبی بٹ

غلط طریقِ تعلیم کے طفیل ابتدائی جماعتوں میں حساب کا مضمون کافی دِقتوں کا باعث ہوتا ہے۔ اور بعض بچّے تو اس سے ایسے بددل ہو جاتے ہیں۔ کہ پرائمری کورس ختم ہونے سے بیشتر ہی اپنے سلسلہ تعلیم کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر مناسب اور صحیح طریق پر اس مضمون کو پڑھایا جائے تو نہ صرف دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ بلکہ بچّوں کے اندر جذبہ خود اعتمادی پیدا کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔ اور جب وہ ایک سوال کو صحیح طور پر حل کر لیتے ہیں۔ تو ان کی مسرّت و شادمانی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ وہ اپنی دماغی صلاحیتوں سے آشنا ہونا شروع کر دیتے ہیں۔ اور محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔ کہ دُنیا میں وہ بھی کوئی مفید کام کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے اساتذہ کرام بچّوں سے ہمدردانہ سلوک روا رکھیں اور ان کی مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ تاکہ ان کا مناسب حل تجویز کر سکیں یہیں وہ چیز

چند گھنٹوں میں سکھانے کی تمنا نہیں کرنا چاہیئے۔ جیسے نسلِ انسانی نے صدیوں کے بعد سیکھا ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تسمانیہ کے قدیم باشندوں کے نزدیک آج بھی گنتی کا معیار صرف ایک۔ دو۔ اور "بے شمار" ہے۔ حساب میں کمزور رہ جانے کی بیشتر وجوہات میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں :-

(۱)۔ عملی کام کا فقدان :

بچوں کی گھریلو زندگی میں انہیں گننے۔ مقابلہ کرنے۔ وزن۔ پیمائش اور چیزوں کی بٹائی کے بہت کم مواقع میسر آتے ہیں۔ اِس کمی کو مناسب تعلیمی سامان کی مدد سے کمرۂ جماعت کے اندر استاد کی زیرِ نگرانی کھیل ہی کھیل میں پورا کیا جا سکتا ہے۔ حساب کے بنیادی تصورات میں سے گنتی کو ہی لے لیجیے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے۔ کہ بچہ گنتی کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو جائے۔ ایک ناک دو آنکھیں۔ ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں۔ اور دو ہاتھوں کی دس انگلیوں سے ۱، ۲، ۵ اور ۱۰ کا تصور آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر صرف ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں سے ۳، ۴، ۶، ۷، ۸ اور ۹ کا تصور دیا جا سکتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ دیگر تعلیمی سامان مثلاً بال فریم۔ لکڑی کے چھوٹے ٹکڑوں۔ شیشے کے رنگدار منکوں اور چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی مدد سے مختلف ہندسوں اور ان کی قیمتوں کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کرانا چاہیئے۔ ہمیں ہرگز ہرگز جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ بلکہ بچوں کو موقعہ دیں۔ کہ وہ ہر چیز پر سوچ بچار کریں۔ اور ان کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ گنتی کے ساتھ ہی ساتھ ہندسوں کی صحیح لکھائی بھی سکھانا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بعد جمع اور تفریق کے قاعدوں کی باری آتی ہے۔ یہاں بھی مناسب تعلیمی سامان کی مدد سے بچوں سے جمع اور تفریق کے پہاڑے بنوائے جا سکتے ہیں جنہیں وہ یاد کر سکتے ہیں۔ اور ضرورت پڑنے پر ان کا استعمال بھی کر سکتے ہیں اب سوالات کی باری آتی ہے۔ تو شروع شروع میں ہمیں نہایت آسان اور چھوٹی چھوٹی رقموں

کے سوالات لینے چاہئیں۔ ابتدا میں ہی بڑی بڑی رقموں کے سوالات لینے سے ایک تو بچوں کا ابتدائی قاعدوں کا تصور ہی ادھورا اور نامکمل رہ جائے گا۔ دوسرے بے شمار غلطیاں کرنے کی وجہ سے ان کے دلوں میں حساب سے نفرت پیدا ہو جائے گی۔ جب بچے چھوٹی چھوٹی رقموں کے سوالات بے روک ٹوک حل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ تو رقموں کو تدریجی طور پر آہستہ آہستہ بڑا کیا جائے۔ اور بہت بڑی رقموں کے سوالات تو ہرگز نہ لئے جائیں۔ کیونکہ بچوں کی روزمرہ کی زندگی میں بڑی رقمیں نہیں آتیں۔ اور جو چیز ان کے روزمرہ کے استعمال میں نہیں آتی۔ اس سے انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

(۲)۔ بچوں میں اختلافِ قابلیت :

سب بچے ایک ہی دماغی قابلیت کے نہیں ہوتے۔ اس لئے ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا۔ بعض بچے ایک چیز کو بہت جلد سمجھ جاتے ہیں۔ اور بعض بدیر۔ اس لئے ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں رکھنا چاہئیے۔ کہ ان کی رفتارِ ترقی بھی یکساں ہو گی۔ اسی چیز کے پیشِ نظر قابل اُستاد ہر بچے کا انفرادی طور پر خیال رکھتے ہیں۔ اور اسے اپنی ہی رفتار پر چلنے میں مدد دیتے ہیں۔ فی زمانہ جب کہ ایک جماعت کے طلبا کی تعداد اکثر چالیس اور پچاس کے قریب ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہو گا۔ کہ تقریباً ایک جیسی قابلیت کے طلبا کے مختلف گروہ بنا لئے جائیں۔ کم استعداد والے طلبا کو مقابلتاً آسان اور تھوڑا کام دیا جائے۔ اور زیادہ قابلیت والے بچوں کو زیادہ اور قدرے مشکل سوالات دئے جائیں۔ تاکہ جماعت کا ہر بچہ اپنی اپنی قابلیت کے مطابق کام میں مصروف رہے۔ اور اپنی کامیابیوں سے خوشی محسوس کرتا ہوا اپنے کام کو جاری رکھ سکے۔ ایک قابل معمار کی طرح ہمیں ایک اینٹ دوسری اینٹ پر نہایت احتیاط سے رکھنی چاہئیے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال رہے۔ کہ بچوں کی دلچسپی اور ذوق کا تار کسی موقعہ پر بھی ٹوٹنے نہ پائے۔ ایک لائق اُستاد اپنے ہر شاگرد کی مشکلات کو انفرادی طور پر سمجھنے اور ان کا مناسب علاج تجویز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہ کبھی آگے نہیں بڑھتا۔

جب تک کہ سابقہ کام پر بچہ کامل طور پر حاوی نہیں ہو جاتا۔

اسی طرح بعض بچے قوتِ حافظہ کے کمزور ہونے کی وجہ سے جمع۔ تفریق اور ضرب کے پہاڑے یاد رکھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ وہ زیادہ دیر تک اپنی توجہ ایک کام پر مرکوز بھی نہیں رکھ سکتے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ بچے تقریری حساب میں تحریری حساب کی نسبت بہتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہاں تھوڑے ہی وقت میں جواب نکالا جا سکتا ہے۔ ایسے بچوں کو آسان اور ان کی روزمرہ زندگی کے متعلق دلچسپ سوالات دئے جائیں۔ اور شروع شروع میں انہیں اجازت ہو۔ کہ وہ پہاڑے کی کتاب کی مدد سے سوالات حل کر سکیں۔ لیکن آہستہ آہستہ انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا جائے۔

(۳) جذباتی وجوہات:

حساب پڑھاتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے۔ کہ بچوں کے دلوں میں اس مضمون کے متعلق نفرت و حقارت کے جذبات کی نشوونما نہ ہونے پائے۔ اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے۔ اگر شروع شروع میں آسان آسان سوالات کر کے ان میں جذبہ خود اعتمادی پیدا کیا جائے۔ اور احساسِ کمتری ان کے نزدیک بھی نہ پھٹکنے پائے۔ اگر ایک جماعت میں کچھ ایسے بچے موجود ہوں۔ جو بہت ہی حساس قسم کے واقع ہوں۔ اور ایک سوال کے غلط ہونے پر ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئیں۔ یا پست ہمتی کے دیگر آثار ظاہر ہونے لگیں۔ تو اُستاد کے لئے لازمی ہے کہ وہ ان کے ساتھ نہایت ہمدردانہ سلوک روا رکھے۔ اور آسان رقموں کے سوالات صحیح طور پر حل کرنے کا موقعہ دے کر ان کا حوصلہ بڑھائے۔ ہرگز ہرگز انہیں نکما۔ کند ذہن عقل کا دشمن اور گدھا وغیرہ خطابات سے نہ نوازا جائے۔ ورنہ چند ہی روز میں وہ اپنے آپ کو ان خطابات کا جائز طور پر اہل ثابت کر دیں گے۔ اس کے برعکس اگر ان کی ہمت بڑھائی جائے۔ اور انہیں چند ایک آسان سوالات صحیح حل کر لینے سے خوش ہونے کا موقعہ دیا جائے۔ تو وہ جلد ہی اپنی کمزوری پر غالب آ سکیں گے۔ اور

جماعت کے دوسرے ہونہار بچّوں کی دیکھا دیکھی شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکیں گے۔

(۴) عبارتی سوالات کے گورکھ دھندے :

عبارتی سوالات کا حل کرنا ضروری اور دلچسپ ہوتا ہے۔ لیکن یہ اتنے مشکل۔ لمبے اور پُرپیچ نہیں ہونے چاہئیں۔ کہ بچّے تو کیا۔ ان کے بڑے بھی ان گورکھ دھندوں کو سمجھنے میں دیر لگائیں۔ یہ سوالات بچّوں کی عام روزمرہ کی زندگی سے لئے جائیں۔ تاکہ انہیں اس بات کا احساس ہو سکے۔ کہ حساب کا جاننا ان کے لئے کس قدر ضروری اور مفید ہے۔ ان سوالات کی عبارت نہایت سلیس اور صاف ہو۔ رقمیں چھوٹی ہوں۔ اور کسی مقام پر بھی انہیں گمراہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ کوئی سوال ان کی سمجھ سے بالاتر نہ ہو۔ کیونکہ اسی صورت میں وہ سوال کے دئے ہوئے حصّوں کا تعلق سمجھ سکیں گے۔ اور سوال کو صحیح طور پر حل کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ مزید یاد رہے۔ کہ عبارتی سوالات صرف اسی وقت لئے جائیں۔ جب بچّے معمولی قاعدوں کی خوب مشق کر چکیں۔ اور سوال کی عبارت کو بخوبی پڑھ اور سمجھ سکیں۔

(۵)۔ اسکول سے غیر حاضری :

پانچ سال سے سات سال کی عمر کے بچّوں کو مختلف بیماریوں مثلاً خسرہ۔ خارش۔ میعادی بخار۔ سرخ بخار۔ آشوب چشم اور کالی کھانسی وغیرہ کی وجہ سے اکثر اسکول سے غیر حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح وہ کسی خاص قاعدے کے چند ضروری مدارج سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور آنے والے قاعدوں کے سمجھنے میں دقّت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر انفرادی طریق تعلیم پر عمل کیا جائے۔ تو بہت حد تک اس مشکل کا تدارک ہو سکتا ہے۔ بچّہ جب صحتیاب ہو کر اسکول واپس آئے۔ تو جہاں اس نے چھوڑا تھا۔ اس سے آگے پھر شروع کر سکتا ہے۔ اور ایک مشفق استاد کی زیرنگرانی اپنی کمی کو رفع کر سکتا ہے۔ اور نئے قاعدوں کے سمجھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ

ے نیا قاعدہ تب ہی شروع کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ سابقہ قاعدہ سے مکمل
پر واقفیت ہو جائے۔ بعض اساتذہ دو قاعدوں کے درمیان چند ایام کا وقفہ
ے دیتے ہیں۔ تاکہ پہلا قاعدہ بچوں کے بخوبی سمجھ میں آجائے۔ اور نیا
دہ سیکھنے میں اُنہیں آسانی ہو۔

اِصطلاحی غور و فکر

(ل)

اِصطلاحات

181, Middle School.

مڈل اسکول ، درمیانی مدرسہ ، مکتب ، کُتّاب

" مکتب " کا لفظ تو پرائمری اسکول کے لئے مخصوص رہا ہے۔ اسے ابتدائی مدارس ہی کے لئے وقف رکھنا چاہیئے۔ " کُتّاب " .Boys-School کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس کی جمع کتاتیب ہے۔ لیکن یہ عربی زبان کا لفظ ہونے کی وجہ سے عرب ممالک میں ثقیل معلوم نہیں ہو سکتا۔ مگر ہمارے ہاں اِس کو رواج دینا مشکل ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے۔ کہ اس میں تو تمام قسم کے ثانوی مدارس شامل ہو جاتے ہیں۔ مڈل اسکول سے جو مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ وہ " کُتّاب " سے اپنی مخصوص حدود کے ساتھ

ادا نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں ہمیں مڈل اسکول کا صحیح اور موزوں ترجمہ" وسطانی مدرسہ"
نظر آتا ہے۔

182. High School.

اعلیٰ مدرسہ، ہائی مدرسہ، ہائی اسکول، اُونچا مدرسہ، بڑا مدرسہ۔
"اُونچا" اور "بڑا" تو غیر موزوں ہیں۔"اعلیٰ مدرسہ" اگرچہ صحیح ہے۔ لیکن
مڈل اسکول کے لئے اگر "وسطانی مدرسہ" اختیار کیا جائے۔ تو مناسبت اور موزونیت
کے لحاظ سے ہائی اسکول کو "فوقانی مدرسہ" کہنا بہتر ہوگا۔

183. College.

کلیہ، جامعہ، کالج، اعلےٰ درسگاہ، دارالعلوم، بیت العلوم، بڑا مدرسہ، مدرسۃ العلوم، تعلیم گاہ۔
"مدرسۃ العلوم" موزوں نظر آتا ہے۔"کلیہ" یا "جامعہ" یونیورسٹی کے لئے یا ایسے کالجوں کے
لئے مستعمل ہیں۔ جو یونیورسٹی کا کام بھی سرانجام دے رہے ہوں۔ لیکن اگر "دانشگاہ" کا لفظ
کالج کے لئے استعمال کیا جائے۔ تو بہت ہی موزوں ہوگا۔

184. University.

بیت العلوم، دارالعلوم، جامعہ، کلیہ۔
بیت العلوم یونیورسٹی کے لئے عام مستعمل رہا ہے۔ "جامعہ" اور "کلیہ"
سے مراد وہ یونیورسٹیاں جو کالجوں کے فرائض سرانجام دے رہے ہوں۔ یا وہ کالج
جو یونیورسٹیوں کا کام بھی کریں۔
"بیت العلوم" ہی بہترین انتخاب پڑتی ہے لیکن اسکے مقابلے میں "دارالعلوم" زیادہ اچھا ہے۔ آج کل "جامعہ"
کا لفظ یونیورسٹی کیلئے اکثر جگہ مستعمل ہے۔ چنانچہ اسکو یونیورسٹی کیلئے مقرر رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے۔

185. At par.

مساوات میں، مساوی، برابر، اعتدال پر، علی السواء۔

اِس کے لئے یوں تو "علی السواء" بہتر ہے ۔لیکن عربیت کی ثقالت کے احساس کے ماتحت "برابر" ہی کو اختیار کرنا ہوگا۔حساب میں اس کے لئے "برابر کا بھاؤ" موزوں ہوگا۔

186. Above par.

مساوات سے اُوپر، اعتدال سے اُوپر، زیادہ، فوق السواء۔

اس کا صحیح مفہوم تو "زائد از حدّ مساوات" ہے۔"فوق السواء" اس کے لئے بہتر ہوگا۔لیکن اس کے مقابلے میں اُردو کے اندر "مساوات سے اُوپر" زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔حساب میں اس کے لئے "باڑھے کا بھاؤ" موزوں ہوگا۔

187. Below par.

مساوات سے نیچے، اعتدال سے نیچے، کم، تحت السواء۔

اگر Above par کے لئے "مساوات سے اُوپر" اختیار کیا جائے۔تو پھر Below par. کے لئے "مساوات سے نیچے" مناسب ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔اِس کے لئے "تحت السواء" بھی موزوں ہے لیکن پھر وہی ثقالت کا سوال ہے۔حساب میں اس کے لئے "بٹے کا بھاؤ" موزوں ہوگا۔

188. Agent.

عامل، منیب، کارکن، کارندہ، گماشتہ۔

"منیب" صحیح ہے، لیکن "کارندہ" زیادہ اچھا ہے۔

189. Amount.

گنتی، رقم، تعداد، میزان، جمع، مقدار۔

اگرچہ تمام مختلف لحاظ سے صحیح ہیں۔تاہم Amount کا عام استعمال "کُل رقم" کی صورت میں ہوتا ہے۔اور یہی بہتر ہے۔

190. Assessment.

تشخیص، تعیین، محصول۔

ان میں سے " تعین " زیادہ اچھا اور موزوں ہے۔

(ب)

اِصطلاحات زیرِ غور

191. Audit
192. Balance
193. Debit & Credit
194. Balance Sheet
195. Charter
196. After date
197. Bond
198. Budget Estimate
199. Capital
200. Fixed Capital

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ــــــ شعبہ اسکول

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۴ اکتوبر سنہ ۴۹ء ۹۳۲۰--N.Q.	م۔ خورشید احمد نمبر ۲۱ (۱۴۰--۲۲۰)	معلم نقشہ کشی گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال۔	معلم نقشہ کشی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری۔ (بمشاہرہ سابقہ)	تاریخ حاضری سے	م محمد اسحاق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
″	م۔ محمد اسحاق (نمبر ۹: ۵۰--۱۰۰) بجواب ۱۴۰--۱۰۵ کے درجہ مشاہرہ میں ہیں۔	معلم نقشہ کشی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری (حال رخصتی)	معلم نقشہ کشی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری (حال رخصتی) بمشاہرہ سابقہ	جس تاریخ سے م۔ خورشید احمد منٹگمری میں چارج لیں۔	م۔ خورشید احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

آموزش

فروری سنہ ۱۹۵۰ء

رموز

مختلف اصحاب سے ملاقات کے دوران میں معلوم ہوا کہ پنجاب کے اضلاع میں ہر سرکاری اور غیر سرکاری ہائی اسکولوں میں ٹرینڈ مدرسین کی خطرناک حد تک کمی ہے۔ اور بظاہر ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ یہ کمی جلد پوری ہو جائے۔ تعلیمی ترقی کی رفتار پہلے سے تیز ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ترقی ہماری بڑھتی ہوئی قومی ضروریات کے مطابق ہے۔ اگر صورت حالات یہی رہی تو ٹرینڈ مدرسین کی کمی روز بروز زیادہ واضح ہوتی جائے گی۔ قارئین کو ذیل میں مندرج اعداد و شمار سے ٹرینڈ مدرسین کی کمی کا کچھ اندازہ ہو جائے گا :-

۶ سے ۱۱ سال کی عُمر کے

زیر تعلیم لڑکے	لڑکیاں	مجموعہ
۴۵۵۰۰۰	۷۷۲۰۰	۵۳۲۲۰۰

اِن بچوں کے لئے ٹرینڈ اُستاد :-

مرد	عورتیں	مجموعہ
۱۵۱۶۷	۲۵۷۴	۱۷۷۴۱

ایسے اُستاد جنہوں نے کوئی ٹریننگ حاصل نہیں کی :-

مرد	عورتیں	مجموعہ
۶۰۶۷	۱۰۳۰	۷۰۹۷

گیارہ سے سولہ سال کی عمر کے

مجموعہ	لڑکیاں	زیرِ تعلیم لڑکے
۱۰۷۴۵۰	۸۷۷۰	۹۸۶۸۰

اِن بچوں کے لئے ٹرینڈ اُستاد :-

مجموعہ	عورتیں	مرد
۴۲۹۹	۳۵۱	۳۹۴۸

ایسے اُستاد جنہوں نے کوئی ٹریننگ حاصل نہیں کی :-

مجموعہ	عورتیں	مرد
۱۷۲۰	۱۴۰	۱۵۸۰

اِس بے دِلی اور بے توجہی کے اسباب کیا ہیں؟

اس سوال کے قطعی اور شافی جواب کے لئے ایک مستقل مقالے کی ضرورت ہے - لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور ملازمتوں اور پیشوں کے مقابلے میں مدرسی ایک زبوں صید تصور کیا جاتا ہے جس کی طرف ہمارے نوجوان بدرجہ مجبوری ملتفت ہوتے ہیں - اس کساد بازاری کو دُور کرنے کے لئے حکومت اور ملّت، دونوں کو توجہ کرنی پڑے گی - حکومت کو یہ مدّنظر رکھنا پڑے گا - کہ قوم کے مختلف اُلاو ان جیوش میں مدرس ایک اہم سپاہی ہے - اور اگر فوجیں ملکی مدافعت کے لئے ضروری ہیں تو مدرسین ملک و ملت کے استقلال کے لئے ناگزیر ہیں - اس لئے ضروری ہے کہ مدرس کی شرائطِ ملازمت خوشگوار زندگی کی کفیل ہوسکیں - ہر شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ فائدہ مند اور پُر آسائش اسبابِ معاش سے قطع نظر کرکے عزت اور مسلسل محنت کی زندگی اختیار کرلے گا - کامیاب معاشرے میں اُجرت، فرائضِ منصبی کے مطابق ہونی چاہیئے - میرے علم میں ہے کہ یہ مسئلہ اربابِ اختیار کے پیشِ نظر ہے - لیکن ــــ

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے۔ لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

لیکن یہ ذمہ داری صرف حکومت ہی کی نہیں ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو چاہیئے۔ کہ مدرسی کو مجاہدانہ شان سے اختیار کریں۔ نفع و نقصان زندگی میں توام ہیں۔ خالق مطلق، فاعل جنس و تسکین، زندگی کو اپنی برکتوں سے مالامال کرسکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم اس کو وحدہٗ لاشریک مانتے ہوئے، اس کے رسول کی اُمت کی خدمت کے لئے آمادہ ہوجائیں۔ ملت کو چند دیوانے درکار ہیں۔ کیا پنجاب کی کم و بیش دو کروڑ آبادی میں دو ہزار دیوانے میسر نہیں آسکتے۔ ہر دس ہزار نفوس میں ایک دیوانہ بھی میسر آجائے تو یہ دو ہزار مرد عورت پنجاب کی کایا پلٹ دینے کے لئے کافی ہیں۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صدا میرے بعد

ہماری تنخواہیں تھوڑی ہیں اور ہمارا کام اہم اور دشوار ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صرف مشاہرے اور محنت کا سوال نہیں۔ ڈیڑھ سو سال کی غلامی سے ملت میں اضمحلال پیدا ہوگیا ہے۔ اور ابھی تک ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس نہیں ہوا۔ ہم اپنے فرائض کو مہینے کی تنخواہ کے ترازو میں تولتے ہیں۔ اپنی [illegible] محنتوں میں شمار کرتے ہیں۔ زندہ قوموں کے افراد کا شیوہ یہ نہیں ہوتا۔

اردو میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی ضرورت محتاجِ بیان نہیں، جہاں تک قومی زبان کے ذریعہ درس و تدریس کا سوال ہے۔ ان کتابوں کے متعلق تقاضا بہت اہمیت رکھتا ہے، اس تقاضا کے پیشِ نظر سنٹرل ٹریننگ کالج بھی حتی الوسع مصروفِ عمل ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں معزالدین صاحب کی کتاب "تدریسِ ریاضی" پہلے نکل چکی

اب ایک اور کتاب عبدالحی علوی صاحب کی " تعلیمی نفسیات " کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔ اور اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔ مصنّف نے تعلیمی نفسیات کے تمام پہلوؤں پر وضاحت کے ساتھ سادہ اور عام فہم زبان میں بحث کی ہے۔ یہ تصنیف صرف مدرسین اور معلّمین کے لئے ہی مفید نہیں بلکہ اس سے وہ والدین بھی استفادہ کرسکتے ہیں، جو اپنے بچّوں کی صحیح نشوونما اور تربیت کے متمنّی ہیں۔ علوی صاحب کا یہ کارنامہ بے حد کاوشس و محنت اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ جس سے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوئی ہے۔ توقع ہے کہ یہ قیمتی کوشش نظرِ استحسان سے دیکھی جائے گی۔

اسلام اور نظریۂ ارتقا

خواجہ عبدالحمید

اندلس اور اسلام کے ایک مشہور فیلسوف ابن رشد نے سچ کہا ہے۔ کہ مذہب اور الہامی کتاب کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ انسان ایک عالم بن جائے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ اچھا انسان بن جائے۔ البتہ ہمارے علم و مذہب میں تضاد بھی نہ ہونا چاہیئے مراد یہ ہے کہ ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم اپنی الہامی کتاب کو سائنس کے نصاب (Text Book) کے طور پر استعمال کریں۔ زیادہ سے زیادہ حق جو ہمیں پہنچتا ہے یہ ہے کہ ہمارے مذہب اور ہماری الہامی کتاب میں ایسی تعلیمات نہ ہوں۔ جو علمی ترقی کو مانع ہوں۔ یا جو علمی تحقیق سے غلط ثابت ہو چکی ہوں۔ اس لحاظ سے ہم مسلمان خوش قسمت ہیں کہ قرآن ہمیں بار بار آیات و بیّنات یعنی اللہ تعالےٰ کی پیدا کردہ کائنات کے حوادث اور حقائق کی طرف بلاتا ہے۔ اور ہمیں کوئی ایسی تعلیم نہیں دی گئی ہے جو علمی ترقی کے لئے رکاوٹ کا کام دے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد نفسِ مضمون کو لیجے۔

ارتقا کے مفہوم میں چند باتیں شامل ہیں:۔

(۱) نظامِ کائنات کی موجودہ صورت وہ نہیں ہے جو اس کی آفرینش کے وقت تھی۔

(۲) اعلیٰ اقسام کی انواع ادنیٰ انواع سے پیدا ہوئی ہیں۔

(۳) پیچیدہ ساخت کے افراد و انواع کی اصل سادہ ساخت کی انواع اور افراد میں

ڈھونڈنی چاہیئے۔ مثلاً بیج سے پودا پیدا ہوتا ہے اور تخم سے حیوان۔

(۴) ارتقاء کے سب درجے ایک خاص ترتیب سے ظاہر ہوئے ہیں۔ ہر درجہ میں کوئی ایسی خاصیت یا صفت پیدا ہوتی ہے جو پہلے درجوں میں موجود نہ تھی۔ اور نہ ہی ان درجوں کو دیکھ کر ہم توقع کر سکتے تھے کہ خاص یہ صفت ہی آگے جاکر پیدا ہوگی۔ ہر درجے میں یہ نئی صفت "خلقاً آخر" کی صورت میں اُبھرتی ہے۔ ان شاملات کے علاوہ اور باتیں بھی شامل ہوسکتی ہیں۔ لیکن میں صرف ان ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

اس امر سے متعلق کہ کائنات کی موجودہ صورت وہ نہیں ہے جو آفرینش کے وقت تھی قرآن کریم میں واضح اشارہ موجود ہے۔ ارشاد ہے (حمٓ السجدہ - ۱۱)

"پھر قصد کیا (اللہ نے) طرف آسمان کے اور وہ دھواں (دخان nebula) تھا۔ پس کہا واسطے اس کے اور واسطے زمین کے کہ آؤ تم خوش یا ناخوش۔ کہا دونوں نے آئے ہم دونوں خوشی سے" یعنی آسمان اور زمین پہلے ملے ہوئے تھے اور ان کی حالت ایک دخان یا دھوئیں کی سی تھی۔ اور اس دخان سے دونوں کی تخلیق ہوئی۔

ایسے ہی ایک خیال کو (Laplace اور Kant) کانٹ اور لے پلیس کے زمانے سے سائنس میں قبولیت حاصل ہے۔ اور اسے کائنات کی تخلیق کا دخانی نظریہ کہا جاتا ہے۔ Nebular Hypothesis۔ اس قدیم دخان میں گرمی کی وجہ سے گردش پیدا ہوئی اور اس گردش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ستارے۔ سورج اور نظام شمسی پیدا ہوئے۔

(۳-۲) اب لیجے یہ بات کہ اعلیٰ اور پیچیدہ ساخت کی ذی حیات اور غیر ذی حیات چیزیں ادنیٰ اور سادہ ساخت کی چیزوں سے پیدا ہوئی ہیں۔

قرآن کریم میں انسان کی تخلیق کے ان مدارج کو جو اسے ماں کے پیٹ میں طے کرنے پڑتے ہیں۔ نہایت بلیغ اور واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

"البتہ پیدا کیا ہم نے آدمی کو بیچ مٹی سے۔ پھر پیدا کیا اس کو ایک قطرۂ منی سے

بیج جگہ مضبوط کے۔ پھر پیدا کیا ہم نے اس منی کو جو لہو میں جا پڑا ہے۔ پس پیدا کیا ہم نے لہو
جمے ہوئے کو بوٹی گوشت کی۔ پس پیدا کیا ہم نے بوٹی کو ہڈیاں۔ پھر پہنا دیا ہم نے ہڈیوں کو
گوشت۔ پھر پیدا کیا ہم نے اس کو پیدائش اور (خلقاً آخر)۔ پھر بہت برکت والا ہے اللہ
بہتر پیدا کرنے والوں سے" (المومنون ۱۲)۔ "پھر پیدا کیا ہم نے اس کو پیدائش اور یعنی
نئی۔ خلقاً آخر پیدائش اور قابلِ غور ہے۔ یہ پیدائش اور اُبھار ہے نئی صفات کا۔ جو
درجہ بہ درجہ اُبھرتی رہتی ہیں۔ پہلے درجوں میں وہ موجود نہ تھیں۔ اور نہ ہی ان درجوں
کو دیکھ کر ہم توقع کر سکتے تھے کہ خاص یہ صفات ہی آگے چل کر پیدا ہوں گی۔

قرآن حکیم میں کئی آیات ایسی ہیں جن میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بیج سے پودا
اور تخم سے حیوان پیدا ہوتا ہے۔ مُردہ زمین پر جب بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ تو
یک لخت لہلہاتے سبزے کی ایک نئی دنیا پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس بلیغ طریقہ سے انسان کو
نشاۃ ثانیہ کی طرف استدلال اور اشارہ ہوتا ہے

کائنات کے ارتقا کے مدارج کو دو اہم حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اوّل غیر ذی
حیات نظامِ کائنات کی اور دوسرے ذی حیات انواع کی تخلیق۔ ذی حیات انواع سے متعلق
قرآنِ حکیم میں عام ارشاد ہے کہ ان کو پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ سائنس کی تحقیقات سے اس
خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے "اور کیا ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو پیدا۔ کیا
پس نہیں ایمان لاتے" (الانبیاء ۳۰)

یہ خیال کہ ہر زندہ چیز یا کل کائنات پانی سے بنی ہے۔ فلاسفہ یونان میں سب
سے پہلے طالیس (Thales.) نے ظاہر کیا تھا۔ مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہے کہ اگر کسی
زندہ شے میں سے پانی کا حصہ نکال دیا جائے تو وہ شے معدوم ہو جاتی ہے۔

متذکرہ بالا آیات اور خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم اپنے منشا اور تعلیم
میں نفسِ ارتقا کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ خود بھی ایسا ہی خیال پیش کرتا ہے۔ فرق صرف

اس امر میں ہے کہ ارتقا کا طریق کار جو زمانہ حال کے حیاتیاتی ماہرین نے متعین کیا ہے۔ وہ وہ نہیں ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ مثلاً زمانہ حال کے ماہرین کے قیاس کے مطابق ذی حیات انواع کے اعلیٰ درجوں میں اور انسان میں فرق صرف شدت، کمیّت اور کیفیت کا ہے۔ ایسا فرق نہیں ہے کہ انسان کو دوسری انواع سے بالکل ہی مختلف الاصل سمجھا جائے ادھر قرآنِ کریم میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ انسان ایک خاص مخلوق ہے جسے ایک خاص وقت میں اور خاص حالات میں اور ایک خاص مقصد کے مطابق پیدا کیا گیا ہے۔ انسان Special Creation ہے۔ عوام میں نظریہ ارتقا سے متعلق جو سوئے ظن ہے اسی وجہ سے ہے۔ انسان کو بن مانس (ape) کی اولاد اور جانشین تصور کرنا ہمارے ان جذبات احترام کو ٹھیس لگاتا ہے جو ہم اپنے متعلق اپنے دلوں میں پاتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں آفرینش کے ڈارونی نظریے کو اگر بالکل ترک بھی کر دیا جائے تو بھی نظریہ ارتقا قائم رہتا ہے۔ کم از کم یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ ڈارون نے کوئی ایسا ثبوت پیش نہیں کیا ہے جس سے ہم قطعی طور پر کہہ سکیں کہ انسان بن مانس کا جانشین ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خود بن مانس انسان کی ایک مسخ شدہ اور ذلیل حالت ہو؟ ایک جگہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔ کہ چند بد بختوں کو سزا کے طور پر حکم دیا گیا تھا "ہو جاؤ ذلیل بندر اور وہ ہو گئے"

اسی طرح ارتقا کے موجودہ نظریہ میں اور قرآنی تعلیم میں ایک اور نہایت واضح اور اہم فرق یہ ہے کہ ماہرین ارتقا ارتقا کی سب منزلوں کو اور ان کی ترتیب کو صرف میکانکی اصول کے مطابق سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔

میکانکی توجیہ سے کیا مراد ہے؟

فرض کیجئے کہ کسی غیر معروف علاقہ میں ایک جھیل یا ندی مچھلیوں سے پُر ہے۔ کوئی شکاری شکار کو نہیں آتا۔ ایک شکاری اپنی لکڑی اور ڈوری کو سنبھالے آتا ہے۔ ڈوری پانی سے

چھوٹی ہی ہے کہ ایک تر و تازہ مچھلی لقمہ پر لپکتی ہے۔ اور کانٹا اس کے حلق میں پھنس جاتا
ہر روز شکاری کامیاب رہتا ہے۔ اس کے دیکھا دیکھی دوسرے شکاری بھی آتے ہیں ا
شکار پھانس کر کامیاب واپس جاتے ہیں۔ لیکن چند مہینوں کے بعد مچھلیاں پھنستی نہیں
حالانکہ ندی میں اس وقت بھی سینکڑوں مچھلیاں موجود ہیں۔ شکاری عام زبان استعما
کر کے کہتے ہیں کہ مچھلیاں چالاک ہو گئی ہیں اور اس لئے لقمہ نہیں پکڑتیں کہ اس میں مو
ہے۔ ڈارونی ماہر کو یہ طرز بیان سخت ناپسند ہے۔ وہ اس واقعہ کی میکانکی توجیہہ یو
کرے گا۔ تمام حیوانات یا تو بے باک و جسور ہوتے ہیں اور یا بزدل اور ڈرپوک۔ بے ب
حیوان اپنے ساتھیوں سے پہلے دشمن سے ٹکر لیتا ہے۔ غذا پر بے سوچے سمجھے لپکتا ہے ا
بے باک مچھلی لقمہ ڈوری پر دیکھتے ہی لپکی اور ماری گئی۔ چند مہینوں کے بعد ان مچھلیو
کی تعداد خود بخود گھٹ گئی اور صرف ڈرپوک مچھلیاں ندی میں رہ گئیں۔ اس لئے اب ڈو
کے لقمہ پر لپکے کون؟ عقل اور چالاکی کا اس امر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مث
میں نے رے لنکاسٹر (Ray Lancaster) سے لی ہے۔

اس کے برعکس قرآن میں جا بجا تاکیدی ارشادات ہیں کہ اللہ نے زمین اور آ
کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ مثلاً قرآن
ارشاد ہے "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے انسان کو بغیر مقصد کے (بے فائدہ) پیدا کیا ہے
کیا اسے ہماری طرف لوٹ کر نہیں آنا ہے؟"

ارتقا سے متعلق اور اس کے طریق کار کی تعیین کے سلسلے میں علمائے اسلام
سب سے زیادہ کام ابن مسکویہ نے کیا ہے۔ ابن مسکویہ نے نظریہ ارتقا کو نبی (ﷺ)
کے مقام کی وضاحت کے لئے پیش کیا تھا۔ نبی ارتقا کا اعلیٰ ترین اور آخری درجہ ہے
مولانا روم (جو ابن مسکویہ سے ۳۵۰ سال بعد پیدا ہوئے تھے) کے مشہور ا
کہ میں (یعنی روح انسانی) پہلے جمادات میں تھا۔ پھر میرا ظہور نباتات میں ہوا۔ پ

حیوانات میں داخل ہؤا۔ اور پھر انسان کی صورت میں ظاہر ہؤا۔ اور اس کے بعد بھی میرے لئے مدارج ہیں۔ اسی نظریے کو پیش کرتے ہیں۔

از جمادی مُردم و نامی شدم | از نما مردم بہ حیواں سرزدم
مردم از حیوانی و آدم شدم | پس چہ ترسم کے زمردن کم شوم
حملہ دیگر بمیرم از بشر | تا برآرم از ملائک بال و پر
بار دیگر از ملک پرّاں شوم | آنچہ اندر وہم نایدآں شوم
آب کوزہ چوں در آب جو شود | محو گردد در وے و چوں او شود

نظریہ ارتقا کی اگر فلسفیانہ جانچ کی جائے تو سب سے زیادہ دِقّت (اور اس کی سب سے زیادہ کمزوری) اس بات میں ظاہر ہوتی ہے۔ کہ آخر ارتقا کا رُخ کدھر ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور ارتقا کے مختلف درجوں کی برتری اور فروتری کا معیار کیا ہے جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے۔ موجودہ سائنس اِس امتحان میں ناکام ہے۔ اور ہمیں ان سوالات کا کوئی قاطع اور واضح جواب نہیں دیتی۔

اِن سوالات کا واضح جواب ہمیں صرف ابن مسکویہ میں ملتا ہے۔ جس کا نظریہ ارتقا درحقیقت قرآنی تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اس کے مطابق نباتات جمادات سے افضل ہیں۔ حیوانات نباتات سے، اور انسان حیوانات سے افضل ہے۔

نباتات میں دو خوبیاں ہیں ان میں حرکت ہے اور غذا سے تمتع حاصل کرنے کی اہلیت ہے۔ ان میں نقص یہ ہے کہ وہ زمین کی بندش میں ہیں۔

حیوان نبات سے افضل ہے۔ اس کی خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) حرکتِ اختیاری۔

(۲) زمین کی بندش سے آزادی۔

(۳) اور نبات کی طرح غذا سے تمتع حاصل کرنے کی اہلیت۔

(۴) کمترین درجہ کا نبات قریباً قریباً جماد ہے۔ اور اعلیٰ ترین نبات (یعنی نخل) قریباً قریباً حیوان ہے۔ اعلیٰ ترین حیوان (بن مانس) انسان کے قریب ہے۔ اور ادنیٰ ترین حیوان قریباً نبات ہے۔

برتری اور فروتری کا معیار یہ ہے۔ کائنات میں مادہ (Matter) کے ساتھ ساتھ ایک یزدانی اور روحانی عنصر بھی ہے جسے روح یا عقل کہہ سکتے ہیں۔ جس درجہ میں یہ روحانی عنصر واضح طور پر اُبھر آتا ہے۔ وہ درجہ اُونچا ہوتا ہے۔ اور جہاں یہ عنصر مادہ کے بوجھ کے نیچے دبا رہتا ہے۔ وہ کمترین ہے۔ یہی خیال رومی کے اشعار میں مضمر ہے۔ یہی معیار یورپ جدید کے جرمن فلسفی ہیگل (Hegel) نے (غالباً رومی کے زیر اثر) پیش کیا تھا۔ اور پھر انگلستان میں (T. H. Green) گرین نے اپنی مشہور تصنیف مقدمہ اخلاقیات میں اسے بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ چنانچہ آج کل انگریزی اور جرمن Idealist سکول کے لئے ارتقا کا صحیح معیار یہی ہے۔ اب ایک سوال باقی ہے۔

کیا ارتقا کا سلسلہ انسان کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے سائنس نے اس سوال کا کوئی شافی اور قطعی جواب تاحال نہیں دیا ہے۔ حکیم نطشے (Nietzsche) نے جواب دیا تھا۔ کہ انسان کے بعد فوق البشر کا درجہ ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے۔ کہ انسان کی ترقی کے کئی اور مدارج ہیں۔ اور بشر کی ترقی کا معراج خیر البشر ہے۔ فوق البشر نہیں۔ خیر البشر رحمۃ اللعٰلمین ہیں ♦

رُوس میں سائنس کی ترقّی

علی ناصر زیدی

گزشتہ جنگ کے بعد ہر ملک نے اپنی بساط کے مطابق سائنسی تحقیقات و تجربات میں چند قدم آگے بڑھائے ہیں۔ جوہری قوت اور ایٹم بم کی دریافت و ایجاد کے بعد جدید سائنس سیاسیات کے ساتھ کچھ اس طرح وابستہ ہو کر رہ گئی ہے کہ دونوں کو جدا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ بعض ممالک کے حالات اخبارات اور دیگر ذرائع سے ہم تک پہنچتے رہتے ہیں۔ اور ہم ایک حد تک باخبر ہیں کہ انگلستان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں سائنسی میدان میں کیا کچھ کیا جا رہا ہے لیکن عرصہ سے روس کے حالات پر ایسی نقاب پڑی ہوئی ہے کہ ہم اُس ملک کی سائنس، وہاں کے طریقِ تعلیم، اساتذہ اور طلبا کے طور طریقوں اور دیگر معاشرتی حالات سے اس قدر واقف نہیں ہیں۔ جتنا کہ ہونا چاہیئے تھا۔ اِس مضمون میں روسی سائنس دانوں کی کاوشوں اور اُس ملک میں سائنس کی رفتار ـــــ اِسی قسم کے چیدہ موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سائنس کی تاریخ میں ایک نئے اور درخشندہ باب کا اضافہ اُس وقت ہُوا۔ جب پندرھویں اور سولھویں صدی میں طباعت اور چھاپہ خانے عام ہو گئے۔ پہلی مرتبہ سائنس ناواقفیت کی تاریکیوں سے نکل کر دنیا کے عوام تک پہنچی۔ تمام مہذّب ممالک نے کتابوں کے حصول کے لئے کوشش کی۔ اور سائنس کی رفتار نیز اُس کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی

لوگوں کو بُرے بھلے کے درمیان امتیاز قائم کرنے کی سُوجھ بُوجھ ہوئی۔ اور وہ جہالت سے قعرِ مذلّت سے نکلنا شروع ہوئے۔ سائنس کی موجودہ ترقّی دنیا کے تمام سائنسدانوں کی متعدد کوششوں کی بدولت ہی ممکن ہو سکی ہے۔ روس میں بھی انگریزی سائنسدانوں کی تصانیف اور اُن کے خیالات سے استفادہ کیا گیا۔ نیوٹن۔ فراڈے۔ میکسویل اور ڈارون جیسے مشہور و معروف سائنسدانوں کے ناموں نے روس میں بھی وہی وقار حاصل کیا جو انگلستان یا دیگر ممالک میں انہیں بخشا گیا۔ اِسی طرح روسی سائنس نے انگلش سائنس پر اپنا اثر ڈالا۔ مثلاً روسی سائنسدان لوباشوسکی (Lobachevsky) نے سب سے پہلے نیوٹن کے قائم کردہ اصولِ طبیعیات کو زیر و زبر کیا۔ مینڈلی لیف نے ہی وہ راستہ قائم کیا جس پر زمانۂ مابعد میں انگریزی سائنس دان جے۔ جے۔ تھامسن اور ارنیسٹ ردرفورڈ کرّوفر کے ساتھ گامزن ہوئے۔ ان کے علاوہ پاؤلوف بھی اپنی کاوشوں کی بدولت مسلّمہ سائنسدان ہے۔

روس میں سائنس اور اُس کی ترقّی کی داستان اسی قدر طویل اور دلچسپ ہے جیسی کسی دوسرے ملک میں۔ انقلاب سے قبل بھی اُس ملک میں تھوڑا بہت کام کیا گیا تھا جس سے انقلاب کے بعد وہاں کے باشندوں نے استفادہ کیا۔ سترھویں صدی کے آخر میں جب کہ پیٹرِ اعظم کا دَور دَورہ تھا مغربی یورپ اور روس کے درمیان تجارتی اور معاشرتی تعلّقات کی داغ بیل پڑنا شروع ہوئی۔ اہلِ سویڈن کو شکست دینے کے بعد روس کے باشندوں نے سائنس کے میدان میں ترقّی کرنا شروع کی۔ اس کا پہلا درخشاں ثبوت ۱۷۲۵ء میں ملا جبکہ سینٹ پیٹرس برگ میں اکیڈیمی آف سائنسیز (Academy of Sciences) کا قیام عمل میں آیا۔ روسی سائنس نے اسی گہوارہ میں پھلنا پھولنا شروع کیا۔ غیر ملکی سائنسدانوں اور ماہرینِ ریاضیات کی خدمات حاصل کی گئیں جن میں آئلر اور بھڈلی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے ساتھ ہی ساتھ ایم۔ وی۔ لومن سوف کا نام بھی آگے بڑھتا ہے۔ جو روس میں فخرِ ملک و قوم سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ پہلا سائنسدان تھا جو اکیڈیمی نے پیدا کیا تھا۔

وہ ایک زبردست ماہر کیمیا و طبیعیات تھا۔ اُس نے اپنے نظریات کو تجربات کی مدد سے ثابت کیا اور ایک نئی شاہراہ قائم کی۔ فزیکل کیمسٹری۔ علم ہیئت میں لومن سوف نے بعض سیّاروں پر فضا کے وجود کا پتہ دیا۔ اُس نے کئی بصری آلات بھی ایجاد کئے۔ وہ علم جغرافیہ اور ارضیات میں بھی دخل رکھتا تھا۔ سائنس کے علاوہ اُس کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ اور آرٹ سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اُس نے تمام عمر ملک و قوم کی خدمت میں بسر کی۔

رفتہ رفتہ اکیڈیمی کے علاوہ ملک کے دیگر بڑے شہروں میں بھی علم و فن کے مرکز قائم ہوئے۔ یونیورسٹیاں بنائی گئیں۔ ماسکو، کزان، خارکوف، سینٹ پیٹرس برگ کی اکیڈیمی آف ملٹری سرجری وغیرہ چند ابتدائی مثالیں ہیں۔ پیٹر اعظم کے زمانہ سے انقلاب اکتوبر تک دو صدیوں کے عرصہ میں روس نے علم و فن کے بہت سے ماہرین پیدا کئے اور عالمی سائنس میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ زار کے زمانہ میں جبکہ سائنس کو ایک ہوّا سمجھا جاتا تھا، سائنسدانوں نے نوعِ انسان کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

اکتوبر کے سوشلسٹ انقلاب نے روسی سائنس کے قالب میں نئی روح پھونک دی۔ ملک کی اقتصادی حالت خراب ہو چکی تھی۔ اور اِن حالات میں کسی قسم کی ترقّی کا بھی ممکن ہونا محال تھا لیکن وہاں کے باشندوں نے ہمّت نہ ہاری اور سائنس، صنعت و حرفت کی اہمیّت کو محسوس کیا۔ ۱۹۱۸ء میں لینن نے خود سائنسی اور تکنیکی پروگرام کا خاکہ تیّار کیا جس میں عوام کے مفاد کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ اکیڈیمی کو اُس پر عمل کرنے اور پبلک کی خدمت کرنے کی دعوت دی گئی۔ حرفت کو عام کرنا، ذرائع نقل و حمل کو آسان اور وافر کرنا، آبی قوت کا اطلاق اور ہوائی موٹروں کو رواج دینا — یہ اور اِسی قسم کے منصوبے زیرِ غور لائے گئے۔

جلد ہی سائنس نئے سانچہ میں ڈھال دی گئی۔ خاص خاص مضامین پر تحقیقات کرنے کے لئے جداگانہ تجربہ گاہیں اور درسگاہیں تعمیر کی گئیں۔ ماسکو اِن درسگاہوں کا مرکز تھا۔ لینن گراڈ دوسرا اہم مرکز تھا اِس مہم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ماہرین کی ضرورت پڑی۔ پُرانے روس یا پُرانے باشندوں میں

ایسے ماہرین بہت ہی کم تھے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ نوجوانوں کو باہر بھیجا جائے۔ تاکہ وہ ٹریننگ کر
جلد واپس آئیں اور اپنے ملک و قوم کی خدمت کریں۔ چند ہی سال میں کایا پلٹ گئی اور تمام مشکلات
پر قابو لیا گیا۔ سائنسدانوں کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی۔ پرانی اکیڈیمی کی بھی صورت بدل گئی۔
چھوٹے چھوٹے شعبے بڑھائے گئے؛ ماہرین نے دن رات محنت سے کام کیا اور ہر ایک شعبہ کو مکمل
درسگاہ کی شکل دے دی۔ عمل گاہیں تعمیر کی گئیں۔ اور نظریات کے ساتھ ساتھ تجربات کی شمع بھی روشن
ہوگئی۔

نئے نئے کالج، نئی نئی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ مرکزی شہروں کے علاوہ دور دراز کے
صوبوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ زمین کے خزانوں کی تلاش کی گئی۔ معدنیات کو ٹٹولا گیا۔ اور
ملک کو ہر طرح سے خوشحال بنانے کی مہم شروع کی گئی۔ لینن کی ہدایات کے مطابق سوویٹ الیکٹریکل
انجینیروں کے ایک کمیشن نے ملک میں برقی جال بچھانے کی ایک سکیم تیار کی۔ بعد میں اسی سکیم نے
اسٹالن کی پنج سالہ سکیم میں نمایاں جگہ حاصل کی۔

نئی نئی درسگاہوں اور صنعت و حرفت کے قیام کا یہ نتیجہ ہوا کہ روس کی ضروریات کو پورا
کرنے کے لئے ملک میں ہی برقی مشینری، ریڈیو، برقی ساز و سامان، بصری آلات اور دیگر اشیاء
تیار ہونے لگیں۔ ہوابازی میں ترقی ہوئی۔ جدید طرز کے ہوائی جہاز بنائے گئے۔ جدید طرز کی
موٹریں، ریلوے انجن، رفتہ رفتہ سب کچھ تیار ہونے لگا۔ طبی دائروں میں بھی روشنی پہنچی۔ نئی
ادویات تیار کی گئیں۔ حیوانیات کی سائنس نے فروغ پایا۔ تحقیقات و تجربات کا سلسلہ شروع
ہوا۔ اور شرحِ اموات کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ زراعت میں جو ترقی روس میں ہوئی۔ وہ
ضرب المثل بن کر رہ گئی ہے۔ عوام کی حالت سدھارنے کے لئے کسانوں کو فارغ البال کرنا
ضروری تھا۔ لق و دق صحرا لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل کر دئے گئے۔ ویرانوں میں سبزہ نظر
آنے لگا۔ زمین سونا اگلنے لگی۔ اور مفلوک الحال کسان خوشحالی و لذتِ حیات سے قریب ہو گئے۔
مارکس اور انجیلز کی شعلہ بیاں تقریروں اور تحریروں نے عوام میں بیداری کی لہر

دوڑا دی۔ معاشرتی ارتقا جس کی تکمیل بعد میں لینن اور اسٹالن کے ہاتھوں ممکن ہوئی۔ اوّل الذکر دو معجز بیان لیڈروں ہی کی توجہ کا مرہونِ منت ہے۔ سائنس کی تاریخ میں اُس کا ذکر ضروری ہے کیونکہ فراغت و آسودگی کے بغیر کسی علم کی بھی ترقی ممکن نہیں ہے۔ تہذیب و تمدن، علم و زبان کوئی چیز بھی مفلوک الحالی کے زیرِ سایہ پروان نہیں چڑھ سکتی ہے۔ روس میں سائنس کی شکل سال بہ سال بدلتی رہی۔ سکولوں نے، زبانی پروپیگنڈہ نے، لیکچروں نے، کتابوں نے، اخباروں نے اور لاسلکی نے ملک کی گہرائیوں میں سائنس کی آواز پہنچائی۔ اور سائنس کی روح کو عوام کے دلوں پر کچھ اس طرح طاری کیا کہ ہر شخص اُس کا دالہ و شیدا بن کر رہ گیا۔ بڑی تیزی سے پبلک نے اُس کو اپنایا۔ اور نہایت قلیل عرصہ میں کارکنان کی تعداد انقلاب سے قبل کے کام کرنے والوں کی تعداد کا دس گنا ہوگئی۔ پہلے سائنس کی ایک نظری شکل موجود تھی اور سائنسدانوں سے اُمید کی جاتی تھی کہ وہ زبانی جوابات سے ہی ہر قسم کے سوال کرنے والے کو مطمئن کریں۔ چند ہی سال میں کایا پلٹ گئی؛ نظریاتی سائنس نے عملی سائنس کو پہلو میں جگہ دی اور ملک میں تکنیک و حرفت نے تیزی سے ترقی کی۔ روزمرّہ زندگی میں سائنس کا اطلاق ایک خواب تھا جس نے جلد ہی حقیقت کی شکل اختیار کی۔ جہاں اُس کے سائے سے گریز کیا جاتا تھا وہاں اُس کے قدموں کو چوما گیا۔

ابتدا کے چند دشوار سالوں ہی میں روس کی سائنس نے عالمی سائنس کے خزانہ میں قابلِ ستائش اضافہ کیا۔ ایٹم اور نظریۂ اضافیت کے متعلق سوچا سمجھا گیا۔ اُن سائنسدانوں نے اپنی تخلیقات اور دماغی پیداواروں کو دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ سائنس کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کی گئی۔ اُس کو پوشیدہ نہیں رکھا گیا اور نہ کسی ایک انسان کی ملکیت بنایا گیا۔ ہر تخلیق کا عملی ثبوت پیش کیا گیا۔ معدنیات کا بہترین مصرف دریافت کیا گیا۔ علم کیمیا، طبیعیات، برقی تکنیک، لاسلکی، بصریات، ہوابازی اور تکنیک کی دیگر متعدد شاخوں میں انقلاب آگیا۔ سویٹ سٹیٹ کے ابتدائی دَور میں بالشویک پارٹی اور روسی حکومت نے سائنس کی طرف جو

خاص توجہ مبذول کی تھی اُس کی عملی تشکیل بعد میں ہی ممکن ہو سکی۔ اسٹالن کی پنج سالہ سکیم نے اُس کو بلندی کے زینہ پر چڑھایا اور آزادیٔ وطن کی خاطر جو جنگ لڑی گئی تھی۔ اُس کے حامیوں کی کاوشوں نے رنگ بدل کر رکھ دیا۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب کمیونسٹ پارٹی کی پندرھویں کانگریس منعقد کی گئی، اسٹالن نے اپنی پنج سالہ سکیم پیش کی۔ جس کا اصل منشا یہ تھا کہ روس میں زراعت کے پہلو بہ پہلو صنعت وحرفت کو بھی فروغ ملنا چاہیئے۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں سولھویں پارٹی کانگریس کے موقع پر قومی بجٹ کی سکیم پیش کی گئی۔ پورے ملک کے طول وعرض میں صنعتی طوفان پورے زور وشور کے ساتھ پھیلا۔ سائنس نے ہاتھ بٹایا کسی ملک کا معاملہ ہو یا کسی فرد کا، سائنسی تحقیقات کو ایک کٹھن سفر سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ تصور کیجے کہ پہاڑوں کے درمیان جن کی چوٹیاں بلند ہیں، دشوار گذار وادیاں ہیں، خاردار پلیٹو ہیں اور اُن سب کو پار کرنا ہے، چوٹی پر پہنچنا ہے۔ مسافر غریب کبھی کبھی ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ ہی نظر نہیں آتا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آگے کیا کرے۔ وہ بہزار دقت چوٹی تک پہنچتا ہے چوٹی پر پہنچتے ہی اُس کو میدانوں کی وُسعتیں نظر آتی ہیں۔ اور وہ مزید سفر کے لئے ایک نیا پروگرام تیار کر لیتا ہے۔ سمجھ لیجے کہ اس سفر کی بلند چوٹیاں ہی سائنس کی وہ گتھیاں ہیں جن کو سُلجھاتے ہی تحقیقات وتجربات کے نئے نئے باب کھل جاتے ہیں۔ ڈاروِن، مینڈلیف پاؤلوف اور دیگر تمام عظیم المرتبت سائنسدان ان ہی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ سائنس متعدد بلند چوٹیوں میں سے ایک چوٹی اُن تعلیمات پر مشتمل ہے جو مارکس، لینن اور اسٹالن کی زبانی عوام تک پہنچیں۔

سائنس کا تکنیکی پہلو ذرا آسان تر ہے۔ اس میں منزل کا تعین ہو جاتا ہے اور بڑھنے والا اُس سمت کو نگاہ میں رکھتا ہے۔ ہوائی جہاز بنانے والے کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہوا باز کا مستقبل کیا ہے۔ رفتار پرواز میں اضافہ کرنے کے لئے کیا کچھ کرنا چاہیئے اور کون سا

کی معاشی یک منوعت پڑے گی۔ موجودہ ریلوے انجن اسٹیفنسن کے بنائے ہوئے نمونہ ہی کی
ترقی یافتہ شکل ہے۔ قومی بچت کے ساتھ ساتھ روس میں سائنسی تکنیک کا ارتقا شروع ہوا۔
جو کچھ بنایا گیا صنعت و حرفت اور زراعتی میدانوں میں اُس کا عملی اطلاق کیا گیا۔ مختلف شاخوں
کے لئے خاص خاص درسگاہیں، خاص خاص ادارے قائم کئے گئے۔ ان کے علاوہ مرکزی
سائنٹیفک اداروں، سائنسی اکیڈیمی، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بھی جداگانہ صنعتی شعبوں
کا قیام عمل میں آیا۔ شاہراہیں قائم ہو جاتی ہیں۔ تو سفر کرنے میں دقت اور تکلیف کم ہو جاتی
ہے۔

گزشتہ ربع صدی میں علم طبیعیات میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ دیگر سائنسی علوم
بھی ترقی پذیر ہوئے لیکن اِس علم میں جو عروج رونما ہوا۔ اُس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ روس
میں بھی طبیعیات کے ماہرین نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ اسٹالن کی پنج سالہ سکیم کا ایک
زرّیں باب یہ بھی ہے۔ کائناتی شعاعوں (Cosmic Rays) کے مطالعہ و مشاہدہ کے لئے
ایک نیا طریقہ دریافت کیا گیا۔ کچھ عرصہ سے آپ اِن شعاعوں کا نام سُن رہے ہوں گے۔ جو اپنی
ہیئت اور اپنی ماہیّت میں دیگر تمام شعاعوں سے مختلف ہیں۔ وہ فضا کی بلندیوں سے آتی
ہیں۔ لیکن اُن کا مخرج معلوم نہیں ہو سکا۔ اُن کا انداز ہی جداگانہ ہے۔ اور جدید طبیعیات میں
وہ تحقیق کا خاص موضوع بنی ہوئی ہیں۔ روس کے سائنسدانوں نے بھی اُن کی طرف توجہ
مبذول کی۔ اسی طرح ایٹم اور ایٹمی توانائی تمام سائنسدانوں کے لئے ایک دلچسپ موضوع
ہے۔ ایٹم کے مرکزی حصّہ یعنی اُس کے قلب میں ہی جوہری توانائی کا راز پنہاں ہے۔ اسی قلب کو
توڑنے سے جوہری قوت حاصل ہوتی ہے۔ ایٹم بم کی تعمیر اسی بنیادی جزو پر منحصر ہے۔ تمام
سائنسدانوں نے ایٹم کے قلب کو توڑنے کے لئے مختلف ذرائع پر طبع آزمائی کی۔ روس میں
بھی ولسن چیمبر (Wilson Chamber) کو قوی مقناطیسی فیلڈ میں جگہ دی گئی۔ اور
وقت کے ان دو اہم موضوعات پر تحقیقاتی کام کیا گیا۔ پہلی مرتبہ کائناتی شعاعوں کے وجود کا

بیتن ثبوت پیش کیا گیا۔ متعلقہ ذرّات کی قوّت کا اندازہ لگایا گیا۔ اور دیگر نئے موضوعات پر غور کیا گیا۔ روسی سائنسدان کی ایجاد سے دنیا کے تمام ممالک نے استفادہ کیا اور بہت سی نئی باتیں دریافت کیں۔ اسی ایجاد کے ذریعہ مثبت برقیات دریافت کئے گئے؛ برقی اثرات سے مبرّا ذرّات کا علم ہوُا۔ جن کو بعد میں نیوٹرون (Neutron) کا نام دیا گیا۔

ماسکو کے ماہرین طبیعیات ایل۔ آئی۔ مینڈل سٹم اور جی۔ ایس۔ لینڈسبرگ نے ہندوستانی ماہر طبیعیات رمن کے ساتھ ہی ساتھ ایک جدید بصری موضوع کی دریافت کا اعلان کیا جس کی اہمیت مسلمہ تھی۔ روشنی اور مادّہ کی اہمیت سمجھنے میں اِس دریافت سے بڑی مدد ملی۔ مادّہ کے سالمات میں جو پوشیدہ خلا مادّہ کی اندرونی ساخت کے لئے ذمّہ دار ہے، اِسی منزل پر آکر دریافت ہوُا۔ اِس موضوع یا دریافت کی اہمیت و مقبولیت کا اندازہ اِس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُس کے شائع ہونے کے بعد سترہ سال کے عرصہ میں دنیا کے تمام ملکوں کے سائنسدانوں نے دلچسپی کا اظہار کیا اور کئی ہزار مقالے منظرِ عام پر آئے۔ جو براہِ راست اسی دریافت سے متعلق تھے۔ آج دنیا کی عمل گاہوں اور فیکٹریوں میں نامیاتی مرکبات کے تجزیہ کے لئے اِسی دریافت سے مدد لی جارہی ہے۔

روس کے مشہور سائنسدان پی۔ ایل۔ کپٹزا کا نام سائنسی موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اُس نے ہیلیم گیس کو محلول شکل میں تبدیل کرنے کے لئے ایک عجیب و غریب مشین تیار کی۔ وی۔ اے۔ فوک نے پیچیدہ ایٹموں سے متعلقہ ایک سخت معمّہ کا حل پیش کیا۔ ایک نوجوان ماہر طبیعیات پی۔ اے۔ کیرنخوف نے ایک نیا بصری موضوع دریافت کیا۔ اگر کوئی سادہ محلول — پانی، گندھک ترشہ یا گلیسرین ایسی شعاعوں سے منور کیا جائے جو ریڈیم سے نکل رہی ہوں تو ایک تقریباً ناقابلِ دید چمک پیدا ہوتی ہے۔ جو عجیب و غریب صفات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ روشنی کے مطالعہ میں ایک موضوع کا اضافہ ہوُا۔ ایک ایسا موضوع جو برقیات کی گردش سے متعلق تھا۔ برقیات اتنی

روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ رفتار کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ اسی طرح دو سائنسدانوں نے یورانیم کے ایٹم کے قلب کے انتشار کے متعلق ایک ممتاز حقیقت کا انکشاف کیا۔ اسی پنج سالہ سکیم کے دَوران میں علمِ طبیعیات کے صنعتی و حرفتی اطلاق کے متعلق نئے اقدامات عمل میں آئے۔ اہم نتائج اخذ کئے گئے۔ اور اُن کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

ریڈیو تکنیک کے میدان میں نئے دروازے کھولے گئے۔ ریاضیاتی بنیادیں قائم کی گئیں۔ اور اُن پر نئی نئی مشینیں تعمیر کی گئیں۔ برقی مشینوں میں بھی تنوّع پیدا ہوا۔ اور وہ نئے اصولوں کے مطابق بنائی جانے لگیں۔ ریڈیائی خلفشار کو دور کرنے کے لئے نئے طریقے دریافت کئے گئے۔ کپشزا نے ہوا کو محلول شکل میں تبدیل کرنے کے لئے ایک نئی قسم کی مشین تیار کی جو دیگر ابتدائی مشینوں پر سبقت لے گئی۔ اِس ایجاد سے خنک سازی یعنی ریفری جریشن میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی۔ وی۔ پی۔ لِنک نے چکنی سطح کی جانچ پڑتال کے لئے بصری آلات کے استعمال میں قابلِ قدر تنوّع پیدا کیا جو روس کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی زیرِعمل لایا گیا۔ برقیات اور بصریات کا باہمی تعلق نہایت اہم ہے۔ روس کے کئی سائنسدانوں نے کئی نئی باتیں دریافت کیں۔ جن کا اطلاق متعدد تکنیکی حلقوں میں کیا گیا۔ جن میں صوت فلم، تیلی وژن اور کچھ جنگی ساز و سامان قابلِ ذکر ہیں۔

روس کے کیمیا دانوں نے ربر، پلاسٹک، مصنوعی تیل اور متعدد نامیاتی اجزا کی تیاری میں دنیا کے دیگر ممالک کے متوازی کام کیا۔ بہت سے دھاتی مرکّبات تیار کئے گئے۔ ماہرینِ ارضیات نے بھی پوری تن دہی کے ساتھ اپنا فرض انجام دیا۔ پورے ملک کے قدرتی وسائل کا جائزہ لیا۔ تیلوں کے نئے چشمے دریافت کئے گئے۔ آج وہاں عمدہ تیل کی لاکھوں من مقدار برآمد کی جا رہی ہے۔ ہوابازی سے دُنیا کے حالات معلوم کئے گئے۔ قطب شمالی کی مہم اِس سلسلہ میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ کرۂ ارض کی فضا، سمندروں اور زمین کی اندرونی کیفیات کا جائزہ لیا گیا۔ حیاتیات میں بھی کافی کام ہوا۔ بہت سے نئے اور اہم نتائج اخذ کئے گئے۔ الغرض روسی انقلاب نے ملکی معاشرت کو نئی شکل دینے کے علاوہ سائنس کو بھی نئے سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا۔ ۱۹۳۶ء میں استالن نے

اپنے ملک کی سائنس کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی: "یہ ایسی سائنس ہے جو لوگوں سے روپوش ہونا نہیں چاہتی، عوام سے الگ تھلگ رہنا پسند نہیں کرتی ہے۔ بلکہ اُن کی خدمت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ لوگ اُس کی قوت اور اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اُس سے مستفید ہونا جانتے ہیں۔ یہ پُرانی روایات کی توہین نہیں کرتی ہے۔ لیکن لکیر کی فقیر بھی نہیں ہے۔ اس میدان میں نئی نئی شاہراہیں وہ لوگ قائم کر رہے ہیں جو سائنسی علقوں میں زیادہ مشہور و ممتاز نہیں ہیں۔ وہ ہمارے ملک کے عوام ہیں۔ عملی انسان ـــــ مرد اور عورتیں جو تجربات میں دلچسپی لیتے ہیں۔"

یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ جنگِ عظیم دوم نے اپنی شکل دکھائی۔ بہت سے سائنسدانوں نے عمل گاہوں سے نکل کر میدانِ جنگ کی راہ لی۔ کچھ اپنی تحقیقات میں ہی مشغول رہے۔ بایں ہمہ روسی سائنس کی تاریخ لینن گراڈ کے اُن سائنسدانوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جو دو سال سے زائد مدت تک ہوائی حملوں کے باوجود، گولیوں کی بوچھاڑیں، بھوک کا مقابلہ کرتے ہوئے، سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے، ہنگامۂ جنگ میں سائنسی تحقیقات میں مشغول رہے، لیکچر دیتے رہے، ہسپتالوں میں کام کرتے رہے اور کتابیں لکھتے رہے۔ انہوں نے مادرِ وطن کے محافظ سپاہیوں کو ہر قسم کی مدد دی۔ ماہرینِ طبیعیات نے جنگی ساز و سامان اور جہازوں کو ٹھیک حالت میں رکھا۔ ماہرینِ نباتات پودوں سے حیاتین حاصل کرتے رہے تاکہ لوگوں کو امراض سے بچاتے رہیں۔ ڈاکٹروں نے بھوک سے لڑنے کے طریقے ایجاد کئے۔ سائنسی درسگاہوں کے لئے بڑا نازک وقت آیا۔ بچے کچھے سائنسدانوں کے کاندھوں پر جنگ نے نئی ذمہ داریاں عائد کیں: ساز و سامان کی کمی، کتابوں کی قلت، سکون کا فقدان، وقت کا تقاضا ـــ ہر قسم کے مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اُن سائنسدانوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اور ملک و قوم کی خاطر فوری مسائل کا فوری حل تلاش کیا۔ جنگ بخیر و خوبی ختم ہوئی۔ اور روس کے سائنسدان وقت کے امتحان پر پُورے اُترے۔ جنگ کے خاتمہ پر بھی سائنس کو سبکدوشی حاصل نہیں ہوئی۔ سپاہیوں کی حالت ٹھیک کرنی تھی۔ زخمیوں کی جانیں بچانا تھیں۔ طبی اداروں نے معجزہ نمائی کی۔ سترفی صدی سے زیادہ زخمی سپاہی صحت یاب ہو کر میدانِ جنگ کو واپس گئے۔ ہسپتالوں ...

شرح اموات پہلی جنگ عظیم کی شرح اموات کا عشر عشیر رہ گئی۔ اس تجربہ نے جراثیم کی روک تھام کے متعلق ایک نیا درس دیا۔ نئے نئے پلاسٹر ایجاد ہوئے۔ جنگ و جدال میں خراب ہو جانے والی آنکھوں کو ٹھیک کیا گیا۔ انتقالِ خون کے متعلق جنگ سے پہلے بھی کافی تحقیقات ہو چکی تھیں۔ جنگ کے دوران بھی اُن کے مطابق عمل ہوا۔ اور مزید ترقی حاصل کی گئی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ مختلف صورتوں میں مختلف ادویات کی حاجت ہوئی تو سوچنے سمجھنے کا موقعہ ملا اور روس کے سائنسدانوں نے تیزی سے زود اثر ادویات تیار کیں۔

جنگ ہر ملک کی اقتصادی حالت پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ روس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ لیکن ایک فائدہ ضرور ہوا۔ ضرورت کے مطابق طرح طرح کے ہتھیار اور مشینیں ایجاد ہوئیں۔ اور سائنسی تکنیک میں نئی راہیں قائم ہوئیں۔ ہوا بازی، بحری ساز و سامان، انجینئرنگ، تمام شاخوں میں ترقی کے آثار نظر آئے۔ نئی نئی دھاتوں اشیا دریافت کی گئیں۔ تیل کے نئے ذخیرے معلوم کئے گئے کیمیا دانوں کے فرائض میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۲ء کے موسم بہار میں جب کہ روس میں جنگ پوری قوت کے ساتھ جاری تھی۔ اسٹالن نے اکیڈیمی آف سائنس کو دو ٹیلیگرام بھیجے۔ پریذیڈنٹ کو خطاب کرتے ہوئے اسٹالن نے کہا تھا "مجھے پورا یقین ہے کہ جنگ کی تباہ کاریوں اور گوناگوں مشکلات کے باوجود اکیڈیمی کی سائنسی خدمات وقت اور ملک کے مطالبات کو پورا کرتی رہیں گی"۔ اسٹالن نے دوسرے تار میں لکھا تھا "مجھے اُمید ہے کہ روس کی اکیڈیمی آف سائنس اس جنگ کی اہمیت اور تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ لے گی جو حکومت روس اور مسلکِ فاشستی کے پیرو جرمنی کے درمیان آپڑی ہے۔ جرمن صرف روسی قوم کے ہی دشمن نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اُن تمام اقوام کے مخالف ہیں جو آزادی کے پروانے ہیں"۔ اور یہی ہوا۔ انقلاب نے روسی اکیڈیمی، یونیورسٹیوں، خاص خاص درسگاہوں، کارخانوں، میدانِ جنگ، ہسپتالوں اور دیگر اہم اداروں میں جس سائنس کی بنیاد ڈالی تھی اُس نے ان تمام اُمیدوں کو پورا کر دکھایا۔ انقلابِ اکتوبر میں جو بیج ڈالا گیا تھا۔ وہ اُس وقت پھل لایا جب ملک و قوم کو اُس کی اہم ضرورت تھی۔

جنگ سے نجات ملی اور فتح و ظفر نے اپنا منہ دکھایا۔ اختتامِ جنگ پر روس کو یہ خیال ہوا کہ اُن تمام مقامات کو پھر گلزار بنایا جائے جو جنگ کے ہاتھوں صحرا بن چکے تھے چنانچہ سنہ ۱۹۴۶ء کی ایک پنج سالہ سکیم تیار کی گئی جس میں اسی قسم کی آبادکاری اور سائنسی ترقی کا خاکہ پیش کیا گیا۔ فزکس، کیمسٹری اور تکنیکی سائنس پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ہوابازی میں جو ترقی ہوئی ہے۔ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ ان چند سالوں میں ماہرین طبیعیات و کیمیا کے علاوہ ماہرین ارضیات اور جغرافیہ دانوں نے لوہے اور تیل کے ذخیروں کی تلاش میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ روسی جغرافیہ پر کئی جلدیں شائع کی گئیں۔ حیاتیات میں پروٹین کے مطالعہ پر خاص زور دیا گیا ہے۔ نئی عمارتیں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ اُن کے لئے نئے مصالحے، نئے ڈیزائن، اُن کو روشن اور گرم رکھنے کے نئے طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں۔

سائیکلوٹرون موجودہ زمانہ کا بڑا مشہور آلہ ہے۔ روس میں وہ بھی بنایا جا رہا ہے۔ اسی قسم کے دیگر آلات کو ترقی دی جا رہی ہے۔ زراعت کو ترقی دینے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کی جا رہی ہے۔ زراعتی کیمیا کو ترقی دی جا رہی ہے۔ طب اور عوامی صحت پر خاص توجہ مبذول کی جا رہی ہے۔ موسمی پیشین گوئی کے لئے نئے آلات سے مدد لی جا رہی ہے۔ جنگ کے زمانہ میں جو رصدگاہیں تباہ ہو گئی تھیں۔ اُن کو پھر تعمیر کیا گیا ہے۔ دیگر سائنسی اداروں کو بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری کیا گیا ہے۔ اس سکیم کے مطابق سنہ ۱۹۵۰ء تک پچاس عظیم الشان عمارتوں کو تعمیر کرنے کا پروگرام پیشِ نظر تھا۔ ماسکو کے نواح میں ۱۲۵۰ ایکڑ زمین میں بوٹانیکل گارڈن لگایا جا رہا ہے۔ چار سال قبل روس میں سات ہزار آدمیوں کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری تھی۔ سنہ ۱۹۵۰ء سے قبل تین ہزار تحقیقاتی طالب علموں کے داخلوں کا پروگرام تھا۔

سچ تو یہی ہے کہ سائنس کا منشا نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کو ترقی دینا ہے۔ کوئی ملک یا کوئی قوم اس حقیقت کو نہ سمجھے تو اس میں سائنس کا کیا قصور؟ ہم سائنسی آلات کو انسانی ترقی کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور اس کو تباہ کرنے کے لئے بھی۔ سائنس نے جو نمایاں [illegible]

دیا ہے۔ اور وہ چیزیں جو ایک صدی قبل مضحکہ انگیز اور ناقابلِ فہم سمجھی جاتی تھیں، زندہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آئی ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ سائنس سیاسیات کے چکر سے نہیں بچ سکتی ہے۔ لیکن جمہوریت اگر صحیح طور پر زندہ ہو۔ تو پھر سائنس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ اور وہ خود بھی کسی ملک یا قوم کے لئے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتی۔

"بچّے اور بڑے"

(ایک نفسیاتی مطالعہ)

راز ق نوُر

ہم کہتے ہیں ہم بڑے ہوشیار ہیں - عمر بیت گئی - بڑے بھلے کا تجربہ ہوگیا - بچے نادان ہیں بچے کیا جانیں کہ کون سی چیز اچھی ہے اور کون سی بُری - اس لئے ہمیں اُن کے ہر کام میں دخل دینے کا حق حاصل ہے - حالانکہ قدرت جو کہ بچّے کی معلّمہ ہے ہم سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے - بچّہ جو کچھ کرتا ہے اُسی کے اشارے پر کرتا ہے - اس لئے اُس کا ہر فعل درست اور لابدّی ہے - فطرت بچّوں کو حکم دیتی ہے - کہ ہر وقت - ہر ساعت کچھ کرتے رہا کرو - بچّہ ان احکام کی تعمیل کرتا ہے - پس اِس میں اُن کا کیا قصور؟ غلطی ہماری ہے - کہ ہم اُن کی ہر حرکت کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں - پہلے ہی سے اُن کے ہر کام کو غلط اور احمقانہ قرار دیتے ہیں - اور اُن کی مدد تو کُجا اُن کے کسی کام کو بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے - دُنیا کی کوئی عدالت ایسا نہیں کرتی کہ جُرم سرزد ہونے سے پہلے سزا کا حکم سُنا دے - مگر ہم بچّے کو "جُرم" کرنے سے پہلے ہی سزا دیتے ہیں مثلاً بچّے نے سنگار میز کی طرف نظر اُٹھائی اور ماں نے دھمکی دی " دیکھو - خبردار جو میز کی طرف ایک قدم بھی اُٹھایا - ہڈیاں گن لوں گی " - گویا بچّے کا کسی طرف دیکھنا بھی جُرم ہے - اتنی بداعتمادی ! اسے توبہ - معلوم نہیں - والدین نے اِس قدر جلد چیں بہ جبیں ہو جانا اپنے لئے کیوں لازمی کر رکھا ہے ؟ اور پھر باپ کی گالیاں اور ماں کی بددُعائیں کس قدر افسوس کی بات ہے - بچّے کی

خودداری۔ یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اب بتلائیے نادان اور ناسمجھ کون ہے؟

باپ کتاب پڑھتا ہے۔ بچّہ شور مچاتا ہے۔ لیمپ سے کھیلتا ہے۔ دیوار پر لکیریں کھینچتا ہے۔ بہرحال اپنا کوئی کام کرتا ہے۔ باپ کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ لیکن باپ کو حق ہونے کا استحقاق ہے۔ وہ بچّے کو منع کرتا ہے۔ بچّہ سہم جاتا ہے۔ بادلِ نخواستہ اپنے کام سے ہاتھ رکھتا ہے لیکن فطرت کی چٹکیاں کب تک خاموش رہ کر سہے۔ بھائی کی کتاب اُٹھا لاتا ہے کبھی ادھر سے کھولتا ہے اور کبھی اُدھر سے۔ باپ کہتا ہے "ارے شریر! بھائی کی کتاب اُٹھا لایا۔ رکھ دو۔ فوراً رکھو۔ پھاڑ دو گے۔ پھٹ جائے گی"۔ بچّہ یقین سے کہتا ہے "نہیں پھاڑتا۔ نہیں پھٹتی"۔ پھر بھی اگر ایک آدھ ورق پھٹ گیا۔ تو کیا ہُوا؟ یہ گالیاں۔ یہ تھپّڑ۔ یہ غصّہ کیوں؟ بچّہ مار کھا کر۔ گالیاں سُن کر سسکیاں لیتا ہُوا آخرکار سو ہی جائے گا۔ لیکن اے سمجھدار باپ! تجھے کیا معلوم؟ کہ اِن سسکیوں میں تُو نے تباہی و بربادی کے کتنے طوفان بند کر دئے۔ بے شک تُو نے بچّے کو بچّے سے بڑا آدمی بنا دیا۔ مگر "بچّہ" مرگیا۔ تُو نے اپنے ہاتھوں اُس کا گلا گھونٹا۔ تیرا بچّہ اب بچّہ نہیں رہا۔ بوڑھا آدمی ہے۔

بچّہ سمجھ گیا۔ کہ دنیا میں بچّہ ہونا بہت بُری بات ہے۔ بچّے کے لئے دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اُسے اگر زندہ رہنا ہے۔ تو بُوڑھا بننا پڑے گا۔ ورنہ بڑے بہت ظالم ہیں۔ اُسے جینے نہ دیں گے۔ بڑوں سے ڈرنا چاہیئے۔ اُن کے سامنے یا تو آنا نہیں چاہیئے یا چُپ چاپ بیٹھے رہنا چاہیئے۔ یہ قابلِ نفرت لوگ ہمارے رنگ زرد، آہ سرد اور دلِ بریان ہونے سے خوش ہوسکتے ہیں۔ اگر دنیا میں رہنا ہے۔ تو انہی کی مرضی پر چلو۔ یہ انسان نہیں۔ خوفناک دیو اور بھُتنیاں ہیں۔ جن کو خدا نے بچّوں پر حکومت کرنے کے لئے مسلّط کیا ہے۔

بچّہ کھیل میں مصروف ہے۔ کچھ بن رہا ہے۔ کچھ بگڑ رہا ہے۔ بگڑی کو بنانے کی متّحدہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ بار جیت جاری ہے۔ بہت کٹھن مہم درپیش ہے۔ اگر اس وقت دھیان کسی اور جانب بھٹک جائے۔ تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ جیتی ہوئی بازی ہر جائے گی۔

کھانا بعد میں بھی کھایا جا سکتا ہے۔ اتنے میں ماں پکارتی ہے " سنتا نہیں نالائق! ادھر آؤ۔
کھانا زہر مار کر لو" ایک ہو تو جواب خاموشی سے دیا جائے۔ بھائی بہنیں سب باری باری گلا
پھاڑ پھاڑ کر کھانا کھانے کے لئے بلا رہے ہیں۔ ناچار بچّہ جھوٹ کا آسرا لے کر گلو خلاصی کراتا ہے
کئی بار " آتا ہوں" کہہ کر بھی نہیں جاتا۔ یہیں سے جھوٹ اور فریب کاری کی ابتدا ہوتی ہے
بچے کے سامنے کھانے سے زیادہ اہم کام ہے۔ اِس لئے اِس وقت وہ کھانا کیسے کھا سکتا ہے؟
مگر آہ۔ وہ گھسیٹا جائے گا۔ پیٹا جائے گا۔ اُس کے کان کھینچے جائیں گے۔ اُسے کھانا کھانے پر
مجبور کیا جائے گا۔ وہ کہتا رہے " بس زیادہ نہیں کھاتا۔ سیر ہو گیا ہوں " کون سُنتا ہے۔ وہ
اُٹھے گا۔ زبردستی پھر بٹھایا جائے گا۔ اُس کے مُنہ میں نوالے ٹھونسے جائیں گے۔ اِس طرح
اُس کے لئے نہایت لذیذ کھانا بھی ایک کڑوی دوائی سے زیادہ بے لطف ہو جاتا ہے۔ وہ دل
میں کہتا ہے۔ خوراک بھی کیا لعنت ہے کھیل کی دشمن ہے۔ پھر سوچتا ہے۔ شاید والدین ہی
بچّوں کے کھیل کے دشمن ہیں۔

کھیل بچّوں کا پیدائشی حق ہے۔ انہیں کبھی کھیل سے محروم نہ کرنا چاہیئے۔ ان کا کھیل
زندگی کا کھیل ہے۔ وہ مستقبل کیلئے کھیل کے ذریعے تیاری کرتے ہیں۔ وہ گھر بنانا سیکھ رہے
ہیں۔ گھوڑے کی سواری سیکھنا چاہتے ہیں۔ اور بندوق چلانا سیکھ رہے ہیں۔ انہیں کھیلنے
دو۔ تاکہ وہ سیکھیں۔ اُن کی بھوک کا اندازہ آپ کیسے لگا سکتے ہیں؟ جب بھُوک لگے گی۔
تو خود بخود دَوڑے آئیں گے۔ اس وقت خشک نوالہ قورمہ پلاؤ کا مزا دے گا۔ وہ شوق سے
کھائیں گے اور خوب سیر ہو کر کھائیں گے۔ اگر ہم اُن کا انتظار نہیں کر سکتے۔ تو وہ ہمارے لئے
اپنا کام کیوں ملتوی کر دیں۔ مناسب یہی ہے کہ ہم اپنا کام کریں۔ اور وہ اپنا کام کرتے رہیں۔
اُن کی دُنیا الگ ہے اور ہماری دُنیا الگ۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کہ ہم ایک دوسرے
کے کاموں میں ہرگز مخل نہ ہوں۔

ماں سینے پرونے کا کام کر رہی ہے۔ بچہ پوچھتا ہے " امّاں جان! [illegible]

ماں کہتی ہے "چُپ"۔ باپ کچھ لکھ رہا ہے۔ بچّہ پُوچھتا ہے "ابّا جان! یہ کیا کر رہے ہو؟" باپ کہتا ہے "چُپ"۔ بہن گائے کے سامنے گھاس ڈال رہی ہے۔ بچّہ پُوچھتا ہے۔ "آپا جان! کیا کر رہی ہو؟" بہن جواب دیتی ہے "چُپ"۔ بھائی دوات میں روشنائی ٹھیک کر رہا ہے۔ بچّہ پُوچھتا ہے "بھائی جان! کیا کر رہے ہو؟" بھائی للکارتا ہے۔ "چُپ"۔ چُپ! چُپ! ہر طرف سے چُپ! یاخداوندِ قدّوس! بچّہ کیا کرے۔ اور کہاں جائے؟

بچّہ سوچنے لگتا ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ میرے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ اگر میں خود کوئی کام کروں۔ تو بھی مار پیٹ۔ گالی گلوچ اور پھٹکار دھتکار۔ اگر پُوچھوں اور سمجھنے کی کوشش کروں۔ تو کوئی بتاتا نہیں۔ سمجھاتا نہیں۔ یا اللہ۔ یہ کیسی دُنیا ہے۔ اور یہ کیسے لوگ ہیں۔ تو ہی اُنہیں سمجھا۔

بچّہ خاموش رہنے لگتا ہے مغموم ہو جاتا ہے۔ اور مایوس رہنے لگتا ہے۔ اُس کا نازک دماغ غم اور غصّے کی حرارت سے جلنے لگتا ہے۔ اُس کی صحت روز بروز گِرنے لگتی ہے اُس کا دل کام کاج سے اُچاٹ ہونے لگتا ہے۔ وہ ہر وقت کسی گہری سوچ میں لگا رہتا ہے جب بچّے چُپ رہنے لگتے ہیں۔ بڑے خوش ہو جاتے ہیں۔ کہ بچّہ اب سیانا ہو گیا۔ شرارتیں نہیں کرتا۔ کاش کوئی انہیں سمجھائے۔ کہ بچّہ سیانا نہیں ہؤا۔ بلکہ فوت ہو گیا۔

اُستاد کہتا ہے۔ خوشامد بُری چیز ہے۔ بچّہ غور سے سُنتا ہے۔ اور اُسے الہامِ ربّانی سمجھتا ہے۔ لیکن جب وہ انسپکٹر صاحب کی تشریف آوری کے موقع پر دیکھتا ہے۔ کہ اُستاد سے زیادہ خوشامدی انسان دُنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ تو وہ اُستاد سے فوراً بدظن ہو جاتا ہے۔ باپ کہتا ہے۔ عبادت بہت اچھی چیز ہے۔ بیٹا سُنتا ہے۔ اور تاک میں لگا رہتا ہے۔ کہ باپ کب دو زانو ہوتا ہے۔ تاکہ وہ بھی اُس کے ساتھ عبادت میں شامل ہو۔ لیکن یہ حادثہ کبھی پیش ہی نہیں آتا۔ اور بچّے کو آخر کار مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ماں

کہتی ہے غصّہ کرنا بیوقوفوں کا کام ہے۔ بچّہ یقین کر لیتا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے۔ کہ ہر صبح ماں باپ میں جوتم پیزار رہتی ہے۔ تو وہ بڑوں کی عقل و دیانت پر انگشت بدنداں ہو جاتا ہے۔ باپ کہتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن بچّہ جب اپنی پُرانی ٹوپی کسی غریب بھولی کو دے دیتا ہے۔ تو بجائے آفرین سُننے کے اُسے سزا ملتی ہے۔ بچّہ ششدر رہ جاتا ہے۔ کہ یہ کیا دغا بازی ہے۔ جس طرح میلے میں کُتّا حیران ہو کر بھونکتا پھرتا ہے۔ بالکل اُسی طرح بچّہ بھی پریشان ہو کر بڑوں کی کرتوتوں پر دِل ہی دِل میں کُڑھتا رہتا ہے۔

پھر بھی ہم کہتے ہیں۔ کہ بچّے ناسمجھ ہیں۔ اور بڑے ہوشیار۔ بڑوں کو بچّوں پر پُورے پُورے حقوق حاصل ہیں۔ کیونکہ بچّے بچّے ہیں۔ اور بڑے بڑے ؛

تنظیم حساب

سید خادم حسین گیلانی

تمہید:

کبھی وہ زمانہ تھا۔ کہ بچہ اسکول میں آیا۔ اور معلم نے اُس کی تدریس شروع کردی۔ نہ تو بچے کی دلچسپی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اور نہ ہی اسکول اور ماحول سے انسیت پیدا کی جاتی تھی۔ مدرس تعلیم کا مرکز تھا جس کے گرد گھوم پھر کر بچہ تعلیم حاصل کرتا تھا۔ مگر آج یہ زمانہ ہے۔ کہ اربابِ تعلیم نے بچے کو محور قرار دیا ہے۔ اور مدرس کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ بچے کی دلچسپی کا خیال رکھے۔ اور ماحول سے اُسے وابستہ کرنے کے لئے پُوری پُوری کوشش کرے۔

پیشتر ازیں تعلیم کا نصب العین یہ تھا۔ کہ بچہ سکول میں آئے۔ اور ب۔ ٹ بٹ پڑھنا شروع کردے۔ اور تیاری کے بعد ایک مخصوص امتحان دے سکے۔ مگر آج کا نصب العین اِس سے جُدا ہے۔ بچے کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرکے بروئے کار لانا اور اُسے بہترین شہری بنانا آج کی تعلیم کا مقصد ہے۔ نیز بچے کی ذہنی، روحانی اور جسمانی قوتوں کی اِس طرح نشوونما کرنا کہ اِن قدروں کی ضرورت و اہمیت کے مطابق انفرادی اور اجتماعی سیرت کی تکمیل ہو سکے۔

میرا مضمون یہ نہیں۔ کہ میں مختلف مضامین اور اُن کے مقاصد سے بحث کرنے کے بعد

یہ واضح کروں ۔کہ اِن سے بچے کی انفرادی یا اجتماعی سیرت کی تکمیل پر کیا اثر پڑتا ہے ۔ یا اِن مضامین کا اسکولوں میں پڑھانا کیوں ضروری ہے ۔ البتہ اپنے قائم کئے ہوئے عنوان کے ماتحت حساب ۔ اُس کے مقاصد اور انسانی تہذیگی پر اُس کا اثر پیش کروں گا۔

حساب کی ضرورت :

حساب ایک سائنس ہے جس کا تعلق روزانہ کاروباری زندگی کے ہر شعبہ سے اتنا گہرا ہے ۔ کہ ہم ایک کو دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے ۔ بلکہ ہم جس قدر اِس پر غور کریں گے ۔ یہ تعلقات اُتنے ہی گہرے ہوتے چلے جائیں گے ۔ کاروباری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حساب کی عدم ضرورت کا سوال پیدا ہوتا ہو ۔ بلکہ جو چیز زندگی میں گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑنے والی ہے ۔ وہ "حساب" ہے ۔

میرے اِس بیان سے اتفاق نہ کرتے ہوئے آپ خود سوچیں ۔ تو آپ کو معترف ہونا پڑے گا کہ واقعی حساب جیسی ضروری چیز زندگی میں اور کوئی نہیں ۔

بچہ پیدا ہوتا ہے ۔ تو اُس کے پیدا ہونے کا وقت گھنٹے ۔ منٹ ۔ سیکنڈ حساب کے محتاج ؛ عمر معلوم کرنے کے لئے حساب کی ضرورت ۔ دُکان دار سے سودا سلف خریدنے کے لئے حساب کی واقفیت کاشتکاری اور زمینداری کی آمد و خرچ کے لئے حساب کی موجودگی ایسی چیزیں نہیں ہیں ۔ جن سے انکار ہو سکے ۔

گھریلو زندگی میں نمک ۔ تیل ۔ آٹا ۔ ایندھن ۔ صابن وغیرہ اشیا کا خریدنا اور اِن اخراجات کو اپنی آمدنی کے متوازی رکھنا حساب کی بہترین ضرورت ہے ۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا ۔ کہ حکومتوں کے بجٹ جن پر حساب کی انتہائی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ اِسی خانگی آمد و خرچ کا اعلیٰ نمونہ ہیں ۔ اِس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے ۔ کہ اِنسان اور حساب کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ اور زندگی کے کسی شعبے میں اِس کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

علم ریاضی کی قدر و منزلت سوسائٹی کی نشوونما اور ترقی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہی

ہے۔ اور اس کی اہمیت کا انحصار استعمال کرنے والے لوگوں کی تہذیب پر ہے۔ اعداد و شمار کا علم ابتدا ہی سے انسانی زندگی کا اہم عنصر رہا ہے۔ اور حساب انسان کی ایک خود ساختہ سائنس ہے۔ ایک ماہر حساب دان یوں فرمایا کرتے تھے۔ کہ دنیا کی تمام سائنس کی بنیاد حساب پر ہے۔ بلکہ دنیا کے تمام کاروبار اور علوم و فنون کی بنیاد حساب ہے۔ جسے انسان نے اپنی سہولت کے لئے ایجاد کیا ہے۔ اِس کا جنم اِنسانی ضرورت سے ہُوا۔ اور یہ انسانی ضروریات کو پُورا کرنے کا اہم اور زبردست ہتھیار ہے۔ جس کے بغیر انسان کی گذر مشکل ہے۔ اِس لئے حساب کا ایک اہم مقصد جو اُس کی پیدائش ہی سے اُس کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ اُس کی ضرورت ہے۔ جو انسانی زندگی کے روزانہ کاروبار میں پیش آتی ہے۔

حساب سے مراد :

حساب اُس فن کا نام ہے۔ جس سے ہم چیزوں کا شمار کرنا اور گننا سیکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جس کی روزانہ لین دین اور کاروبار زندگی میں اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یا وہ اصول اور قواعد جن کا اطلاق شمار اور گنتی پر ہوتا ہے۔ وہ حساب ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ گنتی کے فن اور جن اصولوں پر اِس فن کا دارومدار ہے۔ اُس فن اور اصولوں کے علم و واقفیت کا نام حساب ہے۔

مقاصد کی ضرورت :

کسی نصاب یا مضمون کو مؤثر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ کوئی واضح اور قطعی مقصد مدِّنظر ہو۔ اگر پیشِ نظر مقاصد غیر معین اور مبہم ہوں گے۔ تو یقین فرمایئے۔ کہ اَیسے مقاصد کے حصول کے پیشِ نظر جو بھی جدّ و جہد کی جائے گی۔ اُس کے نتائج غیر واضح اور غیر نمایاں ہوں گے بعینہٖ یہی حالت ہم اپنے گرد و پیش دیکھ رہے ہیں۔ اگر ایک طرف وہی پُرانے مقاصد نظر کے سامنے ہیں۔ تو دوسری طرف نتائج بھی دقیانوسی قسم کے برآمد ہو رہے ہیں۔

نظرِ ثانی کرنے والی نصاب کمیٹی کی رپورٹ :

ہمارے طریقِ تعلیم اور تعلیمی مواد کا انحصار زیادہ تر ہماری اُن توقعات پر ہوتا ہے۔ جو ہمیں کسی مضمون سے ہوں یعنی ہمارے طالب علم کے لئے یہ مضمون کیا کچھ کرے گا۔ اگر ہمیں اپنی تعلیم سے چند مقاصد حاصل کرنے ہیں۔ تو لازماً ہم اپنے طریق ہائے تدریس اور تعلیمی مسالہ کو اس طرز پر ڈھالیں گے۔ کہ ہمارے متعلم کو بیشِ نظر مقاصد کے حصول میں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔ مثلاً اگر حساب پڑھانے میں اُستاد کا مقصد صرف سرعتِ عمل اور چار ابتدائی قاعدوں پر تیزی اور درستی سے عبور کرانا ہو۔ تو وہ سوائے لمبی لمبی ضربوں اور تقسیموں کے اور کوئی رقوم حل نہیں کرائے گا۔ وہ ایسے سوالات حل کرائے گا۔ جن سے صرف سرعتِ عمل پیدا ہو۔ وہ سوالات کی مشکلات - اُلجھنوں اور پیچیدگیوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے گا۔

اگر اُستاد کا مقصد بچے کی ذہنی تربیت۔ قوتِ استدلال۔ قوتِ فیصلہ کی نشو و نما اور تقویت ہوگا۔ تو وہ اِس قسم کے سوالات کا انتخاب کرے گا۔ جن کے حل کرنے میں بچے کو سوچنا پڑے۔ اور سوالات کو سمجھنے اور بتدریج منازل طے کرکے اُن کے حل کے لئے مختلف ذرائع اور ڈھنگ نکالنے پڑیں گے۔ اِن حالات میں اُستاد سوال کی تجزی اور پیچیدگیوں کے سمجھانے کی طرف زیادہ توجہ دے گا۔ اور اعداد و شمار کی طرف کم توجہ ہوگی۔ وہ کوشش کرے گا کہ ایسے سوالات پیش کرے جن سے بچے کو اپنے ذہنی قوائے کا استعمال کرکے معلوم کرنا پڑے۔ کہ کیا کچھ کرنا ہے۔ سوالات منتخب کرتے وقت شائد مدرس سوال اور بچے کی زندگی کے تعلق کو بھی نظر انداز کردے۔ اور ایسے سوالات کا انتخاب کرے۔ جو محض ذہنی جمناسٹک کے لئے مواقع پیدا کریں۔ اور اگر اُس کا مقصد بچے کو موجودہ سماجی زندگی میں کاروباری معاملات سے واقف کرنا ہو۔ اور اِس قابل بنانا ہو۔ کہ وہ زندگی کے حسابی پہلو کو سمجھ سکیں۔ تو وہ صرف ایسے معمے بچے کے سامنے رکھے گا۔ جو فی الحقیقت زندگی میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ اِس بات کا خیال نہیں کرے گا کہ اِس مسئلہ میں حساب کو کس قدر دخل ہے۔ یا اِس میں سرعتِ عمل اور لمبی لمبی ضربیں اور

تقسیموں پر حاوی ہونے کی کتنی ممکنات ہیں۔ اور نہ ہی وہ حل کی تیزی اور صحت کا اتنا خیال کرے گا۔ جتنا اُن حالات میں جن کے ماتحت وہ مسئلہ پیدا ہؤا۔ تدریس میں مقاصد کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے اِسی طرح کی کئی ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

پنجاب گورنمنٹ کی مقرر کردہ نصاب کمیٹی نے حساب پڑھانے کے مقاصد کو بدیں الفاظ ظاہر کیا۔

(۱) طلبا کو آئندہ زندگی میں کام آنے والے حساب میں ماہر کرنا۔

اس لئے معلم حساب کو چاہیئے۔ کہ طلبا کی ایسی تربیت کرے۔ کہ اُنہیں اعداد و شمار میں تیزی کے ساتھ درستی کی مشق ہو سکے۔

(۲) اُنہیں روزانہ زندگی میں کام آنے والے سوالات سمجھنے اور حل کرنے میں پُوری پُوری مہارت ہو جائے۔

ہم سب کو اعداد سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اور وہ آدمی بہت خسارے میں رہتا ہے جو اپنی اُجرت کی پڑتال۔ ضروریاتِ آمد و خرچ کا اندازہ۔ خرید و فروخت کے وقت واجب الادا اور واجب الوصول رقوم کا حساب نہیں کر سکتا۔ یا روزانہ کاروباری دستاویزوں پر دستخط کرتے وقت مندرجہ اعداد کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتا۔ پس حساب پڑھاتے وقت ہمیں یہ امر سامنے رکھنا چاہیئے۔ کہ ہمیں بچے کو اِس قابل بنانا ہے۔ کہ وہ ایسے معاملات کو نپٹانے میں جن کا تعلق اعداد و شمار سے ہو، تیزی و صحت سے کام لے سکے۔

حساب کی عملی ضرورت کے علاوہ ماہرینِ تعلیم نے حساب کو تعلیم کے اصلی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بھی ایک نہایت موزوں اور مناسب مضمون قرار دیا ہے۔

تعلیم کا ایک مقصد بچے میں "قوّتِ فکر" "خود اعتمادی" "موقعہ شناسی اور مشکلات پر قابو پانے کی خواہش پیدا کرنا ہے۔ حساب ایک ایسا مضمون ہے۔ جو اِن قوٰی کو بیدار اور

استوار کرنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ چنانچہ جیومیٹری کی کتابوں کو سکول کے بچوں کی منطق کی کتابیں کہا جاتا ہے۔ ان میں منطق کا متواتر اور بے عیب سلسلہ چلا آتا ہے۔ بچہ ایسے علاوہ شمار میں معروف رہتا ہے۔ جن کی سچائی پر کوئی شبہ نہیں ہوتا۔

حساب سچائی ہے اور یہ عالمگیر سچائی بچے کے ایمان کو مضبوط کرتی ہے اور صحیح حل سے بچے میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے نتائج کی جانچ پڑتال کر سکتا ہے۔ وہ اپنے جوابات کی صحت معلوم کر سکتا ہے۔ نیز حساب ایک ایسا مضمون ہے۔ جو قوی کو بیدار اور استوار کرنے میں بہت مدد دے سکتا ہے۔ چنانچہ اِن تمام کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے پنجاب گورنمنٹ کی نصاب کمیٹی نے ایک مقصد یہ بھی لکھا۔

اِس مضمون کی تعلیم سے طلبا کی ذہانت کو بڑھانا مقصود ہے۔ اور اُن کے ذہنی عمل قوتِ فیصلہ اور قوتِ استدلال کی تربیت کرنا ہے۔

حساب کے مقاصد کے متعلق خواہ ہم ہربرٹ سپنسر سے متفق ہوں کہ "بچے کی اخلاقی تربیت ہوتی ہے" کیونکہ حساب سیکھتے وقت بچہ مکمل بے عیب اور عالمگیر سچائی کو سیکھتا ہے۔ خواہ پسٹالوزی سے اتفاق کریں۔ کہ "حساب سے منطقی تربیت ہوتی ہے" یا فرابل کے ساتھ کہ "یہ بچے کی جبلتِ کردار کو اُبھارتا اور اُس کی تسکین کرتا ہے"

ڈاکٹر مانٹے سوری کے اصول کے مطابق "اِس سے حواس کی تربیت کو جلد ہی علم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے"

مندرجہ بالا تجربات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ حساب اِس لئے سکھایا جاتا ہے۔ کہ یہ مفید ہے۔

اِس علم کی تعلیم سے مندرجہ ذیل مقاصد متصور ہیں:۔

(۱) یہ مضمون ذہانت۔ قوت متصورہ۔ قوتِ فیصلہ اور قوتِ استدلال کی نشوونما کا ایک ذریعہ ہے۔ اِس لئے اِس کا استعمال انتہا ضروری ہے۔

(ب) طلبا کو روزانہ کام میں آنے والے حساب میں ماہر کرنا چاہیئے۔ اُستاد کو چاہیئے کہ سوالات کے عمل کو حتے الوسع واضح کرے۔

(ج) طلبا میں تیزی کے ساتھ گننے سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

حساب کسے کہتے ہیں:

عددوں کے باہمی تعلقات کو جاننا اور اُن تعلقات کی مدد سے چیزوں کی تعداد معلوم کرنا حساب ہے۔

اقسام:

حساب کو دو قسموں میں منقسم کیا جاسکتا ہے (ا) علم حساب (ب) فنِ حساب۔

(ا) اعداد کے باہمی تعلقات یعنی اُن اصولوں کو جاننا جن پر عملِ حسابیہ کی بنیاد ہے۔ یا اُن قواعد کو سمجھنا جو اعمالِ حسابیہ میں استعمال ہوتے ہیں علم حساب کہلاتا ہے۔

(ب) اُن اصول و قواعد کا استعمال خاص موقعوں اور مثالوں میں کرنا فنِ حساب کہلاتا ہے۔

حساب کو نصاب میں کیوں رکھا گیا:

اگرچہ حساب کو نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت و اہمیت پر کافی بحث ہو چکی ہے اور یہ ثابت کر دیا گیا ہے۔ کہ حساب کا نصاب میں شامل کرنا عین فطرت کے تقاضا کے مطابق ہے۔ تاہم یہ بحث تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے۔ اگر اِس کی جزئیات پر روشنی نہ ڈالی جائے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ حساب کو نصاب میں شامل کرنے کے دو فائدے ہیں (ا) عملی (۲) تمدنی۔

عملی فوائد:

(ا) طلبا اُس وقت تک مختلف علوم میں قابلیت حاصل نہ کر سکیں گے۔ جب تک وہ حسابات کی مدد نہ لے سکیں گے۔ دُنیا میں ہر ایک سائنس کی تکمیل حساب ہی سے ہوتی ہے۔ علم النفس۔ علم تراکیبِ اجسام۔ علم الطبیعیات وغیرہ تمام علوم میں حساب کی ضرورت ہے

ہم حساب کی مدد کے بغیر قدرت کی کارگذاری کو نہیں سمجھ سکتے۔ نئی ایجادات میں حساب کا بڑا حصّہ ہے۔

(۲) زندگی پر حساب کا اثر۔ موجودہ زمانہ مشینوں کا زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کا تمام دارومدار او رسائنس کی ترقی کا تعلق حساب کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔

(۳) مندرجہ بالا ہر دو کے لئے حساب کی ضرورت ہے۔ ہر طالب علم جو کالج یا سکول کی تعلیم سے فارغ ہوتا ہے۔ اگرکما حقہٗ حساب کی تعلیم سے مستفید نہیں ہوتا۔ ماسوائے اُن چند اشخاص کے جو اپنے پیشے کے لحاظ سے حساب کی اعلیٰ تعلیم کے محتاج ہوتے ہیں۔ تاہم دیگر مضامین کے مقابلے میں حساب زندگی پر کم اثر انداز نہیں ہے۔

(۴) ضبط کے لحاظ سے عقل کو تیز کرتا ہے۔ اِس میں یادداشت کا ہی تعلق نہیں۔ بلکہ خوب سوچ بچار بھی ہے۔ قوتِ استدلال۔ انہماک اور دریافت کرنا اِس کے ضروری حصّے ہیں۔ درجہ ثانوی کی تعلیم استدلال کے لئے باقاعدہ تربیت ہے۔ اور اِس کا مطلب محض واقفیت ہی بہم پہنچانا نہیں ہے۔

(۵) علوم میں واقفیت حاصل کرنا۔ ہم اُس وقت تک علوم میں واقفیت حاصل نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ حساب کی امداد نہ لی جائے۔

(۶) خرید و فروخت میں انسان دھوکا نہیں کھا سکتا۔

(۷) آمد و خرچ کا حساب باقاعدگی سے رکھا جا سکتا ہے۔ اور آمد کو دیکھ کر خرچ کے کم کرنے کے وسائل اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ اور بچت سے انسان کو فارغ البالی حاصل ہو سکتی ہے۔

(۸) کسی کام سے پہلے اخراجات کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

(۹) سائینس۔ تاریخ۔ جغرافیہ وغیرہ علوم کے حصول میں حساب سے امداد مل سکتی ہے۔

(مسلسل)

بیسویں صدی میں

تعلیمی طریقوں کے سلسلے میں جدّت طرازیاں

مسلسل ——— ۳

سلیم فارانی

(۳) ڈالٹن پلان :

جماعتی تعلیم کی خرابیوں کو دُور کرنے کے لئے اور بچّے کی انفرادی سعی و آزادی کو بروئے کار لانے کے لئے جہاں اور طریق تعلیم ایجاد ہوئے۔ وہاں ایک طریقہ زیرِ عمل ڈالٹن پلان ہے۔ ڈالٹن پلان کی ایجاد کا سہرا امریکہ کی ایک مفکرہ ہیلین پارکہرسٹ کے سر ہے۔ اس مفکرہ نے اپنی اس ایجاد میں دو طرف سے اثرات قبول کئے۔ وہ مانٹے سوری اور فریڈرک برک دونوں کی معتقد تھی، مانٹے سوری کو تو اس نے بعض تصانیف کے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے سلسلے میں کافی امداد دی تھی۔ دونوں کے خیالات لے کر ہیلین پارکہرسٹ نے اپنے طرز پر انفرادی تعلیم کی ایک نہایت مفید اسکیم تیار کی۔ مانٹے سوری اس وقت جو اسکیم تیار کر چکی تھی۔ وہ آٹھ سال کی عمر کے بچّوں تک کے لئے تھی۔ پارکہرسٹ نے جو قدم اُٹھایا۔ وہ اس سے اگلی منزل کے لئے تھا یعنی آٹھ سال سے بارہ سال تک کی عمر والے بچّوں کے لئے۔ اور بعد ازاں اس سے بھی زائد عمر کے طلبہ کے لئے۔

موجدہ کے قول کے مطابق اس کی یہ اسکیم کوئی نیا طریق تعلیم نہیں۔ بلکہ ایک قسم کا نیا انتظام ہے جو سادہ بھی ہے اور اقتصادی لحاظ سے سودمند بھی یا جس سے بچّوں اور

استادوں کو زیادہ سے زیادہ مفید کام کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اور جو قباحتیں دوسری قسم کے نظاموں میں ہیں۔ اِس نظام سے بہت حد تک دُور ہوجاتی ہیں۔ اِس طرزِ عمل سے نہ تو نصاب میں کسی قسم کا اضافہ یا تغیر ہوتا ہے۔ نہ ہی مدرسوں کے لئے کسی قسم کے لمبے چوڑے اثاثے یا سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ایک اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سست و ہوشیار طالب علموں کے لئے ترقی کے برابر مواقع مہیا ہوتے ہیں۔

ہیلین پارکہرسٹ نے اپنی اسکیم کا پہلا معمولی تجربہ وینس کے ایک چھوٹے سے مدرسے میں کیا۔ جہاں وہ خود پڑھاتی تھی۔ اس کی اپنی عمر اس وقت سولہ سال کی تھی۔ اس مدرسے میں مختلف عمروں کے طلبہ تھے۔ اور ان میں سے بعض ایسے تھے۔ جو اس معلّمہ سے بھی بڑے تھے۔ پارکہرسٹ نے ان متفاوت عمروں کے طلبہ کی جماعت کو اطمینان سے تعلیم دینے کا حل سوچتے ہوئے یہ طرز ایجاد کیا کہ ان طلبہ میں سے جو بڑے بڑے تھے۔ ان کے لئے کام مقرر کردئے۔ اور انہیں کہہ دیا کہ ہدایات کے مطابق خود اعتمادی سے کام لے کر انفرادی طور پر اپنا کام کئے جائیں۔ اور معلّمہ کے پاس صرف اس وقت آئیں جب کہ اس کی امداد کے بغیر کام نہ چل سکے۔ یہ طلبہ جب علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے۔ تو وہ خود فارغ و مطمئن ہوکر باقی بچّوں کو پڑھاتی۔

مس پارکہرسٹ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام Education on Dalton Plan ہے۔ اس کتاب میں وہ اپنی ایجاد کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہے۔ کہ میں اپنے زمانے کے نظامِ تعلیم سے بہت حد تک غیر مطمئن تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ یہ نظام مشاہدہ و عمل سے مبرا ہے۔ مدرسے اور کالج ایک فرسودہ اور فضول رسمی طریق پر چل رہے ہیں۔ اور ایسے طلبہ پیدا کرنے سے قاصر ہیں جو محنتی، خود اعتماد اور پختہ اخلاق کے ہوں۔ اور جو طلبہ پیدا ہو رہے ہیں۔ ان میں نہ تو صحیح طور پر کام کی صلاحیتیں ہیں۔ اور نہ خود اعتمادی ہے۔ سیرت کا یہ حال ہے کہ پیہم تنزل ہے۔ چنانچہ اس قسم کے جائزے اور

تحقیق سے بیں اس نتیجہ پر پہنچی کہ اگر ہمارا مقصدِ تعلیم بچّوں کو بلند علمی و ثقافتی معیار پر پہنچا لے کے علاوہ انہیں ضروری طور پر اعلیٰ اخلاقی قوت کا مالک بنانا ہے۔ تو اس کے لئے موجودہ نظامِ تعلیم قطعاً غیر موزوں ہے۔ اسے ہر حال میں بدلنا پڑے گا۔ زندگی کی مشکلات اور اس کے متفرق مسائل کا باحوصلہ مقابلہ کرنے کے لئے شخصیت و اخلاق کی تعمیر اور عزم مصمم کی تخلیق ضروری ہے۔ اور نوجوانوں کو اس اسلوب پر تیار کرنا معلم کا کام ہے لیکن اِس قسم کی تعلیم اور اس قسم کی تیاری ناممکن ہے، جب تک کہ زندگی کی مشکلات اور مسائل سے آزادانہ طور پر دوچار ہونے اور مقابلہ کرنے کے مواقع میسر نہ آئیں۔ اور پھر ان مشکلات میں خود اعتمادی، قوتِ اختراع، قوت ارادہ اور مضبوط اخلاق کی صحیح نشو و نما نہ ہو۔ اس لئے مدرسوں کے صحیح فرائض یہ ہیں۔ کہ وہ بچّوں کے لئے زندگی سے متعلقہ مسائل کا مقابلہ کرنے اور انہیں سلجھانے کے ذریعے ڈھونڈیں اور اس طرح بغیر کسی مداخلت کے اپنے آپ کو خود تعلیم دینے کے مواقع مہیا کریں۔ مدرسے ایسے معمل ہوں جہاں بچّے مختلف تجربات کریں۔ لیکن پُرانے طرز کی تقریر گاہیں نہ ہوں۔ جہاں بچّے خاموش سامع بنے رہیں۔ اور حقیقی فائدہ نہ اُٹھائیں۔ مدرسے کے کمرے جو جماعتوں کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ اور جہاں استادوں کی عاملانہ حیثیت ہوتی ہے۔ اور بچّوں کی صرف سامعانہ، سائنس کے عملی کمروں کی طرح معمل بن جائیں۔ جہاں بچّے خود کام کریں اور اُستاد فقط رہنمائی یا نگرانی کرے۔ اور بجائے مختلف جماعتوں کے کمروں میں گھومنے اور جماعتی تعلیم دینے کے اپنے مخصوص مضمون کے معمل ہی میں رہے۔ بچّے وہاں اپنی مرضی سے آئیں جائیں۔ اور اپنا کام کرتے رہیں۔ جب کبھی بچّے اپنی مشکلات میں انفرادی یا اجتماعی طور پر اُستاد کی امداد چاہیں۔ تو استاد اس کے لئے ہر طرح تیار رہے۔ مدرسے کا ہر کمرہ کسی ایک مضمون تدریس کے لئے مخصوص کارگاہ ہو۔ اور بچّوں کو مطلق آزادی ہو۔ کہ جس مضمون کا مطالعہ کرنا چاہیں۔ اسی مضمون کے مخصوص کمرے میں چلے جائیں۔ اور جتنا چاہیں۔ کام کریں۔

پارکہرسٹ نے یہ نئی اسکیم آٹھ اور بارہ سال کی عمروں کے بچّوں کے لئے

۱۹۱۲-۱۱ء میں تیار کی تھی۔ اور ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک اس پر خوب محنت کی۔ اور مختلف تجربے کئے لیکن اس کے بعد ۱۹۱۸ء تک بہت سے وجوہ کی بنا پر جن میں سے ایک اہم وجہ جنگ عظیم تھی، یہ اسکیم معرض بے توجہی میں رہی۔ ۱۹۱۸ء کے بعد پھر کئی تجربے کئے گئے اور آخر ۱۹۲۰ء میں امریکہ کے ڈالٹن شہر کے فوقانی مدسے میں اسے مکمل طور پر پہلی بار جاری کیا گیا۔ ڈالٹن شہر کے ساتھ اس اتفاقی نسبت سے یہ اسکیم ڈالٹن پلان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس پلان کے عمل کی تحقیق اور اس کے مشاہدہ کی غرض سے دنیا کے محقق ڈالٹن پہنچے۔ انگریزی تعلیمی حلقوں نے تو اس پلان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مناظرے ہوئے، کانفرنسیں ہوئیں، کتابیں چھپیں، اخباروں میں طویل مضامین نکلے اور اس پلان کے اسکولوں میں استعمال کے سلسلے میں مخالف و موافق تنقیدیں شائع ہوئیں۔ لیکن اس کے بنیادی اصول بہر حال ہر جگہ تسلیم کر لئے گئے۔ اور جہاں جہاں حالات نے موافقت کی۔ وہاں کے اسکولوں میں اسے ترویج دینے کی کوششیں شروع ہوئیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ موجدہ نے اس پلان کو مانٹے سوری وغیرہ کی طرح اپنے نام سے مشہور نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ موجدہ کو یہ بات کبھی مرغوب خاطر نہ تھی۔ کہ یہ اسکیم کسی طرح محدود و مسدود ہو کر رہ جائے۔ اور اس میں ترقی ونشوونما کے لئے لچک نہ رہے۔ پارکھرسٹ کی خواہش تھی۔ کہ یہ پلان ارتقا پذیر ہو۔ اور دوسرے تجربے کرنے والے باقاعدہ اس میں مناسب ترمیمیں یا اضافے کرتے چلے جائیں۔ اور حسب حالات اس کو مناسب تشکیل دیتے چلے جائیں۔

یہ اسکیم تین اصولوں پر قائم کی گئی ہے:

(۱) آزادی۔

(۲) اشتراک عمل۔

(۳) انفرادی عمل یا کوشش۔

گویا اس میں جماعتی اور انفرادی دونوں قسم کی خوبیاں موجود ہیں مس پارکھرسٹ نے جماعتی تعلیم کی قباحتوں کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے' جماعت کو اُڑایا نہیں۔ جماعتی تعلیم میں جو انفرادی توجہ نہیں ہوتی تھی یا جو بچّے کو آزادی نصیب نہیں تھی مس پارکھرسٹ نے ان دو اہم خامیوں کو دُور کرنے کے لئے یہ نظامی تبدیلی تجویز کی۔ ڈالٹن پلان کوئی نیا طریق تعلیم نہیں۔ بلکہ نیا نظامِ تعلیم ہے۔ اس میں جماعت کی ہستی تو قائم رہتی ہے۔ لیکن اس کی قباحتیں قائم نہیں رہتیں۔ اس ضرورت کے پیش نظر کہ متعلم کو اس کی مرضی کے مطابق کام کی آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ یہ اہتمام کیا گیا ہے۔ کہ آواز جرس پر ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف دفعتہً تبدیلی کی پُرانی رسم ختم ہو جائے۔ اور بچّے کو اجازت ہو کہ جس مضمون میں چاہے اور جب تک چاہے مصروفِ عمل رہے۔

جماعتوں میں خاموشی کو بہت پسند کیا جاتا رہا ہے' چنانچہ خاموشی ہی سے استادوں کے ضبط کے اندازے لگائے جاتے رہے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت یہ کوئی قابلِ تعریف چیز نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں بچّے کے اندر حس و حرکت نہیں ہوتی' وہ بےکار سا رہتا ہے اور اپنے آپ کو مقید و مجبور خیال کرتا ہے۔ بچّوں کو حرکت کرنے' ایک دوسرے سے مشورہ لینے' صلاح دینے یا مل جُل کر عمل کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے اس قسم کے اشتراکِ عمل کے دوران میں اجتماعی جذبات کے پیدا ہونے کے بہت مناسب سامان پیدا ہوتے ہیں۔ بمقابلہ اس پُرانے طریق کے جس میں بچّے صبر و جبر سے استاد کی تقریری بوچھاڑ برداشت کرتے رہتے ہیں۔ ڈالٹن پلان اس اجتماعی اور انفرادی عمل کے سلسلے میں بہت مفید اسکیم ہے۔

ڈالٹن پلان کا مقصد یہ ہے۔ کہ کسی طرح زیادہ مؤثر طریقے سے بچّے علم حاصل کریں اگرچہ جماعت کی ہستی نظامی لحاظ سے قائم رہتی ہے لیکن تعلیمی لحاظ سے وہ ایک اکائی نہیں رہتی۔ سالانہ کام کی مقدار بھی وہی رہتی ہے۔ جو پُرانے جماعتی نظام میں ہوا کرتی ہے

لیکن اس کام کو پورا کرنے کا طریق مختلف ہے۔

ڈالٹن پلان کا طریق کار یہ ہے کہ سال بھر کے نصاب کو مہینوں کے حساب سے مناسب حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر ان حصّوں کے لئے مناسب سوالات، ہدایات، طرزِ عمل اور کتابیں تجویز کی جاتی ہیں۔ اور یہ سب چیزیں ایک پرچے کی صورت میں طالبعلم کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ یہ پرچہ قسط یا تفویض یا اجارہ کہلاتا ہے۔ اس کو لے کر طالب علم باقاعدہ معاہدہ کرتا ہے۔ کہ یہ کام ایک ماہ کے مقررہ وقت کے اندر اندر ختم کرے گا۔ اور اس سلسلے میں وہ ایک عہد نامے یا اقرار نامے پر دستخط کرتا ہے۔ ہر ماہ میں تمام مضامین کی مفوّضہ قسطیں مکمّل کرنی ہوتی ہیں۔ اور دوسرے ماہ کی قسط اس تکمیل کے بعد ہی دی جاتی ہے کسی طالب علم کو اگر کسی ایک مضمون میں زیادہ دلچسپی ہو۔ اور وہ اس مضمون کی تفویض کو جلد ختم کر لینے کے بعد چاہے کہ اسی مضمون کی دوسرے ماہ کی قسط شروع کر دے۔ تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اس ماہ کے باقی تمام مضامین کی مفوّضہ قسطیں ختم نہ کر لے۔

اس طریق کار میں استاد کو پرانے طرزِ عمل کے مقابلے میں کم حصّہ لینا پڑتا ہے اس کی حیثیت صرف ہادی و رہبر کی سی ہوتی ہے۔ جہاں کہیں طالب علم کے اپنے انفرادی عمل میں کوئی عقدہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ استاد سے اس عقدہ کے سلجھانے میں مدد لیتا ہے۔ اُستاد کا کام یہ ہوتا ہے۔ کہ مناسب تفویضات تیار کرے مختلف عنوانات کے متعلق موزوں کتابوں کے حوالے دے۔ طالب علم کے کام کی نگرانی کرے، اس کے کام میں جو مشکلات پیدا ہوں۔ انہیں سلجھانے میں اس کی بروقت امداد کرے۔ اس کے کام کا روزانہ جائزہ لے۔ اس کی ہمت بڑھائے۔ اور تفویضی کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسے آمادہ رکھے۔

پرانے طریق میں تو جماعتوں کے لئے کمرے ہوتے ہیں۔ لیکن ڈالٹن پلان میں بجائے جماعتوں کے مضمونوں کے لئے مخصوص کمرے ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح جماعتی استادوں کی بجائے مضمونوں کے خاص ماہر استاد ہوتے ہیں مضمون کے مخصوص کمرے میں اس مضمون کے متعلق

کام کرنے کی سہولت بہم پہنچانے کے لئے ضروری سامان موجود ہوتا ہے۔ مثلاً تمام ضروری کتابیں، چارٹ، نقشے، موڈل، تصاویر، رسالے وغیرہ۔ کمرے کے اندر اس مضمون کے متعلق مناسب فضا پیدا کی جاتی ہے۔ بچے اپنی خوشی سے جس مضمون کے کمرے میں چاہیں جاتے ہیں اور وہاں اس مضمون کی تفویضی قسط کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب تک جی چاہے اس کام کو کرتے رہتے ہیں۔ جب اُکتا جاتے ہیں۔ تو خود بخود چلے جاتے ہیں۔ اور کسی دوسرے مضمون کے کمرے میں جاکر وہاں کا تفویضی کام سرانجام دیتے ہیں۔ آوازِ جرس یا وقت نامے کی ملال افروز قید نہیں ہوتی۔

اس بات کی سہولت کے لئے کہ ہر طالب علم کو اور ہر استاد کو معلوم ہو کہ ہر ایک مضمون میں یا تمام جماعت میں بحیثیت مجموعی کس رفتار سے ترقی ہو رہی ہے۔ ہر روز کام کا باقاعدہ جائزہ لیا جاتا ہے اور مختلف طرز کے گرافوں اور شکلوں میں اس جائزے کا اندراج کیا جاتا ہے۔ جن سے صاف پتہ چلتا ہے۔ کہ مختلف اوقات میں کس قدر کام ختم ہوا۔ ایسے ترسیمی اندراجات (گراف) تین قسم کے ہوتے ہیں۔ جن میں سے دو بچے کے پاس ہوتے ہیں اور ایک اُستاد کے پاس۔ ان گرافوں سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے۔ کہ جزوی اور کلی ترقی کیا کچھ ہوئی ہے۔ اور یہ دیکھنے کا موقعہ بھی ملتا ہے۔ کہ آیا طالب علم اپنے کام کو مقررہ وقت کے اندر ختم کرنے کا اہتمام کر رہا ہے یا نہ۔ استاد یا نگرانِ معمل کا گراف جو اس کے کمرے میں لٹکا رہتا ہے۔ استاد کو طالب علموں کے کام کا جائزہ لینے کے قابل بنا تا ہے۔ اور وہ پیچھے رہنے والوں کو نصیحت و ہدایت کر سکتا ہے۔ گویا ڈالٹن پلان کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

(۱) نصاب کی مناسب تفویضات یا اجاروں میں تقسیم۔

(۲) طالب علم کا معاہدہ کہ وقت مقررہ پر تفویض کو ختم کرے گا۔

(۳) جماعتی کمروں کی بجائے مضمونوں کے مخصوص کمرے۔

(۴) جماعتی استادوں کی بجائے مضمونوں کے مخصوص ماہر استاد۔

(۵) کام کی رفتار و ترقی ظاہر کرنے کے لئے رسوم (گراف)

(۶) طالب علموں کی اپنے کام میں آزادی اور انفرادی سعی -

چنانچہ اس اسکیم کو مکمل طور پر عمل میں لانے کے لئے نہ صرف مضامین اور جماعتوں کا نیا نظام قائم کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ مدرسے کے اجتماعی نظام کو بھی نئی تشکیل دینی پڑتی ہے - اس قسم کے نظام کے لئے اسکول میں مندرجہ ذیل چیزوں کی اہم ضرورت پڑتی ہے -

(۱) معمل یا مضمونوں کے کمرے -

(۲) مضمون کے ماہرین -

(۳) تفویضات -

(۴) جائزے -

معمل کا انگریزی میں مترادف لفظ "لیباریٹری" ہے۔ اور چونکہ ڈالٹن پلان میں مختلف مضامین کے کمروں کو لیباریٹری کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس لئے اِس پلان کو "لیباریٹری پلان" بھی کہتے ہیں۔ مس پارکہرسٹ کا منشا ہی یہی ہے - کہ مدرسوں میں ہر مضمون کی لیباریٹری ہو۔ اور اس میں طلبہ مضمون کے متعلق ہدایات کے مطابق اس طرح تجربات کریں جس طرح کہ سائنس کے سلسلے میں کیا کرتے ہیں -

پرانے طرز کے مدارس میں صرف سائنس کے لئے ہی معمل یا لیباریٹریاں ہوتی ہیں۔ جس سے یہ عام عقیدہ سا پیدا ہو گیا ہے۔ کہ سائنس کے علاوہ کسی اور مضمون میں لیباریٹری کا خیال خام ہے۔ لیکن مس پارکہرسٹ اس بے بنیاد عقیدہ کی تردید کے لئے کہتی ہے۔ کہ تجربات و مشاہدات صرف کیمیاوی اشیا کی ترکیب و تجزیہ تک محدود نہیں۔ بلکہ علم کیمیا کے علاوہ دیگر علوم و فنون میں بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ادب زبان کے صحیح طور پر آراستہ کرنے میں طالب علم مشاہدات کر سکتا ہے۔ کہ کسی شاعر نے صرف وہی ایک نظم نہیں لکھی جو عام طور پر درسی کتاب میں انتخاب کی حیثیت سے درج ہوتی ہے۔ بلکہ اور بھی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ جو یہاں مختلف

شاعروں کے کلام کے مجموعوں سے دو چار رہتا ہے۔ کتابوں میں خیالات کی بے پناہ دُنیا دیکھتا ہے۔ اسے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر مختلف مصنفین کے مختلف خیالات ہیں۔ اور اس پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے۔ کہ دُنیا کے مسائل اَن گنت ہیں۔ اور وہ تمام ایک ہی کتاب میں نہیں سما سکتے۔

ڈالٹن پلان میں مضمونوں کے ماہرین کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ انفرادی کام سے بہترین نتائج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں۔ جب کہ مضمون کی نگرانی، ہدایت اور اہتمام ایسے استادوں کے ہاتھ میں ہو۔ جو اس مضمون میں ہر طرح ماہر ہوں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ایک استاد دو مضمونوں میں خاص مہارت رکھتا ہو۔ اور وہ دو مضمونوں کا اہتمام ایک ہی کمرے میں کر سکے۔ لیکن بہتر صورت یہی ہے۔ کہ فی کمرہ ایک مضمون اور ایک اُستاد ہو۔ اِن ماہرین کا کام یہ ہے۔ کہ مضمون کے متعلق طلبہ کے معیار کے مطابق ہر حصے کے لئے موزوں تفویض تیار کریں۔ اور طلبہ کے مطالعہ میں آنے والی تمام قسم کی مشکلات کو دُور کریں۔ ان کے کام کو دیکھیں۔ اور مختلف گرافوں میں اندراج کرائیں۔

(باقی)

خوف کی نفسیات

عبدالحی علوی

اگر ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ مختلف اقسام کے خوف ہماری زندگی پر اتنا چھائے ہوئے ہیں۔ کہ ہم اس کا اندازہ تک نہیں لگا سکتے۔ کبھی تاریکی کا خوف ستاتا ہے کبھی دشمن کا خیال تنگ کرتا ہے۔ اور کبھی امتحان کا خوف رات کی نیند حرام کر دیتا ہے ۔ بعض اوقات تو ان خوفوں سے ہماری زندگی اتنی تلخ ہو جاتی ہے۔ کہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ شائید ہی کوئی شخص ایسا ہو۔ جو کسی نہ کسی چیز کے خوف میں مبتلا نہ ہو بعض اوقات تو یہ خوف اتنے لغو ہوتے ہیں۔ کہ ہمیں اُن آدمیوں پر ہنسی آتی ہے۔ جو ان خوفوں سے متأثر ہو جاتے ہیں۔ مشہور سائنس دان اور نامور جرنیل بھی ان خوفوں سے اپنا دامن نہیں بچا سکے سکندر اعظم جیسے فاتح کے دلوں میں یہ خوف اتنے جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ کہ ان کے لئے فتح کرنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ اور ان کی ساری زندگی ان خوفوں سے متحرک و متہیج ہوتی رہتی ہے۔ عصبی مریضوں کی تو خاص شکایت ہی کسی نہ کسی خوف کی موجودگی ہوتی ہے۔ اور وہ طبیبوں کے پاس اس شکایت کی خاطر جاتے ہیں۔ لیکن بالعموم انہیں محروم ہی واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ اور وہ معمولی سے معمولی خوفوں سے بھی نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ اس مضمون میں ہم ان خوفوں کا مجمل طور پر مطالعہ کریں گے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے بعد ہم اپنے کردار کے اس پہلو کی اصلاح

سکے اپنی زندگی کو اور زیادہ خوشگوار بنا سکیں۔

خوف کی قسمیں:

پہلی قسم تو ان خوفوں پرمشتمل ہے۔ جو اپنے آپ پر اعتماد نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی محاذ جنگ میں جانے سے اس لئے ڈرتا ہے۔ کہ اسے اپنی جسمانی قوت پہ بھروسہ نہیں ہوتا۔ امتحان سے اس لئے خائف ہے۔ کہ اسے اپنی تیاری پر یقین نہیں ہوتا۔ لیکچرار کسی بڑے مجمع میں جانے سے اس لئے گھبراتا ہے کہ اسے اپنی علمی قابلیت پر پُورا پُورا اعتماد نہیں ہوتا۔

دوسری قسم میں وہ خوف شامل ہیں۔ جو محض تشویش سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کشمیر کے مسئلے کا صحیح حل نہ ہؤا۔ تو معلوم نہیں۔ ہمارے ملک میں کتنی آفت آجائے گی۔ اسی طرح کے خیال قسم قسم کے خوف قبل از وقت پیدا کرتے رہتے ہیں۔

تیسری قسم کے خوف وہ ہیں۔ جن کا تعلق کسی خاص حالت سے ہوتا ہے۔ یہ حالت خواہ حقیقی ہو یا غیر حقیقی۔ اس کی موجودگی میں خوف خود بخود طاری ہو جاتا ہے۔

آیئے ذرا اس تیسری قسم کا مطالعہ کریں۔ مشہور عالم ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ (Sigmund Freud) نے ایسے خوفوں کو تین قسم میں منقسم کیا ہے:۔

(۱) ایسی اشیا کا خوف جو فی الحقیقت خطرناک ہیں۔ مثلاً سانپ۔ درندے۔ بارود۔ زلزلہ۔ وبائی امراض کے جراثیم وغیرہ۔

(۲) ایسی اشیا کا خوف جو صرف بعض صورتوں ہی میں خطرے کا موجب بن سکتی ہیں۔ ایک صحیح الدماغ انسان ان چیزوں سے نہیں گھبراتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک خطرے کا امکان بہت کم ہے لیکن چند آدمی ایسے بھی ہیں۔ جو ان سے اتنا ڈرتے ہیں۔ جیسے واقعی خطرہ سامنے ہے۔ مثلاً ریل گاڑی کے حادثے کا امکان اگرچہ کچھ نہ کچھ ہے لیکن یہ اتنا کم ہے۔ کہ ایک عام آدمی کو اس خیال سے متأثر ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جہاز طوفان

کے نتیجے سے تباہ ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس خیال سے اپنے تئیں سفر کے خیال سے باز رکھنا مضحکہ خیز خیال کرتے ہیں۔ دریا کا پُل ٹوٹ سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ پُل اُس وقت دریا میں گر جائے گا۔ جب ہم اسے عبور کر رہے ہوں گے۔ کتنا مُہمل خیال ہے۔ تنہائی بھی خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ لیکن صرف چند خاص حالات ہی ہیں۔ تنہائی سے ہمیشہ ڈرتے رہنا ہمارے روزمرہ کے کاموں میں حارج ہوتا ہے۔

(۳) ایسی چیزوں کا خوف جن کا خطرے سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مثلاً بے ضرر جانور جیسے کیڑے مکوڑے۔ بھیڑ بکری۔ مُرغی وغیرہ۔ ہوادار کروں۔ تاریک جگہوں۔ آدمیوں کے ہجوم۔ چوک۔ بازار۔ کھُلی سڑک۔ غلاظت۔ دولت۔ پانی وغیرہ کا خوف۔ ایسی تمام اشیا کا خوف بظاہر بالکل ہی بیہودہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ ایسی اشیا شاذونادر ہی خوف کا باعث بن سکتی ہیں لیکن یقین جانئے۔ کہ ایسے آدمیوں کی تعداد کم نہیں۔ جو ایسی چیزوں کے خوف میں اس حد تک مبتلا ہیں۔ کہ وہ اپنی زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ گھر سے باہر وہ نہیں نکل سکتے۔ کہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔ کھانا مزے سے نہیں کھا سکتے۔ کیونکہ انہیں ڈر ہے۔ کہ کسی نے کھانے میں زہر نہ ملا دیا ہو۔ چھُری چاقو گھر میں نہیں رہنے دیتے۔ کہ ان سے قتل ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہجوم کے پاس سے اس لئے گذرنے سے خائف ہیں۔ کہ وہ شرما جاتے ہیں۔ نہر اور دریا کے قریب تک نہیں جاتے کہ مبادا اس میں گر نہ جائیں۔ اور تو اور مرغی جیسے گھریلو جانور کو دیکھتے ہی بے اختیار چیخنے لگ جاتے ہیں۔ جہاں مرغی نظر آئی۔ ان پر وحشت کے آثار طاری ہوئے۔ ایسے آدمیوں کی زندگی پر غور کیجیے۔ اور خود ہی انصاف کیجیے۔ کہ ان کی زندگی مسرت سے کتنی دُور ہے۔

۲۔ خوف کیا ہے؟

خوف جسم کی ایک خاص حالت کا نام ہے جس میں چند خاص تبدیلیاں رُونما ہوکر انسانی کردار کو اس کی معمولی فعالیت سے روک دیتی ہیں۔ اصطلاح میں اس حالت کو جذبہ

کہتے ہیں۔ خوف کے جذبے کے متعلق ایک مشہور عالم کینن (Cannon)* کے انکشافات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کیفیت کے طاری ہونے پر دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ معدہ اپنا کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ فشار خون بڑھ جاتا ہے۔ جسم کے عضلات سخت ہو جاتے ہیں۔ قوتِ گویائی پر اتنا اثر پڑتا ہے۔ کہ انسان یا تو لفظ تک نہیں نکال سکتا۔ یا رُک رُک کر بولتا یا چیختا ہے۔ قوت یا توانائی جسم کے اندر سے باہر کی طرف آتی ہے۔ چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر خوف زیادہ شدید ہو۔ تو انسان حرکت سے بھی معذور رہ جاتا ہے کبھی کبھار موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ سب خوف کی علامات ہیں۔

مندرجہ بالا تمام خارجی علامات کا باعث نظام عصبی کا خود اختیاری حصہ (Autonomic Nervous System) ہے۔ جو ان تمام علامات کو ضبط میں رکھتا ہے۔ لیکن ان سب تبدیلیوں کا باعث جسم کا وہ چھوٹا سا غدّہ ہے۔ جسے ایڈرینل (Adrenal) کہتے ہیں۔ داخلی اور خارجی تمام تبدیلیاں اس غدّے کے سیّال یا رطوبت سے پیدا ہوتی ہیں۔ جسے ایڈرینلن (Adrenalin) کہتے ہیں۔ یہ غدّہ گردوں کے اُوپر ٹوپی کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ خوف کی حالت محسوس کرتے ہی یہ غدّہ اپنے سیّال یا ہارمون کو بہت تھوڑی مقدار میں براہ راست خون میں ملا دیتا ہے۔ یہی تبدیلیاں اس وقت بھی دیکھنے میں آتی ہیں جب آدمی کسی چیز سے بھی خائف نہ ہو۔ لیکن اس ہارمون کی ایک قلیل مقدار کو ٹیکے کے ذریعے سے اس کے جسم کے اندر داخل کر دیا جائے۔ آدمی اس ٹیکے کے بعد خوف موجود نہ ہونے کے باوجود بھی خائف ہوتا ہے۔ اس تجربے سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ خوف کے پیدا کرنے میں اس چھوٹے سے غدّے کا بہت زیادہ دخل ہے۔ اس سیّال کے پیدا ہونے سے قوتِ ہاضمہ برباد

---

*W.B. Cannon: *Bodily changes in Pain, Hunger, Fear and Rage.* (1932)

ہو جاتی ہے منظم حرکات پیدا نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ حسّی اور حرکی اعصاب کا باہمی تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ ذہنی استعداد میں خاصی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ سوچ بچار سے انسان یکسر محروم رہ جاتا ہے۔ اس کیفیت کے دوران میں کسی ایک ذمہ دارانہ کام کی توقع رکھنا عبث ہے۔ فعلیاتی لحاظ سے خوف گویا جسم کی ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں جسم کی بعض اندرونی تبدیلیوں کی مدد سے اسے کسی خاص صورت حالات کا مقابلہ کرنے یا اس سے بچنے کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے خوف ایک طرح کی ذہنی شکست ہے۔ جس میں مقابلہ کی تاب نہ لاکر اس خاص صورت حالات سے اپنے تئیں بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ کیفیت صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان کسی وجہ سے ماحول کی مطابقت اختیار نہ کر سکے خوف کی مدد سے وہ ان تمام افعال کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔ جو ماحول کی پیچیدگیوں کی مطابقت اختیار کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

۳۔ خوف کا استعمال:

(۱) ڈارون (Darwin) اور بعض دوسرے علما خوف کو بوقت ضرورت ایک قوّت بہم پہنچانے والا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ کینن بھی اس خیال سے متفق ہیں۔ کہ ہنگامی ضرورت کے وقت ایڈرنیلین سیّال سے پیدا ہونے والی تمام جسمانی تبدیلیاں جسم کو قوّت کے اظہار کے لئے زیادہ مستعد بنا دیتی ہیں۔ یہی مستعدی بالآخر انسان کو ہر قسم کے خطرے سے بچا لیتی ہے۔ چنانچہ یہ اکثر ملاحظہ کیا گیا ہے۔ کہ خوف کی حالت میں انسان ایسی دیوار پھاند گیا ہے۔ جسے بعد میں وہ انتہائی کوشش کے باوجود نہیں پھاند سکا۔ اس آدمی کی مثال پر غور کیجیے۔ جو کسی جنگلی جانور کے خوف سے بے تحاشا بھاگ رہا ہے۔ اس کی ٹانگیں بے پناہ قوت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ گویا قدرت نے خوف کا جذبہ اس لئے عطا کیا ہے۔ کہ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر غیر معمولی قوت سے کام لے سکے۔

لیکن اس ضمن میں پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ انسان کو اپنی روزانہ زندگی میں کتنی دفعہ اس غیر معمولی قوت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ یہی قوت اسے شیر اور چیتے جیسے درندوں سے جان بچانے میں ممد ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی مکان گر رہا ہو۔ تو انسان بڑی پھرتی سے بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اگر دشمن اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ یا اس پر حملہ کر دے تو وہ اس طاقت سے کام لیتے ہوئے اس کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ تمدّن کے اس دَور میں ہمیں ہر روز ایسے کتنے مواقع پیش آتے ہیں۔ جن میں اس قسم کی طاقت کا استعمال اشد ضروری ہے۔ اپنے روزانہ کاموں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوگا۔ کہ ان میں زائد طاقت کا اظہار چنداں ضروری نہیں۔ کالج جانے۔ طلبہ کا سامنا کرنے۔ گھریلو کام سرانجام دینے۔ سفر کرنے۔ سودا سلف خریدنے۔ دوستوں سے ملنے اور بعض ناگوار اور تلخ حالات کا مقابلہ کرنے میں غیر معمولی قوت کے استعمال کی چنداں ضرورت نہیں۔

اگر کسی حقیقی خطرے کی موجودگی میں جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے خوف کے دَوران کی غیر معمولی قوّت قدرت کا ایک عطیّہ ہے۔ تو حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے خوف کی موجودگی اشد ضروری ہے۔ لیکن اگر قوّت کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ تو خوف کے جذبے کی ضرورت ہی تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اگر تقریر کے دَوران میں اپنے سامعین سے خائف ہوں۔ تو اُس میں کون سی ایسی خطرے کی صورت ہے۔ جس سے میں بچنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہاں زندگی تو معرضِ خطر میں ہے ہی نہیں۔ تو جان کا خوف کیوں پیدا ہو۔ اسی طرح مرغی اور کیڑے مکوڑے سے ڈرنے میں کون سا راز پنہاں ہے۔ کہ خوف کے ذریعے سے جسم کو غیر معمولی قوت بہم پہنچائی جائے۔ برعکس اس کے ایسے خوف تو انسان پر عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔

(۲) بعض علما کا خیال ہے۔ کہ درد اور تکان وغیرہ کی طرح خوف ایک طرح کی اطلاع یا تنبیہ ہے۔ کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اور ہم اپنے آپ کو اس قدر تنبیہ کے بعد غلطیوں۔ بُرائیوں یا قدرت کے قوانین کی خلاف ورزی سے بچا سکیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تمام مذاہب میں خوف

ایک نہایت ہی ضروری عنصر ہے۔ ایک حدیث میں یُوں آیا ہے: "رأس الحکمة مخافة الله"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف ہی سب سے بڑی دانائی ہے۔ لیکن آپ پُوچھ سکتے ہیں۔ کہ ہمیں متنبّہ کرنے کے لئے آخر خوف کیوں ضروری ہے؟ کیا اِس شدید جذبہ کے عوض کوئی اور پُرسکون حالت اسی مقصد کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتی؟ جب رات کے وقت تاریک اور سنسان جگہ پر کوئی آدمی نظر آتا ہے۔ تو میں کیوں ڈر جاتا ہوں؟ طالب علم کالج دیر سے پہنچنے سے کیوں خائف ہوتے ہیں؟ انسان موت سے کیوں ڈرتا ہے؟ ہم کیوں سوسائٹی کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے؟ کیا خوف کے علاوہ جو بے شمار مضر اثرات پر مشتمل ہے۔ اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں۔ جس سے ہمیں بروقت متنبّہ کیا جا سکے؟

(۳) بعض اوقات خوف کی شدت سے جسمانی حرکات بند ہو جاتی ہیں۔ اور کوشش کے باوجود انسان سے کوئی فعل بھی سرزد نہیں ہو سکتا۔ لیکن اکثر اوقات غیر منظم حرکات پردۂ ظہور میں آتی ہیں۔ یہاں تک کہ جو لڑکا باؤلے کُتے سے ڈر کر بھاگ رہا ہو۔ اس کی حرکات بطور مکمل منظم نہیں ہوں گی۔ خوف صحیح اقسام کی حرکات کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ اور زندگی کے پُرسکون راستے میں روڑے اٹکاتا رہتا ہے۔ اس لئے ایسے اصحاب جو اپنے جسم کو خوف کی سیاہ چادر میں مستور رکھتے ہیں۔ اپنی زندگی کے مقررہ راستے میں آگے بڑھنے کے عوض راہِ فرار اختیار کر رہے ہوتے ہیں۔ گویا خوف ان کی زندگی پر اتنے چھا جاتے ہیں۔ کہ صراطِ مستقیم پر ان کے لئے گامزن رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر چند ایسے خوفوں کو نکال دیا جائے۔ جو فی الواقع اپنی غیر معمولی قوت کی بنا پر ہمیں ظاہری خطرات سے بچنے میں مدد دیتے ہیں۔ تو باقی ماندہ تمام خوف خلافِ فطرت ہیں۔ جو ترقی کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ اور انسان کو "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" کے مشہور مقولے پر عمل نہیں کرنے دیتے۔

۴۔ خوف کہاں سے آتے ہیں؟

(۱) ایسے اشخاص یا مقامات جو کسی وجہ سے ہمارے بچپن کے زمانے میں خوف پیدا

کرنے کے باعث ہوئے۔ مثلاً اگر کوئی دو ڈھائی سال کا بچہ کسی بلندی سے گر کر اپنے تئیں زخمی کرلے۔ تو بلندی کا خوف تقریباً ساری عُمر موجود رہے گا۔ یا اگر چھوٹے بچے کو کوئی آدمی ڈرائے۔ تو اُس شخص کا خوف اُس کے دل میں جاگزیں ہوجائے گا۔ اسی طرح ہمارے اکثر خوف زمانۂ طفولیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) ہمارے بے شمار خوف "انعکاس مشروط" کا نتیجہ ہیں۔ جو تمام کے تمام ہماری لاعلمی میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں مشہور امریکی عالم نفسیات واٹسن کے تجربات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ دریافت کیا۔ کہ خوف پیدا کرنے کے اساسی اسباب صرف دو ہیں یعنی بلند آواز اور جسمانی سہارے کا اچانک ہٹ جانا۔ اس کے علاوہ نوزائیدہ اور کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ ان دو خوفوں کے علاوہ باقی ماندہ تمام خوف انعکاس مشروط کے عمل سے بردۂ ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ واٹسن نے بچوں کو خرگوش اور دوسرے بالدار جانوروں سے ڈرانا سکھا دیا یعنی جب بھی بچہ خرگوش سے کھیل رہا ہوتا۔ ڈاکٹر موصوف زور کی آواز سے بچے کو ڈرا دیتا۔ اس عمل کی چند روزہ تکرار کے بعد بچہ نہ صرف خرگوش سے ڈرنا سیکھ گیا بلکہ ہر بالدار جانور سے اور بالوں والی اشیا سے۔ ذیل کی شکل اس عمل کی توضیح کرتی ہے:۔

بلند آواز (م۱) ——> خوف (جواب ۱)
خرگوش (م۲) ——> مسرت اور خوشی کا اظہار (جواب ۲)

چند روز کی تکرار کے بعد:۔

خرگوش (م۲) ——> خوف (جواب ۱)

جس طرح خرگوش کا خوف اکتسابی ہے۔ اسی طرح بچوں کے بے شمار خوف انعکاس مشروط سے پیدا ہوتے رہتے ہیں یعنی ہر وہ شے جو خوف کے اصلی مہیج یعنی بلند آواز سے پیوستہ ہوگی۔ کچھ عرصہ کے بعد بذاتِ خود خوف کا باعث بن جائے گی۔

مثلاً اگر بجلی کی گرج کے دوران میں کوئی کُتا نظر کے سامنے سے گذر رہا ہو۔ تو بعد میں کُتا بھی خوف پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ اسی طریقے سے بچے بصری سمعی اور لمسی خوف سیکھ لیں گے۔ جب یہ اکتسابی قسم کے خوف (کُتے کا خوف یا خرگوش کا خوف) کافی پائیدار ہوجائیں گے۔ تو پھر ہر وہ شے بھی جو اُن کے ساتھ پیوستہ ہوگی۔ خوف پیدا کرنے کا باعث بن جائے گی یعنی محکم ہونے کے بعد اکتسابی قسم کے خوف اصلی ہیجان کی مانند بن جائینگے اسی طریقے سے بچے کی عمر اور اس کے تجربے کی وسعت کے ساتھ ساتھ خوفوں کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جائے گا۔ مثلاً اگر بچہ کُتے کی آواز سے بلی کو کمرے سے باہر نکلتا دیکھے۔ تو بلّی بھی خوف کا سبب بن جائے گی۔ اگر وہ بلّی کو کسی سیاہ رنگ والے برتن میں دُودھ پیتی دیکھے گا۔ تو اب اُس برتن سے بھی ڈرنے لگ جائے گا۔ چونکہ یہ برتن عموماً باورچی خانے ہی میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور باورچی خانے میں زیادہ تر نوکر ہی کام کرتا رہتا ہے۔ اس لئے باورچی خانے اور اس نوکر سے بھی خائف ہوجائے گا۔

اکثر بچوں کو رات کی تاریکی میں خوفناک کہانیاں سُنائی جاتی ہیں۔ یا بعض اوقات تاریکی بلند آواز سے پیوستہ ہوجاتی ہے۔ نتیجۃً تاریکی کا خوف ہم سب کے دلوں میں جاگزیں ہوجاتا ہے۔ اسی طرح تاریکی کا خوف بڑھتے بڑھتے کئی طرح کی اشیا پر حاوی ہوجاتا ہے۔

واٹسن نے یہ بھی معلوم کیا۔ کہ صرف وہ اشیا ہی خوف کا باعث نہیں ہوتیں۔ جو خوف کے اساسی ہیجان سے پیوستہ ہوں۔ بلکہ وہ شے جو بھی دوسرے ہیجان سے ملتی جُلتی ہو۔ اسی طرح چوہوں اور ان سے ملتے جُلتے جانوروں کے خوف پیدا ہوجائیں گے۔ بچہ اگر کسی خاص آدمی کی آواز سے ڈر جائے۔ تو ہر وہ آواز ڈر کا باعث بن جائے گی۔ جو اُس آواز سے مشابہ ہو۔ خوف پیدا کرنے کے اصلی سبب تو بھولتے چلے جائیں گے۔ لیکن ان کا خوف بدستور قائم رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں کسی خاص شے یا جگہ مثلاً تنگ گلی کوچوں کا خوف۔ بند کمروں کا خوف۔ سنسان جگہوں کا خوف وغیرہ کا اصلی سبب معلوم کرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔

کیا ہم بتا سکتے ہیں۔ کہ ہم کتوں سے کیوں ڈرتے ہیں؟ کیا ہم آسانی سے جان سکتے ہیں کہ بعض عورتیں کیڑے مکوڑوں۔ خاص طرز کے مکانوں سے کیوں ڈرتی ہیں؟ ایسے تمام خوف یقیناً انعکاس مشروط کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ اس عمل کا موقع محل تلاش کرنا آسان کام نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ہم اساسی اور اکتسابی قسم کے خوفوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ خوفوں کے اصلی اسباب کہیں لاشعور حصۂ نفس میں پنہاں ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ان خوفوں سے نجات حاصل کرنا بھی بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ جب تک خوفوں کی اصلیت پر روشنی نہ پڑے ان کی بیخ کنی کرنا آسان نہیں ہوتا۔

ایک چھوٹا لڑکا اپنے ہمجولیوں کے ساتھ باغ میں گرے ہوئے آم جمع کرنے میں مصروف تھا۔ کنواں چل رہا تھا۔ اور پانی نالیوں نالیوں آموں کے تھالوں میں پہنچ رہا تھا۔ اتفاقاً ایک عظیم الشان قلمی آم کے تھالے میں فرش زمرّدین پر کوئی لوکا ستایا ہوا گرگٹ فروکش تھا۔ یہ چھوٹا سا گروہ کیریوں کی تلاش میں اسی درخت کے نیچے پہنچا۔ اور کیریاں جمع کرنے لگا۔ جب پانی اس درخت تک پہنچا۔ تو غریب جانور نے اپنی جان کے خوف سے لڑکے کی شلوار کے پائنچے میں پناہ لے لی۔ اور گھٹنے کے اندرونی جانب چپک گیا لڑکے نے چیخنا شروع کردیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر دوسرے بچے سہم کر دور جا کھڑے ہوئے بیچارہ لڑکا تڑپ رہا تھا۔ اس کی چیخ سُن کر باغ کا مالی آیا۔ اور اسے اس مصیبت سے نجات دلوائی۔

ایک روز م (جو اس واقعہ میں خود شریک تھا) اپنی بلّی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کہ اس نے اچانک ایک خوفناک چیخ ماری۔ جسے سُن کر گھر کے تمام لوگ جمع ہو گئے لڑکا بدستور چیخ رہا تھا۔ اور بُری طرح فرش پر کُود رہا تھا۔ جب لڑکے کے کپڑے اُتارے گئے تو ایک گیندے کا بڑا سا پھول صحرائے دامن کو طے کرتا ہوا فرش صحن پر آگرا۔ معلوم ہوا۔ بنائے وحشت یہی چیز تھی۔ ننھے میاں گلشن کائنات کی سب سے زیادہ نازک اور خوبصورت

چیز کو گرگٹ سمجھ کر خوف زدہ ہو رہے تھے۔ اس پھول کو انہوں نے شاخِ گل سے قطع کر کے زیب دہ کالر کر لیا تھا لیکن پھول کسی نامعلوم طریقے سے قمیص کے اندر داخل ہو گیا۔ اور ننھے میاں بعد میں اس قسم کے پھولوں سے ڈرنا سیکھ گئے۔

(۳) خوف کا ایک سبب اجتماعی قسم کا ہے۔ اکثر لڑکے کتے اور بلیوں سے اس لئے ڈرتے ہیں۔ کہ ان کے دوست ان جانوروں سے خائف ہوتے ہیں۔ جنوں بھوتوں اور ہیبت ناک کہانیوں کا خوف اسی وجہ سے تقریباً ہم سب کی زندگی میں ایک اہم حصہ لے رہا ہوتا ہے۔ گذشتہ فسادات کی واردات سنتے ہی ہم سب کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ ہمارے بے شمار خوف محض توہم پرستی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایسے اوہام مختلف قوموں اور مختلف مقاموں سے مخصوص ہیں۔ اور ہم اس ماحول میں رہتے ہوئے ان خیالات سے متأثر ہونے پر مجبور ہیں۔ مثلاً پنجاب کے دیہات میں یہ عام خیال ہے۔ کہ اگر سفر کی خاطر باہر جاتے ہوئے راستے میں سیاہ بلی ملے۔ تو وہ سفر خطرے کا باعث ہوگا۔ بڑے بوڑھے۔ عورتیں مرد۔ سب ہی اس خوف میں مبتلا ہیں۔

(۴) بے شمار خوف امتناع (Repression) کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ عصبی مریضوں کے خوفوں پر روشنی ڈالنے سے معلوم ہوگا۔ کہ بے ضرر چیزوں کے خوف پیدا ہو جانے کی وجہ ہی امتناع ہے۔ جسے تلاش کرنے کے لئے ہمیں لاشعور نفس کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے فرائڈ نے یہ دریافت کیا کہ جب بھی ہماری کوئی اساسی خواہش یا فطری میلان مثلاً محبت۔ عزت یا رفاقت وغیرہ کسی وجہ سے تکمیل حاصل نہ کر سکے۔ تو اس سے خوف کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی بعض اوقات امتناع کا باعث کوئی ناگوار حادثہ ہوتا ہے۔ یہ حادثہ جس شے کے ساتھ پیوستہ ہو کر ہمارے ذہن سے اتر جائے گا۔ بعد میں جا کر وہی شے خوف کا محرک بن جائے گی۔ امتناعی خوفوں کی تمام قسموں میں مریض کسی اندرونی خطرے کو خارجی دنیا میں منتقل کر رہے ہوتے ہیں۔ اس انتقال کے عمل سے ہمارے خوف مختلف لباس پہن کر اپنی نمائش کرتے رہتے ہیں۔ ان خوفوں کی ایک واضح صورت طرح طرح کی جسمانی بیماریاں ہیں یعنی

شہاک لوگ خوفوں سے جان بچاکر دق اور سرطان جیسے موذی امراض میں پناہ لے لیتے ہیں اور اس طرح زندگی کی مصائب اور کشمکش کا سامنا کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حقیقی زندگی میں غیر معمولی شجاعت کا ثبوت دینے کے عوض بیمار بن جانا کتنا آسان ہے۔ جو لوگ کسی مزمن مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کی تہ میں عصبی خوف بھی پنہاں ہوتے ہیں۔ جن کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے بچپن کے زمانے کے خصوصی حالات اور تربیت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ایک لڑکی اپنی عمر کے ساتویں سال سے لے کر بیسویں سال تک بہتے پانی کے خوف میں مبتلا رہ چکی تھی۔ چلتے پانی کی آواز سے خاص طور پر شدید خوف طاری ہو جاتا۔ بند پانی کا اسے اتنا خوف نہیں تھا۔ جتنا بہتے ہوئے پانی کا۔ اس خوف کی وجہ جس سے وہ قطعاً بے خبر تھی۔ ایک ناگوار حادثہ تھا جب تک اس حادثے سے اسے آگاہ نہ کیا گیا۔ اس کا خوف رفع نہ ہوا۔ جب وہ سات سال کی تھی۔ تو وہ اپنی ماں اور چچی کے ہمراہ کسی پہاڑی علاقہ میں سیر و تفریح کی خاطر گئی۔ ماں تو جلد ہی گھر واپس آ گئی۔ لیکن بچی اپنی چچی کے ساتھ وہاں رہنے پر مصر ہوئی۔ ماں کے چلے جانے کے بعد لڑکی نے اپنی چچی کو اطلاع دئے بغیر ادھر اُدھر گھومنا شروع کر دیا کچھ عرصہ کے بعد چچی نے جب اسے تلاش کرنا شروع کیا۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ وہ ایک چھوٹی سی آبشار میں پھنسی ہوئی ہے۔ پانی اس کے سر پر گر رہا ہے۔ اور لڑکی پر شدید خوف طاری ہے۔ اسے اس مصیبت سے نجات دلائی گئی۔ لیکن لڑکی نے اپنی چچی سے یہ درخواست کی۔ کہ اس کی ماں کو اس واقعے کی اطلاع ہرگز نہ ہو۔ چچی نے اس کی تسلی کی خاطر یہ وعدہ کر لیا۔ کہ وہ اس حادثے کے متعلق اس کی ماں کو کچھ نہ کہے گی۔ دوسرے روز چچی اپنے گھر واپس چلی گئی لیکن کچھ عرصہ کے بعد لڑکی پر خوف کے بے اختیار حملے طاری ہونے شروع ہو گئے۔ جو اس وقت تک موجود رہے۔ جب تک کہ تیرہ سال کے بعد اس کی چچی نے اسے اس حادثے کی یاد نہ دلائی۔ اور یہ بھی کہا۔ کہ آج تک اس نے اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ مکمل واقعہ کے یاد آنے کے بعد رفتہ رفتہ اس کا خوف جاتا رہا۔

عدم مطابقت اور خوفوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق ایسی عورتیں جن کی گھریلو زندگی خوشگوار نہیں ہوتی۔ ان کی ایک معقول تعداد طرح طرح کے خوفوں میں مبتلا ہوتی ہے۔ ان تمام واقعات کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ان خوفوں کی ابتدا بھی کسی نہ کسی فراموش شدہ ناگوار حادثے سے پیوستہ ہے۔

(مسلسل)

اصطلاحی غور و فکر

(گذشتہ سے پیوستہ)

سلیم فارانی

201. Charge

فرض، نگرانی، ذمہ داری، قیمت۔

درحقیقت یہ لفظ مواقع استعمال کے لحاظ سے مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے حسب موقع استعمال اس کی اصطلاحی صورت کی تعیین ہونی چاہیئے۔ چنانچہ اس کے لئے مندرجہ ذیل ترجمے مناسب ہوں گے:

(۱) جہاں یہ لفظ کسی چیز کو کسی دوسری میں رکھنے کی مقدار کے لئے استعمال ہو جیسے بندوق میں بارود کی مقدار تو وہاں اس کے لئے مناسب ترجمہ "صحیح مقدار" ہے۔

(۲) جہاں اس کا مفہوم کسی کام کا کسی کے ذمہ کرنا ہو۔ تو وہاں اس کے لئے مناسب ترجمہ "امر مفوضہ" "تفویض" یا "ذمہ داری" ہے۔

(۳) جہاں کسی چیز کے فرض ہونے کے سلسلے میں استعمال ہو۔ تو وہاں "فریضہ" بہتر ہوگا۔

(۴) جب اس سے مقصد کسی چیز یا شخص کو کسی کی حفاظت میں رکھنا ہو۔ تو پھر "نگرانی" یا "تحویل" زیادہ اچھے ترجمے ہوں گے۔

(۵) کسی شخص کی تنقیص کے سلسلے میں اس لفظ کا استعمال ہو تو پھر اس کا مناسب ترجمہ "الزام" ہوگا۔

(۶) جنگی زبان میں یہ "یورش" یا "حملہ" کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور ایسے ماحول میں یہی دو لفظ اس کا مناسب ترجمہ ہیں۔

(۷) کوئی جج یا پادری Charge کرے۔ تو اس کا مفہوم اچھے طور پر "ہدایت" یا "حکم" کے الفاظ سے ادا ہوگا۔

(۸) بوجھ، اُجرت، امانت وغیرہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

بصورت جمع یہ لفظ "Charges" مختلف معانی پیش کرتا ہے۔ اور مقاصد و مفہوم کے مطابق اس کے لئے مندرجہ ذیل مناسب الفاظ ہیں۔

(۱) اُجرت

(۲) لاگت یا قیمت

(۳) مطالبات

(۴) الزامات

بعض حضرات نے اس کے لئے "قدر" یا "اقدار" کا لفظ تجویز فرمایا ہے۔ وہ غلط ہے۔ اور صحیح طور پر یہ دونوں لفظ Value یا Values کے مخصوص معانی ہیں۔

202. Days of Grace

مہلت، زائد دن، زائد ایام۔

اس کا مفہوم دراصل وہ مہلت ہے جو کسی چیز کے واجب الادا ہو جانے کے بعد دی جاتی ہے۔ اس کے لئے "رعایتی دن" کوئی غیر موزوں ترجمہ نہیں۔ "مزید مہلت" بھی نامناسب نہیں۔

203. Quotations

یہ لفظ بھی اصطلاحی لحاظ سے مختلف مفہوم کے ادا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۱) وہ فقرہ یا قطعہ عبارت جس کو کہیں سے نقل کیا گیا ہو۔ یا جس کا حوالہ دیا گیا ہو۔
اس کے لئے موزوں ترجمہ " اقتباس " ہے۔
(۲) سامانِ تجارت کی تازہ قیمتیں۔ اس سلسلے میں " نرخ نامہ " مناسب ہوگا۔

204. Academy

اکادمی ، مجلس ، محفل ، انجمن ، حلقہ۔

مندرجہ بالا الفاظ Academy کا ایک مفہوم ادا کرتے ہیں۔ اور اس ایک مفہوم کے لحاظ سے " مجلس " زیادہ اچھا ترجمہ ہے لیکن مجلسی مفہوم کے علاوہ Academy کا لفظ کئی اور مفہوم ادا کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اس کا ایک اور مفہوم تعلیم گاہ اور یونیورسٹی ہے۔ اس لئے ان معنوں میں اس کا موزوں ترجمہ " درسگاہ " یا " جامعۃ " ہوگا۔

Academy اس باغ کو بھی کہتے ہیں جہاں افلاطون درس دیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے لئے " اکادمی " کہنا یعنی اس انگریزی لفظ کی تاریخ مفید ہوگی۔

Academy کا لفظ استعارۃً افلاطونی نظامِ فلسفہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں موزوں ترجمہ " فلسفہ اشراقی " ہوگا۔

205. Acceleration

یہ طبیعیات کی مخصوص اصطلاح ہے جس کا مفہوم کسی متحرک چیز کی بڑھتی ہوئی رفتار فی ثانیہ ہے۔ اس کے لئے عربی کے دو لفظ اسراع اور تسریع موزوں معلوم ہوتے ہیں جو اصل انگریزی لفظ Acceleration سے زیادہ ثقالت نہیں رکھتے۔

فلکیات میں ستاروں کی حرکت کے لئے بھی اس انگریزی اصطلاح کے لئے اسراع یا تسریع کا لفظ موزوں ترجمہ ہوگا۔

206. Accelerator

اس سے مراد وہ شخص یا چیز ہے۔ جو کسی چیز کی رفتار تیز کرے اور Acceleration

کی مناسبت سے اس کے لئے اسراع کا اسم فاعل " مُسرِع " موزوں رہے گا۔

207. Accent

یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں کسی رکن لفظ (Syllable) پر دباؤ کا تعلق ہے۔ اس کے لئے موزوں ترجمہ " دباؤ " یا " زور " ہوگا۔

لیکن جہاں یہ تلفظ کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے۔ وہاں اس کے لئے مناسب ترجمہ " لب ولہجہ " ہے۔

208. Accidental

ناگہانی ، غیر متوقع ، غیر ارادی ، اتفاقی ۔

یہ تمام الفاظ برابر مفہوم ادا کرتے ہیں۔ لیکن ان سب میں " اتفاقی " بہترین معلوم ہوتا ہے۔

209. Accommodating

آشتی پذیر ، صلح پسند ، مرنجاں مرنج ، نرم طبیعت ، خوش خلق ۔

ان سب کے مقابلے میں " بامروت " زیادہ اچھا ہے۔

210. Accomplice

ساتھی ، شریک ، مجرم ۔

چونکہ یہ لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جو جرم میں شریک ہو۔ اس لئے اس کے واسطے " شریکِ جرم " بہتر ترجمہ ہوگا ۔

سرکاری جریدے کے اعلانات

شعبہ اسکول

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۱ جنوری سنہ ۵۰ء ۹۶۱-E	م۔ محمد سمیع خان بی اے بی ٹی	ایک اُمیدوار جن کے قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کہونہ کی حیثیت سے تقرر کے احکام جاری ہو چکے ہیں۔	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیپ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ کریم حیدر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ل۔ د صفدر حسین کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں۔

شعبہ دفاتر

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۹ جنوری سنہ ۵۰ء ۴۲۲-E	م۔ محمد یوسف شاہ نمبر ۲۰۵ (۵۰ — ۱۰۰)	قائم مقام ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر	قائم مقام ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ عبدالمجید کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں۔
〃	س۔ مظفر حسن زیدی نمبر ۹۸ (۵۰ — ۱۰۰)	ادنیٰ محرر دفتر ناظر مدارس قسمت راولپنڈی۔	ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر	〃	م۔ محمد یوسف شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
〃	م۔ عبدالرحیم میٹرک I (۵۰ — ۱۰۰)	قائم مقام ادنیٰ محرر دفتر ناظر مدارس قسمت راولپنڈی جو چوہدری اللہ دتہ محرر اعلیٰ کی رخصت میں کام کر رہے ہیں۔	قائم مقام ادنیٰ محرر دفتر ناظر مدارس قسمت راولپنڈی بمشاہرہ پچاس روپے ماہوار۔ درجہ (۵۰ — ۳ — ۸۰ / ۴ — ۱۰۰)	〃	س۔ مظفر حسن زیدی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

تاج مکمل تاریخ پاکستان — تاج مکمل تاریخ ہندوستان

میٹریکولیشن پرشین گرامر

مصنفہ قاضی غلام الدین قادری
ایم۔ اے (علیگ)

مفید میٹریکولیشن پرشین گرامر مصنف کے پندرہ سالہ طویل تعلیمی تجربہ کا نچوڑ ہے۔ جو جدید طریقۂ تعلیم کے تحت مختلف مثالوں کے ذخیرہ کے ساتھ میٹرک کے جدید سلیبس کے مطابق نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے۔ اس کتاب کو تیار کرتے وقت معلوم سے نامعلوم کی طرف کے اصول کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اصطلاحات آسان وضع کی گئی ہیں۔ جو بچوں کے جلد ذہن نشین ہو جائیں گی۔ جدید فارسی کی طرف کما حقہٗ توجہ دی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں ماڈل ٹیسٹ پیپر دئے گئے ہیں جن میں گذشتہ دس سال کے یونیورسٹی سوالات موجود ہیں۔ عبارت سلیس اور عام فہم ہے۔

ضخامت ... ۳ صفحات

قیمت فی جلد
ایک روپیہ بارہ آنہ

تاج مکمل جغرافیہ

(سوالاً جواباً)

۱۹۴۹ء تک مکمل۔

نئے انداز میں ترمیم کے ساتھ ہر سہ کتب کے نئے ایڈیشن تیار کئے گئے ہیں جو وقت کے جدید تقاضوں کو بہ احسن وجوہ پورا کرتے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں یقیناً طلبہ کے لئے نادر تحفہ ہیں۔

- یونیورسٹی کے پرچوں کا ساتھ ساتھ حوالہ دیا گیا ہے۔
- تاریخ ہند کی کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک قیام پاکستان اور آج تک کے واقعات سے مکمل ہے یقیناً آپ ان کتابوں کو حاصل فرما کر دوسری کتب سے بے نیاز ہو جائیں گے

قیمت فی جلد: دو روپے آٹھ آنہ

رہنمائے ترجمہ فارسی

(میٹریکولیشن کے لئے)

فاضل مصنف نے طویل درسی تجربہ کے بعد اس اعلیٰ کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ جس کی چند خصوصیات ذیل میں درج ہیں:۔

- اردو سے فارسی ترجمہ کے تمام ضروری قواعد عام فہم اور سلیس زبان میں درج ہیں۔
- کتاب کی تیاری کے وقت گرامر کے اصول اور قواعد اور معلوم سے نامعلوم کے زریں اصول کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔
- جدید فارسی کے اسلوب بیان اور مروجہ الفاظ کا کافی ذخیرہ بہم پہنچا دیا گیا ہے۔
- مستعمل الفاظ کے اضداد، حکایتیں، کہانیاں، خطوط اور ضرب الامثال غرضیکہ کتاب ہر طرح مکمل ہے۔ اردو سے فارسی لغات کا مختصر سا مجموعہ بھی شامل ہے۔

ضخامت ۲۴۸ صفحات۔

قیمت فی جلد
ایک روپیہ بارہ آنہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز کشمیری بازار لاہور

پریکٹیکل انگلش ٹرانسلیشن

حصہ اوّل ۶ر دوم ۸ر سوم ۸ر

طلباء مڈل کے لئے انگریزی ترجمہ کا بہترین سلسلہ سلیبس اور ضروریات طلباء کے عین مطابق۔ زبان آسان اور طریقۂ تعلیم تدریجی ہے۔ اسباق بلحاظ گرامر اس طرح دلچسپ انداز میں ترتیب دئے گئے ہیں۔ کہ طلباء کی طبیعت اُچاٹ نہیں ہوتی۔ کتابیں اغلاط سے پاک ہیں۔ کاغذ، طباعت عمدہ ہے ان کو رائج کرکے آپ اپنے ذوق کی تکمیل فرمایئے

مفید تاریخ ہند

اوّل ۱۲ر دوم ۱۲ر

مفید تاریخی کہانیاں

اوّل ۱۲ر دوم ۱۲ر

محکمہ تعلیم کے جدید سلیبس کے مطابق پاکستان کے بچوں کی تعلیمی ضروریات کے مطابق کہانیوں کے دو مجموعے اور دو کتابیں مڈل کے لئے تاریخ کی۔ جو جدید سکیم کے مطابق نئے سرے سے ترتیب دی گئی ہیں۔ اُمید ہے۔ آپ اس کوشش کو پسند فرما کر ان کتابوں کو رائج فرمائیں گے۔

اِسباق الاملا

(اوّل) پرائمری کے لئے ۶ر

(دوم) مڈل کے لئے ۸ر

اصلاح تلفظ۔ املا اور زباندانی۔

املا جیسا ضروری مضمون ادراس سے بے اعتنائی! ان کتابوں کی اشاعت کے بعد آپ کا گلہ کہ املا پر عمدہ کتابیں نہیں ہیں۔ بےجا ہوگا۔ ان ہر دو کتابوں میں ہر قسم کے الفاظ کا ذخیرہ فراہم کرکے قواعد ضروریہ کے تحت خاص اسلوب سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر اس سے اچھی کتابیں آپ کو نہ ملیں گی۔

قرآنی اخلاق

مصنفہ

پروفیسر عبدالصمد صارم

"میں تکمیلِ اخلاق کے لئے بھیجا گیا ہوں"۔ (محمدؐ)

دُنیا میں کروڑوں چلتے پھرتے انسانی ڈھانچے ہیں لیکن انسانیت، اونچے کردار اور اعلےٰ اوصاف کی حامل ہے۔ انسان کہلانے کا شرف حاصل کرنے کے لئے "قرآنی اخلاق" کا مطالعہ کیجئے۔ خود پڑھئے۔ دوستوں کو پڑھایئے۔ بچوں کو پڑھایئے

فاضل مصنف نے قرآن کریم کی اُن آیات کو جنمیں اخلاق وکردار کے متعلق احکام ہیں ۴۸ عنوانات کے تحت ترتیب دے کر یہ اعلےٰ کتاب مرتب فرمائی ہے۔ آپ اِس کو اپنے سکول میں بطور نصاب دینیات مڈل وہائی کلاسز میں رائج فرماکر طالب علموں کو صحیح اخلاق کا نمونہ بنایئے۔

قیمت ایک روپیہ چار آنہ

قوانین عربی ۱۲ر

مڈل کے لئے عربی کی بہترین گرامر

- مڈل کلاسز کے لئے جدید ترین سلیبس کے مطابق عربی قواعد کی کتاب۔
- جدید طریقہ تعلیم کے مطابق دروس الصرف و دروس النحو کو ترتیب دیا گیا ہے۔
- گردانیں چارٹوں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں۔

منتخباتِ اُردو

اوّل ۱۲ر دوم ۱۲ر

مرتبہ: ظفر اقبال ایم۔اے۔بی۔ٹی۔پی۔ای۔ایس

منتخباتِ اُردو جے۔وی اور ایس۔وی کلاسز کے لئے تیار کرایا گیا ہے۔ اس میں قدیم و جدید اُردو ادب کا انتخاب نہایت صحیح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نارمل سکولوں کے علاوہ لائبریریوں کے لئے ایک گرانقدر تحفہ ہے۔ آپ یقیناً اِن کو پڑھ کر اُردو ادب کے سارے دَور سے واقف ہو جائیں گے۔

ماڈرن پرشین گرامر ۸ر

محکمہ تعلیم کی جدید سکیم کے مطابق نئے انداز میں فارسی قواعد کی مکمل کتاب۔ مڈل کے سلیبس کو کما حقہٗ پورا کرتی ہے۔

اُردو خط وکتابت (جدید) ۱ر

پرائمری جماعت کے لئے نہایت آسان زبان میں خطوط نویسی کے طریق و آداب کے متعلق اچھوتی کتاب۔ ۴۴ صفحات میں ایک بڑا ذخیرہ۔ کاغذ و طباعت عمدہ۔

ہماری خوشخطی کاپی

اوّل ۳ر دوم ۳ر سوم ۳ر چہارم ۳ر

خوشخطی کی یہ کاپیاں نہایت اعلیٰ جملوں، مشکل الفاظ اور دلچسپ اندازِ بیان کی حامل ہیں۔ اِن کو ملاحظہ فرما کر آپ پسند نہ فرمائیں۔ تو ہمارا ذمہ۔ آج ہی طلب فرمائیں۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ایجوکیشنل پبلشرز کشمیری بازار لاہور

مارچ ۱۹۵۰ء

اصطلاحات نمبر

- رموز — ادارہ
- اصطلاحات کا مسئلہ — سیلکہ
- اصطلاحی غور و فکر (دفتری اصطلاحات)
- محکمۂ تعلیم کے سرکاری اعلانات

مدیر

بشیر ہاشمی

معاونین

سلیم فارانی   عبدالغفور چودھری

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس، ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

ناشر

کتاب منزل

لاہور

قیمت فی پرچہ دس آنے

مارچ سنہ ۱۹۵۰ء
جلد ۲
شمارہ ۱۲

سالانہ چندہ
پاکستان کے لئے ۶ روپے
غیر ممالک کیلئے ۸ روپے

رموز

اُردو کو پاکستان کی قومی و ملکی زبان قرار دیا گیا ہے، منتہائے نظریہ ہے کہ دفتری، معاشری اور تعلیمی کام اسی کے ذریعے انجام پائیں لیکن اس مقصد بیداری کی راہ میں سب سے بڑی دِقّت اصطلاحوں کا مسئلہ ہے۔ اب تک دفتری اور تعلیمی کام انگریزی زبان کے ذریعے چلتے رہے ہیں اور اربابِ دفتر و تعلیم اسی کے عادی ہو چکے ہیں۔ جب تک ان کی مروّجہ انگریزی اصطلاحوں کی جگہ اُردو اصطلاحیں وضع نہیں کی جائیں گی۔ دفاتر و تعلیم کا کام بذریعہ اُردو رواں ہونا دُشوار ہے۔ چنانچہ اس دِقّت کو رفع کرنے کی کوششیں مختلف طور پر ہو رہی ہیں، اور آموزش بھی حتی الوسع مصروفِ سعی و اجتہاد ہے۔

اس شمارے میں پروفیسر سلیم فارانی صاحب کا ایک وقیع و فکر انگیز مضمون بعنوان "اصطلاحات کا مسئلہ" شائع ہو رہا ہے۔ اس میں وضع اصطلاحات کے طور طریق پر قابل قدر بحث کی گئی ہے۔ اور اصطلاح سازی کے متعلق بڑی کام کی باتیں پیش کی گئی ہیں۔

آموزش میں اب تک جن اصطلاحات کا ترجمہ شائع ہوتا رہا ہے وہ کم و بیش وہی تھیں جن کے متعلق ادارہ سے وقتاً فوقتاً استفسارات ہوتے رہے ہیں، اس شمارے سے یہ اہتمام کیا جا رہا ہے کہ مختلف علوم و فنون اور محکموں کی اصطلاحات باقاعدہ و بالترتیب شائع کی جائیں۔ چنانچہ اس نمبر میں اہم دفتری اصطلاحات بیک جا پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ ہم کوئی حرفِ آخر پیش کر رہے ہیں۔ حاشا و کلا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اُردو میں دفتری کام رواں کرنے کی راہ میں جو اصطلاحی دِقّتیں تاخیر کا باعث بن رہی ہیں، انہیں دُور کرنے کے لئے ہم اپنی وسعت کے مطابق اعانت کریں۔ اصطلاحیں استعمال ہی سے منجھ منجھ کر جلا پاتی اور معیار کو پہنچتی ہیں، حسب ضرورت ان میں ترمیم و اصلاح ہوتی رہے گی۔

آموزش نے وضع اصطلاحات کے لئے جو اصول مدِنظر رکھے ہیں۔ درج ذیل ہیں :۔

وضع اصطلاحات کے لئے مجوزہ اصول :

(۱) اصطلاح جہاں تک ممکن ہو' واضح اور سہل ہونی چاہیئے ۔

(۲) جن اصطلاحوں کے لئے پہلے اردو میں الفاظ مروّج ہیں' انہیں قائم رکھا جائے' بدلا نہ جائے۔ تاوقتیکہ معنوی تحقیق اس تغیر پر مجبور نہ کرے ۔

(۳) جو انگریزی اصطلاحیں عام فہم اور عام مستعمل ہیں اور جن کے لئے اُردو میں پہلے الفاظ موجود نہیں ۔انہیں جوں کا توں یا ہلکے سے تصرف کے ساتھ اپنالیا جائے ۔

(۴) جامع و مختصر اصطلاح وضع کی جائے ۔ اور اس اختصار کی خاطر جیسا کہ انگریزی میں یونانی' لاطینی اور فرانسیسی الفاظ ہیں'۔اسی طرح اُردو میں عربی و فارسی الفاظ سے احتراز نہیں ہونا چاہیئے۔ ہاں البتہ بہت ثقیل الفاظ سے تاحدِ امکان احتراز ضروری ہے ۔

(۵) عربی یا فارسی زبان میں انگریزی اصطلاحوں کیلئے جو الفاظ پہلے مروّج ہیں اُن سے جہاں تک ممکن ہو استفادہ کیا جائے۔

(۶) عربی و فارسی زبانوں سے نئی اصطلاح وضع کرتے وقت مندرجہ ذیل چیزیں ملحوظ رکھی جائیں۔ تاکہ غلطی سے احتراز ہو : (۱) لفظ کی لغت۔ (۲) لفظ کی ترکیب۔ (۳) محاورہ۔

(۷) جدید عربی و فارسی میں انگریزی اصطلاحوں کو جہاں معرب و مفرس کیا گیا ہے۔انہیں قائم رکھنے میں مختلف فوائد ہوں گے :۔ (۱) عربی و فارسی ممالک سے مشترک اصطلاح ہوگی۔
(۲) انگریزی اصطلاح سے بھی اجنبیت نہیں ہوگی ۔

(۸) مختلف علوم و فنون میں عربی میں مدت سے جو اصطلاحیں مروّج چلی آتی ہیں۔ انہیں قائم رکھا جائے ۔ ان کی صورت کو بدلا نہ جائے۔

(۹) بہتر ہوگا کہ علوم و فنون کی اصطلاحیں تمام اسلامی ممالک میں مشترک سی ہوں ' تاکہ اسلامی دنیا میں فنی و علمی اتحاد قائم ہو ۔اس کے لئے اگر ان اسلامی ممالک کی جدید وضع اصطلاحوں کو پیشِ نظر رکھا جائے ۔ تو بہت مفید ہوگا ۔

اصطلاحات کا مسئلہ

سلیم فارانی

انسان نے تہذیب و تمدن کے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے جس چیز میں اپنی ترقی زیادہ نمایاں طور پر دکھائی وہ اظہار ما فی الضمیر اور تبادلہ خیالات کا طریق ہے۔ ابتدائی بشر شائد اعضائی حرکات و اشارات سے کام لیتا تھا۔ اور اس سلسلے میں اسے بے حد کد و کاوش اور دِقت اُٹھانا پڑتی تھی؛ اور ممکن ہے کہ اس کا ما فی الضمیر بھی صحیح طور پر ادا نہ ہوتا ہو' ادائے مطالب کے اس ابتدائی طریق میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ جس سے طبیعت اکثر ملول ہو جاتی۔ بعد میں مختلف آوازوں سے کام لیا جانے لگا؛ اور ایک مختصر سی آواز مختلف اعضائی حرکات و اشارات کی قائم مقامی کرنے لگی۔ ارتقا کی راہ میں اس تھوڑے سے اقدام نے بشر کا بوجھ ہلکا کر دیا اور کد و کاوش اور دِقت جو اس کے لئے ملال افروز تھی' کچھ خفیف ہوئی' اظہار میں ذرا کم وقت خرچ ہونے لگا۔ اس کے بعد جب وہ کچھ قدم اور آگے بڑھا' تو الفاظ رونما ہوئے۔ الفاظ مختلف قسم کی آوازوں اور اعضائی اشاروں کے قائم مقام تھے۔ ایک لفظ نے ملال افروز مشقت کو کافی حد تک سہولت میں بدل دیا' بہت سا وقت بچنے لگا۔ بعد ازاں الفاظ جڑنے لگے۔ لیکن تہذیب و تمدن کی راہ ارتقا میں وہ منزل آئی کہ جب [illegible] مفہوم کو ایک ایک لفظ میں ادا کرنے کی ضرورت ہونے لگی۔ گویا اظہار خیال [illegible]

جیسر آنے لگیں۔ آگے قدم بڑھا تو علوم و فنون کے حقائق و تفاصیل رموز کی صورت میں ایک ایک لفظ کے اندر سمٹ سمٹ کر آنے لگیں۔ اور اصطلاحیں ظاہر ہونے لگیں۔ بشر متمدن و مہذب ہو کر مختصر الفاظ میں معلومات کی تفصیل طلب کا تانا تیں سمٹنے لگا۔ اس قسم کی مسلسل مشق نے بشر کا حافظہ بھی تیز و قوی کر دیا۔ اور علوم و فنون اس میں آرام پانے لگے ———— یہ ہے اس طویل داستان کا اختصار جو ارتقائے زبان و تہذیب کے جدید محقق ہمیں سناتے ہیں۔

اس داستان سے جو نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ درج ذیل ہیں :۔

(۱) الفاظ و اصطلاحات کی کثرت اعلیٰ تہذیب و تمدن، وسیع معلومات، قوی حافظہ، اور ارتقائے علوم و فنون کی علامت ہے۔

(۲) تہذیب و تمدن کی ترقی زبان کی نشو و نما کے آئینے میں ظاہر ہوتی ہے۔

(۳) اپنی زبان میں اصطلاحات و الفاظ کا اضافہ کرنے والا تہذیب کی راہ میں ترقی کا قدم اُٹھاتا ہے۔

(۴) کم الفاظ اور معدودے چند اصطلاحات پس ماندگی، غیر مہذبیت، محدود معلومات، کمزور حافظے اور عدم ارتقائے علوم پر دال ہیں۔

اس بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس قوم کی زبان میں الفاظ و اصطلاحات کی جس قدر کثرت ہے۔ وہ قوم تہذیب و تمدن، معلومات، عقلی نشو و نما اور علوم و فنون کے لحاظ سے اسی قدر آگے بڑھی ہوئی ہے (یہاں یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ مستعار اصطلاحات و الفاظ سے تہذیب و تمدن، معلومات، عقلی نشو و نما اور علوم و فنون بھی مستعار نظر آتے ہیں۔ اور مستعار چیز پر قوم کا فخر و ناز بے معنی ہے۔ کسی قوم کی زبان میں مستعار الفاظ کی بھرمار اس کی اپنی زبان کی نا اہلیت گرسنگی اور کم مائگی کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے)

معلوم ہؤا کہ مہذب و متمدن قوم کی زبان میں اصطلاحات کی وسیع اور روز افزوں مقدار کی موجودگی اس کی شائستگی کی ترقی کے لئے ضروری ہے اور اس توسیع سے روکنا یا کوتاہی کرنا تہذیب و تمدن

کی دوڑ میں پیچھے رہنا اور قدیم وحشت و بربریت کی طرف مائل ہونا ہے۔

اصطلاحات کے مسئلہ کو واضح طور پر سمجھنے کی خاطر ضروری ہے۔ کہ اصطلاح کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔

اصطلاح کی ماہیت و اہمیت:

اصطلاح اس مفرد لفظ یا مرکب کو کہتے ہیں۔ جو ایسے علمی مطالب کے ادا کرنے کے لئے وضع کیا جاتا ہے۔ جن کو پورے طور پر بیان کرنے کے لئے لمبی عبارتیں یا لمبے جملے کہنے یا لکھنے پڑتے ہیں۔ گویا یہ ایک چھوٹا سا لفظ ہوتا ہے جو بہت سے الفاظ میں بیان کردہ مفہوم کا قائم مقام ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک اشارہ ہے۔ جس سے بہت سے خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔

اصطلاحوں کے بہت سے فائدے ہیں:۔

(۱) علمی مطالب کو ادا کرنے میں بے معنی طول سے انسان بچ جاتا ہے۔

(۲) لمبے لمبے جملے کہنے اور لکھنے نہیں پڑتے۔

(۳) جہاں کسی علمی بحث میں ایک ہی مفہوم کی طرف بار بار حوالہ آتا ہے۔ تو طویل عبارتوں کے تکرار کی کوفت نہیں ہوتی۔

(۴) وقت ضائع نہیں ہوتا۔ بلکہ تھوڑے سے وقت میں اصطلاحوں کی مدد سے بہت سے معلومات بہم پہنچائے جاتے ہیں۔

(۵) لکھنے اور پڑھنے والے طول خاطر نہیں ہوتے۔

(۶) کاغذ کا صرفہ نہیں ہوتا۔

(۷) ادراک مفہوم اور حافظے میں ترقی ہوتی ہے۔

علوم و فنون کی تعلیم "تشریح" توسیع اور ترقی کے لئے اصطلاحات کا وجود ناگزیر ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اصطلاحات علوم و فنون کا محور ہیں۔ اور جو قوم علوم و فنون" معلومات" اور

عمل پیرا ہو کر ترقی کی راہوں پر گامزن ہونا چاہتی ہے۔ تو اسے اپنے علمی و فنی و مختلف اصطلاحات میں پیش قدمی کرتے چلے جانا چاہیئے تاکہ ایک طرف اس کی اپنی زبان وسیع ہوتی چلی جائے۔ اور دوسری طرف اس کی ثقافت ترقی پذیر ہو سکے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ کسی قوم کے تہذیبی ارتقا کا آئینہ اس کی زبان ہوتی ہے۔ اور اس زبان کی وسعت سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کہ قوم کس قدر ترقی یافتہ ہے؟ زبان کی وسعت کا مدار اس بات پر ہے کہ وہ کہاں تک تمام قسم کے خیالات کا صحیح طور پر اظہار اور علوم و فنون کی باتوں کو واضح و جامع طور پر بیان کر سکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا دار و مدار الفاظ و اصطلاحات پر ہے۔ الفاظ و اصطلاحات کافی نہ ہوں تو علمی باتوں کا اظہار و بیان محدود و تنگ ہوتا ہے۔ اور یہ اس امر کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ قوم علم و فن کی راہ میں زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے۔

اُردو زبان میں ابتدا ہی سے علمی و فنی اصطلاحات سازی کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ہر زمانے میں محسنینِ اُردو کی عنایات سے اس کے اندر بے شمار اصطلاحوں کا اضافہ ہوتا چلا آیا۔ جس سے زبان کو یہ ترقی و وسعت نصیب ہوئی کہ گذشتہ صدی میں ہی یہ زبان تمام قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے قابل ہو گئی۔ مگر ابھی اس میں جدید مغربی علوم و فنون کی اصطلاحوں کی کمی تھی۔ اور انگریزی زبان کا تعلیم و دفاتر پر غلبہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے چنداں احتیاج بھی پیدا نہیں کر رہا تھا۔ لیکن جب برِ صغیر پاک و ہند غلامی کے پنجے سے نجات حاصل کرنے کے لئے بیسویں صدی کی ابتدا میں بپا یا نہ کوششوں میں مصروف ہوا۔ اور تعلیمی معاملات میں قومی زبان کو ذریعہ بنانے کی اشد ضرورت محسوس ہونے لگی تو اس طرف بھی توجہ ہونے لگی۔ اگرچہ قومی زبان کے متعلق متعصبانہ جھگڑوں نے صحیح طور پر کام کرنے کی سہولتیں کم دیں لیکن کچھ نہ کچھ خاموشی سے ہوتا رہا۔ مختلف طور پر انفرادی کوششیں جاری رہیں۔ لیکن باقاعدگی سے اصطلاح سازی کا کام دکن میں شروع ہوا، جہاں ہر قسم کی تعلیم اُردو زبان میں دینے کا اہتمام کیا گیا تھا، اور اُردو میں مختلف جدید علوم و فنون کی کتابوں کی ضرورت تھی۔

دکنی کوشش اگرچہ بہت گرانقدر اور مفید تھی، لیکن ایک مختصر سے علاقے میں علمی کتابوں کے ترجموں تک محدود تھی اور جدید علوم و فنون کی پہنائیاں وسیع تر تھیں اور ان میں روزانہ نئے اضافے ہو رہے تھے۔ تاہم جو کچھ ہوا ہر طرح قابلِ احترام تھا۔ وحید الدین سلیم نے اصطلاح سازی کے گُر بتائے لیکن ان میں یہ احتیاط مدِ نظر رکھی کہ کسی طرح اس برِ عظیم کی دو بڑی قومیں مطمئن رہیں اور اس مشترک اطمینان کی خاطر عربی ترکیب کی اصطلاحات وضع کرنے کو ناپسند قرار دیا۔ لیکن جس قوم کی خاطر یہ کیا گیا وہ معاند قوم ہر طرح اُردو کو نیست کرنے کے درپے تھی، اور اس کی بجائے ہندی نما سنسکرت کو ملکی زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کے لئے تن من دھن لگا رہی تھی، ہندی نما سنسکرت کا رواج تو کیا ہو سکتا، ان کی اصلی غرض و غایت اُردو کو جو حقیقتاً دونوں قوموں کی مشترک زبان تھی، اس غلط پروپاگنڈے کی بنا پر مٹانا تھا کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ لیکن قدرت سب پر غالب ہے۔ اسے یہ منظور نہ تھا اور اس نے وامتازوا الیوم کا نقارہ بجا کر برِ عظیم کو دو بڑے حصوں میں منقسم کر دیا۔ اور اُردو کو قوم و سلطنت بخش دی۔

پاکستان کے قیام سے اُردو پاکستان کی ملکی زبان بنی، اور آزاد فضا میں یہ ضرورت پیدا ہوئی کہ ملک کے تمام کام قومی زبان میں سرانجام ہوں، تمام شعبے اور کاروبار اسی زبان کی وساطت سے چلیں، لیکن واضح ہے کہ یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دفتری اور علمی و فنی اصطلاحات اُردو زبان میں وضع نہ ہوں، نظام ملکی کے تمام شعبے انگریزی زبان کی وساطت سے چلتے رہے ہیں۔ اور تمام شعبوں کے ارباب و اہل کار انگریزی اظہار کے عادی ہو چکے ہیں۔ جب تک مناسب اُردو اصطلاحات مروّجہ انگریزی اصطلاحات کی جگہ نہیں لیں گی، ملکی زبان میں ملکی نظام چلانے کا اقدام ناممکن ہے۔ جب تک تمام علوم و فنون کی اصطلاحیں اُردو میں نہیں ڈھلیں گی اور ان علوم و فنون کی کتابیں اُردو اصطلاحوں کے ساتھ اُردو میں شائع نہیں ہوں گی، تعلیمی شعبہ صحیح طور پر اُردو میں کام نہیں چلا سکے گا۔ اسی طرح انجینئری، جہاز رانی، ہوا بازی، نشریات، طب، قانون وغیرہ کے شعبے اُردو اصطلاحیں

وضع ہونے کے بغیر ملکی زبان سے نہیں چل سکیں گے! اصطلاح سازی کے کام کو سنجیدگی، متانت اور سرعت کے ساتھ سرانجام دینے کی ضرورت جتنی اب ہے پہلے نہ تھی، چنانچہ حکومت بھی متوجہ ہے، ادارے بھی اور ارباب ذوق بھی، کوششوں اور تدابیر کا جوش ہر طرف ہے، مگر اس جوش کی حقیقت انعقاد مجالس یا نشستند و گفتند و برخاستند تک ہے اس سے مزید کچھ نہیں؛ پاکستان کے قیام کو تین سال ہو چلے لیکن اس سلسلے میں ابھی تک نتیجہ کچھ برآمد نہیں ہوا۔ کوئی مسلمہ فہرست اصطلاحات کسی شعبے کے سلسلے میں شائع نہیں ہوئی، اصطلاح سازی کا مسئلہ بھی یو این او کا مسئلہ کشمیر ہو چلا ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ ایک نہیں کئی اسباب ہیں۔

سب سے پہلا سبب تو وہ عشق ہے جو غلامانہ دور میں انگریزی کے جمالی چکا چوند کے دل و دماغ پر چھا جانے سے پیدا ہوا اور جس کے ساحرانہ سحر کے متوالے آزادانہ دور میں بھی کچھ اس طرح کے دل باختہ ہیں کہ حقیقتاً ان کے لئے انگریزی سے فراق ناقابل برداشت ہے۔ انہیں مرغوب خاطر نہیں کہ دل و دماغ کی محکومی دور ہو، چنانچہ مختلف انداز سے بھیس بدل بدل کر یہ جذبہ نمودار ہوتا ہے، کبھی آواز بلند ہوتی ہے کہ ہم انگریزی چھوڑ نہیں سکتے ہمیں مغرب کے محسنوں سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ کبھی تحریک ہوتی ہے کہ سائنسی علوم و فنون کی تعلیم میں ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اگر انگریزی کو چھوڑ بیٹھے، کبھی پُر زور دلیل سے بحث کی جاتی ہے کہ سائنسی علوم و فنون میں تازہ ترین مغربی تحقیقات سے ہم مستفید نہیں ہو سکیں گے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ انگریزی کے بغیر ریسرچ ناممکن ہے، کبھی وثوق سے چلایا جاتا ہے کہ انگریزی بین اقوامی زبان ہے، بین اقوامی تعلقات کی اہمیت کی بنا پر ہمیں اسے لازماً اپنے ساتھ رکھنا چاہیئے ——— حقیقت بین نگہ بھانپ سکتی ہے کہ ان سب چیزوں کا منبع ایک ہی ہے۔ انگریزی کا غلامانہ عشق۔ اور یہ سب اُردو کو رواج دینے کے خلاف بہانے ہیں۔ ذرا ان کا جائزہ لیجئے۔ مان لیا کہ ہمیں مغرب کے محسنوں سے

بہت کچھ سیکھنا ہے! تو کیا یہ استفادہ انگریزی کی ہی وساطت سے ہو سکتا ہے۔ اور اس استفادہ میں ہر کہ و مہ کے لئے انگریزی کا ہی دامن پکڑنا کہاں تک حق بجانب ہے؟ کیا وہ فوائد اپنی زبان میں ڈھال کر اپنی قوم کے افراد تک نہیں پہنچائے جا سکتے؟ اور کیا اس کے لئے فقط ایک دارالترجمہ مغرب و مشرق کے درمیان کڑی ثابت نہیں ہو سکتا؟ ڈیڑھ دو سو سال میں ہماری قوم کے کتنے افراد انگریزی لازمی طور پر پڑھ پڑھ کر مغرب سے کیا کچھ سیکھ سکے؟ جو اب قوم کے تمام افراد پر اس زبان کی تعلیم لازمی طور پر برقرار رکھنے کی قیود قائم رکھی جائیں؟ سائنسی علوم میں کتنوں نے مستفید ہو ہو کر کوئی ایجاد کر دکھائی اور انگریزی کی بنا پر ہی' بین اقوامی نہ سہی' اپنے ملک میں ہی کوئی تحقیقاتی شہرت حاصل کی؟ کتنے ہیں کہ جو علوم و فنون کے حقیقی معراج پر پہنچے؟ تقریر و تحریر میں مدح سرائی تو اکثر کی ہوتی ہے لیکن ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ انگریزی سائنس دان ریسرچ سکالر سے تو بجلی کے کارخانے کا ایک معمولی تجربہ کار کاریگر بھی ہزار درجے اچھا ہے جو بگڑی ہوئی مشین کو درست تو کر سکتا ہے۔ اور ہمارا ریسرچ سکالر ؎

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

آسمان کی باتیں تو آپ اس سے سن لیجے' سائنس کی اہمیت پر انگریزی میں گفتگو کرا لیجے۔ مغربی سائنس دانوں کے قصیدے پڑھوا لیجے۔ لیکن اس سے ایجاد کی توقع کرنے کی گستاخی نہ کیجے۔ ابھی تک انگریزی تعلیمی ذریعہ کی حیثیت سے مدارس سے ہٹائی تو نہیں گئی لیکن کوئی بتائے کہ انگریزی ہی کی وساطت سے ہمارے سائنس کے اعلیٰ ترین ماہروں میں سے کتنے ہیں جو ایٹمی قوت کے حقائقِ تخلیق سے عملی طور پر آشنا ہیں۔ اور اپنی قوم کی خاطر کچھ اس سے بچاؤ کی تدابیر سوچنے میں محوِ کار ہیں؟ ایٹمی قوت کی تباہ کاریوں سے تو آج انگریزی سے ناآشنا افراد بھی ترجموں کی برکت سے بہت حد تک آشنا ہیں۔ عملی ایجادات و تحقیقات کے لئے انگریزی لازمہ ہے' تو اب تک اس سلسلے میں کوئی کارنامہ یہاں کیوں ظاہر نہیں ہوا؟

بھلا زبان کے ساتھ کارناموں کی وابستگی ہے؟ نہیں، تحقیقات و ایجادات کا انحصار دماغی غلامی پر نہیں، بلکہ دماغی آزادی پر ہے۔ اس کا تعلق سمجھ سے ہے زبان سے نہیں۔ انگریزی کی وساطت سے جو تاریخی معلومات ڈیڑھ سو سالوں میں ہمارے دل و دماغ میں ٹھونسے گئے اور راسخ عقائد کی صورت اختیار کر گئے، کہاں تک حقائق پر مبنی تھے؟ حقائق پر سے پردے ہٹانے میں محققین کو انگریزی نے کہاں تک مدد دی؟ علوم و فنون سے استفادہ ضروری اور لازمی چیز ہے، لیکن باقی چیزوں کی طرح اس چیز میں بھی انگریزوں کے طرزِ عمل کی کیوں پیروی نہیں کی جاتی؟ انگریزوں نے تمام زبانوں کے علوم و فنون سے استفادہ کیا لیکن ان زبانوں کی تعلیم اپنی قوم کے تمام افراد پر لازمی کر کے نہیں بلکہ ان علوم و فنون کے معلومات کو اپنی زبان میں ڈھال ڈھال کر۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی زبان کو وسعت نصیب ہوئی۔ اُردو میں تمام علوم و فنون ڈھل جائیں تو یہ بھی انگریزی کی طرح بے نیاز زبان ہو جائے۔ اسی بے نیازی کی حد تک اپنی زبان کو پہنچانا قوم و ملک کے لئے باعثِ فخر ہے۔ لیکن اِس حد تک زبان کب پہنچے گی؟ اسی وقت جب کہ غیر زبان سے بے نیاز ہو کر اپنی زبان کی وسعت کے لئے سامان کیا جائے گا۔ انگریزی چلتی رہی تو پھر اپنی زبان میں علوم و فنون ڈھل چکے۔ دوسری زبان کے تازہ ترین معلومات بہم پہنچانے کا کام ایک مرکزی دارالترجمہ سرانجام دے سکتا ہے اور اس دارالترجمہ کے لئے خصوصی قابلیت کے حضرات مفید ہو سکتے ہیں۔ جو اپنے فن یا مضمون میں ماہر ہوں اور انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہوں، ظاہر ہے کہ یہ ہر ایک فرد کے بس کا روگ نہیں اور نہ ہر ایک فرد اس دارالترجمہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ چیز خاص صلاحیتوں والے افراد تک محدود ہونی چاہیئے۔ انگریزی اختیاری یا انتخابی زبان کی حیثیت سے نصابِ تعلیم میں شامل رہنی چاہیئے۔ نہ کہ لازمی زبان اور ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے، بین الاقوامی تعلقات کے نظم و نسق میں بھی ہر فرد کو دخل نہیں۔ اس کا انحصار بھی مخصوص صلاحیتوں کے افراد پر ہے، بین الاقوامی زبان کی اہمیت اُن مخصوص افراد ہی کے لئے

لازمی ہونی چاہیئے۔ نہ کہ سب کے لئے۔ قوموں کی آزادی ان کی اپنی زبان کے ساتھ بہت حد تک وابستہ ہوتی ہے۔ سب سے بڑی آزادی ذہنی آزادی ہے۔ اور ذہنی آزادی قومی زبان کے اختیار سے آتی ہے۔ کوئی ہزار بہانے کرے، اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اُردو زبان غلامانہ کس مپرسی کے دور میں انگریزی کے تسلط کی بنا پر انگریزی کے غلام عشاق کے نزدیک قطعی طور پر وقار کھو چکی ہے، اس کو حقارت سے دیکھنے کے عادی حضرات کی نگاہوں میں یہ زبان اب بھی کچھ بیچ نہیں رہی۔ وہ اسے جدید علوم وفنون کی اصطلاحات کا متحمل ہی نہیں گردانتے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبان اتنی پس ماندہ اور بے صلاحیت ہے کہ جدید معلومات و ایجادات کے تذکرے کے لئے اس کے پاس مناسب الفاظ نہ موجود ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ نیز انہیں اُردو میں اپنی شان کم تر ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں اُردو زبان سے ناواقفیت کی بنا پر ہیں۔ اُردو کا واقف اُردو کی شان کا منکر نہیں ہو سکتا۔

تیسرا سبب جو خطرناک رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے یہ ہے کہ اصطلاح سازی پر مامور ذمہ دار اصطلاح سازی سے قاصر ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے علم وفن میں تو سند یافتہ ماہر مشہور ہیں لیکن اُردو زبان اور اُردو میں اصطلاح سازی کے فن سے نابلد ہیں۔ اور انہیں اُردو دان اصطلاح سازی کے فن کے ماہرین کی امداد سے ہتک عزت تا قصر شان کا احساس ہوتا ہے۔ بھلا یہ کہاں مناسب ہے کہ فن کے سند یافتہ ماہر تو وہ ہوں اور ان کے فن کی اصطلاح سازی کا سہرا ایک حقیر اُردو دان کے سر ہو۔ کوئی ایسی صورت ہونی چاہیئے کہ اصطلاح سازی میں بھی انہی کی ناموری ہو۔ اس سلسلے میں کچھ اس طرح تعصب کا مظاہرہ ہو رہا ہے کہ جیسے ان کے علم وفن کی انگریزی اصطلاحیں انہی سند یافتہ ماہرین کی ذاتی جاگیر بن چکی ہیں۔ جن کا حق تالیف و ترجمہ انہیں کے حق میں محفوظ ہے۔ چونکہ یہ خود اصطلاح سازی سے

قاصر ہیں۔ اس لئے یہ اس اعلان کی آڑ لیتے ہیں کہ اُردو میں اصطلاحات کا ترجمہ صحیح نہیں ہو سکتا یا یہ کہ انگریزی اصطلاحات ہی اُردو میں قائم رکھنی چاہئیں۔ پہلے اعلان میں تو اُن کے قاصر ہونے کی دلیل ہے۔ دوسرے میں وہ قومی زبان کی اس توسیع پر ضرب کاری لگانا چاہتے ہیں۔ جو قومی تہذیب و ثقافت کے ارتقا کے لئے ضروری ہے۔

بعض ماہرین علم و فن اُردو زبان میں بھی ماہر ہیں۔ لیکن وہ اصطلاح سازی کے صحیح اصول نہ جانتے ہوئے اصطلاحوں کو کچھ اس طرح بنا رہے ہیں کہ وہ یا تو سرے سے غلط ہی ہیں یا مبہم ہیں۔ اُردو دان ماہرین علم و فن ہمارے لئے اس وقت بہت غنیمت ہیں۔ لیکن وہ صحیح اور مفید کام اسی وقت کر سکتے ہیں۔ جب وہ اصطلاح سازی کے اصول مدِنظر رکھیں۔ ان کے لئے ان اصولوں کی واقفیت ضروری ہے۔ ورنہ ان کی بے اصول کوششیں قومی زبان کی تحقیر کا باعث ہوں گی۔

ان تمام اسباب کے پسِ پردہ اُردو کی مخالفت کی جھلکیاں ہیں۔ اور اُردو حق بجانب ہو گی۔ جو کہہ اُٹھے کہ ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ٭ کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

بعض ارباب ذوق جو اُردو کے متوالے ہیں اور جذبۂ قومی کے ماتحت اس زبان کی خدمت پر کمر بستہ ہیں، اصطلاح سازی میں انفرادی کوششیں کر رہے ہیں۔ چند ایک کے ماسوا اکثر کی کوششوں میں مندرجہ ذیل اہم نقص ہیں:۔

(۱) ابہام و اشکال زیادہ ہیں۔

(۲) صحیح ترجمے نہیں۔

(۳) مرکب اصطلاحوں کی ترکیبیں صحیح نہیں۔

(۴) الفاظ کی صورت بھی درست نہیں۔

(۵) اصطلاح سازی کا کوئی اصول مدِنظر نہیں رکھا گیا۔

ایسی اصطلاحات قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتیں، بلکہ ان کا رواج شاید مضحکہ خیز ثابت ہو۔

بہرحال اصطلاح سازی کا معاملہ جو قوم و ملک کی آزادی و خوشحالی کی خاطر بہت جلد طے ہونا چاہیئے تھا۔ اور ہو سکتا تھا۔ تا صرار اربابِ فن، بے نیاز مجالس اور بے اصول اصحابِ کار کی نذر ہو کر مندرجہ اسباب کے پیشِ نظر ایک عقدۂ لاینحل بن کر رہ گیا ہے۔ اگر کچھ ہوا ہے تو وہ یہ کہ انگریزی میں عقیدت بڑھانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اور ملکی زبان میں نہ دفاتر چالو ہو سکے ہیں نہ علوم و فنون کی اصطلاحات ڈھالی جا سکی ہیں کہ قومی تعلیم کا کام رواں ہو۔

قومی آزادی کا استقلال مطلوب ہے اور آزاد اذہان کی تربیت مقصود ہے تو اصطلاحات کے مسئلے کو جلد سلجھانا چاہیئے۔ اور اس کے سلجھانے کی ایک صورت یہی ہے کہ مندرجہ بالا اسباب جو اس کام کی راہ میں حائل ہیں دُور کئے جائیں یعنی

(۱) مخلصانہ کوششیں کی جائیں۔

(۲) کام ان کے سپرد کیا جائے جو اہل ہوں اور انتہائی محنت و کاوش سے کام لے کر اسے جلد نپٹا سکیں۔

(۳) کام اصول کے مطابق ہو۔

مخلصانہ کوشش تو یہی ہے کہ اُردو کو جب آزاد پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جا چکا ہے۔ تو پھر اب آزاد ملک کے اصولِ عمل کے مطابق اسے دفتری اور تعلیمی زبان بنا دینا چاہیئے۔ اور انگریزی کو اس منصب سے ہٹا کر تعلیمی نصاب میں اس طالبِ علم کے اختیار پر چھوڑ دینا چاہیئے جسے اس کا عشق ہو۔ دفتری اور تعلیمی زبان بنا دینے پر اسبابِ متعلقین خود بخود اپنے استقلالِ منصب کی خاطر اُردو میں کام چلانے پر کوشاں ہوں گے۔ اور کام چلانے سے ہی معلوم ہوگا۔ ان کے لئے معیاری دفتری اور تعلیمی اصطلاحات بہم پہنچا دی جائیں۔

ہر علم و فن کی اصطلاح سازی کا کام ایسی مجالس کے سپرد کیا جائے۔ جن کے ارکان مندرجہ ذیل ہوں:۔

(۱) علم یا فن کے کم از کم دو ماہر خصوصی۔

(۲) السنۂ شرقیہ کا ماہر۔

(۳) ماہر اصطلاح ساز یا اصطلاح سازی کا اصول دان۔

علم یا فن کے ماہر خصوصی اصطلاحوں کی مکمل فہرست مہیا کریں۔ اور اس کے ساتھ حسب ضرورت اصطلاح کے صحیح مفہوم سے تعارف کرانے میں مجلس کو امداد دیں۔ السنۂ شرقیہ کا ماہر مناسب الفاظ و تراکیب بہم پہنچائے اور ماہر فن اصطلاح سازی یا اصطلاح سازی کا قانون دان ترکیب و اصطلاح کی صحت کا جائزہ لے۔ جہاں کہیں ارباب علم و فن خود السنۂ شرقیہ کے بھی ماہر ہوں۔ اور اصطلاح سازی کے اصولوں سے بھی آشنا ہوں وہاں نمبر۲ اور نمبر۳ کی چنداں ضرورت نہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

ان مجالس پر فرض عائد کیا جائے کہ ایک مختصر سی مدت کے اندر اندر اپنی فہرست مرتب کر کے پیش کریں۔ یہ فہرست پھر اعلیٰ محتسبوں کے سامنے پیش ہو یا مزید ارباب فن کو اس کی نقلیں بھجوا کر مقررہ مدت کے اندر ان پر تنقید و تبصرہ طلب کیا جائے۔ اور پھر جلد ہی ان تنقیدوں کے زیر اثر نظر ثانی کرا کے شائع کرا دیا جائے۔ اگرچہ یہ شائع شدہ فہرست قطعی و آخری نہیں ہوگی۔ تاہم کام چلانے کے لئے مفید ہوگی۔ رفتہ رفتہ کام میں استعمال ہو ہو کر اصطلاحیں منجھیں گی۔ اور ان کی حسب ضرورت اصلاح ہوتی جائے گی۔ تا آنکہ مستقل ہو جائیں۔ اشاعت فہرست کے مرحلے تک پانچ چھ ماہ سے زیادہ صرف نہیں ہونے چاہئیں۔

دفتری اصطلاحیں کوئی تین چار سَو سے زیادہ نہیں ہو سکتیں۔ اور اسی طرح مختلف علوم و فنون میں سے ہر علم یا ہر فن کی اصطلاحوں کی تعداد بھی چند سینکڑے ہوگی۔ اس کام پر زیادہ مدت صرف نہیں ہونی چاہیئے۔

اصطلاح سازی کے سلسلے میں سب سے اہم چیز اصطلاح سازی کے بنیادی اصول اور طریقے ہیں۔ جن پر کاربند ہونا نہایت ضروری ہے۔ بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اصطلاح جہاں تک ممکن ہو، واضح، سہل، سریع الفہم، جامع، مختصر اور خوبصورت وضع کی جائے۔

(۲) اُردو زبان کی نوعیت کو حتی الوسع قائم رکھنے کی کوشش کی جائے۔

(۳) عملی مادے اور الفاظ حسب ضرورت ان زبانوں سے لئے جائیں جو تشکیل اُردو میں بطور عنصر شامل ہیں۔

(۴) اسلاف کی یادگار اصطلاحوں کو قائم رکھا جائے۔

(۵) علوم و فنون کی جو اصطلاحیں اُردو میں مدت سے مروج ہیں انہیں بدلا نہ جائے تاوقتیکہ معنوی تحقیق اس تغیر پر مجبور نہ کرے۔

(۶) اسلامی دُنیا کے علمی و فنی اتحاد کے پیش نظر عربی و فارسی میں علوم و فنون کی جدید مروجہ اصطلاحات کو موزونیت کی حد تک اپنایا جائے۔

(۷) جو انگریزی اصطلاحیں عام فہم اور عوام کی زبان پر رائج ہیں۔ اور جن کے لئے اُردو میں پہلے الفاظ موجود نہیں، انہیں جوں کا توں یا ہلکے سے تصرف کے ساتھ اپنا لیا جائے۔

(۸) انگریزی اصطلاحوں کی ساخت، معنی اور ماخذ کے لحاظ سے پوری تحقیق کر لی جائے، ان کی نوعیتیں سمجھ لی جائیں اور پھر اسی تحقیق کی روشنی میں انہیں اُردو میں اصطلاح سازی کے طریقوں کے مطابق ڈھالا جائے۔

اصطلاح واضح ہونی ضروری ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اصطلاح سے مفہوم کے صحیح پہلو نمایاں ہونے چاہئیں۔ یہ نہ ہو کہ اصطلاح کا لفظ تو کسی اور چیز کی دلالت کرے اور مفہوم کچھ مراد ہو۔ اصطلاح کا سہل ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ثقیل اصطلاحوں کے الفاظ زبان پر آسانی سے رواں نہیں ہو سکیں گے۔ اور ان کے یاد کرنے میں تکلیف یا نفرت ہوگی۔ ثقیل الفاظ سے اصطلاح بھی گراں ہو

ہے۔ ہاں جہاں ثقیل الفاظ کے بغیر چارہ نہ ہو تو وہاں ان کے اختیار کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اصطلاح واضح و سہل ہونے کے علاوہ سریع الفہم بھی ہونی چاہیئے۔ یعنی الفاظ مشکل اور مبہم نہ ہوں۔ ورنہ اصلی مفہوم کی طرف ذہن کے منتقل ہونے میں دقتیں حائل ہوں گی۔ اصطلاح جامع بھی ہونی چاہیئے' یعنی اس کے مفہوم سے اس سے متعلقہ کوئی چیز اس سے خارج نہ ہو بعض اصطلاحیں بہت لمبی اختراع کی جاتی ہیں۔ یہ اچھی چیز نہیں ہے۔ اصطلاح ہر ممکن حد تک مختصر ہونی چاہیئے۔ اوّل ایک ہی لفظ ہو' جہاں ایک لفظ سے کام نہ چل سکے تو دو لفظ اختیار کیے جائیں دو لفظوں سے آگے بھی بصورت مجبوری بڑھنا چاہیئے۔ یہ بھی خیال رکھا جائے کہ اصطلاح خوبصورت بنے' بھونڈی اور عیب دار نہ ہو۔

اصطلاح سازی میں سب سے زیادہ جس چیز کی کوشش مطلوب ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُردو زبان کی نوعیت کو قائم رکھا جائے۔ محققین السنہ نے دنیا کی زبانوں کے تین بڑے خاندان بتائے ہیں آریائی' سامی' حامی' ان میں ہر ایک کی بیشمار شاخیں ہیں۔ آریائی خاندان دو بڑی جماعتوں میں منقسم ہے مشرقی اور مغربی۔ پھر یہ جماعتیں چار چار شعبوں میں منقسم ہیں۔ مشرقی کے چار شعبے انڈو ایرانین' اناٹولک' تھریسو الیرین اور بالٹوسلیوک ہیں۔ مغربی جماعت کے چار شعبے ہیلینک' اٹیلک' کلٹک اور ٹیوٹانک ہیں۔ اور انہی کے شعبوں میں یونانی' لاطینی' اطالوی' فرانسیسی' اندلسی' پرتگالی' جرمن اور انگریزی زبانیں آتی ہیں۔ آریائی زبان کے مشرقی انڈو ایرانین شعبے کے آگے دو بڑے مجموعے ہیں۔ انڈین اور ایرانین۔ ایرانین میں پشتو' فارسی' پہلوی اور زند زبانیں آتی ہیں۔ انڈین میں سنسکرت' پالی' پراکرت اور دیگر تمام برعظیم پاک و ہند کی زبانیں آتی ہیں۔ جن میں اُردو شامل ہے۔ چنانچہ اس شجرہ نسب سے پتہ چل سکتا ہے کہ اُردو کس اصل کی زبان ہے۔ اور اس کا رشتہ کن کن زبانوں سے ہے؟

اس اصل کو مدِ نظر رکھنے کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے۔ کہ اس زبان کی ترکیب و نشوونما میں کون سی زبانوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور اس میں کن زبانوں کے الفاظ زیادہ ہیں جو اس

کا جزو لاینفک ہو چکے ہیں، کیونکہ زبان کی اصل د مواد تو قواعدی لحاظ سے موثر ہوتی ہے لیکن اس
دبی وعلمی معیار کی حیثیت سے وہ تمام عناصر اہم ہوتے ہیں جو اس کی اس حیثیت کی ترکیب و تشکیل
عث ہوتے ہیں۔ اُردو کی اصل ہندی ہونے کے باعث اس میں ہندی الفاظ کا بکثرت موجود ہونا
منع ہے۔ ان کے علاوہ زیادہ تر الفاظ عربی اور فارسی ہیں۔ فرہنگ آصفیہ کے مصنف نے
۵۴۰۰۹ الفاظ درج کئے ہیں۔ جن میں برِعظیم پاک وہند کی مختلف زبانوں کے الفاظ
۲۱۶۱ بتائے ہیں۔ عربی کے ۷۵۸۴ فارسی کے ۶۰۴۱ سنسکرت کے ۵۵۴
یزی کے ۵۰۰ اور باقی مختلف زبانوں کے (جن میں ترکی، عبرانی، سریانی، یونانی،
گالی، لاطینی، فرانسیسی، ہسپانوی وغیرہ زبانیں شامل ہیں) کل ۱۸۱۔ ان مختلف زبانوں
ں ترکی کے الفاظ سب سے زیادہ بتائے ہیں۔ گویا اُردو میں اس کی اصل کے لحاظ سے
لفاظ آئے ہیں۔ ان کے علاوہ سب سے زیادہ عربی الفاظ اور پھر فارسی الفاظ شامل
ں۔ انگریزی کے الفاظ تو سنسکرتی الفاظ سے بھی کم ہیں۔ چنانچہ اُردو زبان کی ترکیب
اصل ظاہر کرتی ہے کہ اصطلاح سازی میں اس کی نوعیت کو برقرار رکھنے کے لئے
ندرجہ ذیل اصول مدِنظر رکھے جائیں :-

(۱) چونکہ یہ زبان آریائی ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو۔ اصلاح کی ترکیب و توضیح آریائی زبانوں کے اصول کے مطابق ہو یعنی جس قوانین کے مطابق اس زبان میں الفاظ وضع ہوتے چلے آئے ہیں۔ اسی طرح وضع کئے جائیں۔

(۲) دوسری زبانوں سے الفاظ لیتے وقت سب سے زیادہ اور سب سے پہلے عربی و فارسی کے الفاظ لئے جائیں۔ اس کے بعد انگریزی اور وہ بہت ہی کم یعنی عربی و فارسی الفاظ کے مقابلے میں تقریباً پچاس اور ایک کی نسبت سے گویا پچاس عربی الفاظ لئے جائیں۔ تو کہیں ایک لفظ انگریزی کا آئے۔

اصطلاحی الفاظ وضع کرنے کے لئے مادوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اُردو اصطلاحوں

کا خاص خیال رکھا جائے کہ اُردو زبان کے علاوہ جن زبانوں سے لفظ لئے جا رہے ہیں جو اس زبان کے خاص عنصر ترکیبی ہیں۔ یعنی عربی اور فارسی' تاکہ اصطلاحوں کی تشکیل اُردو کے لئے اجنبی نہ ہو۔ لیکن اس سلسلے میں یہ احتیاط کی جائے کہ ہر قسم کے لفظی لاحقے نہ لگائے جائیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے اسلاف نے علوم و فنون کی جو اصطلاحات پہلے وضع کی ہیں خواہ وہ عربی ہیں یا فارسی' لیکن اس زبان میں مروّج رہی ہیں۔ اور ان علوم و فنون کی درسی درسگاہوں میں انہی اصطلاحوں کے ذریعے دی جاتی رہی ہے مثلاً طب' ریاضی' منطق' فلسفہ اور اخلاقیات وغیرہ' ان اصطلاحات کو قائم رکھا جائے۔ کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کی یادگاریں ہیں۔ اور انہیں مٹانا نامناسب ہے۔

اسی طرح بعض اصطلاحیں پہلے اُردو میں مدت سے مروّج ہیں۔ انہیں بھی قائم رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ عوام کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ اور ان کے مفاہیم تک ذہن کے منتقل ہونے کی عادت سی ہو چکی ہے' انہیں نہ بدلا جائے۔ ہاں البتہ اگر معنوی تحقیق اس پر عائل ہو۔ کہ وہ اصطلاح کے جدید مفہوم کے لئے موزوں نہیں بلکہ ابہام اور غلطی پیدا کرتی ہے۔ تو پھر اسے بدلنے میں تامل نہ کیا جائے۔ لیکن اس بدلنے میں بھی احتیاط کی جائے۔ کہ کہیں نیا لفظ پہلے لفظ سے بھی زیادہ مبہم اور مشکل نہ ہو۔

پاکستان کی سیاسی' ملکی اور علمی بہتری کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا اسلامی دنیا سے سیاسی اور علمی وفنی اتحاد ہو۔ علمی وفنی اتحاد کے لئے اصطلاحات بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ اگر عربی و فارسی کی وہ مشترک اصطلاحیں جو اسلامی دنیا میں رائج ہیں۔ بعینہٖ یا ہلکے سے تصرف کے ساتھ اُردو میں اپنا لی جائیں۔ تو اسلامی دنیا کے علمی اتحاد کا مقصد جلد حاصل ہوگا۔ مفرد اصطلاحوں میں تو الفاظ بعینہٖ لینے میں کوئی دقت نہ ہوگی البتہ مرکب اصطلاحوں میں الفاظ وہی رہ کر ترکیبی صورت میں اُردو کے مطابق تصرف کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس تصرف کی اشد ضرورت ہو۔

بعض انگریزی اصطلاحیں بھی اپنائی جا سکتی ہیں لیکن ایسے سلسلے میں احتیاط کی ضرورت ہے کہ یہ کام اس حد تک ہو جس حد تک اُردو کی نوعیت کو برقرار رکھنے میں مشکل نہ لگے۔ انگریزی اصطلاحیں بہت کم اُردو میں آنی چاہئیں۔ اور ان میں سے بھی وہی اپنائی جائیں۔ جو عام فہم اور عوام کی زبان پر اس طرح رائج ہو چکی ہیں۔ کہ ان میں اجنبیت نظر نہیں آتی اور ان کے لئے اُردو میں پہلے الفاظ موجود نہیں۔ ایسی اصطلاحوں کو جوں کا توں بھی لیا جا سکتا ہے۔ اور ہلکے سے تصرف کے ساتھ بھی اپنایا جا سکتا ہے۔

انگریزی اصطلاحوں کو اُردو میں منتقل کرنے سے پیشتر انگریزی اصطلاحوں کی ساخت، ان کے معانی اور مآخذ کی پوری تحقیق کر لینی چاہیئے۔ ان کی نوعیتیں سمجھ لینی چاہئیں۔ کیونکہ اس طرح اُردو میں صحیح مفہوم اصطلاح ادا کرنے کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈنے میں دقت نہ ہوگی۔ بلکہ مناسب اور موزوں الفاظ ہی ڈھونڈے جا سکیں گے۔

انگریزی اصطلاحوں کی نوعیتیں مختلف ہیں۔

(۱) بعض تو سیدھے سادے الفاظ ہیں۔ جن کا آسانی سے لغوی ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ اور وہی لغوی ترجمہ کا لفظ ہی اُردو میں کام آ سکتا ہے۔ کیونکہ اسی سے اصطلاح کا صحیح مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

(۲) بعض الفاظ تو پیچیدہ ہیں۔ لیکن ان کے اشتقاق کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس اشتقاق کے مادے کے مطابق اُردو میں مادہ لے کر لفظ بنایا جا سکتا ہے۔

(۳) بعض ایسی اصطلاحیں ہیں۔ جن کا اشتقاق ہی مشکوک ہے۔ ایسی اصطلاحوں کے کے سلسلے میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان میں یا تو کچھ تصرف کر لیا جائے۔ یا اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو انہیں اس وقت تک ویسا ہی اپنا لیا جائے۔ جب تک کہ ان کے اشتقاق کا صحیح علم نہیں ہو جاتا۔

(۴) بعض اصطلاحیں ایسی ہیں جو چیزوں کے [illegible]

رکھی گئی ہیں۔ ان میں ایسا تصرف کرنا چاہیئے۔ کہ موجد یا دریافت کنندہ کے نام کو ٹھیس نہ لگے۔ اور وہ نام ہر طرح قائم رہے۔ موجد یا دریافت کنندہ کا احسان اس قابل ہے۔ کہ اس کی تشہیر ہو اور زبان کے ماتھے پر احسان فراموشی کا داغ نہ لگے۔

(۵) بعض اصطلاحیں اشیاء کے ایسے نام ہیں جو ہندی یا عربی یا فارسی سے انگریزی میں منتقل ہوئے تھے۔ اور انگریزی میں ان کی شکل بدل دی گئی۔ ان کے لئے جدید الفاظ ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ ایسی اصطلاحوں کو اپنی پہلی عربی یا فارسی یا ہندی صورت کی طرف لوٹایا جائے۔ اور ان کی مسخ شدہ شکل کو اصل حالت میں قائم کیا جائے۔

(۶) بعض اصطلاحیں ایسی ہیں جو روم و یونان و دیگر ممالک کی خرافیات (میتھالوجی) یا دیوتاؤں کے قصوں کہانیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ انگریزی کے تتبع میں ان اصطلاحوں کو ہو بہو یا تصرف کے ساتھ اُردو میں منتقل کرنا نقصان دہ ہوگا۔ کیونکہ ان خرافیات اور دیوتاؤں کے قصوں کہانیوں سے ہمارے ملک کے افراد ناواقف ہیں۔ ایسی اصطلاحیں ان خرافیاتی یا افسانوی ممالک میں تو موزوں ہیں لیکن یہاں مطلقاً موزوں نہیں۔ ان اصطلاحوں کے سلسلے میں بہتر طریق یہ ہے۔ کہ جن چیزوں کے متعلق وہ اصطلاحیں ہیں۔ اُن کی ماہیت اور ان کے خواص معلوم کئے جائیں۔ اور اس ماہیت و خواص کے مطابق ان کے لئے نام یا اصطلاحیں تجویز کی جائیں۔

(۷) بعض اصطلاحیں ایسی ہیں جو معنوی حیثیت سے اس چیز کی غلط خاصیت ظاہر کرتی ہیں جس کے لئے وہ وضع کی گئی ہیں یعنی چیز کچھ خواص رکھتی ہے اور اس کے نام یا متعلقہ اصطلاح سے کچھ اور خواص ظاہر ہوتے ہیں۔ جو اس چیز میں نہیں پائے جاتے۔ ایسی اصطلاحوں کا لفظی ترجمہ بھی درست نہیں ہوگا۔ ان اصطلاحوں کے سلسلے

میں بھی بہتر اقدام یہی ہوگا۔ کہ غلط اصطلاح کو ترک کر دیا جائے ۔اور صحیح خاصیت
کے مطابق نئی اصطلاح وضع کی جائے۔ کیونکہ اصطلاح کا مقصد یہ ہے۔ کہ صحیح
مفہوم کو کافی حد تک واضح کر دے۔

(۸) اصطلاحی لفظوں میں یہ ضروری نہیں۔ کہ مکمل طور پر مفہوم پر حاوی ہوں، اصطلاحی لفظ
کے کئی معانی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اصطلاح کے لحاظ سے معنی کی ایک جھلک ہوتی ہے۔
جو لفظ کے اصطلاح بن جانے پر زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہی جھلک ہی اصطلاح
کے لئے کافی ہے۔ انگریزی میں بعض اصطلاحیں ایسی بھی آتی ہیں۔ جن کے الفاظ
میں اصطلاحی مفہوم کی جھلک نمایاں طور پر نہیں ہوتی ' ایسے الفاظ کا لغوی ترجمہ مفید
نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے لئے اُردو میں ایسے الفاظ وضع کرنے چاہیئں۔ جن میں ان
اصطلاحوں کے صحیح مفہوم کی جھلک نمایاں ہو۔

ان بنیادی اصولوں اور انگریزی اصطلاحوں کے سلسلے میں احتیاطوں کے ذہن نشین
کرنے کے بعد نئی اصطلاحوں کے وضع کرنے کے صحیح طریقے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اصطلاحیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ مفرد اور مرکب' اور یہ فعلی ہوتی ہیں یا اسمی' ہر ایک کے
بنانے کے طریقے جُدا جُدا ہیں۔ نئی اصطلاحوں کے وضع کرنے میں دو قسم کے اقدام کئے جاتے ہیں۔
ایک لفظ اخذ کرنا دوسرا تشکیل اصطلاح۔ لفظ اخذ کرنے میں مندرجہ ذیل چیزوں مدِ نظر رکھی
جاتی ہیں:۔

(۱) انگریزی اصطلاح کا صحیح لغوی معنی کیا ہے۔ اور اس معنی کے لحاظ سے اُردو میں
کون سا لفظ ہے۔

(۲) اُردو میں اگر اس کے لئے کوئی لفظ موجود نہیں۔ تو پھر عربی یا فارسی میں اس کے لئے
کون سا لفظ موجود ہے۔

(۳) اصطلاح کے لغوی معنی اور صحیح مفہوم میں کچھ فرق تو نہیں۔ نہیں تو لغوی معنی والا لفظ

ہی مناسب ہوگا۔ اور اگر فرق ہے تو پھر صحیح مفہوم کو ادا کرنے والا لفظ سے تلاش کیا جائے۔ اُردو میں عدم موجودگی کی صورت میں عربی یا فارسی سے ڈھونڈا جائے۔

(۴) یہ بھی دیکھ لیا جائے۔ کہ جو لفظ لیا جا رہا ہے۔ وہ ان زبانوں میں عام مستعمل اور رائج ہے یا نہیں۔ عام مستعمل اور رائج لفظ کو ترجیح دی جائے۔ ورنہ شاذ استعمال والے لفظ سے دِقّتیں پیدا ہوں گی۔

(۵) اصطلاح کے لئے اُردو میں اگر پہلے کوئی لفظ موجود ہے۔ اور وہ صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ تو اُسے ترجیح دی جائے۔

(۶) انگریزی اصطلاح کا مادہ معلوم کرکے اس مادے کے مطابق اُردو یا عربی یا فارسی مادہ ڈھونڈا جائے۔

لفظ یا مادہ اخذ کر لینے کے بعد دوسرا اقدام اس لفظ یا مادے کو مناسب اصطلاحی تشکیل دینا ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں:-

(۱) لفظ کو اصطلاح کا نیا معنی دیا جائے۔ اور اس میں مناسب تصرف کر لیا جائے۔

(۲) مادے کو سابقوں (Pre-fixes) اور لاحقوں (Suffixes) کے ذریعے اصطلاحاً تشکیل دیا جائے۔

انگریزی میں بہت سے الفاظ و اصطلاحات مادے پر سابقے اور لاحقے زیادہ کرنے سے بنے ہیں۔ مادے کے مقابلے میں اُردو یا عربی یا فارسی مادہ ڈھونڈھ لینے کے بعد اُردو زبان کے مستعمل سابقوں یا لاحقوں میں سے مناسب سابقہ یا لاحقہ اس مادے پر ایزاد کیا جائے۔ اُردو میں بے شمار سابقے اس قسم کی امداد دے سکتے ہیں۔ مثلاً اَ (اَچھوتا، اکارت وغیرہ)، از (ازبس، از سرِ نو وغیرہ)، اَن (اَن پڑھ، اَن گنت وغیرہ)، با (باقاعدہ، باوفا وغیرہ)، باز (بازپرس وغیرہ)، بر (برخلاف، برطرف وغیرہ)، بے (بے بس، بے تحاشا وغیرہ)،

پا (پابند، پامال وغیرہ)، پر (پردیس وغیرہ)، پُر (پُرزور وغیرہ)، پس (پس پا، پس ماندہ وغیرہ)، پن (پنسیری وغیرہ)، پنج (پنجگانہ وغیرہ)، پیش (پیش خدمت، پیش خیمہ وغیرہ)، تِ (تپائی وغیرہ)، تہ (تہ خانہ وغیرہ)، چو (چوکس، چوکنا وغیرہ)، خر (خرمگس وغیرہ)، خُرد (خُردبین، خُردسال وغیرہ)، خود (خودغرض وغیرہ)، خوش (خوش حال، خوش الحان وغیرہ)، زبر (زبردست وغیرہ)، زیر (زیردست وغیرہ)، زود (زودرنج، زودفہم وغیرہ)، سَس (سپوت وغیرہ)، سر (سرسبز، سرگراں وغیرہ)، شاہ (شاہباز، شہتوت وغیرہ)، صاحب (صاحب دل وغیرہ)، غیر (غیرموزوں، غیرآباد وغیرہ)، لا (لادوا، لاوارث وغیرہ)، میر (میرمجلس، میرمحلہ وغیرہ)، نا (ناآشنا، ناامید وغیرہ)، نیم (نیم حکیم، نیم گرم وغیرہ)، ہر (ہرکارہ، ہرجائی وغیرہ)، ہم (ہم پیالہ، ہم جنس وغیرہ)، ہمہ (ہمہ دان، ہمہ گیر وغیرہ)، یک (یک رنگ، یک لخت وغیرہ) اور اسی قسم کے اور سابقے۔

اِسی طرح بے شمار لاحقے مثلاً ا (جھوٹا، سچا وغیرہ)، آباد (جلال آباد وغیرہ)، اپ (ملاپ وغیرہ)، اپا (رنڈاپا وغیرہ)، اپن (اکیلاپن وغیرہ)، ات (باغات، بیگمات وغیرہ)، اٹا (سناٹا وغیرہ)، آرا (معرکہ آرا، جلوہ آرا وغیرہ)، ارت (بھارت وغیرہ)، اری (بھکاری وغیرہ)، اڑی (کھلاڑی وغیرہ)، اس (پیاس وغیرہ)، اسا (دلاسا وغیرہ)، افروز (جلوہ افروز وغیرہ)، افزا (غم افزا وغیرہ)، افشاں (نورافشاں وغیرہ)، افگن (شیرافگن وغیرہ)، اک (خوراک، پوشاک وغیرہ)، اکا (لڑاکا وغیرہ)، آلود (خواب آلود وغیرہ)، انداز (نظرانداز، تیرانداز وغیرہ)، اندیش (خیراندیش وغیرہ)، اوٹ (لگاوٹ، بناوٹ وغیرہ)، آویز (دلآویز وغیرہ)، باز (دغاباز وغیرہ)، باش (خوش باش وغیرہ)، بان (میزبان وغیرہ)، بند (کمربند وغیرہ)، بیں (خُردبیں وغیرہ)، پرداز (کارپرداز وغیرہ)، پرست (بُت پرست وغیرہ)، پن (بچپن وغیرہ)، تراش (سنگتراش وغیرہ)، توڑ (سرتوڑ وغیرہ)، جو (بہانہ جو وغیرہ)، چہ (دیگچہ وغیرہ)، چی (مشعلچی وغیرہ)، خانہ (کارخانہ وغیرہ)، خوار (وظیفہ خوار وغیرہ)،

دار (آبدار، پہرے دار وغیرہ)، دان (قدردان وغیرہ)، دیدہ (ستم دیدہ، جہاں دیدہ وغیرہ)، سار (خاکسار وغیرہ)، ساز (نواساز وغیرہ)، ستان (گلستان وغیرہ)، ش (آزمائش، آسائش وغیرہ)، شناس (حق شناس وغیرہ)، فام (گلفام وغیرہ)، فروش (گلفروش وغیرہ)، فہم (کج فہم، تیز فہم وغیرہ)، کار (بیکار، دستکار وغیرہ)، کدہ (غم کدہ، میکدہ وغیرہ)، کش (دم کش، سرکش وغیرہ)، کن (کارکن وغیرہ)، گار (پرہیزگار، سازگار وغیرہ)، گاہ (بارگاہ، گذرگاہ وغیرہ)، گر (کاریگر وغیرہ)، گزار (شکرگزار وغیرہ)، گو (غزل گو وغیرہ)، گوں (نیلگوں وغیرہ)، گیر (ماہی گیر وغیرہ)، ل (گھائل وغیرہ)، مال (رومال، ریگ مال وغیرہ)، مند (غرض مند وغیرہ)، ن (جھاڑن وغیرہ)، نگار (افسانہ نگار وغیرہ)، نما (بدنما وغیرہ)، نواز (بندہ نواز وغیرہ)، نویس (عرضی نویس وغیرہ)، و (نکھٹو وغیرہ)، ور (طاقتور وغیرہ)، ہارا (لکڑہارا وغیرہ)، ی (پڑھائی وغیرہ)، یل (مریل وغیرہ) اور اس طرح کے دیگر لاتعداد لاحقے جو کتب لغت میں محفوظ و محصور ہیں (اور جن کے متعلق وحیدالدین سلیم نے اچھی خاصی فہرست مرتب کرکے بہم پہنچائی ہے)۔

یہ ضروری نہیں کہ سابقوں اور لاحقوں سے جو اصطلاح بنے اس میں انگریزی اصطلاح کے سابقے کے مقابلے میں اُردو سابقہ اور انگریزی لاحقے کے مقابلے میں اُردو لاحقہ مناسب ہو، کیونکہ بعض اوقات انگریزی میں سابقے کی بہترین ترجمانی اُردو میں بذریعہ لاحقہ ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات اس کے برعکس۔

مفرد اصطلاحیں وضع کرنے میں تو زیادہ دقت نہیں ہوتی، اس کے مقابلے کا لفظ اُردو یا عربی یا فارسی لے لیا، یا سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے مادے پر اضافہ کرنے سے مقصود حاصل ہوگیا۔ لیکن مرکب اصطلاحیں مفرد کی طرح نہیں۔ ان میں زیادہ دقت ہوتی ہے۔ چنانچہ مرکب اصطلاح وضع کرتے وقت تین چیزیں مد نظر رکھنی پڑتی ہیں۔

(۱) ترکیب کا طریق -

(۲) اجزائے ترکیبی کا باہمی تعلق -

(۳) ترکیب میں اجزا کا تغیر -

ترکیب کا طریق وہی مقصود ہے جو اُردو میں رائج رہا ہے۔ اُردو میں دو الفاظ کی ترکیب مختلف طور سے ہوتی رہی ہے -

دونو ہندی لفظ (مثلاً آگ بگولہ یا دیاسلائی وغیرہ)

دونو فارسی لفظ (مثلاً زبان دراز ، تنگ دست وغیرہ)

دونو عربی لفظ (مثلاً خیر مقدم ، تکیہ کلام وغیرہ)

ایک ہندی ایک فارسی (مثلاً نیک چلن ، سبزی منڈی وغیرہ)

ایک ہندی ایک عربی (مثلاً عجائب گھر ، پیسہ اخبار وغیرہ)

ایک فارسی ایک عربی (جیسے فضول خرچ ، دستخط وغیرہ)

ایک ترکی ایک فارسی (جیسے اُردو بازار وغیرہ)

ایک ہندی ایک ترکی (جیسے مونگ پلاؤ وغیرہ)

ایک انگریزی ایک ہندی (جیسے ریل گاڑی وغیرہ)

ایک انگریزی ایک فارسی (جیسے جیل خانہ وغیرہ)

اسی طرح اُردو میں مرکب اصطلاح وضع کرنے میں اسی قسم کی ترکیبی صورتوں کو مدِنظر رکھنا چاہیئے۔ ترکی اور انگریزی زبان کے الفاظ بہت کم لیکن ہندی ، فارسی اور عربی کے عام فہم اور عام مستعمل الفاظ مندرجہ بالا ترکیب سے استعمال کئے جا سکتے ہیں -

اجزائے ترکیبی کا باہمی تعلق قواعدِ زبان کے مختلف طریق سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا مختلف قسم کی ترکیبی صورتوں میں بہتر ہے کہ مندرجہ ذیل اصول مدِنظر رکھے جائیں :-

عربی قواعد کے لحاظ سے :

مرکب اضافی میں مضاف پہلے مضاف الیہ بعد میں جیسے دارالترجمہ۔

فارسی قواعد کے لحاظ سے :

(۱) مرکب اضافی میں مضاف پہلے مضاف الیہ بعد میں اور مضاف کے حرفِ آخر پر کسرۂ اضافی جیسے بزمِ سخن۔

(۲) مرکب اضافی میں مضاف پہلے مضاف الیہ بعد میں لیکن کسرۂ اضافی ندارد جیسے اہل کار۔

(۳) مرکب اضافی میں مضاف الیہ پہلے مضاف بعد میں اور کسرۂ اضافی ندارد جیسے شتر سوار۔

(۴) مرکب تشبیہی میں مشبہ بہ پہلے اور مشبہ بعد میں جیسے آہو چشم۔

(۵) مرکب توصیفی میں صفت پہلے اور موصوف بعد میں جیسے تنگ دست۔

(۶) مرکب توصیفی میں اسم بمعنی صفت پہلے اور موصوف بعد میں۔ جیسے فرعون مزاج۔

(۷) مرکب توصیفی میں موصوف پہلے صفت بعد میں اور کسرۂ توصیفی ندارد جیسے خونِ ناحق۔

اُردو قواعد کے لحاظ سے :

(۱) مضاف الیہ پہلے مضاف بعد میں اور دونوں کے درمیان علامت اضافت (کا کے کی) جیسے جیب کی گھڑی۔

(۲) مضاف الیہ پہلے مضاف بعد میں لیکن علامت اضافت ندارد۔ جیسے ڈاک گاڑی۔

(۳) صفت پہلے موصوف بعد میں جیسے سفید ٹوپی۔

(۴) مشبہ پہلے مشبہ بہ [illegible] جیسے

(۵) معطوف علیہ پہلے معطوف بعد میں لیکن علامت عطف ندارد جیسے گفتند۔
(۶) اسم پہلے امر بعد میں (اسم فاعل ترکیبی) جیسے منہ توڑ۔
(۷) اسم پہلے اور ماضی بعد میں (مفعول کے معنوں میں) جیسے آپ بیتی، جیب کترا، دل جلا۔
(۸) ماضی پہلے ماضی بعد میں جیسے پالا پڑنا، بھولا بھٹکا۔
(۹) اسم پہلے صفت حالیہ بعد میں جیسے خدا لگتی۔
(۱۰) صفت حالیہ پہلے صفت حالیہ بعد میں جیسے جیتی جاگتی۔
(۱۱) اسم پہلے حاصل مصدر بعد میں جیسے سر منڈائی۔
(۱۲) حاصل مصدر پہلے حاصل مصدر بعد میں جیسے اُدھیڑ بُن یا دوڑ دھوپ۔
(۱۳) اسم پہلے اسم فاعل واوی بعد میں جیسے کام چلاؤ۔

اُردو میں بعض مرکبات ایسے بھی بنتے ہیں کہ جن میں اجزائے ترکیبی کے اندر تغیر واقع ہوتا ہے۔ اور ان کی مندرجہ ذیل مختلف صورتیں ہیں:۔

(۱) پہلے لفظ کے ساتھ میم کا اضافہ جیسے ٹالم ٹول۔
(۲) بعض اوقات الف کا اضافہ جیسے رنگا رنگ۔
(۳) بعض اوقات درمیان میں یا جیسے ملیامیٹ۔
(۴) دوسرے جز کے ساکن حرف علت سے پہلے کے حروف حذف کر دینا اور پہلے جز کو دوسرے کے ساتھ ملا دینا جیسے گڑ اور تمباکو سے گڑاکو یا نیب اور گری سے بجوری وغیرہ۔
(۵) بعض جگہ دونوں جزوں کے کچھ حروف گر جاتے ہیں جیسے سرکہ + انجبین سے سکنجبین
(۶) بعض جگہ ایک جز کے حروف گر جاتے ہیں جیسے سچ اور جھوٹ سے [illegible]۔
(۷) پہلے جز کا آخری اور دوسرے کا پہلا حرف گر جاتا ہے جیسے [illegible]

جنگ + گاہ سے جنگاہ۔

(۸) پہلے جزو کا آخری اور دوسرے کا پہلا حرف ایک ہو۔ تو مشدد ہو جاتا ہے جیسے شب + بو سے شبّو۔

(۹) بعض اوقات حروف علت گر جاتے ہیں۔ جیسے پانی + چکی سے پن چکّی۔

اسی طرح اُردو قواعد کے تمام اصول ترکیب مدِنظر رکھ کر ان کے مطابق رکب اصطلاحیں وضع کی جا سکتی ہیں۔

بہرحال مقصود یہ ہے کہ صحیح علمی وفنی اصطلاحیں زبان اور ترکیب کے لحاظ سے ردو زبان کی نوعیت کے مطابق ڈھالی جائیں۔ اور اس سلسلے میں نہ تاخیر کی جائے۔ نہ ہلسنے سازی۔ قومی تعمیر کا کام جو بہت حد تک زبان کے رواج پر موقوف ہے۔ زیادہ دیر ے معطل نہ رکھا جائے۔ انگریزی کا عشق قومی تعمیر کے رستے میں روڑا ہے۔ اِسے بعجلت مکنہ ہٹا دیا جائے۔

اصطلاحی غور و فکر

دفتری اصطلاحات

1. Accepted for payment

قبول شدہ ادائی' تسلیم شدہ ادائی' بل منظور' بل قبول' ادائیگی کے لئے منظور' ادائیگی مقبول' اداپسند' ادائی مسلّم'

قبول شدہ ادائی اور تسلیم شدہ ادائی اصطلاح مذکور کا صحیح مفہوم ادا نہیں کرتے۔ اصطلاح کا مفہوم تو یہ ہے کہ کسی بل کو ادائیگی کے لئے قبول کر لیا گیا ہے۔ لیکن ابھی ادائیگی منظور نہیں ہوئی' اور چونکہ ابھی ادائیگی منظور نہیں ہوئی اس لئے "بل منظور" یا "ادائیگی کے لئے منظور" بھی موزوں نہیں۔ "بل قبول" اور "ادائیگی مقبول" بھی اصل مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ "اداپسند" تو غلط فہمی پیدا کرنے والی اصطلاح ہے۔ اور یہ عاشقانہ قبولیت کے لئے موزوں ہے۔ "ادائی مسلّم" کے مقابلے میں "ادائیگی تسلیم" بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں ادائیگی کے تسلیم کرنے کے معانی صحیح طور پر ادا ہو جاتے ہیں۔ اور بل کی منظوری یا ادائیگی کے لئے منظوری کا ابہام بھی پیدا نہیں ہوتا۔

2. Accord sanction

منظوری دینا' منظوری کی توثیق' منظوری کی تصدیق' جواز کی تصدیق' رخصت کی

تصدیق ' اجازت کی توثیق ' اختیار دینا ' فرض عائد کرنا ' رخصت کی اجازت دینا '

اصطلاح بالا کا صحیح مفہوم "منظوری دینا" ہی ہے۔ اور یہ منظوری کسی چیز کی ہو سکتی ہے۔ اصطلاح کے اندر خصوصیت نہیں۔ اس لئے رخصت کی تصدیق ' اجازت کی تصدیق ' جواز کی تصدیق وغیرہ صحیح نہیں۔ اسی طرح اختیار دینا ' فرض عائد کرنا یا رخصت کی اجازت دینا بھی اصل مفہوم سے دور ہیں۔ منظوری کی توثیق اور منظوری کی تصدیق میں تکلف ہے "منظوری دینا" یا "اجازت دینا" درست ہیں۔ لیکن اصطلاح بالا کے لئے صحیح ترجمہ "منظوری دی جائے" ہونا چاہیئے ۔

3. Account

آمد و خرچ ' حسابی تفصیل ' فرد حساب ' تفصیل ' چالو کھاتا ' کھاتہ ' گنتی ' شمار ' حساب '

ان میں سے "حساب" موزوں نظر آتا ہے اور اس کے بعد "حسابی تفصیل"۔ لیکن اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو "حسابی تفصیل" اچھا ہے۔ کیونکہ Account سے اصل مفہوم حساب کا تفصیلی اندراج ہی ہوتا ہے "حسابی تفصیل" سے بہتر "حساب کتاب" ہے۔ آسان بھی ہے اور عام فہم بھی ' اسے قائم رکھنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے ۔

4. Accountant

محرر ' حساب نویس ' جمع خرچ نویس ' محاسب '

ان تمام الفاظ میں سے محاسب اچھا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں "سیاہ نویس" بہتر ہے۔ اور عام مستعمل بھی ہے ۔

5. Acknowledgment

رسید ' قبولیت ' وصول یابی ' اقرار ' اقبال ' وصول یابی کی اطلاع ' معاوضہ ' صلہ '

قدر، اقبال اور معاوضہ یا صلہ اصطلاح بالا کا محدود مفہوم ادا کرتے ہیں۔ اور محل استعمال کے مطابق صحیح طور پر استعمال کئے جا سکتے ہیں لیکن جو مفہوم عام طور پر مراد لیا جاتا ہے اس کے لئے وصول یابی کی اطلاع قبولیت اور اقرار اچھے ہیں۔ لیکن قبولیت و اقرار سے ابہام پیدا ہو سکتا ہے" وصول یابی کی اطلاع" بحیثیت اصطلاح کچھ طویل سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض مقامات استعمال کے لحاظ سے یہی ترجمہ موزوں ہوگا۔ لیکن" رسید" جو آسان بھی ہے مفہوم بھی صحیح ادا کرتا ہے اور عام مستعمل بھی ہے ہر لحاظ سے بہتر ہے۔

6. Acquittance Roll

کھاتہ، ادائے قرضہ، کھاتہ بیباقی، فارغ خطی، فرد وصولی، فرد بھر پائی، قبض الوصول،

اس کے لئے" قبض الوصول" پہلے سے عام مروج ہے۔ اس لئے نیا لفظ وضع کرنے کی ضرورت نہیں۔

7. Additional

ذیلی، ثانی، زائد، اضافی، الحاقی، ضمنی، ضمیمی، فالتو، مزید، امدادی، معاون، یہ تمام الفاظ ایڈیشنل کے کسی نہ کسی پہلو کو بیان کرتے ہیں۔ اور محل استعمال کے لحاظ سے مختلف طور پر جائز ہوں گے۔ لیکن ان تمام میں جس لفظ سے ایڈیشنل کا مکمل مفہوم واضح طور پر ادا ہوتا ہے۔ وہ "زائد" ہے۔ اور قابل ترجیح ہے۔

Administrative approval

انتظامی منظوری، انتظامی پسندیدگی، عملی پسند، نظمی منظوری، اہتمامی تصدیق، عاملانہ تصدیق، ناظمانہ توثیق، منتظمانہ تصدیق، ناظمانہ اظہار پسندیدگی،

انتظامی منظوری کے علاوہ باقی سب مشکل بھی ہیں اور معنوی لحاظ سے غیر موزوں بھی۔ مثلاً عاملانہ توثیق، ناظمانہ اظہار پسندیدگی وغیرہ تو اصل اصطلاح کا مفہوم ادا نہیں کرتے بلکہ

ابہام سا پیدا کرتے ہیں۔ اور اصطلاح کے لئے مبہم ترجمہ درست نہیں۔ "انتظامی منظوری" اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی معنوی غلط فہمی کا امکان ہے، اس کے لئے بہتر "حکمانہ منظوری" ہے۔

9. After-date

مورخہ مابعد، بعداز تاریخ، غلط تاریخ، بعد از وقت،

ان میں سے "بعد از تاریخ" موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اگر سابقہ "پس" کا استعمال کیا جائے تو بہت اچھی اصطلاح پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی "پس مورخہ"۔

10. Allotment

نامزدگی، تقسیم، بانٹ، بٹوارا، تعیین، قسمت، تفویض،

یہ تمام الفاظ اصطلاح مذکور کا مفہوم ادا کرتے ہیں، لیکن ان سب میں نامزدگی یا تفویض زیادہ موزوں ہیں۔

11. Antidated

مورخہ ماقبل، مورخہ قبل از تاریخ، مورخہ قبل،

اصطلاح کا مفہوم یہ ہے، کہ اصل تاریخ اجرا سے پہلے کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ تاریخ کے لئے انگریزی مادہ date کے ساتھ ایک سابقہ Anti-(Prefix) لگا کر اس مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔ اُردو میں بھی اگر اسی طرح سابقے سے فائدہ اُٹھایا جائے اور اختراع کر لی جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ بلکہ اسی طرح کا طرزِ اختراع مفید پڑے گا۔ قبل سے اگر مخفف سابقہ "قب" بنا دیا جائے اور اسے مورخہ سے پہلے لگایا جائے تو Anti-dated کی طرح اُردو میں بھی "قب مورخہ" اصطلاح پیدا ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ غیر اختراع پسند طبائع پر یہ گراں گزرے، ان کی تسکین کے لئے مورخہ قبل یا مورخہ قبل از تاریخ میں سے کوئی اختیار کر لینا بہتر ہوگا۔

12. Appropriation of funds

تصرف سرمایہ، قبضہ سرمایہ، ملکیت سرمایہ، استعمال سرمایہ، تخصیص سرمایہ، سرمایہ ہتھیا لینا،

ملکیت، قبضہ، استعمال اور تخصیص صحیح مفہوم ادا نہیں کرتے، ان سب میں "تصرف سرمایہ" بہتر ہے۔ مختصر بھی ہے، آسان بھی اور مفہوم بھی صحیح طور پر ادا کرتا ہے۔

13. Approved

منظور، مسلّم، توثیق شدہ، موثق، مصدق، تصدیق شدہ، صادشدہ، تسلیم، ان سب میں سے منظور اور تسلیم قابلِ تسلیم ہیں۔ اور باقی کچھ ثقیل سے ہیں۔ لیکن محل استعمال کے لحاظ سے وہ بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کسی ایسی چیز کے متعلق بات کہی جا رہی ہو۔ کہ جس کو تسلیم کیا جا چکا ہے یا جس کی تصدیق ہو چکی ہے تو وہاں کہا جائیگا یہ چیز تسلیم شدہ یا تصدیق شدہ یا مصدق ہے۔ لیکن جب کسی ایسے دفتری کاغذ پر جو افسر کے سامنے بغرض Approval پیش ہُوا ہو۔ تو اس کے اوپر Approved کی جگہ منظور یا تسلیم لکھنا مناسب ہوگا۔ لیکن منظور چونکہ granted کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے بہتر ہے۔ کہ Approved کے لئے "تسلیم" ہی اختیار کیا جائے۔

14. Arrears claims

Arrears کے لئے چار لفظ عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں: بقایا، پس ماندہ رقم، وصول طلب قرضے اور مطالبات ادا شدنی۔ لیکن ان سب میں سے "بقایا" بہتر ہے۔ مختصر بھی ہے، صحیح بھی اور Arrears کے مفہوم پر حاوی بھی۔ Claims کے لئے حقوق، مطالبات، دعوے، طلبیاں، تقاضے، استغاثے وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اصطلاح مقصود کے لئے ان سب میں سے مطالبات ہی زیادہ موزوں ہے چنانچہ Arrears claims کے لئے "مطالبات بقایا" موزوں ترجمہ ہوگا۔

15. Assessment

تعیین، تشخیص، تقرر، تخمینہ، جرمانہ، ٹیکس، محصول، مالگذاری

Assess کا صحیح مفہوم تعیین کرنا ہے۔ خواہ جرمانے کی ہو یا محصول کی، مالگذاری کی یا کسی اور قسم کے ٹیکس کی۔ اور اس لحاظ سے Assessment کے لئے موزوں لفظ تعیین ہی ہے۔ لیکن چونکہ یہ تعیین تشخیص کے بعد ہوتی ہے۔ اس لئے بعض اوقات Assessment کا لفظ تشخیص کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ تعیین یا تشخیص کا لفظ بغیر حدود کے استعمال کرنے سے ابہام پیدا ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی عہدہ پر تقرر یا کسی مرض کی تحقیق کے لئے بھی بالترتیب تعیین اور تشخیص کے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ Assessment کے لئے ٹیکس کی نوعیت کے مطابق حد لگا دی جائے۔ یعنی فقط تعیین کہنے کے بجائے حسب ضرورت تعیین جرمانہ، تعیین ٹیکس، تعیین محصول وغیرہ کہا جائے۔

16. Audit

جانچ، تنقیح، تنقیح حساب، پڑتال، محاسبہ

مندرجہ بالا سارے ترجمے مفہوم کے لحاظ سے درست ہیں۔ اور تنقیح بہتر ہے۔ لیکن پڑتال چونکہ عام مستعمل ہے۔ اس لئے اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔

17. Audit note

فرد تنقیح، فرد محاسبہ، تنقیح نامہ

فرد تنقیح اچھا ہے۔ لیکن جب Audit کے لئے پڑتال کا لفظ استعمال کیا جا رہا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ اس کے لئے "فرد پڑتال" استعمال نہ کیا جائے۔ اور یہ اردو میں مروج ترکیبوں کے لحاظ سے صحیح بھی ہے۔ مفہوم بھی واضح طور پر ادا کرتا ہے۔

18. Audit objection

اعتراض تنقیح، اعتراض پڑتال، اعتراض محاسبہ، [illegible]

مفہوم ادا کرنے کے لحاظ سے پہلے تین درست ہیں۔ اعتراض نامہ عام ہے۔ اس کا تعلق یا پڑتال سے کوئی ظاہری تعلق نہیں۔ اس لئے اس سے ابہام پیدا ہوگا۔ لیکن Audit کے لئے تو پہلے "پڑتال" کا لفظ عام مستعمل ہے۔ اور جہاں پڑتال کنندہ جیسی اصطلاحیں عام استعمال میں آتی رہی ہیں۔ وہاں Audit objection کے لئے پڑتال اعتراض نامناسب نہیں۔

19. Balance

موازنہ ، فاضل ، باقی ، توازن ،

یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ترازو اور کانٹے کے معنوں میں (۲) توازن اور پاسنگ کے معنوں میں (۳) جہاں تک حسابات کا تعلق ہے باقی ، فاضلات اور بچت کے معنوں میں (۴) تناسب کے معنی میں۔

مقام استعمال کے لحاظ سے اس کی اصطلاحی صورت قائم ہونی چاہیئے۔

دفتری حسابات کے سلسلے میں اس کا مناسب اور موزوں ترجمہ "بقایا" یا "بچت" ہے فاضلات بھی درست ہے لیکن اس کی عربی ثقالت شائید ناگوار ہوگی۔ بقایا زیادہ اچھا ہے۔

20. Balance sheet

چٹھا ، واصل باقی ، روشن باقی ،

ان تمام میں سے "واصل باقی" زیادہ اچھا ہے۔ اور رائج بھی ہے۔

21. Budget

موازنہ ، میزانیہ ، بجٹ ، بجٹ کا اندازہ

ان سب میں سے "میزانیہ" ہی زیادہ موزوں ہے۔

22. Budget allotment

تقسیم میزانیہ ، تقسیم موازنہ ، موازنے کی حصہ بندی ، بانٹ ، تفویض موازنہ

[illegible] درست ہیں۔ لیکن تقسیم بہتر ہے۔ ان میں سے تقسیم میزانیہ

اچھا رہے گا۔

23. Budget estimate

تخمینی موازنہ، موازنہ کا تخمینہ، میزانی تخمینہ، میزانیاتی تخمینہ،

ان کے مقابل تخمینی میزانیہ بہتر رہے گا۔

24. Call tenders

ٹنڈر منگانا، چکوتیاں طلب کرنا، ٹنڈر طلب کرنا، ٹھیکہ داروں کا تخمینہ طلب کرنا، تخمینہ اخراجات طلب کرنا،

"تخمینہ اخراجات طلب کرنا" درست ہے، لیکن ٹنڈر کا لفظ چونکہ مختصر اور عام فہم اور عام مستعمل ہے۔ اس لئے اسے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس لئے "ٹنڈر منگانا" زیادہ موزوں ہوگا۔

25. Cash Books

نقدی کھاتہ، کتاب نقدی، نقدی کردی، رجسٹر نقدی، روکڑ بہی،

ان سب کے مقابلے میں "کھاتہ نقدی" زیادہ موزوں اور بہتر ہے۔

26. Cheque

چیک، ہُنڈی،

ہُنڈی عام مستعمل ہے۔ لیکن چیک بھی کچھ ایسا اجنبی نہیں کہ اسے بدلنے کی ضرورت محسوس ہو۔

27. Circular

خط دائر، گشتیہ، گشتی چٹھی، گشتی مراسلہ، گشتی اعلان،

اِن سب میں سے گشتی چٹھی یا گشتی مراسلہ صحیح اور قابلِ ترجیح

28. Circulate

گھمائیے، گردش میں لیئے، دورہ کرائیے، رواج دیجئے، مشہور کیجے،

یہ الفاظ Circulate کا اصطلاحی مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ہاں البتہ مندرجہ ذیل قابلِ غور ہیں:-

سب کو مطلع کر دیجے،

سب کو اطلاع دے دیجے،

ملاحظہ کرا دیجے،

سب کو آگاہ کر دیجے،

پھرا دیجے،

اعلان یا سرکاری مراسلہ کے سلسلے میں "پھرا دیجے" مختصر ہونے کے لحاظ سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بہتر لفظ "غور و ملاحظہ کرانا" ہے۔ چنانچہ Circulate among Staff کے لئے مناسب الفاظ "برائے اطلاع عملہ" یا "برائے ملاحظہ عملہ" ہیں۔

29. Clerk

صیغہ دار، اہلکار، منشی، محرر، کاتب، نگران دفتر،

ان تمام میں "محرر" زیادہ اچھا ہے۔ اگرچہ صیغہ دار بھی مستعمل ہے۔ لیکن مقابلتہً محرر موزوں رہے گا۔ کاتب اور اہلکار Clerk کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوتے، بعض دفاتر میں منشی بھی استعمال ہوتا ہے۔ "محرر" و "منشی" میں سے کوئی ایک اختیار کیا جاسکتا ہے۔

30. Compensation

بدلہ، عوض، اجر، مکافات، تلافی مافات، معاوضہ،

مکافات، تلافی مافات اور معاوضہ صحیح مفہوم ادا کرتے ہیں۔ لیکن اختصار و سہولت کے پیشِ نظر "معاوضہ" قابلِ ترجیح ہے۔

31. Contingent charges

"اتفاقی مصارف، اتفاقی اخراجات، صرفہ صادر، فوری اخراجات"

اتفاقی مصارف اور صرفہ صادر دونوں اچھے ترجمے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک اختیار کر لیا جائے۔ صرفہ صادر تو بعض دفاتر میں استعمال بھی ہو رہا ہے۔

32. Current account

چالو کھاتہ، چلت حساب،

چلت حساب مقابلتاً قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے۔

33. Dated

اس کے لئے "مورخہ" عام مستعمل ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں۔ کہ اسے بدلا جائے۔

34. Dealing clerk

محرر متعلقہ، محرر خصوصی، محرر متعلق، صیغہ دار متعلق،

ان سب میں سے "محرر خصوصی" زیادہ اچھا ہے۔

Demand draft

مطالبہ نامہ، مطالبہ ہنڈی،

ان دو کے مقابلے میں عام مستعمل لفظ "درشنی ہنڈی" ہے۔ اور وہی قابلِ ترجیح ہو سکتا ہے۔

36. Demi official

اس کے لئے تو عام مستعمل "نیم سرکاری" ہے۔ اور یہی مروج و قائم ہونا چاہیئے۔ موزوں بھی ہے۔ صحیح ترجمہ بھی اور مختصر بھی۔

37. Designation

تقرر، نام، وصف، خطاب، لقب، منصب، عہدہ

ان تمام الفاظ میں سے "منصب" یا "عہدہ" زیادہ اچھا اور موزوں ہے۔

38. Despatcher

جاریہ نویس، صیغہ دار جاریہ، محرر مراسلات، مہتمم ترسیل

یہ تمام مفہوم کے لحاظ سے درست ہیں۔ لیکن "جاریہ نویس" زیادہ اچھا اور موزوں ہے اور اکثر دفاتر میں جہاں اُردو میں کام ہوتا رہا ہے۔ مستعمل بھی رہا ہے۔

39. Disbursing Officer

مہتمم ادائیات، عہدیدار ادائیات

ان دو کے مقابلے میں "مہتمم ادائیات" بہتر ہے۔

40. Disciplinary action

قانونی کارروائی، تادیبی کارروائی

"قانونی کارروائی" عام مستعمل ہو چلا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اصطلاح کا صحیح مفہوم "تادیبی کارروائی" سے ادا ہوتا ہے۔ اور یہی قابلِ ترجیح اور مروّج ہونا چاہیئے۔

41. Draft for approval

یہ الفاظ اس مسودہ پر افسر کو مخاطب کر کے لکھے جاتے ہیں۔ جس کے متعلق اُن سے منظوری لینا ہو۔ اِس کے لئے مسودہ برائے پسندیدگی، منظوری کے لئے مضمون، منظوری کے لئے خاکہ، مسودہ برائے توثیق، تجویز کئے جاتے ہیں۔ لیکن خاکہ اور مضمون ڈرافٹ کا مفہوم ادا نہیں کرتے۔ اس کے لئے صحیح لفظ مسودہ ہے۔ اور اس اصطلاح کا ترجمہ "مسودہ بغرض منظوری" زیادہ جچتا ہے۔ اور یہی قابلِ ترجیح ہے۔

42. Duplicate

نقل، جواب، ہو بہو نقل، نقل ثانی، نقل دستاویز، مثنی
مثنی قابل ترجیح ہے۔ اس پر حرفی لفظ کا اعتراض بھی بے جا ہوگا کیونکہ
عام مستعمل ہے۔

43. Emergency

فوری ضرورت، ہنگامی ضرورت، ناگہانی ضرورت، وقتی ضرورت،
اتفاقی ضرورت، مشروط احتیاج، فوری تقاضا۔

ضرورت، احتیاج اور تقاضا میں سے ضرورت ہی زیادہ موزوں اور سہل ہے۔ مشروط احتیاج "تو یہاں بے تعلق ہے۔ ناگہانی، ہنگامی، وقتی اور اتفاقی کے مقابلے میں فوری زیادہ سہل اور مفہوم کے قریب ہے۔ چنانچہ "فوری ضرورت" قابل ترجیح ہے۔

44. Endorsement

اس کے لئے "رائے" یا "اظہار رائے" موزوں ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ "تصدیق" زیادہ اچھا ہے۔ چونکہ یہ تصدیق کاغذ کی پشت پر ہوتی ہے۔ اس لئے اس صورت میں "تصدیق ظہری" بہت موزوں ہوگا۔

45. Establishment

بنیاد، تاسیس، بنا، عمارت، اساس وغیرہ مختلف لفظی معانی ہیں لیکن یہاں تک دفتری اصطلاح کا تعلق ہے۔ اس کے لئے "عملہ دفتری" موزوں اور درست ہے۔

46. Establishment Returns

عملہ دفتری کی اطلاعات

47. Ex-officio

اِس کا ترجمہ "بلحاظ منصب" یا "بلحاظ عہدہ" مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے ۔

48. Expenditure Statement

گوشوارہ اخراجات، گوشوارہ مصارف، جدول مصارف، جدول اخراجات۔ اِن تمام میں سے "گوشوارہ اخراجات" زیادہ اچھا ہے ۔ اور استعمال بھی ہوتا رہا ہے ۔

49. Extension

توسیع، وسعت، فراخی، گنجائش، پھیلاؤ، اضافہ، زائد حصّہ، جامعیت۔ جامعیت کے علاوہ باقی تمام ترجمے مختلف محل استعمال کے لحاظ سے صحیح ہیں۔ جامعیت البتہ غیر صحیح اور غیر موزوں ہے ۔ جامع وہ چیز ہے جو تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ لیکن Extention سے مراد ایک چیز میں بڑھاؤ ہے ۔ اس کے لئے لفظ "توسیع" ہی زیادہ موزوں ہے ۔ اور ہر محل میں استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ مندرجہ بالا تمام قسم کے معانی پر حاوی بھی ہے ۔

50. For approval

بغرض تصدیق، بغرض منظوری، بغرض استصواب رائے، بغرض مصادقہ، بغرض موافقت، برائے قبولیت، بغرض رضامندی، بغرض پسندیدگی۔ [illegible] "بغرض منظوری" [illegible] بھی ہے ۔

51. For [illegible]

[illegible] برائے اطاعت، برائے تعمیل حکم [illegible] بغرض تعمیل ۔ [illegible] "بغرض تعمیل" [illegible]

52. For necessary action

ضروری ہدایات کے لئے ، ضروری عمل کی خاطر ، ضروری احکام کے لئے ، مناسب فیصلہ کے لئے ، برائے تعمیل ضروری ، برائے فرمان ضروری ، بغرض کارروائی ضابطہ۔

حقیقت میں یہ اصطلاح دو رُخی ہے ۔کبھی ماتحت سے افسرِ بالا کی طرف احکام حاصل کرنے کی خاطر کاغذ بھیجتے وقت یہ الفاظ لکھے جاتے ہیں۔ کبھی افسرِ بالا کی طرف سے ماتحت کو تعمیل کے لئے اسی طرح ارشاد ہوتا ہے ۔ چنانچہ ترجمے میں یہی دونوں صورتیں مدِنظر رکھی جائیں۔ ان دو صورتوں کے لحاظ سے مندرجہ ذیل ترجمے مناسب ہوں گے ؛

بصورت اوّل : برائے فرمانِ واجب ۔

بصورت دوم : برائے تعمیلِ واجب ۔

مشترک کے لئے " بغرض کارروائی ضابطہ" درست رہے گا۔

53. For orders

بغرض احکام والا ، بغرض حکم واجب ، بغرض صدور حکم ۔

ان میں سے "بغرض صدورِ حکم" اچھا ہے ؛

54. For remarks

بغرض اظہار رائے ، بغرض ملاحظہ ، بملاحظہ ، بغرض تبصرہ ،

ان سب میں سے " بغرض اظہار رائے" اچھا ہے ؛

55. For suggestion

بغرض اقتراح ، بغرض رہنمائی ، بغرض رہبری ، برائے ہدایت ، بغرض استصواب رائے ، بغرض اشارہ ، بغرض رائے ۔

ان تمام میں سے " بغرض رائے " اچھا ہے ۔ لیکن اس سے چونکہ اصطلاح کا پورا

مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اس لئے بہتر ہوگا۔ کہ "بغرض تجویز و رائے" اختیار کیا جائے۔

56. Forwarding letter

سفارشی مراسلہ، تقدیم نامہ، تعارفی مراسلہ، تعارفی خط، تعارفی چٹھی، چٹھی۔
Forwarding کے لئے تعارفی کا لفظ اگرچہ قریب المفہوم ضرور ہے۔ لیکن
اصل مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ Forwarding letter کے لئے موزوں ترجمہ "تقدیم نامہ"
ہے۔ اس کی عربیت گراں خاطر نہ ہو تو اس کا رواج موزوں و مفید ہوگا۔

57. Grade of pay

رتبۂ تنخواہ، معیار تنخواہ، پایۂ معاوضہ، درجۂ تنخواہ، تنخواہ کی منزل، انداز معاوضہ
ان سب کے مقابلے میں "درجۂ مشاہرہ" بہتر ہے۔

58. Head clerk

صدر محرر، سر محرر، صدر صیغہ دار، رئیس التحریر، ہیڈ کلرک۔
ان میں سے "رئیس التحریر" عام طور پر ایڈیٹر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔
Clerk کے لئے محرر کا لفظ اختیار کر لیا جائے۔ تو ہیڈ کلرک کے لئے "سر محرر" نہایت
موزوں لفظ ہوگا۔ یہ بھی ہیڈ کلرک کی لفظی ساخت سے ہم آہنگ سا ہے۔ اور انگریزی کی طرح
اُردو کا سابقہ یہاں کام آ رہا ہے۔

59. Immediate

فوری، ضروری، بالفور، جلدی۔
ان تمام میں سے "فوری" اچھا ہے۔ اور عام مستعمل ہے۔

60. Income & Expenditure Statement

گوشوارہ جمع و خرچ، گوشوارہ آمدنی و خرچ۔
ان کے مقابلے میں "گوشوارہ آمد و خرچ" اچھا رہے گا۔

61. In Continuation of this Office letter

بسلسلہ ماسبق، گذشتہ سے پیوستہ، گذشتہ سے متعلق، باتصال معروضات گذشتہ، گذشتہ کے علاوہ، معروض اوّل کے ساتھ، بطور ضمیمہ، گذشتہ معروضات کے ضمن میں۔ اِن سب میں سے کوئی بھی جچتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ان کے مقابلے میں موزوں یہ ہے کہ "بسلسلہ مراسلہ دفتر ہذا" اختیار کیا جائے۔

62. Increment

اضافہ، اضافہ میعادی۔

اضافہ چونکہ عام لفظ ہے۔ اور *Increment* کے صحیح مفہوم تک محدود نہیں۔ اس لئے اس صحیح مفہوم کے پیش نظر بہتر ہوگا، کہ اس کے لئے "اضافہ میعادی" استعمال کیا جائے۔

63. Initial

دستخط، دوحرفی دستخط، اکھّر، مخفف دستخط، مختصر دستخط، نشان، مہر۔

Initial اور *Signature* میں امتیاز مدِّنظر رکھنا ضروری ہے۔ *Signature* سے مراد مکمل یا پُورے دستخط ہیں۔ اور *Initial* سے مخفف دستخط یا وہ دستخط جس میں صرف نام کے ابتدائی حروف لکھ دیئے جاتے ہیں۔ *Signature* کے لئے اگر "دستخط" کا لفظ مخصوص کر دیا جائے۔ تو پھر *Initial* کے لئے "نشان" ہی موزوں ہوگا۔

64. Interview

بالمشافہ گفتگو، معائنہ، آمنے سامنے، ملاقات، سوال و جواب، باریابی، بالضابطہ ملاقات، جائزہ، امتحان، زبانی امتحان۔

Interview کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ کسی اسامی کے لئے اُمیدوار کو سامنے بلا کر اس کا جائزہ لیا جائے کہ کہاں تک وہ اس اسامی کے لئے موزوں ہے۔ دوسرا عام ملاقات،

عام ملاقات کے لئے لفظ "ملاقات" ہی موزوں ہے۔ لیکن پہلی صورت میں "مشافہہ" بہتر اور موزوں رہے گا۔

65. Issue Order

حکم جاری کیا جائے، احکام جاری ہوں۔
ان میں سے "حکم جاری کیا جائے" بہتر ہے۔

66. Junior

چھوٹا، صغیر، اصغر، ادنیٰ، کہتر، خورد، ذیلی، تحتی، تحتانی۔
مختلف مقام استعمال کے لحاظ سے یہ مختلف الفاظ موزوں ہیں۔ لیکن عام طور پر جو اس اصطلاح سے مفہوم لیا جاتا ہے۔ اس کے لئے "صغیر" اور "ادنیٰ" مناسب الفاظ ہیں۔ اور یہی مستعمل ہیں۔

67. Last Pay Certificate

قبض الوصول، صداقت نامہ وصولی آخری تنخواہ۔
اس کے لئے "قبض الوصول" موزوں ہے۔ لیکن چونکہ Acquittance Roll کے لئے یہ لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا۔ کہ اس کے لئے "تصدیق آخری تنخواہ" یا "قبض الوصول تنخواہ" استعمال کیا جائے۔

68. Lien

استحقاق، حق، استحقاق قبضہ، قبضہ، حق قانونی، حق منصب۔
ان سب کے مقابلے میں "حق عود" بہتر ہے۔

69. Memorandum

اس کے لئے "یادداشت" عام مروّج ہو چکا ہے۔ اس کے بعد "یاد نامہ" بھی موزوں معلوم ہوتا ہے۔ "یاد آور"، "یاد آوری کا کاغذ"، "نوٹ"، "یاد آوری کا خط"

یادداشت کی چِٹھی، خط یاد افروز وغیرہ تکلفات ہیں اور غیر موزوں ہیں۔

70. Menial Staff

اِس کے لئے " ادنیٰ ملازمین" ہی بہتر ہے۔ اور رائج بھی ہے۔

71. Mentioned above

مذکورہ بالا، مذکورۃ الصدر، اُوپر دِئے ہُوئے۔
"مذکورہ بالا" اچھا ہے۔ اور عام رائج ہے۔

72. Mentioned below

مذکورہ ذیل، حسب ذیل،
اس کے لئے "مندرجہ ذیل" عام مستعمل ہے۔ "حسب ذیل" بھی اچھا ہے۔

73. Noted for future reference

"آئندہ احتیاط کی خاطر مدِنظر رکھ لیا گیا" "آئندہ رہنمائی کے لئے ملحوظ رکھا گیا"، آئندہ ملحوظ خاطر رہے گا، "بہتر: اطلاع پائی" "مطلع ہُوا" "آگاہی ہوئی"
ان سب میں سے مناسب معلوم ہوتا ہے "بہتر! آئندہ ملحوظ رہے گا"

74. Office letter

اِس کے لئے " دفتری مراسلہ" اچھا ہے۔

75. Officiating

قائم مقام، عارضی، غیر مستقل۔
یہ تمام الفاظ استعمال میں آتے ہیں۔ لیکن "قائم مقام" عام مروج، صحیح اور قابلِ ترجیح ہے۔

76. On probation

زیر امتحان ، زیر آزمائش ، آزمائشی ، آزمائش پر ، آزمائشی طور پر ۔

لیکن ان سب میں سے ہمیں "زیر آزمائش" زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ "آزمائشی" اگرچہ مختصر ہے لیکن اس سے مفہوم صحیح طور پر ادا نہیں ہوتا ۔ "آزمائش پر" اور "آزمائشی طور پر" مختلف ترکیبی صورتیں ہیں ۔ ان کے مقابلے میں "زیر آزمائش" مختصر ہے اور زیادہ جچا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔

77. Orderly

خادم ، محافظ ، منظم ، اردلی ۔

اس کے لئے عام طور پر "اردلی" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور وہی بہتر ہے ۔

78. Out of Date

بے وقت ، متروک ، غیر مروّجہ ، ہجور ۔

اس کے لئے "متروک" زیادہ موزوں اور مناسب ہے ۔ "غیر مروّج" بھی بُرا نہیں ۔

79. Over Payment.

اس کے لئے "زائد ادائی" اچھا ترجمہ ہے ۔

80. Paper under Consideration

اس کے لئے "کاغذ زیر غور" اچھا ہے ۔ اور مستعمل ہے ۔

81. Pending Cases

امور مرجوعہ ، امور مُعلّقہ ، امور غیر منفصلہ ، امور زیر سماعت ، امور زیر تجویز ، امور زیر غور ، امور ملتویہ ۔

"امور معلّقہ" عالمانہ ترجمہ ہے ۔ لیکن اس پر عربیت کی ثقالت کا شائبہ

اعتراض وارد ہو۔ جو نازک طبائع پر گراں ہوتی ہے۔ اِس لئے بہتر ہے کہ "امورزیرِغور" ہی کو ترجیح دی جائے۔ سہل بھی ہے اور عام مستعمل بھی ؛

82. Peon

اِس کے لئے "چپراسی" عام مستعمل ہے ؛

83. Periodical Increment Statement

گوشوارہ اضافہ میعادی ، فرد اضافہ میعادی ۔

"گوشوارہ اضافہ میعادی" بہتر ہے ؛

84. Please Note

توجہ کیجے ، ذہن نشین کیجے ، دیکھ لیجے ، درج کرلیجے ، یاد داشت لکھ لیجے ، ملحوظ فرمالیجے ، ملاحظہ فرمالیجے ، قابلِ غور ہے ، قابلِ ذکر ہے ، قابلِ توجہ ہے ، تحریر کرلیجے ، مدِّنظر رکھ لیجے ، ملحوظ رکھیے ، مطلع ہوں ، ذہن میں رکھیئے ، خیال رکھیئے یہ تمام کسی نہ کسی صورت میں اصطلاحی مفہوم ادا کرتے ہیں۔ "مطلع ہوں" عام مستعمل ہے ؛

85. Please Speak

بالمشافہہ ، زبانی ، بیان کرم فرمایئے ، براہ کرم کہیئے ، گفت گو کیجے ۔

ان سب میں سے "زبانی" بہتر اور موزوں ہے ؛

86. Post

منصب ، اسامی ، جگہ ، عہدہ ، موقف ، مقام ، ملازمت ، خدمت ۔

اُن میں سے منصب ، اسامی ، عہدہ *Post* کے مفہوم کے زیادہ قریب ہیں - اسامی کا لفظ عام مستعمل ہے - اور یہی بہتر ہے - Vacancy کے لئے "خالی اسامی" استعمال کیا جائے تو موزوں ہوگا ؛

87. Precedent

نظیر، نمونہ، سند، مثال، سابقہ رواج۔

اصطلاحی لحاظ سے "سابقہ" زیادہ اچھا ہے لیکن اگر اسے "Prefix" کے لئے مخصوص کردیا جائے، تو Precedent کے لئے "نظیر" زیادہ موزوں رہے گا۔

88. Probationary period

عرصہ زیرِ آزمائش، آزمائشی دَور، امتحانی عرصہ، اُمیدوارانہ عرصہ، کارآموزانہ دَور، زمانہ شاگردی، زمانہ اُمیدواری، زمانہ زیرِامتحان، زمانہ زیرِآزمائش، زمانہ نوآموزی۔

ان تمام کے مقابلے میں "زمانہ آزمائش" زیادہ اچھا اور جچا ہُوا معلوم ہوتا ہے

89. Put up for approval

بغرض توثیق پیش ہو، بغرض تصدیق پیش ہو، برائے منظوری پیش ہو۔

ان میں سے "بغرض منظوری پیش ہو" بہتر ہے، کیونکہ اس میں تصدیق، توثیق کے معانی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

90. Put up for consideration

بغرض ملاحظہ پیش ہو، بغرض غور پیش ہو۔

اس کے لئے "برائے غور پیش ہو" بہتر ہے۔

91. Put up previous papers please

براہ کرم سابقہ کاغذات پیش ہوں، سابقہ کاغذات بھیجئے۔

ان کے لئے بہتر ہے۔ کہ "سابقہ کاغذات پیش کریں" (س ک پ ک) استعمال کیا جائے۔

92. Quotations

نرخ نامہ، حوالہ، نقل، بیان، شرح، نرخ، جاریہ قیمتیں ۔

یہ اصطلاح مختلف معنوں میں استعمال ہوتی ہے ۔

جہاں اس سے مقصود وہ فقرے یا عبارت کے قطعے مراد ہوں جن کو کہیں سے نقل کیا گیا ہو یا جن کا حوالہ دیا گیا ہو ۔ وہاں اس کے لئے موزوں ترجمہ " اقتباسات " ہے ۔ اور جہاں سامانِ تجارت کی تازہ قیمتیں مقصود ہوں تو وہاں " نرخ نامہ " مناسب ہوگا ۔

93. Recess

وقفہ، وقفہ تفریح، عُطلہ، مہلت، چھٹی، ہنگامی تعطیل ۔

معانی کے لحاظ سے سب الفاظ صحیح ہیں، لیکن " تفریح " چونکہ عام مستعمل ہے ۔ اس لئے اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں ۔ " تفریح " سے وقفہ تفریح کا مفہوم سب جانتے ہیں ۔

94. Record

اندراج، تحریر، روداد، قلم بندی، کارنامہ، مسل، فرد، کاغذات، مآثر، آثار، سجل، دفتر، دستاویز، یادداشت ۔

ان میں سے پہلے پانچ تو بہت غیر موزوں ہیں ۔ باقی بہت محدود ہیں ۔ اور ریکارڈ کی تمام شاملات پر حاوی نہیں، دفتر اور فرد بھی اسی کی سی جامعیت نہیں رکھتے دفتری اصطلاح میں ریکارڈ کا زیادہ تر اطلاق کاغذات پر ہوتا ہے ؛ " دفتری کاغذات " موزوں ترجمہ ہوگا ۔ لیکن اس کے مقابلے میں " مسلیں " عام مستعمل بھی ہے اور رائج بھی ۔ اس کو بصورت جمع استعمال کیا جائے تو بہتر ہوگا ۔ انگریزی لفظ ریکارڈ کو قائم رکھتے ہیں کوئی حرج نہیں ۔ " دستاویزات " بھی مستعمل ہے ۔

95. Record keeper

محافظ دفتر، صیغہ دار محافظی ۔

صیغہ دار محافظی کے مقابلے میں "محافظ دفتر" اچھا ہے ۔

96. Record Room

مسل خانہ، محافظ خانہ،

"محافظ خانہ" عام رائج ہے ۔

97. Recurring Expenditure

مکرر اخراجات، رجوعی اخراجات، متواتر اخراجات، مصارف متوالی ۔

ان تمام میں سے آخری ترجمہ مناسب اور بہتر ہے ۔

98. Registered Number

نمبر داخلہ، نشان داخلہ، نشان شرکت ۔

ان تینوں میں سے "نمبر داخلہ" زیادہ موزوں ہے ۔

99. Remittance transfer receipt

رسید منتقلی زر مرسلہ ۔

100. Resultant Vacancy

آخری اسامی، حاصل اسامی، نتیجی اسامی، پیدا شدہ اسامی، منتج اسامی، عقبی اسامی، ذیلی اسامی، تبعی اسامی ۔

ان سب میں سے "ذیلی یا تبعی اسامی" زیادہ موزوں اور اچھا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔

101. Retirement

اس کے لئے موزوں "سبکدوشی" ہے ۔

102. Safe

کنوپہ ، پیٹی ، تجوری ۔
اس کے لئے " تجوری " زیادہ موزوں ہے ۔

103. Salary bill of establishment

بل تنخواہ دفتری عملہ ، برادرد عملہ ۔
" برادرد عملہ " بہتر ہے ۔ اور اکثر دفاتر میں مستعمل بھی ہے ۔

104. Sanction

اس کے لئے موزوں لفظ " منظوری " ہے ۔

105. Sanctioned

اس کے لئے مناسب ترجمہ " منظور " ہے ۔

106. Schedule

فہرست ، گوشوارہ ، فرد ۔
فہرست اور فرد کے مقابلے میں " گوشوارہ " زیادہ اچھا ہے ۔ عام مستعمل بھی ہے ۔ اور موزوں بھی ۔

107. Senior

چھوٹا ، صغیر ، اصغر ، ادنیٰ ، کہتر ، خورد ، زیرین ، تحتی ، تحتانی ۔
ان سب میں سے " ادنیٰ " ہی عام مستعمل اور معروف ہے ۔ اس لئے یہی قابلِ ترجیح ہے ۔

108. Stenographer

سٹینوگرافر ، محرر ، کلرک ، زود نویس ۔
محرر عام ہے ۔ لیکن سٹینو گرافر ایک خاص قسم کا محرر ہے ۔ اسی طرح کلرک کا بھی

اطلاق نہیں ہوسکتا۔ زود نویس اگرچہ مفہوم کے قریب ہے لیکن اصل اصطلاح میں یہ
اِملا اختصار سے قلمبند کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے وہ زود نویس سے ادا نہیں ہوتا سٹینوگرافر
حقیقت میں ملفوظات کو مختصر الفاظ میں قلمبند کرتا جاتا ہے۔ اس لئے اس نسبت سے
" مختصر نویس" بہتر ہوگا ۔

109. Submitted for orders

اس کے لئے " بغرض صدور حکم پیش خدمت ہے" بہتر اور موزوں ہے ۔

110. Superintendant office

مہتمم دفتر، محافظ دفتر، منتظم دفتر، ناظم دفتر۔
ان کے مقابلے میں " نگران دفتر" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے ۔

111. Surplus

فالتو، بیشی، زائد، فاضل، توفیر، نائد مقدار، فاضل مقدار۔
اس کے لئے یہ تمام لفظ صحیح مفہوم ادا کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام کے مقابلے میں
" سرحاصل" زیادہ اچھا اور جچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مفہوم صحیح ادا کرنے کے علاوہ
یہ کچھ Surplus کی لفظی ساخت اور آواز سے بھی ملتا جلتا ہے ۔

112. Temporary

عارضی، وقتی، غیر مستقل اور موقتی۔
لیکن ان سب میں سے " عارضی" ہی بہتر اور موزوں ہے۔ اور یہ عام
مستعمل بھی ہے ۔

113. Terms of reference

حل طلب امور، تحقیقاتی امور، فیصلہ طلب امور، امور تنقیح، دریافت طلب مسائل
امور حوالی ۔

امور جاری غیر موزوں اور بعید از مفہوم ہے۔ باقی تمام ترجمے مفہوم کے قریب قریب ہیں۔ لیکن " امور تنقیح " ان سب میں زیادہ مناسب اور مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔ اور اسی کا رواج قابل ترجیح ہے +

114. Time table

تنظیم اوقات ' نظام نامہ اوقات ' نقشہ انضباط اوقات ' نقشہ اوقات ' شجرہ اوقات ' شجرہ تقسیم اوقات ۔

Time table کے معنی کے لحاظ سے سارے تراجم مفہوم کے قریب قریب ہیں۔ لیکن ان میں قدرے ثقالت اور طوالت کی وجہ سے مقابلتاً یہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کہ " وقت نامہ " اختیار کیا جائے۔ جو ان سب کے مقابلے میں مختصر بھی ہے۔ اور مفہوم کے لحاظ سے درست بھی +

115. Treasury chalan

اس کے لئے عام مستعمل ترجمہ " چالان خزانہ " ہے۔ اور یہی موزوں ہے +

116. Typist

طباع ' ٹائپسٹ ' طرح نگار میں سے تو ٹائپسٹ ہی اچھا ہے۔ لیکن اس کے لئے اگر " مشینی محرر " کہا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا +

117. Under consideration

جس معاملے پر ابھی غور و خوض ہو رہا ہو۔ اور فیصلہ نہ ہؤا ہو۔ یہ اصطلاح اس معاملے کے متعلق استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے لئے تین ترجمے عام طور پر تجویز کئے جاتے ہیں۔ زیر تجویز ' زیر تامل ' زیر غور۔ تجویز کا لفظ تو Consideration کے لئے ناموزوں ہے۔ " تامل " اگرچہ کسی حد تک فیصلہ کی تاخیر کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ تردد کا عنصر بھی شامل ہے۔ " غور " Consideration کا صحیح اور موزوں

ترجمہ ہے۔ ہم "زیرغور" کو ہی ترجیح دیں گے ۔

118. Under reference

زیرحوالہ، زیرغور، زیر بحث، زیرتذکرہ، زیرتبصرہ ۔

زیرغور Under Consideration کے لئے، زیر بحث Under discussion کے لئے، زیرتبصرہ Under review کے لئے موزوں ہے Under reference کے لئے "زیرحوالہ" مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

119. Under signed

زیر دستخطی، نیچے دستخط کرنے والا، دستخطی، دستخط نگار ۔

زیر دستخط اور دستخطی دونوں غلط ہیں ۔ اس کے لئے "دستخط نگار" موزوں معلوم ہوتا ہے ۔

120. Up-to-date

تازہ ترین علم کے مطابق، تازہ ترین ضروریات کے مطابق، تازہ ترین، الی الآن ۔

الی الآن عربی ہے اور ثقالت کے اعتراض سے محفوظ نہیں ۔ "تازہ ترین" کے علاوہ باقی دو لمبے ترجمے ہیں ۔ "تازہ ترین" اگرچہ مناسب ترجمہ ہے ۔ لیکن اس کے مقابلے میں "ہنوزی" زیادہ موزوں ہوگا۔ مختصر بھی ہے اور اصل مفہوم پر حاوی بھی ۔

121. Write off

مٹا دینا، خارج کر دینا، غلط قرار دینا، محو کرنا ۔

یہ سب ترجمے ناموزوں ہیں، اصل میں یہ اصطلاح دفتر میں اس وقت یا موقعہ پر استعمال کی جاتی ہے ۔ جبکہ کسی چیز کو ناقابلِ ادا قرار دینا مقصود ہو، اور ایسے موقع کے لئے "قلم زد کرنا" عام مستعمل ہے ۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک اصطلاح

"نظری کرنا" بھی ہے ۔ اور وہ زیادہ موزوں ہے ۔

122. With reference to your letter No.

بہ حوالگی آپ کا خط نمبر، بحوالہ آپ کی چٹھی نمبر، بہ نسبت آپ کے مکتوب نمبر، بہ تعلق آپ کے گرامی نامہ نمبر، بحوالہ مراسلہ نمبر،

بہ نسبت ، بہ تعلق اور بہ حوالگی تو ناموزوں ترجمے ہیں۔ جہاں بزرگواروں سے خطاب ہو تو وہاں " بحوالہ مکتوب گرامی نمبر " موزوں ہے ۔ لیکن عام دفتری خط وکتابت کے لحاظ سے " بحوالہ آپ کی چٹھی نمبر " یا " بحوالہ مراسلہ نمبر " میں سے کسی کو انتخاب کرلیا جائے ۔" بحوالہ آپ کی چٹھی نمبر " اکثر مستعمل بھی ہے اور عام فہم ہونے کے لحاظ سے موزوں بھی ۔

123. Your most obedient servant

آپ کا سچا خادم ، آپ کا وفادار خادم ، آپ کا تابعدار خادم ، آپکا تابع فرمان ، آپ کا مطیع خادم ، آپ کا اطاعت شعار ، آپ کا فرماں پذیر خادم ، آپ کا بندۂ حکم ، آپ کا بندۂ فرمان ، آپ کا ازحد تابعدار خادم ، آپ کا مطیع فرمان ۔

تابعدار کا لفظ قابل اعتراض ہے ۔ کیونکہ اس کا صحیح مفہوم وہ حاکم ہے ۔ جو کسی کو تابع رکھے ۔ خادم کے لئے یہ لفظ غلط مستعمل ہے ۔ باقی تمام صحیح ترجمے ہیں ۔ لیکن موزوں یہی ہے ۔ کہ " آپ کا فرماں بردار خادم " یا " اطاعت شعار " لکھا جائے ۔

124. Yours faithfully

آپ کا وفادار ، آپ کا وفادار خادم ، آپ کا معتمد ، وفادار شما ، حضور کا وفادار ، آپ کا باوفا ، صادق القول ۔

اِن سب میں سے " آپ کا وفادار " ہی اچھا ہے۔ لیکن اختصار و موزونیت کے لحاظ سے " وفاکیش " یا " وفا آگین " بہتر رہے گا ؛

125. Yours truly

آپ کا سچّا خادم ' آپ کا سچّا ' آپ کا بندۂ اخلاص ' آپ کا نمک حلال آپ کا خالص نمک حلال ۔

خادم ' بندہ اور نمک حلال کی تو یہاں ترجمے کے لحاظ سے مطلق ضرورت نہیں۔" آپ کا خالص نمک حلال " تو مضحکہ خیز اور سخت ناموزوں ہے ' بلکہ لغو ہے ۔ اِن سب کے مقابلے میں " آپ کا مخلص " بہتر ہے۔ لیکن " آپ کا ' اگر ترک کر دیا جائے تو اچھا ہوگا۔ کیونکہ یہ ایک تکلّف ہی ہے۔" مخلص " بہت اچھا ہے ؛

رکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ـــــــــ شعبہ اسکول

تاریخ و نمبرہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
فروری ۱۹۰ء ۲۴۸۱	م۔ غلام مصطفیٰ نمبر ۳۸۵ : ۱۰۰/۵۰	معلم دستکاری جو اب معلم نقشہ کشی گورنمنٹ ہائی اسکول کھوڑہ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں ۔	معلم دستکاری گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ (گجرات) بمشاہرہ سابقہ ۔		م۔ عنائیت اللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۔
”	م۔ عنائیت اللہ ۱۰۰/۵۰	قائم مقام معلم دستکاری گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ ۔	معلم دستکاری گورنمنٹ ہائی اسکول کھوڑہ ۔		م۔ غلام مصطفیٰ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۔